زیر نظر

اُستاد محقّق آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

تفسیر نمونہ جلد ۲

ترجمہ

حضرت مولانا سید صفدر حُسین نجفی رح

زیر سرپرستی

حضرت آیت اللہ العظمیٰ الحاج سید علی رضا سیستانی مدظلہ

فہرست









۱۸۸۔ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

ترجمہ

۱۸۸۔ ایک دوسرے کے اموال آپس میں باطل (و ناحق) طریقے سے نہ کھاؤ اور گناہ کے ذریعے لوگوں کے مال کا ایک حصّہ کھانے کے لیے اس میں سے (کچھ مال) قاضیوں کو نہ دو جب کہ تم جانتے ہو۔

تفسیر

اس آیت میں مسلمانوں کو ایک بہت ناپسندیدہ عمل سے روکا گیا ہے۔ ان سے ارشاد ہوتا ہے: ایک دوسرے کے مال و دولت میں ناحق تصرف نہ کرو اور غیر صحیح طریقے سے مال پر قبضہ نہ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ دوسروں کے مال میں تصرف کرنے اور اسے ناحق کھانے سے انہیں قاضیوں کے روبرو جانا پڑے اور پھر انہیں بھی ہدیہ رشوت کے طور پر کچھ پیش کرنے لگیں تاکہ لوگوں کا مال ظلم سے اپنی ملکیت بنا سکیں اس کام میں وہ دو بڑی خلاف ورزیوں کے مرتکب ہوتے ہیں

دوسروں کا حق کھانا اور رشوت دینا۔ رشوت کا مسئلہ اسلام کی نظر میں اتنا اہم ہے کہ امام صادقؑ فرماتے ہیں:

واما الرشا فی الحکم فھو الکفر باللہ العظیم۔

باقی رہا فیصلہ کرنے میں رشوت لینا۔ تو یہ خدائے عظیم سے کفر ہے۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے ایک مشہور حدیث منقول ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

لعن اللہ الراشی والمرتشی والساعی بینھما۔

خدا اپنی رحمت سے دور رکھے رشوت لینے والے، رشوت دینے والے اور ان کے درمیان واسطہ بننے والے کو

سورہ نساء کی آیت ۲۹ میں بھی ایسا ہی مفہوم بیان ہوا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: "جائز اور صحیح راہ تجارت کے بغیر جو کچھ تم اپنے قبضے میں لیتے ہو اس میں تصرف نہ کرو۔"

زیر نظر آیت صراحت سے کہتی ہے کہ اگر کچھ لوگ رشوت کے ذریعے عدالت میں کامیاب ہو جائیں تو نزاعی مال اُن پر حرام ہوگا اور ظاہری طور پر کسی کے حق میں عدالت کے حکم سے وہ مال کا حقیقی مالک نہیں بن سکتا۔ صراحت سے رسول اکرمؐ کی ایک حدیث میں منقول ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

میں تمہاری طرح کا ایک بشر ہوں (اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ ظاہری طریقے سے تمہارے درمیان فیصلہ کروں) ہو سکتا ہے بعض لوگ دلیل قائم کرنے میں زیادہ قابل ہوں اور میں ظاہری دلیل کی وجہ سے ان کے حق میں

---

[1] وسائل، ج ۱۲، باب ۵، من ابواب ما یکتسبون۔



فیصلہ کردوں لیکن یہ جان لو کہ اگر میں کسی کے حق کا دوسرے کے لیے فیصلہ کر بھی دوں پھر بھی وہ جہنم کا ایک ٹکڑا اگر اُسے حاصل کرنے والا آگ چاہتا ہے تو اُس میں تصرف کرے ورنہ اُسے چھوڑ دے۔ ؎

رشوت خوری ۔ ایک مصیبت

ایک عظیم مصیبت جو زمانۂ قدیم سے نوعِ انسانی کو دامن گیر ہے اور جو آج کل تو بڑی شدت سے رائج اور جاری و ساری ہے، وہ رشوت ہے۔ عدالتِ اجتماعی کی راہ میں یہ ایک بہت بڑی رکاوٹ رہی ہے اور آج بھی ہے۔ اسی کے سبب وہ قوانین جو کمزوروں کے تحفظ کے ضامن تھے۔ طاقتوروں کے ان مظالم کے حق میں استعمال ہوتے ہیں قانون جنہیں محدود کرنا چاہتا تھا کیونکہ طاقتور اور قوی لوگ تو ہمیشہ اپنی قوت کے بل بوتے پر اپنے منافع کی حفاظت کر سکتے ہیں یہ تو ضعیف اور کمزور لوگ ہی ہیں جن کے منافع اور حقوق کی حفاظت قانون کو کرنا ہے۔ واضح ہے کہ اگر رشوت کا دروازہ کھلا رہے تو قوانین کا نتیجہ بالکل برعکس نکلے گا کیونکہ قوی لوگ تو رشوت دینے کی قدرت رکھتے ہیں اس کے نتیجے میں ان کے ہاتھوں قوانین کمزور لوگوں کے حقوق پر ظلم و ستم اور تجاوز جاری رکھنے کے لیے ایک کھیل بن کر رہ جائیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ جس معاشرے میں رشوت نفوذ کرے گی وہاں زندگی کا شیرازہ بکھر کر رہ جائے گا اور ظلم و فساد، ناانصافی اور تبعیض کا دور دورہ ہوگا اور قانون عدالت برائے نام باقی رہ جائے گا۔ اسی لیے اسلام نے رشوت خوری کو پوری شدت کے ساتھ قباحت قرار دیا ہے، اس کی مذمت کی ہے اور اسے گناہان کبیرہ میں سے قرار دیا ہے۔ یہ امر قابل توجہ ہے کہ رشوت جیسی برائی اور قباحت دوسرے پُر فریب ناموں سے انجام پاتی ہے۔ رشوت خوار اور رشوت دینے والا اس کے لیے ہدیہ، حق و حساب، حقِ زحمت اور انعام جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن واضح ہے کہ ناموں کی یہ تبدیلی کسی طرح بھی اس کی ماہیت اور حقیقت کو نہیں بدل سکتی۔ ہر صورت میں جو بھی پیسہ اس طریقے سے وصول ہوگا وہ حرام اور ناجائز ہے۔

نہج البلاغہ میں اشعث بن قیس کا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ ایک مرتبہ وہ حضرت علیؑ کے محکمۂ عدل میں اپنے مدِمقابل پر کامیابی کے لیے رشوت لے کر آیا۔ ہوا یوں کہ رات کے وقت ایک لذیذ حلوے سے بھرا ہوا برتن لے کر حضرت علیؑ کے دروازے پر آیا۔ وہ اُسے ہدیہ قرار دے رہا تھا۔ حضرت علیؑ نے غصے سے فرمایا:

"هبلتك الهبول اعن دين الله اتيتني لتخدعني .... والله لو اعطيت الاقاليم السبعة بما تحت افلاكها على ان اعصى الله في نملة اسلبها جلب شعيرة ما فعلته وان دنياكم عندي لاهون من ورقة في فم جرادة تقضمها مالعلي ولنعيم يفنى ولذة لا تبقى"

سوگوار تجھ پر روئیں۔ کیا تو اس لیے آیا ہے کہ مجھے فریب دے اور مجھے دینِ حق سے باز رکھے۔ خدا کی قسم اگر سات اقلیم ان سب چیزوں کے سمیت جو ان کے آسمانوں کے نیچے ہیں مجھے دے دی جائیں صرف اس کے

؎ فی ظلال، ج ۱، ص ۲۵۲



بدلے کر میں چیونٹی کے منہ سے جَو کا ایک چھلکا ظلم سے چھین لوں تو میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا۔ تمہاری یہ دُنیا میرے نزدیک ٹڈی کے منہ میں چبائے ہوئے پتے سے بھی زیادہ بے وقعت ہے۔ علی کو فنا ہونے والی نعمتوں اور جلد گزر جانے والی لذتوں سے کیا کام۔

اسلام رشوت کی ہر شکل وصورت کو مذموم سمجھتا ہے۔ پیغمبر اسلامؐ کی تاریخ حیات کا ایک واقعہ ہے کہ آپؐ کو ایک مرتبہ خبر ملی کہ آپؐ کی طرف سے معین ایک حاکم نے ہدیہ کے نام پر رشوت قبول کرلی ہے۔ آنحضرتؐ غضبناک ہوئے اور اس سے فرمایا۔

"کیف تأخذ مالیس لك بحق؟"

"تو وہ چیز کیوں لیتا ہے جو تیرا حق نہیں ہے؟......."

اُس نے جواب میں معذرت کرتے ہوئے کہا:

"لقد کانت هدیة یا رسول الله؟"

"اے رسول خدا! میں نے جو کچھ لیا وہ تو ہدیہ تھا"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا

"ارأیت لوقعد احدکم فی داره ولم نوله عملا اکان الناس یهدونهٔ شیئا؟"

"اگر تم گھروں میں بیٹھے رہو اور میری طرف سے کسی جگہ پر عامل و حاکم نہ بنو تو کیا پھر بھی لوگ تمہیں ہدیہ دیتے ہیں؟"

اس کے بعد آپؐ نے حکم دیا اور اس سے وہ ہدیہ لے کر بیت المال میں داخل کر دیا گیا اور اُسے آپؐ نے معزول کر دیا[1]

اسلام نے تو یہاں تک اہتمام کیا ہے کہ قاضی کہیں مخفی رشوتوں میں مبتلا نہ ہو جائے۔ اسلام نے حکم دیا ہے کہ قاضی خود بازار میں نہ جائے

۱۸۹۔ يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ؕ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○

ترجمہ

۱۸۹۔ لوگ آپ سے مہینے میں چاند کی مختلف صورتوں کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہیئے کہ یہ تقسیم اوقات (اور طبیعی

[1] الامام علیؑ، جلد ۱، ص ۱۵۵، ۱۵۶



تقویم) کا مظہر ہیں نیز یہ لوگوں (کے نظام زندگی) کے لیے اور حج کے وقت (کے تعین) کے لیے ہیں (اور جیسے زمانہ جاہلیت میں مروج تھا کہ حج کے موقع پر جب لوگ احرام باندھ لیتے تو پھر گھر کے دروازے سے اندر نہیں آتے تھے بلکہ عقب سے داخل ہوتے تھے) یہ نیک کام نہیں کہ عقب مکان سے اندر آؤ بلکہ نیکی یہ ہے کہ تقویٰ اختیار کرو اور گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہوا کرو اور خدا کی نافرمانی سے پرہیز کرو تاکہ کامیاب ہو جاؤ۔

شانِ نزول

منقول ہے کہ:

معاذ بن جبل رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم سے بار بار یہ سوال کیا جاتا ہے کہ یہ چاند کیسا ہے اور یہ تدریجاً بدر کامل کی صورت کیوں اختیار کرتا ہے اور پھر دوبارہ پہلی حالت پر لوٹ آتا ہے؟

منقول ہے کہ:

"یہودیوں نے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے پوچھا کہ یہ چاند کس لیے ہے اور اس کا کیا فائدہ ہے۔"

ان سوالات کے جواب میں محلِ نظر آیت نازل ہوئی جس میں بتایا گیا کہ چاند کی مختلف صورتیں انسانی نظام زندگی کیلئے بہت سے فوائد کی حامل ہیں۔

تفسیر

جیسا کہ اس آیت کی شان نزول میں آیا ہے کہ کچھ لوگ پیغمبر اسلامؐ سے چاند کے متعلق سوالات کرتے تھے۔ اس سوال کے جواب میں خداوند عالم نے پیغمبر صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کو حکم دیا ہے کہ وہ چاند کے آثار و فوائد بیان کریں۔ انہیں بتائیں کہ مہینوں کی ابتداء طلوع ہلال کی صورت میں اور پھر تدریجاً اس کی تبدیلی عبادات اور دینی فرائض کی انجام دہی نیز مادی نظام زندگی کے لیے بہت کار آمد ہے۔ یہ اس لیے ہے تاکہ لوگ آسانی سے اپنے تجارتی امور اور دیگر پروگراموں کو ترتیب دے سکیں نیز وعدوں اور عہد و پیمان کے لیے وقت کا تعین کر سکیں۔ اس طرح روزہ رکھنے اور حج جیسی عظیم عبادت کی انجام دہی کے لیے مخصوص وقت ہے۔ جس کے تعین کے لیے بہترین راستہ چاند ہی کی وضع و کیفیت ہے۔ چاند دیکھ کر لوگ ہمیشہ ابتداء، وسط اور آخر ماہ کی تشخیص کر سکتے ہیں اور اپنے امور کو اس کے مطابق ترتیب دے سکتے ہیں۔

حقیقت میں چاند ایک "طبیعی تقویم" ہے جو تمام افراد بشر کے لیے عام ہے۔ اس سے تمام لوگ چاہے وہ پڑھے لکھے ہوں یا اَن پڑھ اور دُنیا کے کسی بھی حصے میں آباد ہوں اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ اس سے فقط آغاز، وسط اور آخر ماہ ہی کو نہیں پہچانا جا سکتا بلکہ غور و خوض سے مہینے کے ہر دن کی تشخیص کی جا سکتی ہے۔ واضح ہے کہ تقویم اور جنتری یعنی لوگوں کے لیے



تاریخ کے تعین کا دقیق ذریعہ نہ ہو تو اجتماعی زندگی کا نظام نہیں چل سکتا۔ اسی بناء پر خدائے بزرگ و برتر نے نظام زندگی کی بقاء کے لیئے یہ عالمی تقویم عنایت فرمائی ہے۔

طبیعی اور فطری میزان اور پیمانے

قوانینِ اسلام کی ایک خصوصیت اور امتیاز یہ ہے کہ اُنہیں عموماً طبیعی اور فطری میزان کے مطابق قرار دیا گیا ہے کیونکہ طبیعی مقیاس ایک ایسا ذریعہ ہے جو سب لوگوں کے ہاتھ میں دیا گیا ہے اور رفتارِ زمانہ اس پر اثر انداز نہیں ہوتی جب کہ اس کے برعکس غیر طبیعی نظام ہائے مقیاس سب لوگوں کے اختیار میں نہیں ہیں یہاں تک کہ دورِ حاضر میں بھی تمام لوگ مصنوعی مقیاسوں سے استفادہ نہیں کر پاتے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کبھی بالشت کو اور کبھی قدم کو، کبھی انگلی کی گرہوں کو اور کبھی انسان کے طول قامت کو پیمانہ قرار دیتا ہے۔ اس طرح وقت کے تعین کے لیے غروبِ آفتاب، طلوعِ فجر، سورج کے نصف النہار سے گذر جانے اور چاند دیکھ لینے کو مختلف مواقع پر میزان قرار دیتا ہے۔

"لیس البر بأن تأتوا البیوت من ظہورھا" یعنی گھر کی پشت سے گھر میں داخل ہونا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ یہاں حج کے متعلق گفتگو جاری ہے اور بتایا گیا ہے کہ حج کے اوقات کو چاند کے ذریعے معین کیا جا سکتا ہے۔ اب خداوند عالم نے حج کے موقع پر زمانہ جاہلیت کی ایک رسم کی طرف توجہ دلاتے ہوئے اس سے منع فرمایا ہے۔ وہ لوگ جب احرام باندھ لیتے تو عام راستے اور گھر کے دروازے سے گھر میں داخل نہیں ہوتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ احرام باندھے ہوئے شخص کو گھر کے دروازے سے داخل نہیں ہونا چاہیئے۔ اس بناء پر وہ گھر کی پچھلی طرف نقب لگاتے اور احرام کی حالت میں صرف وہیں سے داخل ہوتے۔ وہ اس عمل کو کارِ نیک سمجھ کر انجام دیتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک یہ عمل ایک طرح سے ایک عادت ترک کرنے کا اظہار تھا۔ احرام چونکہ عادات ترک کرنے کا نام ہے لہٰذا وہ خیال کرتے تھے کہ اس کی تکمیل اس عادت کے ترک کرنے سے ہونا چاہیئے [1]

لیکن قرآن صراحت سے کہتا ہے کہ نیکی تقویٰ میں ہے نہ کہ ایسی بے ہودہ عادات و رسوم میں اور پھر بلا فاصلہ حکم دیتا ہے کہ گھروں میں عمومی راستے ہی سے داخل ہوا کرو۔

البتہ آیت کا ایک وسیع تر اور زیادہ عام معنیٰ بھی ہے اور وہ یہ کہ جب کسی بھی کام کے لیئے ابتداء کی جائے چاہے وہ مذہبی اعمال میں سے ہو یا ان کے علاوہ چاہیئے کہ اُس کے صحیح راستے سے اُس میں داخل ہوا جائے نہ کہ انحرافی، اُلٹے اور غیر عادی طریقوں سے۔ یہی مفہوم جابر نے امام باقرؑ کے ارشاد سے نقل کیا ہے [2]

تفاسیر اہل بیتؑ میں اس آیت کے بارے میں ہے:

ہم ابواب خداوندی اور اس تک پہنچنے کا راستہ اور جنتِ الٰہی کی طرف بلانے والے ہیں۔ [3]

اس کا مفہوم یہ ہے کہ اپنے تمام مذہبی امور میں اس کے اصلی راستے سے داخل ہونا چاہیئے اور نظامِ حیات اہل بیتؑ ہی سے

---

[1] تفسیر بیضاوی۔ [2] مجمع البیان۔ [3] مجمع البیان۔



حاصل کرنا چاہیئے کیونکہ وحی انہی کے گھر میں اُتری ہے اور وہ مکتب وحی الٰہی کے تربیت یافتہ ہیں۔

"لیس البر بان ...." یہ جملہ ہو سکتا ہے ایک اور لطیف نکتے کی طرف بھی اشارہ ہو وہ یہ کہ معارف دینی کے متعلق سوال کرنے کی بجائے مہینے کے چاند کے بارے میں تمہارا سوال کرنا ایسے ہے گویا کوئی شخص گھر کے اصلی دروازے کو چھوڑ کر اس کی پشت پر نقب زنی کر کے اس میں داخل ہو جو کتنا برا کام ہے۔

۱۹۰۔ وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ۝

ترجمہ

۱۹۰۔ اور راہ خدا میں تم اُن لوگوں سے قتال کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں اور حد سے تجاوز نہ کرو کیونکہ خدا تجاوز کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

شان نزول

ابن عباس سے منقول ہے کہ یہ آیت صلح حدیبیہ کے موقع پر نازل ہوئی۔ واقعہ یوں ہے کہ رسول خدا اپنے ۰۰۰۱ اصحاب کے ساتھ عمرہ کے لیے تیار ہوئے۔ جب سرزمین حدیبیہ پر (جو مکہ کے قریب ایک جگہ ہے) پہنچے تو مشرکین نے انہیں مکہ میں داخل ہونے اور مناسک عمرہ بجا لانے سے روکا۔ طویل سلسلۂ گفتگو کے بعد انہوں نے پیغمبر اکرمؐ سے صلح کر لی اور طے یہ پایا کہ رسول اللہؐ اگلے برس عمرہ ادا کرنے آئیں اور وہ ان کے لیے تین دن تک مکہ خالی کر دیں گے تاکہ آپ خانہ کعبہ کا طواف کر سکیں اگلے سال جب آپؐ مکہ کی طرف جانے کے لیے آمادہ ہوئے تو ڈر تھا کہ شاید مشرکین وعدہ وفا نہ کریں اور رکاوٹ پیدا کریں۔ یوں جنگ شروع ہو جانے کا امکان تھا۔ اور آپ ماہ حرام میں جنگ کرنے پر خوش نہ تھے۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی اور حکم دیا گیا کہ اگر دشمن جنگ شروع کر دے تو تم بھی اس کے مقابلے میں کھڑے ہو جاؤ۔

تفسیر

اس آیت میں قرآن نے ان لوگوں سے قتال کا حکم صادر فرمایا ہے جو آغاز جنگ کریں اور مسلمانوں کے سامنے تلوار نکال لیں۔ قرآن نے اجازت دی ہے کہ دشمن کو خاموش کرنے کے لیے ہتھیار بر ہاتھ رکھا جائے اور ہر قسم کے دفاعی ذرائع سے استفادہ کیا جائے اور حقیقت میں اب مسلمانوں کے صبر و تحمل کا زمانہ ختم ہو گیا ہے۔ اور اب وہ ہر طرح اور جانبازی سے اپنے حقوق کا دفاع کر سکتے ہیں

جنگ کیوں اور کس سے؟

اس آیت میں تین بنیادی نکات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو جنگ کے موقع کی اسلامی منطق کو مکمل طور پر واضح کرتے ہیں:



۱۔ جملہ "وقاتلوا فی سبیل اللہ" (خدا کی راہ میں جنگ کرو) اسلامی جنگوں کے اصلی مقصد اور ہدف کو واضح کرتا ہے۔ انتقام، جاہ طلبی، حصول اقتدار، کشور کشائی، مال غنیمت اور دوسروں کی زمینوں پر قبضہ ان سب مقاصد کے لیے جنگ کرنا اسلام کی نگاہ میں مذموم ہے۔ صرف راہ خدا میں اور قوانین الہٰی کے پھیلانے کے لیے جہاد کرنا صحیح ہے یعنی حق، عدالت اور توحید کے لیے اور ظلم، فساد، انحراف اور کجروی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے جہاد درست ہے۔

۲۔ جملہ "الذین یقاتلونکم" (اُن سے لڑو جو تم سے جنگ کریں) صراحت کرتا ہے کہ کن لوگوں سے جنگ کی جائے۔ جب تک مد مقابل ہتھیار نہ اٹھائے اور جنگ کے لیے کمر بستہ نہ ہو جائے مسلمانوں کو پیش قدمی نہیں کرنا چاہیئے (سوائے چند استثنائی مواقع پر جن کے بارے میں دیگر آیات جہاد میں اشارہ کیا جائے گا)

اس آیت سے ضمناً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فوجیوں کے علاوہ دیگر اشخاص (خصوصاً عورتوں اور بچوں) پر حملہ نہ کیا جائے کیونکہ وہ جنگ کے لیے نہیں اٹھے لہٰذا انہیں محفوظ و مامون رہنا چاہیئے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام کے عظیم پیشوا حضرت علی ابن ابیطالب علیہ السلام اپنی فوج کو یہ حکم دیتے ہوئے نظر آتے ہیں:

"لا تقاتلوهم حتی یبدؤکم فانکم بحمد الله علی حجة وترککم ایاهم حجة اخری لکم." [1]

جب تک وہ حملہ نہ کریں تم جنگ کی ابتداء نہ کرو کیونکہ تم حق کے پیروکار ہو اور ان کے خلاف تمہارے پاس حجت و دلیل موجود ہے۔ نیز جنگ کی ابتداء نہ کرنا تمہاری حقانیت کی ایک اور دلیل ہے۔

۳۔ جملہ "ولا تعتدوا" (حد سے تجاوز نہ کرو) سے اس بات کا تعین ہوتا ہے کہ کب تک جنگ کی جائے۔ اسلام میں جنگ خدا کے لیے اور اس کی راہ میں ہوتی ہے اور راہ خدا میں کسی قسم کی تعدی اور تجاوز نہیں ہونا چاہیئے اسی لئے دور حاضر کی جنگوں کے برعکس اسلام جنگی امور کے بارے میں اخلاقی اصولوں کی پاسداری کی بہت تلقین کرتا ہے۔ مثلاً جو لوگ ہتھیار زمین پر رکھ دیں یا جو جنگ کرنے کی قوت کھو بیٹھیں یا جو اصولی طور پر جنگ کرنے کی قدرت نہیں رکھتے۔ جیسے بوڑھے، عورتیں اور بچے ان پر حملہ آور نہیں ہونا چاہیئے باغوں اور درختوں کو تباہ و برباد نہیں کرنا چاہیئے اور دشمن کے پینے کے پانیوں کو زہر آلود کرنے کے لیے زہریلا مواد استعمال نہیں کرنا چاہیئے (یعنی کیمیاوی ہتھیاروں اور جراثیمی ہتھکنڈوں کے استعمال کی اجازت نہیں ہے)۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"فاذا کانت الهزیمة باذن الله فلا تقتلوا مدبراً ولا تصیبوا معوراً ولا تجهزوا علی جریح ولا تهیجوا النساء باذی وان شتمن اعراضکم وسببن امرائکم." [2]

جب خدا کی مدد سے دشمن کے لشکر کو شکست دے دو تو جو لوگ بھاگ کھڑے ہوں انہیں قتل نہ کرو اور زخمیوں کو نہ مارو۔ عورتوں کو اذیت و تکلیف نہ پہنچاؤ اگرچہ وہ تمہیں برا بھلا کہیں اور تمہارے سرداروں کو گالیاں بکیں۔

اس آیت کی تفسیر میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے جہاد ہائے اسلامی کے بارے میں دشمنان اسلام کے بے بنیاد بے شمار اتہامات اور بہتانوں کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ قرآن نے صراحت کے ساتھ مقاصد جنگ، جن سے جنگ کرنا ہے اور جہاد کے مختلف

---

[1] نہج البلاغۃ عبدہ، مطبوعہ بیروت، ص ۴۵۳۔ [2] نہج البلاغۃ، عبدہ، ص ۴۵۳ مطبوعہ بیروت



کوائف وحالات کے بارے میں وضاحت کردی ہے۔ اس سے مخالفین کے اعتراضات کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔ دیگر آیات جہاد میں انشاء اللہ مزید تشریح و توضیح آئے گی۔

۱۹۱۔ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُمْ مِنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّىٰ يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ فَإِنْ قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ كَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ○

۱۹۲۔ فَإِنِ انْتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ○

ترجمہ

۱۹۱۔ اور انہیں (بت پرستوں کو جو کسی جرم و تجاوز سے منہ نہیں موڑتے) جہاں پاؤ قتل کر دو اور جہاں (مکہ) سے انہوں نے تمہیں نکال دیا ہے۔ انہیں نکال باہر کرو اور فتنہ (و بت پرستی) قتل سے بھی بدتر ہے اور ان سے مسجد حرام کے پاس جنگ نہ کرو جب تک وہ وہاں پر تمہارے ساتھ جنگ نہ کریں پس اگر وہ تم سے جنگ کریں تو انہیں قتل کرو۔ یہی ہے کافروں کی جزاء

۱۹۲۔ اور اگر وہ رک جائیں تو خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

تفسیر

آیت ۱۹۰ تا ۱۹۵ میں خدا تعالیٰ نے ان کفار مکہ کے بارے میں مسلمانوں کی ذمہ داری کو واضح کیا ہے جنہوں نے مسلمانوں کو گھر سے بے گھر کیا، انہیں ہر قسم کی اذیت و آزار پہنچائی اور انہیں اسلام سے برگشتہ کرنے کے لیے ہزاروں جتن کئے۔

زیر نظر پہلی آیت میں اس حکم کے دائرے کو وسعت دیتے ہوئے مسلمانوں کو اجازت دی گئی ہے کہ ان دشمنوں کو جہاں بھی آمادۂ پیکار دیکھو قتل کر ڈالو اور جیسے انہوں نے اپنی پوری قوت سے مسلمانوں کو مکہ سے باہر نکالنے اور آوارۂ منزل کرنے کے لیے اقدام کئے ہیں۔ ان سے وہی سلوک کرو اور انہیں مکہ سے باہر نکال دو۔

"وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ"

"اور فتنہ قتل سے بدتر ہے"

لغت کے لحاظ سے "فتنہ" کا ایک وسیع معنیٰ ہے۔ اس کے مفہوم میں ہر قسم کا مکر و فریب، فساد، شرک گناہ اور رسوائی شامل ہے۔ اس آیت میں اس سے مراد وہی شرک اور بت پرستی ہے جو بہت سے اجتماعی مفاسد



اختلاف، پراگندگی، گناہ و فساد اور خونریزی کا سرچشمہ ہے۔

اس مفہوم کی شاہد ایک اور آیت ہے:

"قاتلوھم حتّٰی لا تکون فتنۃ و یکون الدین للّٰہ"

اُن سے جنگ کرو تاکہ فتنہ جڑ سے ختم ہو جائے اور سب واحد و یگانہ پرست ہو جائیں

اس بنا پر الفتنۃ اشد من القتل والے جملے کا معنیٰ یہ ہو گا کہ بت پرستی کا مذہب اور اس سے پیدا ہونے والے مکہ میں مروج بہت سے انفرادی و اجتماعی فسادات قتل کرنے اور مار دینے سے بھی سخت تر ہے کیونکہ ان امور نے خدا کے امن والے حرم کو آلودہ کر رکھا ہے۔ اس لیے خونریزی کے خوف سے شرک و بت پرستی سے جنگ کرنے سے دستبردار نہیں ہونا چاہیئے اور جیسے بھی ہو سکے پہلے صلح جوئی سے اور پھر شدتِ عمل اور سختی سے بت پرستی اور اس سے پیدا ہونے والے فتنہ و فساد کی ریشہ کنی ہونا چاہیئے۔

اس کے بعد مزید فرمایا کہ مسلمانوں کو مسجد الحرام کا احترام کرنا چاہیئے۔ اس جگہ کا احترام جسے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی درخواست کے مطابق جائے امن قرار دیا ہے۔ جب تک وہاں خود دشمن ہتھیار نہ اٹھائے اس وقت تک ان سے جنگ کرنے اور قتل کرنے کی اجازت نہیں لیکن اگر وہ مسجد الحرام کا احترام نہ کریں تو پھر مسلمانوں کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے دفاع کے لیے مسجد الحرام کے اندر بھی جنگ کر سکیں۔ البتہ پیش دستی نہیں کر سکتے اور نہ وہ یہ حق رکھتے ہیں کہ خدا نے جسے جائے امن قرار دیا ہے اس کا احترام پامال کریں۔

آیت کے آخر میں تصریح کی گئی ہے کہ یہ کفار کی سزا ہے کہ اگر وہ کسی مقدس جگہ پر تجاوز روا رکھیں تو انہیں سخت اور منہ توڑ جواب دیا جائے تاکہ وہ حرم کے تقدس اور احترام سے غلط فائدہ نہ اٹھا سکیں۔

"فان انتھوا فان اللّٰہ غفور رحیم"

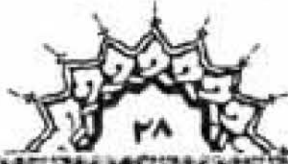
"اگر وہ رک جائیں تو خدا پردہ پوشی کرنے والا مہربان ہے"

اس آیت میں ارشاد ہوتا ہے کہ کفر سے دستبردار ہونے اور بت پرستی اور شرک کے مذہب کو پس پشت ڈال دینے سے خدا ان کی توبہ قبول کرے گا اور وہ مسلمانوں کے بھائی ہو جائیں گے یہاں تک کہ وہ ان سزاؤں اور تاوان سے بھی صرفِ نظر کرے گا جو مجرموں کے لیے ہوتا ہے۔

۱۹۳- وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۖ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ○

ترجمہ

۱۹۳- اور اُن سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ (اور بت پرستی اور لوگوں سے سلبِ آزادی کی حالت) باقی نہ رہے اور دین خدا کے لیے مخصوص ہو جائے۔ پس اگر وہ (اپنی غلط روش سے) دستبردار ہو جائیں (تو ان سے مزاحمت



نہ کرو کیونکہ تعدی اور تجاوز ظالموں کے علاوہ کسی کا شیوہ نہیں ہے ۔

تفسیر

اس آیت میں اسلامی جہاد کا مقصد بیان کیا گیا ہے ۔ آیت کے مطابق جنگ کا ہدف وہ اغراض نہیں ہیں جو عموماً جنگوں میں لوگوں کی ہوتی ہیں ۔ اسلامی جہاد نہ زمین پر فرماں روائی اور کشور کشائی کے لیے ہے اور نہ غنائم پر قبضہ کرنے کے لیے ۔ اس کا مقصد اپنے مال کی فروخت کے لیے منڈیوں کا حصول ہے نہ خام مال پر قبضہ اور نہ ہی یہ جہاد ایک نسل کی دوسری نسل پر فوقیت قائم کرنے کے لیے ہے بلکہ اس کا مقصد ہے فقط پروردگار کی خوشنودی کا حصول، اجتماعی عدالت کا قیام، ان لوگوں کی حمایت جو مکر و فریب اور گمراہی کی زد میں ہیں، انسانی معاشرے سے شرک اور بت پرستی کی بساط الٹنا اور احکام الٰہی کا نفاذ ۔ اس بناء پر جیسا کہ مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ اسلامی جنگ اس لیے ہوتی ہے کہ انسانی معاشرے میں فتنہ باقی نہ رہے اور توحید پرستی کا دین تمام انسانی معاشروں میں رواج پا جائے ۔

آیت کے ذیل میں مزید ارشاد ہوتا ہے کہ لوٹ آنے اور کفر، فساد اور بت پرستی سے دست بردار ہو جانے کی صورت میں مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ ان سے متعرض نہ ہوں اور گذشتہ واقعات کا انتقام لینے کے درپے نہ ہوں اور ماضی کو بھول جائیں کیونکہ تعرض اور تجاوز فقط ستمگر اور ظالم لوگ ہی کیا کرتے ہیں ۔

اسلامی جہادوں کو حقیقت میں تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :

۱ ۔ ابتدائی جہادِ آزادی

خداوند عالم کے احکام اور پروگرام نوع انسان کی سعادت، آزادی، تکامل، خوش بختی اور آسائش و آرام کے لیے ہیں اور اس نے اپنے انبیاء و مرسلین کا یہ فریضہ قرار دیا ہے کہ وہ ان احکام کو لوگوں تک پہنچائیں ۔ اب اگر کوئی شخص یا گروہ ان احکام کی تبلیغ کو اپنے پست منافع سے مزاحم سمجھتے ہوئے اس کی راہ میں روڑے اٹکائے تو انہیں حق پہنچتا ہے کہ وہ پہلے صلح و آشتی سے اور اگر اس سے ممکن نہ ہو تو قوت و طاقت سے اپنی دعوت کی راہ سے یہ رکاوٹیں ہٹا دیں اور اپنے لیے تبلیغ کی آزادی حاصل کریں ۔

دوسرے لفظوں میں تمام معاشروں میں لوگ یہ حق رکھتے ہیں کہ راہِ حق کی طرف دعوت دینے والوں کی آواز سنیں اور ان کی دعوت قبول کرنے میں آزاد ہوں ۔ اب اگر کچھ لوگ ان کا یہ جائز حق چھیننا چاہیں اور انہیں اجازت نہ دیں کہ وہ راہِ حق کی طرف پکارنے والوں کی پکار گوشِ دل سے سن سکیں اور فکری و اجتماعی قید و بند سے آزاد ہوں تو پھر ان پروگراموں کے طرفداروں کو حق پہنچتا ہے کہ وہ حصول آزادی کے لیے ہر ذریعہ استعمال کریں ۔ یہیں سے اسلام اور دیگر آسمانی ادیان میں "ابتدائی جہاد" کی ضرورت واضح ہوتی ہے ۔

اس طرح اگر کچھ لوگ مومنین پر دباؤ ڈالیں کہ وہ اپنے پرانے مذہب کی طرف لوٹ جائیں تو یہ دباؤ دور کرنے کے لیے بھی ہر ذریعہ استعمال کیا جا سکتا ہے ۔

۲ ۔ دفاعی جہاد

بعض اوقات کسی فرد یا گروہ پر جنگ ٹھونسی جاتی ہے اور اس پر تجاوز کیا جاتا ہے یا دشمن اس کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر اچانک



حملہ کر دیتا ہے ایسی صورت میں حملے کا نشانہ بننے والے فرد یا گروہ کو تمام آسمانی اور انسانی قوانین دفاع کا حق دیتے ہیں ۔ اُسے حق پہنچتا ہے کہ ایسے میں جو کچھ اُس سے اپنے وجود کی بقاء کے لیے بن پڑے کرے اور اپنی حفاظت کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرے ۔ جہاد کی اس قسم کو "دفاعی جہاد" کہتے ہیں ۔ احد ، احزاب ، موتہ ، تبوک ، حنین اور بعض دیگر اسلامی جنگیں جہاد کے اسی حصے کا جزو ہیں اور یہ سب جنگیں دفاعی پہلو کی حامل ہیں ۔

۳۔ شرک و بت پرستی کے خلاف جہاد

اسلام لوگوں کو یہ آخری اور بلند ترین دین انتخاب کرنے کی دعوت دیتا ہے اس کے باوجود وہ عقیدے کی آزادی کو بھی محترم شمار کرتا ہے ۔ اسی لیے آسمانی کتب کی حامل قوموں کو اسلام نے کافی مہلت اور رعایت دی ہے کہ وہ مطالعہ اور غور و فکر سے دین اسلام کو قبول کریں اور اگر وہ اسے قبول نہ کریں تب بھی ان سے اسلام ایک ہم پیمان اقلیت والا معاملہ کرتا ہے اور مخصوص شرائط کے ساتھ جو پیچیدہ ہیں نہ مشکل ان سے صلح آشتی سے باہمی زندگی گذارتا ہے ۔

لیکن ـــــ شرک اور بت پرستی کوئی دین اور آئین نہیں اور نہ ہی وہ قابل احترام ہے بلکہ وہ تو ایک قسم کی بے ہودگی ، کجروی اور حماقت ہے ۔ دراصل وہ ایک فکری اور اخلاقی بیماری ہے جس کی ہر قیمت پر ریشہ کنی ضروری ہے ۔ دوسروں کی فکر و نظر کی آزادی اور احترام کے الفاظ ان کے لیے استعمال ہوتے ہیں جن کے فکر و عقیدہ کی کم از کم کوئی صحیح بنیاد تو ہو لیکن کجروی ، بے ہودگی ، گمراہی اور بیماری تو کوئی ایسی چیز نہیں جسے محترم سمجھا جائے ۔ اسی لیے اسلام حکم دیتا ہے کہ جیسے بھی ہو انسانی معاشرے سے بت پرستی کی ریشہ کنی کی جائے چاہے اس کے لیے جنگ مول لینا پڑے ۔ بت خانے اور بت پرستی کے آثار صلح صفائی سے نہ مٹ سکیں تو قوت و طاقت کے بل بوتے پر انہیں ویران و منہدم کیا جانا چاہیئے ۔

مدینہ میں جہاد کا حکم کیوں دیا گیا

ہم جانتے ہیں کہ جہاد ہجرت کے دوسرے سال مسلمانوں پر واجب ہوا ، اس سے پہلے واجب نہ تھا ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مکہ میں ایک تو مسلمانوں کی تعداد اتنی کم تھی کہ مسلح قیام عملاً خودکشی کے مترادف تھا اور دوسری طرف مکہ میں دشمن بہت زیادہ طاقتور تھا لہٰذا مکہ کے اندر ان کا مقابلہ کرنا ممکن نہ تھا ۔

جب پیغمبر اکرمؐ مدینہ تشریف لائے تو بہت سے لوگ آپؐ پر ایمان لے آئے اور آپؐ نے اپنی دعوت مدینہ کے اندر اور باہر ہر طرف پھیلائی ۔ اس طرح آپؐ ایک مختصر سی حکومت کے قیام اور دشمن کے مقابلے میں ضروری وسائل جمع کرنے کے قابل ہو گئے ۔ مدینہ چونکہ مکہ سے کافی دور تھا اس لیے یہ امور آسانی سے انجام پا گئے ۔ انقلاب اور آزادی پسند قوتیں دشمن سے مقابلے اور دفاع کے لیے تیار ہو گئیں ۔

"فتنہ" کا قرآنی مفہوم

لفظ فتنہ اور اس کے مشتقات قرآن میں مختلف معانی میں استعمال ہوئے ہیں ۔ ان میں سے چند یہ ہیں :

۱۔ آزمائش و امتحان ـــــ جیسے یہ آیت ہے

"احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا اٰمنا وھم لا یفتنون"[1]

[1] عنکبوت آیۃ ۲



کیا لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کا یہ کہنا کافی ہے کہ وہ ایمان لے آئے ہیں اور ان کا امتحان اور آزمائش نہیں ہوگی؟ (عنکبوت ۲۰)

۲۔ فریب دہی ——— ارشاد الٰہی ہے:

"یابنی آدم لا یفتننکم الشیطان ...."

اعراف: آیت ۲۷۔

اے اولادِ آدم شیطان تمہیں مکر و فریب نہ دے

۳۔ بلاء اور عذاب ——— فرمان الٰہی ہے:

"واتقوا فتنۃ لا تصیبن الذین ظلموا منکم خاصۃ"

انفال: آیت ۲۵۔

اس عذاب سے ڈرو جو فقط ظالموں ہی کے لیے نہیں بلکہ اُن کے لیے بھی ہے جنہوں نے خود تو ظلم نہیں کیا لیکن ظلم ہوتا رہا اور وہ چپ سادھے رہے۔

۴۔ شرک، بت پرستی اور مومنین کی راہ میں رکاوٹ بننا ——— ارشاد ہوتا ہے:

"وقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ ویکون الدین کلہ للہ"

انفال: آیت ۳۹۔

اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ شرک اور بت پرستی باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ سے مخصوص ہو جائے

۵۔ گمراہ کرنا اور گمراہی ——— سورۂ مائدہ میں ہے:

"ومن یرد اللہ فتنتہ فلن تملک لہ من اللہ شیئا"

مائدہ: آیت

اور جسے خدا گمراہ کر دے (اور اس سے توفیق سلب کر لے) تو تم اس کے مقابلے میں کوئی قدرت نہیں رکھتے

بعید نہیں کہ ان تمام معانی کی ایک ہی بنیاد ہو (جیسے مشترک الفاظ کی یہی صورت ہوتی ہے) اور وہ بنیاد یہ ہے کہ فتنہ کا اصل لغوی معنی ہے کہ سونے اور چاندی کو آگ کے دباؤ کے نیچے رکھنا تاکہ خالص اور ناخالص حصہ جدا ہو جائے۔ اس لیے جہاں کہیں دباؤ اور سختی ہو یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً امتحان کے مواقع پر شدت اور مشکل ورزش ہوتی ہے جو انسان کے امتحان کا باعث بنتی ہے۔ عذاب بھی شدت کی ایک قسم ہے۔ فریب سے بھی یہی مفہوم نکلتا ہے کیونکہ مختلف ذرائع سے کسی کو دھوکا دیکر دباؤ ہی ڈالا جاتا ہے۔ یہی حال کفر اور مخلوق کی ہدایت کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرنے کا ہے۔ ان میں سے ہر ایک میں ایک قسم کا دباؤ اور شدت پائی جاتی ہے۔

۱۹۴۔ الشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمَاتُ قِصَاصٌ فَمَنِ اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ○

ترجمہ

۱۹۴۔ حرام مہینہ حرام مہینے کے مقابلے میں (اگر دشمن اس کا احترام نہ کریں اور تم سے لڑیں تو تم بھی مقابلہ بالمثل



کا حق رکھتے ہو اور تمام حرام امور (قابل) قصاص ہیں اور (بطور کلی) جو شخص بھی تم پر تجاوز کرے تو اُس کی طرح تم بھی اُس پر تعدی کر سکتے ہو اور خدا سے ڈرتے رہنا (اور زیادتی نہ کرنا) اور جان لو کہ خُدا پرہیز گاروں کے ساتھ ہے۔

تفسیر

مشرکین جانتے تھے اور پیغمبر اکرمؐ سے سن بھی چکے تھے کہ حرمت والے مہینوں (ذی القعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب) میں اسلام کے نقطۂ نظر سے جنگ کرنا ناجائز اور خصوصیت سے مسجد الحرام اور مکہ میں تو اور بھی زیادہ غیر درست ہے نیز پیغمبر اسلام اِس حکم کا احترام کرتے ہیں اس لیے اُن کی خواہش تھی کہ مسلمانوں پر انہی مہینوں میں غفلت کی حالت میں حملہ کر دیں اور وہ خود ان محترم مہینوں کے احترام سے بے پرواہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو اس کی اجازت نہیں کہ وہ مقابلہ کریں اور یوں ہی رہا تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔

زیر بحث آیت نے ان کی سازش سے پردہ اٹھا دیا اور کہا کہ حرام مہینوں میں جنگ کا جواب انہی مہینوں میں دیا جائیگا حرام مہینوں میں مسلمانوں کی طرف سے مقابلہ درحقیقت ان مہینوں کا احترام لوٹانے کے لیے ہی ہے۔

"والحرمات قصاص ....." واقعاً یہ اُن لوگوں کا دندان شکن جواب ہے جو حرام مہینوں میں جنگ کی اجازت دینے پر پیغمبر اکرمؐ پر اعتراض کرتے تھے یعنی نگاہ اسلام میں ماہ حرام کا احترام اِن لوگوں کے مقابلے میں ہے جو اُسے محترم سمجھیں لیکن جو اس کے احترام کو پامال کریں ان سے رعایت ضروری نہیں اور ان سے اِس ماہ میں بھی جنگ کرنا جائز ہے۔ اسی لیے مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ جنگ کی صورت واضح ہو جائے تو مقابلے کے لیے کھڑے ہو جاؤ تاکہ مشرکین دوبارہ حرام مہینوں کا احترام زائل کرنے کی جرأت نہ کر سکیں۔

اِس کے بعد ایک کلی اور عمومی حکم صادر فرمایا گیا ہے۔ وہ یہ کہ مقابلہ بمثل ہر مسلمان شخص کا فریضہ ہے۔ تمام لوگوں کو اجازت دی گئی ہے کہ ظالم کے مقابلے میں کھڑے ہو جائیں اور جس قدر ظلم و تجاوز ان پر کیا گیا ہے اتنا ہی اس کا جواب دیں۔

یہ کام فطرت و آفرینش کے قوانین کے مطابق ہے۔ یہاں تک کہ بدن کے خلیے حملہ کرنے والے جراثیموں کے مقابلے میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور مملکتِ بدن پر ان کے تجاوز اور حملے کا دفاع کرتے ہیں۔ نباتات بھی اسی طبیعی اور تکوینی قانون سے استفادہ کرتے ہیں۔ وہ حوادث، طوفانوں اور مختلف حملہ آوروں کے مقابلے میں استقامت دکھاتے ہیں اور ان حملوں کا مقابلہ کرتے ہیں

مسیحیت کہتی ہے: اگر کوئی تمہارے دائیں رخسار پر تھپڑ مارے تو بایاں بھی اُس کے سامنے کر دو اور اسے دوسرے تھپڑ کے لیے تیار کرو۔

اِس کے برعکس اسلام کہتا ہے: جس قدر تم پر ظلم و تعدی ہو اس کا جواب اس طرح دو اور تسلیم کا معنی موت اور مقابلے کا معنی زندگی ہے۔ یہ ہے اسلام کی منطق (البتہ یہ امر دوستوں کو معاف کرنے اور اُن سے درگذر کرنے کے منافی نہیں اور یہ ایک الگ بحث ہے)

"واتقوا اللّٰہ واعلموا انّ اللّٰہ مع المتقین": اِس جملے میں دوبارہ تاکید کی گئی ہے کہ جواب اور دفاع تجاوز کی مقدار سے زیادہ نہ ہو کیونکہ جواب دینے میں زیادتی حریم تقویٰ و پرہیزگاری سے بعید ہے۔



۱۹۵۔ وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّہْلُکَۃِ ۛ وَاَحْسِنُوْا ۛ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ○

ترجمہ

۱۹۵۔ اور راہِ خدا میں خرچ کرو (اور خرچ نہ کرکے) اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ اور نیکی کرو کہ اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

تفسیر

جس طرح جہاد میں مخلص، طاقتور اور تجربہ کار مردوں کی ضرورت ہے اسی طرح مال و دولت کی بھی احتیاج ہے کیونکہ جہاد میں روحانی و جسمانی آمادگی کی ضرورت ہے اور فوج کے لیے مناسب اسلحہ اور سامان جنگ کی بھی احتیاج ہے۔

یہ صحیح ہے کہ پہلے درجے کا عامل سرنوشت اور انجام جنگ کا تعین مجاہدوں اور جانبازوں ہی سے ہوتا ہے۔ لیکن مجاہد کو وسائل کی بھی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آیت تاکید کررہی ہے کہ اس راہ میں خرچ نہ کرنا گویا اپنے تئیں ہلاکت و تباہی میں ڈالنے کے مترادف ہے۔

خصوصاً اس زمانے میں توبہت سے مسلمان جذبے اور عشق جہاد سے سرشار تھے لیکن فقیر و محتاج تھے اور اسباب جنگ مہیا کرنے کی سکت نہ رکھتے تھے جیسا کہ قرآن نقل کرتا ہے کہ وہ لوگ پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں آتے اور آپؐ سے درخواست کرتے تھے کہ ہمارے لیے سامان جنگ مہیا فرمائیں اور ہمیں میدان جنگ میں بھیجیں لیکن اسباب مہیا نہ تھے لہٰذا وہ افسردہ اور غمگین روتی ہوئی آنکھوں سے پلٹ آتے:

"تولّوا و اعینھم تفیض من الدمع حزنًا الّا یجدوا ما ینفقون"

آنکھوں میں اشک رواں لیے ہوئے لوٹ جاتے اور غم زدہ ہوتے کہ ان کے پاس مال کیوں نہیں جس سے وہ اسباب جنگ مہیا کریں اور میدان جنگ میں حاضر ہوں۔ (توبہ - ۹۲)

خرچ کرنا معاشرے کو ہلاکت سے بچاتا ہے۔

یہ آیت اگرچہ آیات جہاد کے ذیل میں آئی ہے لیکن اس سے ایک کلی و اجتماعی حقیقت معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ خرچ کرنا افراد معاشرہ کو ہلاکت سے بچانے کا باعث بنتا ہے۔ اس کے برعکس اگر انفاق اور خرچ کرنے کے عمل کو فراموش کردیا جائے اور دولت ایک ہی طبقے کے پاس جمع ہو جائے تو ایک محروم اور بے نوا اکثریت وجود میں آجائے گی۔ زیادہ دیر یہ حالت قائم نہیں رہے گی اور جلد ایک دھماکہ ہوگا جس کے نتیجہ میں انسان اور سرمایہ داروں کا مال جل کر خاکستر ہو جائے گا۔ اس سے خرچ کرنے اور ہلاکت سے بچنے کا باہمی ربط بھی واضح ہو جاتا ہے۔

اس بناء پر انفاق اور خرچ کرنا محروموں اور محتاجوں سے پہلے سرمایہ داروں کے لیے مفید ہے یعنی دولت و ثروت کا اعتدال دولت و ثروت کا محافظ ہے۔ چنانچہ حضرت علیؑ اس حقیقت کی طرف اشارہ فرماتے ہیں:



"حصنوا اموالکم بالزکوۃ"

زکوٰۃ دے کر اپنے مال کی حفاظت کرو۔

"واحسنوا ان اللہ یحب المحسنین": آیت کے آخر میں احسان اور نیکی کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس طرح جہاد و انفاق کے مرحلے سے احسان و نیکی کے مرحلے کی طرف راہنمائی کی گئی ہے کیونکہ اسلام کی نظر میں احسان انسانیت کے تکامل وارتقاء کے بلند ترین مرحلے کا نام ہے۔

آیت انفاق میں اس جملے کا آنا اس طرف اشارہ ہے کہ انفاق میں نیکی کی مکمل تصویر اور مہربانی کا پورا اظہار ہونا چاہیئے اور ہر قسم کے احسان جتلانے اور جن امور سے اس شخص کو رنج پہنچے جس سے نیکی کی گئی ہے، بچنا چاہیئے۔

۱۹۶۔ وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا
اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ
الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ
رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَاۤ اَمِنْتُمْ
فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ
الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الْحَجِّ
وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ
لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ
وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝

ترجمہ

۱۹۶۔ حج و عمرہ کو خدا کے لیئے مکمل کرو اور اگر محصور ہو جاؤ (اور ایسی رکاوٹیں پیدا ہو جائیں جن کے باعث مکہ میں داخل نہ ہو سکو مثلاً دشمن کا خوف ہو یا کوئی بیماری لاحق ہو جائے)، تو جو قربانی فراہم ہو اسے ذبح کرو (اور احرام سے خارج ہو جاؤ) اور اپنے سروں کو نہ منڈواؤ جب تک قربانی اپنے مقام تک نہ پہنچ جائے (اور قربان گاہ میں ذبح نہ ہو جائے) اور اگر کوئی بیمار ہو جائے یا اس کے سر میں کوئی تکلیف واذیت ہو (اور مجبور ہو کر وہ اپنا سر نہ منڈوائے) تو اسے چاہیئے کہ روزہ، صدقہ یا گوسفند کی صورت میں فدیہ اور کفارہ دے۔ جب (بیماری یا دشمن سے) مامون ہو جائیں تو جو لوگ عمرہ



ختم کرنے کے ساتھ ہی حج کا آغاز کر دیں، تو جو قربانی انہیں میسر ہو (اسے ذبح کریں) اور جن کے پاس نہیں ہے تو وہ تین دن حج کے دنوں میں اور سات دن واپس آکر روزے رکھیں۔ یہ پورے دس دن ہیں (البتہ) یہ ایسے شخص کے لیے ہے جس کے گھر والے مسجد الحرام کے پاس نہ ہوں (یعنی اہل مکہ اور اطراف مکہ میں سے نہ ہو) اور خدا سے ڈرو اور جان لو کہ وہ سخت عتاب کرنے والا ہے۔

تفسیر

لفظ "حج" قرآن میں دس مقامات پر آیا ہے۔ ان میں سے ہر موقع پر اس اہم امر سے مربوط کسی نہ کسی حکم یا معاملے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مثلاً

(۱) نمائندہ توحید حضرت ابراہیم خانہ خدا کی تعمیر کر چکے تو ایک عام اعلان کے ذریعے آپ نے ساری دنیا کے لوگوں کو اس مقدس مقام کی زیارت کی دعوت دی۔

"و اذن فی الناس بالحج یأتوک رجالا وعلی کل ضامر یأتین من کل فج عمیق"

لوگوں کو اعلام حج کی انجام دہی کی دعوت دیجئے تاکہ پیادہ اور لاغر اونٹوں پر سوار دور دراز سے لوگ تمہارے پاس آنے لگیں (حج ۲۷)

(۲) اسلام میں حج کی تشریع سورہ آل عمران کی آیت ۹۷ کی وساطت سے ہوئی ہے:

"وللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا"

ہر وہ شخص جو اپنے پروردگار کی طرف جانے کی استطاعت اور توانائی رکھتا ہے اس پر اس کے گھر کا حج فرض ہے۔

(۳) وہ مہینے جن میں یہ عمل انجام پاتے ہیں، اس سلسلے میں ارشاد ہوتا ہے:

"الحج اشھر معلومات"

مراسم حج کی ادائیگی معین مہینوں میں ہونا چاہیے۔

(۴) حدود و شرائط اور وہ اعمال جو مراسم حج میں انجام دینا چاہئیں۔ زیر بحث آیت میں بھی ان کی طرف اشارہ ہے۔

"واتموا الحج والعمرۃ للہ ...."

(۵) فلسفہ اجتماع اور اس کے فوائد ـــــ ارشاد ہوتا ہے۔

"لیشھدوا منافع لھم"

تاکہ وہ اس میں موجود اپنے لیے فوائد حاصل کریں۔ (حج ۲۸)

ان میں سے ہر ایک بحث اپنے مقام پر آئے گی۔ زیر بحث آیت میں چند ایک احکام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جنہیں یہاں بیان کیا جاتا ہے۔

عمرہ اور حج کے اعمال

عام طور پر خانہ خدا کے زائرین پہلے مراسم عمرہ اس ترتیب سے بجا لاتے ہیں:



معین نقاط جنہیں میقات کہتے ہیں سے احرام باندھتے ہیں یعنی وہ عہد کرتے ہیں کہ احرام باندھے ہوئے شخص پر جو کام حرام ہیں انہیں ترک کر دیں گے اور احرام کا لباس جو وہ ان سلے کپڑے کے ٹکڑوں پر مشتمل ہوتا ہے پہن لیتے ہیں اور لبیک لبیک کہتے ہوئے خانۂ خدا کی طرف چل پڑتے ہیں۔ سب سے پہلے سات مرتبہ خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہیں اور اس کے بعد اس جگہ پر جو مقام ابراہیم کے نام سے مشہور ہے دو رکعت نماز ادا کرتے ہیں۔ اس کے بعد صفا و مروہ کی دو پہاڑیوں کے درمیان آتے جاتے ہیں اور پھر اپنے کچھ بال یا ناخن کاٹنے سے احرام سے خارج ہو جاتے ہیں۔

مراسم حج بجالانے کے لیے مکہ میں احرام باندھتے ہیں۔ نویں ذی الحج کو مکہ سے چار فرسخ دور بیابان عرفات کی طرف جاتے ہیں۔ اس دن زوال سے لے کر غروب آفتاب تک وہاں رہتے ہیں۔ یہاں اپنے پروردگار سے دعا و زاری کرتے ہیں۔ غروب آفتاب کے بعد مشعر الحرام کی طرف کوچ کرتے ہیں۔ یہ مقام مکہ سے ڈھائی فرسخ دور ہے۔ رات اس مقدس وادی میں بسر کرتے ہیں اور طلوع آفتاب کے وقت اس سرزمین سے منیٰ کی طرف چل پڑتے ہیں۔ یہ مقام مشعر الحرام سے قریب ہی ہے۔ یہ عید قربان کا دن ہے اسی دن ایک خاص جگہ "جمرۂ عقبہ" پر سات کنکریاں مارتے ہیں۔ اس کے بعد قربانی کرتے ہیں اور پھر سر کے بال منڈوا کر احرام سے خارج ہو جاتے ہیں۔ اسی دن یا اس کے بعد مکہ کی طرف پلٹ آتے ہیں۔ وہاں طواف خانۂ خدا، نماز طواف، صفا و مروہ کے درمیان سعی، طواف منیٰ اور نماز طواف منیٰ بجالاتے ہیں۔ گیارہ اور بارہ کی درمیانی رات منیٰ میں گزارتے ہیں۔ اس طرح مراسم حج انجام دیتے ہیں۔ یہ حج دراصل ایک تاریخی واقعہ ہے اور اس کے مراسم تہذیب نفس سے مربوط مسائل اور اجتماعی و معاشرتی فلسفوں کی طرف کنایات و اشارات ہیں۔ (ان میں سے ہر فلسفہ متعلقہ آیات کے ذیل میں تفصیل سے بیان ہوگا)

اب اس امر کی طرف توجہ دی جانا چاہیئے کہ آیت کہتی ہے کہ تمام اعمال خدا کے لیے اور اس کے فرمان کے مطابق ہونا چاہئیں اور انہیں ظاہریت، ریاکاری اور رسول کے لیے نہیں ہونا چاہیئے۔

اس بناء پر آیت کا پہلا جملہ " واتموا الحج والعمرة لله " یہ بتاتا ہے کہ حج و عمرہ کے اعمال میں تقرب الٰہی کے سوا کوئی وجہ اور سبب نہیں ہونا چاہیئے۔

" فان احصرتم فما استيسر من الهدى " مزید کہتا ہے کہ اگر احرام باندھے ہوئے ہو اور پھر کوئی رکاوٹ مثلاً بیماری یا دشمن کا خوف لاحق ہو جائے اور عمرہ و حج کے اعمال نہ بجالانے جا سکیں تو ضروری ہے کہ اپنی استطاعت کے مطابق قربانی ذبح کرو۔

توجہ رہے کہ اگر یہ رکاوٹ بیماری وغیرہ کی طرح کی ہو اور عمرہ مفردہ کا احرام باندھ رکھا ہے تو قربانی کو مکہ میں بھیجنا چاہیئے تاکہ وہاں ذبح کی جائے اور اگر دشمن کی طرف سے ممانعت ہوئی ہے تو جہاں ہیں وہیں قربانی کا فریضہ انجام دینا چاہیئے۔ جیسے پیغمبر اکرمؐ نے حدیبیہ کے مقام پر کیا تھا۔ اگر حج کا احرام باندھ رکھا ہے اور بیماری کا سامنا ہو تو قربانی منیٰ میں بھیجنا چاہیئے۔

" ولا تحلقوا رءوسكم حتى يبلغ الهدى محله .... " حج میں جن کاموں کو انجام دینا ہے ان میں سے ایک سر کے بالوں کا منڈوانا ہے لیکن توجہ رہے کہ قربان گاہ میں قربانی ذبح ہونے سے پہلے تم یہ عمل بجالانے کا حق نہیں رکھتے۔

مگر جس شخص کو کوئی بیماری یا کچھ اور رکاوٹیں درپیش ہیں جن کی وجہ سے اُسے وقت سے پہلے سر منڈوانا پڑے اور اس کام کے



پیش آنے کی صورت میں ضروری ہے کہ فدیہ دے اور یہ فدیہ تین دن کے روزے یا چھ مساکین کو کھانا کھلانا اور یا ایک بھیڑ ذبح کرنا ہو سکتا ہے۔

"فاذا امنتم فمن تمتع بالعمرة الى الحج ......" جب بیماری یا دشمن سے آسودہ خاطر ہو جاؤ اور حج تمتع انجام دینا چاہو تو اپنی استطاعت کے مطابق اونٹ، گائے یا بھیڑ کی قربانی دو۔ قربانی کا جانور نہ مل سکے یا مالی حالت اس کی اجازت نہ دے تو تین دن حج کے ایام میں (ساتویں، آٹھویں اور نویں کا دن) اور سات دن واپس جانے کے بعد کل دس دن روزے رکھو۔

"تلك عشرة كاملة" معلوم ہے کہ تین اور سات کل دس دن بنتے ہیں۔ پھر بھی قرآن کہتا ہے: یہ دس دن کامل ہو جائیں گے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ حرف "واو" اگرچہ عام طور جمع کرنے کے لیے آتا ہے نہ کہ تخییر کے لیے "تلك عشرة كاملة" کا جملہ لایا گیا ہے اور شاید لفظ کاملہ اس طرف بھی اشارہ کرتا ہو کہ دس دن کے روزے بطور کامل قربانی کا قائم مقام بن سکتے ہیں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ دس کا عدد ایک لحاظ سے کامل ترین عدد ہے کیونکہ اعداد کو جب ایک سے شمار کرتے ہیں تو وہ دس تک اپنی صعودی سیر کی تکمیل کرتے ہیں۔ اس کے بعد تو حقیقت میں دس اور کسی دس سے پہلے والے عدد کی ترکیب ہے۔ مثلاً گیارہ (دس اور ایک) اور بارہ (دس اور دو) [1]

"ذلك لمن لم يكن اهله حاضرى المسجد الحرام" یہ حج تمتع کا پروگرام ان لوگوں کے لیے ہے جو مسجد الحرام میں موجود یا اس کے قرب و جوار میں نہ ہوں۔ (فقہاء میں مشہور یہ ہے کہ جو شخص مکہ سے ۴۸ میل دور رہتا ہے حج تمتع اس کی ذمہ داری ہے لیکن جو مکہ سے اتنا دور نہیں اس کا وظیفہ حج قران یا حج افراد ہے) اس مسئلے کی تفاصیل اور مدارک فقہی کتب میں موجود ہیں۔

آیت کے آخر میں حکم دیا گیا ہے کہ تقویٰ اختیار کرو اور اس سلسلے میں جو احکام دیئے گئے ہیں ان کی تعمیل میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کرو اور پروردگار کے شدید عقاب سے اپنے آپ کو محفوظ رکھو۔

یہ تاکید شاید اس لیے ہے کہ حج ایک اہم اسلامی عبادت ہے اور اگر اس کے مراسم و اعمال پر پوری توجہ نہ دی جائے یا اس کی روح کو فراموش کر دیا جائے تو مسلمانوں کو بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑے گا۔

حج وہ عبادت ہے جسے امیرالمومنینؑ نے اسلام کا پرچم اور اہم شعار قرار دیا ہے۔ اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں آپؑ نے وصیت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"الله الله فى بيت ربكم لا تخلوه ما بقيتم فانه ان ترك لم تناظروا":

تمہیں خدا کی قسم دیتا ہوں جب تک زندہ ہو خانہ خدا سے دستبردار نہ ہونا کیونکہ اگر اس کی زیارت متروک ہو گئی تو تمہیں مہلت نہیں دی جائے گی اور تمہارا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔



دشمنانِ اسلام کی طرف سے یہ جملہ بھی مشہور ہے کہ وہ کہتے ہیں "جب تک حج کی رونق برقرار ہے ہم ان پر کامیابی حاصل نہیں کر سکتے"[1]
ایک اور دانشور کہتے ہیں۔

مسلمانوں کی حالت پر افسوس ہے اگر وہ حج کا معنی اور حقیقت نہ سمجھ سکیں اور دوسروں پر بھی افسوس ہے اگر وہ اس کا معنی سمجھ لیں۔

اس بحث کے آخر میں جس نکتے کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے یہ ہے کہ اس میں شک نہیں کہ حج تمتع (وہ حج جو پہلے عمرہ سے شروع ہوتا ہے اور اس میں عمرے کے تمام اعمال بجالانے کے بعد احرام سے نکل جاتے ہیں پھر نئے سرے سے حج کا احرام باندھتے ہیں اور اس کے مراسم بجالاتے ہیں) شریعت اسلام میں زیر نظر آیت کے مطابق شروع ہے اور اس آیت کی منسوخی کے بارے میں ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں۔ نیز اس سلسلے میں شیعہ اور اہل سنت کتب میں بہت سی روایات منقول ہیں۔ ان میں سے اہل سنت کے مشہور محدثین مثلاً النسائی نے اپنے سنن میں، احمد نے اپنے مسند میں، ابن ماجہ نے اپنے سنن میں، بیہقی نے اپنے مشہور سنن میں، ترمذی نے اپنی صحیح میں اور مسلم نے بھی اپنی مشہور کتاب میں تاکیدی روایات نقل کی ہیں یہ حکم منسوخ نہیں ہوا اور قیامت کے لیئے باقی ہے۔

جو مشہور روایت حضرت عمر سے اس حج اور نکاح موقت کی حرمت کے بارے میں نقل ہوئی ہے، واضح ہے کہ صریح قرآن کے مقابلے میں وہ کسی طرح بھی قابل اعتبار نہیں ہے قطع نظر اس کے کہ پیغمبر اسلامؐ کے علاوہ کوئی شخص کسی حکم کو منسوخ کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ اسی بنا پر اہل سنت کے بہت سے علماء نے بھی مذکورہ روایت کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

۱۹۷۔ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِى الْحَجِّ ۗ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ۗ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِى الْاَلْبَابِ ۝

ترجمہ

۱۹۷۔ حج معین مہینوں میں ہے اور جو لوگ (احرام اور مناسکِ حج شروع کر لینے سے) حج اپنے اوپر فرض کر لیتے ہیں (انہیں توجہ رکھنی چاہیئے کہ) حج میں عورتوں سے جنسی ملاپ، گناہ اور جدال نہیں ہے اور جو اچھے کام تم انجام دیتے ہو، خدا انہیں جانتا ہے۔ زادِ راہ اور توشہ مہیا کرو کیونکہ بہترین زاد و توشہ پرہیزگاری ہے اور اے صاحبانِ عقل مجھ سے ڈرو۔

تفسیر

اس آیت میں قرآن یاد دلاتا ہے کہ حج کا عمل معین مہینوں میں انجام پانا چاہیئے اور اسے سال بھر انجام نہیں دیا جا سکتا اور جیسا کہ کتب حدیث، تفسیر اور فقہ میں ہے کہ یہ عظیم عبادت صرف شوال، ذی القعدہ اور ذی الحجہ کے پہلے دس دنوں میں انجام دی جا سکتی ہے

[1] شبہات حول الاسلام



۱۹۸- لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۪ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ○

۱۹۹- ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

ترجمہ

۱۹۸- کوئی گناہ اور حرج نہیں کہ تم اپنے پروردگار کے فضل سے (اور ایام حج میں اقتصادی منافع سے) فائدہ اٹھاؤ (کیونکہ حج کا ایک فلسفہ اسلامی اقتصادی معاشرے کی بنیاد رکھنا بھی ہے) اور جب میدان عرفات سے کوچ کرو تو مشعر الحرام کے پاس خدا کو یاد کرو اسے اس طرح یاد کرو جس طرح اس نے تمہیں ہدایت کی ہے اگرچہ اس سے پہلے تم لوگ گمراہ تھے۔

۱۹۹- پھر اس جگہ سے کہ جہاں سے لوگ کوچ کرتے ہیں (سرزمین منیٰ کی طرف) کوچ کرو اور خدا سے طلب مغفرت کرو جو بخشنے والا مہربان ہے۔

تفسیر

موسم حج میں اقتصادی کارکردگی

زمانہ جاہلیت میں مراسم حج بجالانے کے موقع پر معاملہ، تجارت، مسافروں کو لے جانا اور سامان لانا لے جانا حرام اور گناہ سمجھا جاتا تھا۔ مسلمان فطری طور پر منتظر تھے کہ انہیں معلوم ہو کہ زمانہ جاہلیت والے احکام جوں کے توں باقی رہیں گے یا یہ کہ اسلام اُن کے بے وقعت ہونے کا اعلان کرتا ہے۔

محل بحث آیت نے ان دنوں میں معاملہ یا تجارت کے گناہ ہونے کو غلط قرار دے دیا ہے اور بتایا ہے کہ موسم حج میں کسی قسم کا معاملہ یا تجارت کرنے میں کوئی مانع اور حرج نہیں اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ لوگ فضلِ خدا سے بہرہ ور ہوں اور کوئی نفع حاصل کریں اور اپنے ہاتھوں کی کمائی سے فائدہ اٹھائیں۔

اسلامی کتب اور منابع میں حج کے فلسفہ میں جہاں اس کے اخلاقی، سیاسی اور ثقافتی پہلوؤں کی طرف اشارہ ہوا ہے



"واذکروه کما هداکم و........"

اس حصے میں قرآن متوجہ کرتا ہے کہ پروردگار کی ہدایت کے شکرانے کے طور پر مشعر الحرام میں اس کی یاد میں رہو ایسی یاد جو اس ہدایت کے مطابق ہے جو خدا کی طرف سے ہے (اس بنا پر ہو سکتا ہے کہ لفظ کما یہاں لما یا مثل کے معنی میں ہو)۔

اُس زمانے میں مسلمان اِس عظیم نعمت یعنی ہدایت کی قدر و قیمت کو اچھی طرح سمجھ سکتے تھے کیونکہ اُن کا فاصلہ اس دور سے زیادہ نہ تھا۔ جب جزیرۃ العرب ہر طرف سے گمراہی میں گھرا ہوا تھا۔ اُن کے سامنے تھا کہ خداوند عالم نے کس طرح انہیں اس پاک دین کی برکت سے ان تمام بدبختیوں، گمراہیوں اور سرگردانیوں سے نجات دی ہے "وان کنتم من قبلہ لمن الضالین"۔

عرفات کو عرفات کیوں کہتے ہیں۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ عرفات مکہ سے چار فرسخ کے فاصلے پر ایک وسیع و عریض بیابان ہے۔ وہاں حاجی حضرات نویں ذی الحجہ کو زوالِ آفتاب سے لے کر غروب تک ٹھہرتے ہیں۔

اس سرزمین کا نام عرفات کیوں ہے۔ اس بارے میں بہت سے پہلو مذکور ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب خدا کی وحی کا قاصد جبرئیل حضرت ابراہیمؑ کو مناسکِ حج کی نشاندہی کروا رہا تھا تو حضرت ابراہیمؑ کہتے "عرفت" "عرفت" یعنی میں نے پہچان لیا"۔ "میں نے پہچان لیا"۔

لیکن بعید نہیں کہ یہ نام رکھنا ایک اور حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہو اور وہ یہ کہ یہ سرزمین جہاں سے مراحلِ حج شروع ہوتے ہیں معرفت پروردگار اور اس کی پاک ذات کو پہچاننے کے لیے بہت آمادہ اور تیار ماحول مہیا کرتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ وہ روحانی اور معنوی جذبہ جو انسان میں اِس سرزمین میں داخل ہوتے وقت پیدا ہوتا ہے اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

سب ایک ہی صورت میں، سب ایک انداز میں، سب بیابان نشیں، شہر کے شور و غل سے دور، مادی دُنیا کے ہاؤ ہو سے پرے، زرق و برق دنیا سے اوجھل ایک آزاد اور گناہ سے پاک فضا میں آسمان کے سائے تلے اُس جگہ جہاں فرشتۂ وحی کے پر چھوتے رہے جہاں سے جبرئیل کا زمزمہ، ابراہیمؑ خلیل اللہ کی مردانہ وار پکار، پیغمبر اسلامؐ اور صدر اول کے مجاہدین کی حیات بخش صدا کی بھنبھناہٹ آج بھی سنائی دیتی ہے۔ وہ مقام جہاں انسان نہ صرف یہ کہ عرفانِ پروردگار کے نشہ میں سرمست ہو جاتا ہے اور کچھ لمحوں کے لیے ساری مخلوق کی تسبیح کے سرور سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے بلکہ اپنے وجود کے اندر اپنی کھوئی ہوئی ذات کو جس کی تلاش میں تھا پا لیتا ہے اور اپنی ذات کا عارف ہو جاتا ہے۔ اس مقام پر وہ جان لیتا ہے کہ وہ وہ شخص نہیں جو رات دن تلاشِ معاش میں حیرانیانہ کوہ و صحرا کی وسعتوں کو اپنے قدموں سے ماپتا رہتا تھا اور جو کچھ ملتا تھا اُس سے سیراب نہ ہوتا تھا یہاں وہ جان لیتا ہے کہ ایک اور گوہر اس کی روح کے اندر چھپا ہوا ہے جو دراصل اُس کے وجود کی حقیقت ہے۔

جی ہاں اِس سرزمین کو عرفات کہتے ہیں۔ کس قدر عمدہ اور مناسب نام ہے۔



مشعر الحرام ــــ کے نام کے بارے میں بھی کہا گیا ہے کہ وہ جگہ شعائر حج کا مرکز ہے اور ان عظیم و پرشکوہ آسمانی مراسم کی نشانی ہے۔

لیکن یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ مشعر "شعور" کے مادہ سے ہے۔ اس تاریخی رات (دس ذی الحجہ کی رات) جب زائرین خانۂ خدا اور عرفات میں اپنا تربیتی پروگرام مکمل کرنے کے بعد ادھر کوچ کرتے ہیں۔ رات ڈھلے سے صبح تک نرم پتھروں پر تاروں بھرے آسمان تلے، ایک ایسی سرزمین پر جو محشر کبریٰ کا نمونہ اور قیامت عظمیٰ کا ایک مظہر بنی ہوتی ہے۔ لوگ ہر طرف یوں پھیلے ہوتے ہیں جیسے ٹھاٹھیں مارنے والے سمندر کی طوفانی موجیں ہوں۔ صبح تک لوگوں کی آوازیں اس سرزمین پر سنائی دیتی رہتی ہیں۔

جی ہاں آلائشوں سے پاک اس پاکیزہ اور جلا دینے والے ماحول میں، احرام کے معصومانہ لباس میں، نرم کنکریوں پر بیٹھا انسان اپنے اندر یوں محسوس کرتا ہے جیسے فکر و شعور کے تازہ چشمے ابل رہے ہوں اور ان کا پانی دل کی گہرائیوں میں گر رہا ہو اور وہ اپنے اندر سے ان جھرنوں کی آواز صاف طور پر سن رہا ہو۔ ہاں اسی جگہ کو مشعر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

"ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ"

ربّ جلیل نے اس آیت میں ایک امتیاز اور خصوصیت پر خط بطلان کھینچا ہے جس کے قریش مکہ اپنے بارے میں قائل تھے۔ قریش اپنے تئیں حمس[1] (بر وزن خمس) کہتے تھے اور وہ اپنے آپ کو اولاد ابراہیمؑ اور سرپرست کعبہ قرار دیتے تھے۔

وہ کسی عرب کو اپنے برابر نہ سمجھتے تھے وہ کہتے تھے حرم مکہ سے باہر رہنے والوں کا احترام حرم میں رہنے والوں کے برابر نہیں کرنا چاہیے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر ہم ایسا کریں گے تو عرب ہماری قدر و قیمت کے قائل نہیں ہوں گے۔ اسی بنا پر انہوں نے عرفات میں ٹھہرنے کو ترک کر دیا تھا کیونکہ وہ محیط حرم سے باہر تھا حالانکہ انہیں معلوم تھا کہ یہ وقوف حج اور دین ابراہیمؑ کا جزو ہے[2]

مندرجہ بالا آیت میں قرآن حکم دیتا ہے کہ مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ سب ایک ہی جگہ عرفات میں وقوف کریں اور وہاں سے سب کے سب مشعر کی طرف آ جائیں اور پھر وہاں سے سرزمین منیٰ کی طرف کوچ کریں۔

"وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ"

مزید فرماتا ہے کہ خدا سے طلب مغفرت کرو اور زمانۂ جاہلیت کے ان افکار و خیالات سے کنارہ کشی کر لو کیونکہ حج مساوات و برابری کا درس ہے اور یاد دلاتا ہے کہ خدا غفور و رحیم ہے۔

۲۰۰- فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ۭ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ○

---

[1] حمس کا معنی ہے وہ افراد جو اپنے دین میں مستحکم ہوں۔ [2] سیرت ابن ہشام ج ۱ صفحہ ۲۱۹ و ۲۲۰



۲۰۱- وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ○

۲۰۲- اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ○

ترجمہ

۲۰۰ـ اور جب اپنے مناسک (حج) انجام دے لو تو ذکر خدا کرو جیسے (زمانۂ جاہلیت میں موہوم مفاخر پر فخر و مباہات کرتے ہوئے) اپنے آباء کو یاد کرتے (رہے) ہو بلکہ اس سے بھی بڑھ کر (یہاں دو طرح کے لوگ ہیں)، بعض کہتے ہیں خدایا ہمیں دُنیا میں بھلائی عطا کر، ایسے لوگوں کا آخرت میں کوئی حصّہ نہیں۔

۲۰۱ـ بعض کہتے ہیں خداوند ہمیں دنیا میں بھلائی عطا کر اور آخرت میں بھی اچھائی سے نواز اور ہمیں (جہنم کی) آگ کے عذاب سے محفوظ رکھ ــــ

۲۰۲ـ وہ اپنی کوشش (اور دعا) کا صلہ اور حصّہ پائیں گے اور خدا جلد حساب چکا دینے والا ہے۔

تفسیر

امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ زمانہ جاہلیت میں مراسم حج کی انجام دہی کے بعد ایک اجتماع منعقد ہوا کرتا تھا اور لوگ اپنے باپ دادا کی طرف سے ملنے والے موہوم افتخارات خوب بیان کیا کرتے تھے۔ قرآن متوجہ کرتا ہے کہ اعمال حج بجالانے کے بعد خدا کو یاد کیا کرو اور اس عظیم اجتماع میں خدا اور اس کی وسیع و بے شمار نعمتوں پر گفتگو کیا کرو اور اپنے دلوں کو اس کی جانب مائل کرو اور اس یادِ خدا میں اتنا تو شوق و شغف اور سوز و گداز ہو جتنا زمانہ جاہلیت میں اپنے آباء و اجداد کے فخر و مباہات کے ضمن میں ہوتا تھا بلکہ خدائے بزرگ و برتر کے بارے میں تو زیادہ جوش و خروش اور گہرائی ہونا چاہیئے۔

"فاذکروا اللہ کذکرکم اٰبآءکم او اشد ذکرًا"

ضمنی طور پر اس آیت سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ بزرگی اور عظمت خدا سے مربوط رہنے میں ہے نہ کہ اپنے آباء و اجداد کے موہوم مفاخر و مباہات سے وابستگی میں۔

"فمن الناس من یقول ...."

اس کے بعد قرآن دو گروہوں کی کیفیت کو واضح کرتا ہے اور ان کے افکار و فہم کا تذکرہ کرتا ہے۔ ان میں سے ایک گروہ وہ ہے جو مادی منافع کے سوا کچھ نہیں دیکھتا اور ان کے علاوہ خدا سے کسی چیز کی درخواست نہیں کرتا اور وہ کہتا ہے

"ربنآ اٰتنا فی الدنیا حسنۃ"۔ خدایا! ہمیں دُنیا کی نعمتیں بخش دے۔



ایسے لوگوں کا معنویت و روحانیت میں کوئی حصّہ نہیں اور آخرت میں اُن کے نصیب میں کچھ نہیں ۔ یہ لوگ اس ابدی و باقی اور ہمیشہ رہنے والے جہاں سے بے بہرہ ہیں ۔ جہاں انسان کو ہر چیز کی ضرورت ہوگی ۔

دوسرے گروہ میں وہ لوگ ہیں جن کے افکار و نظریات فقط مادی زندگی تک محدود نہیں بلکہ وہ حیاتِ دنیا کو بھی معنوی تکامل و ارتقا کے لیے مقدمہ سمجھتے ہیں اور آخرت کے گھر کی سعادت کے بھی طلب گار ہیں ۔ یہ آیت درحقیقت اسلامی منطق کو مادی اور معنوی مسائل میں مشخص کرتی ہے اور جو لوگ صرف مادیات میں ڈوبے ہوئے ہیں انہیں ان لوگوں کی طرح مذموم قرار دیتی ہے جو دنیاوی زندگی پر کوئی نظر نہیں رکھتے نیز یہ آیت انسانوں کی اُس جہان میں دردناک عذاب سے نجات بھی چاہتی ہے ۔

"وقنا عذاب النار"

"حسنہ" کا معنی ہے "نیکی" ۔ اس کا ایک وسیع مفہوم ہے ۔ اس میں تمام مادی و معنوی نعمتیں شامل ہیں ۔ لیکن بعض احادیث میں حسنہ کے مفہوم کے بارے میں پیغمبر اسلام سے منقول ہے ۔

"ومن اوتی قلبًا شاکرًا و لسانًا ذاکرًا و زوجة مؤمنة تعینه علی امر دنیاه و اخرته فقد اوتی فی الدنیا حسنة وفی الاٰخرة حسنة و وقی عذاب النار"۔[1]

جسے خدا شکرگزار دل دے ۔ یادِ حق میں مشغول زبان بخشے اور صاحبِ ایمان بیوی عطا کرے جو امورِ دنیا و آخرت میں اس کی مددگار ہو اسے دنیا و آخرت کی نیکی بخشی ہے اور آتشِ جہنم کے عذاب سے بچایا ہے ۔

واضح ہے کہ اس حدیث میں عام مفہوم کی بعض خاص امور کے حوالے سے تفسیر کی گئی ہے اور اس میں بعض واضح مصادیق کی نشاندہی کی گئی ہے نہ کہ منحصراً اس کا بس یہی مفہوم ہے ۔

"اولٰئک لھم نصیب ممّا کسبوا واللّٰہ سریع الحساب"

گذشتہ بحث کے بعد اس آیت میں ہے کہ دونوں گروہ اپنی کاوشوں کے نتیجے سے بہرہ ور ہوتے ہیں ، وہ بھی جو خدا سے صرف دنیا چاہتے ہیں اور وہ بھی جو دنیا و آخرت کے خواستگار ہیں ۔ ان میں سے کوئی بھی محروم نہیں ہوتا البتہ ہر ایک کا صلہ اُس کی خواہش تک محدود ہے ۔

حقیقت میں یہ آیات سورہ اسراء کی آیات ۱۸ اور ۲۰ کی طرح ہیں جن میں فرمایا گیا ہے :

جو شخص دُنیا کا طالب ہے جتنی مقدار ہم چاہتے ہیں اسے دے دیتے ہیں اور جو آخرت کو چاہتا ہے اور اس کے لیے کوشش کرتا ہے جبکہ ایمان بھی رکھتا ہے تو اس کی سعی نتیجہ بخش ہوگی اور ہر گروہ کو تیرے پروردگار کی عطا و بخشش پہنچ کے رہیگی ۔

خلاصہ یہ کہ انسان وہ کچھ پائے گا جو کچھ چاہے گا ۔

جو نکتہ یہاں باقی رہ جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اس آیت میں دعا کو کسب سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ سوال یہ ہے کہ کیا دُعا

---

[1] مجمع البیان : آیت مذکورہ کے ذیل میں ۔



کو کسب و اکتساب کہا جا سکتا ہے ؟

قرآن مجید میں ۶۷ مقامات پر مادہ "کسب" اور اس کے مشتقات کا استعمال کیا گیا ہے ۔ ان کے مطالعہ سے نتیجہ نکلتا ہے کہ لفظ کسب جسمانی کاموں کے علاوہ روحانی اور قلبی امور میں بھی استعمال ہوتا ہے ۔

سورہ بقرہ کی آیت ۲۲۵ میں ہے :

" ولٰکن یؤاخذکم بما کسبت قلوبکم "

لیکن جو تمہارے دل کسب کرتے ہیں اس پر ہم تمہارا مواخذہ کریں گے

سورہ نساء کی آیہ ۱۱۱ میں ہے ۔

" ومن یکسب اثماً فانما یکسبہ علیٰ نفسہ "

جو شخص کسب گناہ کرتا ہے وہ اپنے ہی نقصان میں کسب کرتا ہے ۔

اس بناء پر دعا اور خواہش بھی ایک طرح کا کسب و اکتساب ہے ۔ علاوہ ازیں حقیقی دعا صرف زبان سے نہیں بلکہ پورے وجود انسانی سے ہوتی ہے ۔

زیر بحث آیت کی تفسیر میں ایک اور احتمال بھی ہے وہ یہ کہ لفظ " اولٰئك " صرف دوسرے گروہ کی طرف اشارہ ہو جو دنیا و آخرت دونوں کے درپے ہے جو مادیت و معنویت کو ایک دوسرے سے ملا دیتا ہے یہ ان لوگوں کا گروہ ہے جو نہ صرف مادی ہیں اور نہ صرف تارک دنیا ۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی مساعی نتیجہ و ثمر تک پہنچتی ہیں اور وہ ان سے بہرہ ور ہوتے ہیں لیکن دوسرے لوگوں کی زحمتیں اور کوشش رائیگاں جاتی ہیں ۔

" واللہ سریع الحساب "

پروردگار کی جانب سے آیت کے آخری حصے میں سرعت حساب کی یاد دہانی کرائی گئی ہے ۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ خدا چشم زدن میں سب کا حساب کر دے گا :

" ان اللہ تعالیٰ یحاسب الخلائق کلھم فی مقدار لمح البصر " [1]

یہ اس بناء پر ہے کہ خداوند عالم مخلوقات کی طرح نہیں ہے ۔ مخلوقات کا وجود اور ہستی چونکہ محدود ہے اس لیے جب وہ ایک معاملے میں مشغول ہوں تو دوسرے سے غافل ہو جاتی ہیں جب کہ خدا تعالیٰ یوں نہیں ہے ۔

علاوہ ازیں محاسبے کے لیے پروردگار کو کسی زمانے کی ضرورت نہیں ہونی چاہیئے کیونکہ ہمارے افعال کا اثر جسم و جان ، ہمارے ارد گرد کے موجودات ، زمین اور ہوا کی موجوں میں باقی ہے ۔

حقیقت میں معاملہ ان خود کار مشینوں کا سا ہے جن کی کارکردگی (out put) ان کے ساتھ ساتھ گھومنے والے نمبر سے ظاہر ہو جاتی ہے ۔

---

[1] مجمع البیان ؛ اس آیت کے ذیل میں ۔



۲۰۳ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ○

ترجمہ

۲۰۳ — اور خدا کو معین دنوں (۱۱، ۱۲ اور ۱۳ ذی الحجہ) میں یاد کرو اور جو لوگ جلدی کریں اور (ذکرِ خدا کو) دو دنوں میں انجام دیں ان پر کوئی گناہ نہیں اور جو تاخیر کریں (اور تین دن انجام دیں) ان پر بھی کوئی گناہ نہیں (یہ اُن کے لیے ہے) جو تقویٰ اختیار کریں۔ نیز خدا سے ڈرو اور جان لو کہ تم اس کی طرف محشور ہو گے۔

تفسیر

یہ آیت مراسمِ حج کے بعد ذکرِ خدا کا پروگرام پیش کرتی ہے۔ اس کے مطابق زمانہ جاہلیت کے موہوم مفاخر کی بجائے چند روز یادِ الٰہی میں بسر کرنا چاہئیں۔ یہ مدت کم از کم دو دن اور زیادہ سے زیادہ تین دن ہے۔ سابق آیات کے قرینہ سے یہ دن عیدِ قربان کے مراسم کے بعد ہیں اور یہ یقیناً ذی الحجہ کی ۱۱، ۱۲ اور ۱۳ تاریخیں ہیں۔ روایات کی زبان میں ان دنوں کو ایامِ تشریق کہا جاتا ہے اور جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے یہ روشنی بخشنے والے دن ہیں جن میں ان بلند مرتبہ مذہبی مراسم کے ذریعے انسانی روح اور جان روشن ہو جاتی ہے۔

احادیث کے مطابق ۱۵ نمازوں کے فوراً بعد (جو عید کے روز نمازِ ظہر سے لے کر ۱۳ ذی الحجہ کی نمازِ صبح تک ہیں) ان الہام بخش جملوں کا تکرار کیا جاتا ہے:

"اللّٰہ اکبر، اللّٰہ اکبر، لا الٰہ الا اللّٰہ واللّٰہ اکبر، وللّٰہ الحمد، اللّٰہ اکبر علٰی ما ھدانا، اللّٰہ اکبر علٰی ما رزقنا من بھیمۃ الانعام"۔

"فلا اثم علیہ" (اس پر کوئی گناہ نہیں) ہو سکتا ہے یہ جملہ دو اور تین دن کے ذکرِ خدا میں اختلاف کی طرف اشارہ ہو یعنی اس تعداد میں سے جسے چاہو اختیار کرو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے (اور آیت سے ابتدائی طور پر بھی یہی مفہوم ظاہر ہوتا ہے)

یہ بھی ممکن ہے کہ آیت کے اس حصے میں خانہ خدا کے زائرین سے مطلق گناہ کی نفی ہو یعنی ایمان، خلوص اور توجہ سے مناسکِ حج انجام دینے سے جو ان اذکار سے مکمل ہوتے ہیں، زائرینِ کعبہ کے گذشتہ گناہوں کے آثار اور رتہ در تہ



گناہ و معاصی اُن کے قلب و جان سے دُھل جائیں گے اور جب وہ اس عظیم تربیتی مکتب سے نکلیں گے تو ان کی روحیں آلائش گناہ سے پاک ہو چکی ہوں گی۔ "لمن اتقی" (یعنی — ان لوگوں کے لیے جو تقویٰ اختیار کریں) کے الفاظ اسی مفہوم کی تائید کرتے ہیں۔

۲۰۴۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ○

۲۰۵۔ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ○

۲۰۶۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ۭ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ○

ترجمہ

۲۰۴ — کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جن کی گفتگو دنیاوی زندگی کے بارے میں تمہیں بھلی معلوم ہوتی ہے اور وہ جو دل میں چھپائے ہوئے ہیں خدا اُس پر گواہ ہے اور (جبکہ) وہ سخت ترین دشمن ہیں۔

۲۰۵ — (ان کی نشانی یہ ہے کہ) جب وہ رُخ پھیرتے ہیں (اور تیری بارگاہ سے نکلتے ہیں) تو زمین میں فساد برپا کرنے کے درپے ہوتے ہیں اور وہ فصلوں اور چوپایوں کو تباہ و برباد کرتے ہیں (اس کے باوجود کہ وہ جانتے ہیں کہ) خدا فساد کو پسند نہیں کرتا۔

۲۰۶ — اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ خدا سے ڈرو (تو ان کا اصرار اور ہٹ دھرمی بڑھ جاتی ہے) اور ضد اور تعصب انہیں گناہ کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔ جہنم کی آگ ان لوگوں کیلئے کافی ہے اور (جہنم) کیا بُری جگہ ہے۔

شان نزول

یہ آیات اخنس بن شریق کے متعلق نازل ہوئی ہیں۔ وہ خوبصورت اور خوش بیان شخص تھا۔ وہ پیغمبر اکرمؐ سے دوستی کا اظہار کرتا تھا اور خود کو مسلمان ظاہر کرتا تھا۔ جب پیغمبر اسلامؐ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور آپؐ کے پاس بیٹھتا تو اظہار ایمان کرتا اور منافق ہونے کے باوجود قسمیں کھاتا اور کہتا کہ میں آپؐ کو دوست رکھتا ہوں اور خدا پر ایمان رکھتا ہوں۔ پیغمبرؐ بھی (بظاہر) اُسے تپاک سے ملتے اور اس سے اظہار لطف و محبت فرماتے۔



ایک مرتبہ اس کے اور قبیلہ ثقیف کے درمیان دشمنی ہوگئی۔ اُس نے ان پر شب خون مارا۔ اُن کے چوپائے مار ڈالے اور فصلوں کو آگ لگا دی۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے کھیتوں سے گزرا اور انہیں آگ لگا دی اور ان کے چوپایوں کے پاؤں کاٹ دیئے۔ اِس طرح اس نے اپنے اندرونی نفاق کو ظاہر کیا اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

بعض نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ مذکورہ آیات سریہ رجیع کے بارے میں ہیں۔ واقعہ یوں ہے کہ مبلغین اسلام کی ایک جماعت پیغمبر اکرمؐ کی طرف سے اطراف مدینہ کے لیے روانہ ہوئی تاکہ مختلف گروہوں سے ملاقات کرے۔ ایک نامردانہ سازش کے نتیجے میں وہ سب شہید ہوگئے۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

پہلی شان نزول آیات کے مضمون سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے۔ بہرحال آیات سے ملنے والا درس عمومی ہے اور سب کے لیے ہے۔

تفسیر

جیسا کہ شان نزول میں آیا ہے آیات بعض منافقین کے نفاق کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور ان کا تقاضا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ اپنے تئیں ان سے بچائے رہیں۔ فرمایا گیا ہے کچھ لوگ اپنی باتوں سے اظہار ایمان کرتے ہیں اور قسم کھا کر یوں ظاہر کرتے ہیں کہ ان کی باتیں اُن کے اعتقاد کی مظہر ہیں حالانکہ وہ اسلام کے سخت ترین دشمن ہیں۔ اسی لیے یہ لوگ جب پیغمبرؐ کی خدمت سے اٹھ کر باہر جاتے ہیں تو زمین میں فساد کرتے ہیں، کھیتوں کو اجاڑ دیتے ہیں اور انسانوں کو تباہ کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اُن کے رُخ کردار سے پردہ اُٹھاتا ہے اور اُن کے باطن کو پیغمبر اکرمؐ کے سامنے آشکار کرتا ہے اور فتنہ اور فساد میں اُن کی بڑھتی ہوئی فعالیت کے بارے میں نبی اکرمؐ سے کہتا ہے اگر یہ لوگ اپنے اظہارات میں سچے ہوتے تو فساد اور تخریب کاری کی طرف ہاتھ نہ بڑھاتے کیونکہ سب کو معلوم ہے کہ خدا تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ "واللہ لا یحب الفساد." رہا یہ امر کہ پیغمبر اکرمؐ ایسے افراد سے کشادہ روئی سے کیوں پیش آتے تھے تو وہ اس لیے کہ آپؐ مامور تھے کہ لوگوں کے ظواہر کو قبول کریں۔ جب تک کہ اُن سے کوئی مخالفت سرزد نہ ہو اور ہونا بھی اس طرح چاہیئے۔

بعض کا احتمال ہے کہ جملہ " اذا تولی " سے مراد "حکومت" ہے کیونکہ لفظ "تولی" مادہ ولایت سے ہے جس کا معنی حکومت ہے۔ اس مفہوم کی بنا پر آیت کی تفسیر یوں ہوگی کہ منافقین جب حکومت حاصل کر لیتے ہیں تو فساد اور تخریب کاری کے ذریعے بندگانِ خدا پر ظلم و ستم روا رکھتے ہیں۔ آبادیاں ویرانوں میں بدل جاتی ہیں اور لوگوں کے مال و جان محفوظ نہیں رہتے جب انہیں اس بُرے عمل سے روکا جاتا ہے تو ان کی ہٹ دھرمی اور تعصب میں اضافہ ہو جاتا ہے اور نہ صرف یہ کہ وہ نصیحت کرنے والوں کے نصائح پر کان نہیں دھرتے بلکہ غرور اور اپنی مخصوص نخوت کے ساتھ حق



کے خلاف کاموں میں اضافہ کرتے ہیں ایسے افراد کو جہنم کی آگ کے سوا کوئی چیز رام نہیں کر سکتی "فحسبه جهنم"...... یعنی جہنم اس کے لیے کافی ہے اور وہ بری جگہ ہے۔

درحقیقت یہ آیت منافقین کی ایک اور صفت کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور وہ ہے خشک تعصب اور ہٹ دھرمی جو انہیں بڑے سے بڑے گناہوں کی سرحد تک پہنچا دیتی ہے۔ "اخذته العزة بالاثم." جب کہ صاحبان ایمان حکومت ایمان کی پناہ میں اس بری صفت اور اس کے خطرناک آثار سے دور ہیں۔

۲۰۷۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ○

ترجمہ

۲۰۷۔ (علیؑ جیسے صاحب ایمان اور فداکار جنہوں نے ہجرت کی شب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بستر پر سو کر گزاری) کچھ لوگ اپنی جان خدا کی خوشنودی کے بدلے بیچ دیتے ہیں اور خدا اپنے بندوں پر مہربان ہے۔

شان نزول

اہل سنت کے مشہور مفسر ثعلبی کہتے ہیں کہ جب پیغمبر اسلام نے ہجرت کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا تو اپنے قرضوں کی ادائیگی اور موجود امانتوں کی واپسی کے لیے حضرت علیؑ کو اپنی جگہ مقرر کیا اور جس رات آپؐ غار ثور کی طرف جانا چاہتے تھے اس رات مشرکین آپؐ پر حملہ کرنے کے لیے آپؐ کے گھر کا چاروں طرف سے محاصرہ کئے ہوئے تھے آپؐ نے حضرت علیؑ کو حکم دیا کہ وہ آپؐ کے بستر پر لیٹ جائیں۔ اپنی مخصوص سبز رنگ کی چادر انہیں اوڑھنے کو دی۔ اس وقت خداوند عالم نے جبرئیل اور میکائیل پر وحی کی کہ میں نے تم دونوں کے درمیان بھائی چارہ اور اخوت قائم کی ہے اور تم میں سے ایک کی عمر کو زیادہ مقرر کیا ہے۔ تم میں سے کون ہے جو ایثار کرتے ہوئے دوسرے کی زندگی کو اپنی حیات پر ترجیح دے ان میں سے کوئی بھی اس کے لیے تیار نہ ہوا تو ان پر وحی ہوئی کہ اس وقت علیؑ میرے پیغمبرؐ کے بستر پر سویا ہوا ہے اور وہ تیار ہے کہ اپنی جان ان پر قربان کر دے۔ زمین پر جاؤ اور اس کے محافظ و نگہبان بن جاؤ۔

جب جبرئیل حضرت علیؑ کے سرہانے آئے اور میکائیل پاؤں کی طرف بیٹھے تھے تو جبرئیل کہہ رہے تھے سبحان اللہ، آفرین آپ پر اے علیؑ کہ خدا آپ کے ذریعے فرشتوں پر فخر و مباہات کر رہا ہے۔



اس موقع پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور اسی بناء پر وہ تاریخی رات "لیلۃ المبیت" کے نام سے مشہور ہوگئی۔

ابن عباس کہتے ہیں: جب پیغمبرؐ مشرکین سے چھپ کر ابوبکر کے ساتھ غار کی طرف جارہے تھے یہ آیت علیؑ کے بارے میں نازل ہوئی جو اس وقت بستر رسولؐ پر سوئے ہوئے تھے۔

ابوجعفر اسکافی کہتے ہیں: جیسے ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ جلد ۳ صفحہ ۲۷۰ پر لکھا ہے، حضرت علیؑ کے پیغمبرؐ کے بستر پر سونے کا واقعہ تواتر سے ثابت ہے اور اس کا انکار غیر مسلموں اور کم ذہن لوگوں کے علاوہ کوئی نہیں کرتا۔ [1]

تفسیر

جیسا کہ شان نزول میں بیان ہوچکا ہے یہ آیت ہجرت کی رات حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہوئی لیکن اس کا ایک کلی و عمومی مفہوم بھی ہے۔ یہ آیت چونکہ گذشتہ آیت "ومن الناس من یعجبک ......" کے مقابلے میں آئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس آیت میں انسانوں کے جس گروہ کی طرف اشارہ ہے سابق گروہ کے مقابلے میں ہے اور ان کی صفات بھی ان کی صفات کے مقابل ہیں۔ وہ لوگ خود غرض، خود پسند، ہٹ دھرم اور بغض و عناد رکھنے والے تھے ______________ اور منافقت کے ذریعے لوگوں میں اپنی عزت و آبرو بناتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو دین کا خیر خواہ اور مومن ظاہر کرتے تھے لیکن ان کا کردار اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ وہ زمین میں فساد برپا کرتے تھے اور لوگوں کو ہلاک کرتے تھے جب کہ یہ دوسرا گروہ صرف خدا سے معاملہ کرتا ہے اور اپنا سب کچھ یہاں تک کہ جان بھی خدا کے پاس بیچ دیتا ہے۔ یہ گروہ اس کی رضا کے سوا کسی چیز کا خریدار نہیں اور خدائی طرز کے علاوہ کسی طریقے سے عزت و آبرو کے حصول کا قائل نہیں۔ انہی انسانوں کی فداکاریاں ہیں جن کی وجہ سے دین و دنیا کے امور کی اصلاح ہوتی ہے، حق و حقیقت زندہ و پائیدار ہے، حیات انسانی خوش گوار ہے اور شجر اسلام بار آور ہے۔

یہیں سے آیت کے صدر و ذیل کی مناسبت یعنی "واللہ رؤف بالعباد" کا مفہوم آشکار ہوجاتا ہے کیونکہ اس قسم کے انسانوں کا لوگوں میں وجود اپنے بندوں پر خدا کی رأفت و مہربانی کا مظہر ہے اس لیے کہ اگر ایسے فداکار، اپنی پرواہ نہ کرنے والے جانباز اُن پست عناصر کے مقابلے میں نہ ہوتے تو ارکان دین اور اسلامی معاشرہ

---

[1] الغدیر، جلد ۲، صفحہ ۴۴ و صفحہ ۴۵ پر ہے کہ غزالی نے احیاء العلوم ج ۳ صفحہ ۲۳۸ پر صفوری نے نزہۃ المجالس ج ۲، صفحہ ۲۰۹ پر ابن صباغ مالکی نے فصول المہمہ میں سبط ابن جوزی نے تذکرہ خواص صفحہ ۲۱ پر، امام احمد نے مسند ج ۱ صفحہ ۳۴۸ پر تاریخ طبری جلد ۲ صفحہ ۹۹ پر سیرۃ ابن ہشام ج ۲، صفحہ ۲۹۱ پر سیرۃ حلبی ج ۱ صفحہ ۲۹ تاریخ یعقوبی ج ۲ صفحہ ۲۹ پر لیلۃ المبیت کے واقعہ کو نقل کیا ہے۔



پاش پاش ہو جاتا لیکن پروردگار مہربان ہمیشہ ان فداکار اور جانثار دوستوں کے ذریعے دشمنوں کی تباہ کاریوں کا ازالہ اور تلافی کرتا ہے جیسا کہ سورہ حج کی آیہ ۴۰ میں ہے۔

"ولولا دفع اللّٰہ النّاس بعضہم ببعض لہدمت صوامع وبیع وصلوات ومساجد....."

اگر خدا ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعے دفع نہ کرتا تو عبادت خانے، گرجے، یہودیوں کے عبادت خانے (کنیسے) اور مسجدیں سب ویران ہو جاتیں۔

یہ نفع بخش معاملہ جو خدا والوں نے اپنے پروردگار کے ساتھ کیا ہے۔ قرآن کی دوسری آیات میں بھی مذکور ہے مثلاً سورہ توبہ کی آیہ ۱۱۱ میں ارشاد ہوتا ہے۔

"انّ اللّٰہ اشترٰی من المؤمنین انفسہم واموالہم بانّ لہم الجنّۃ یقاتلون فی سبیل اللّٰہ فیقتلون ویقتلون........"

خدا مومنین سے اُن کے نفوس اور مال خریدتا ہے تاکہ اس کے بدلے انہیں جنّت دے دے۔ وہ راہِ خدا میں جنگ کرتے، قتل کرتے اور قتل ہوتے ہیں........

محل بحث آیت حضرت علیؑ کی ایک بہت بڑی فضیلت ہے جس کا ذکر اکثر اسلامی کتب میں آیا ہے۔ یہ فضیلت اس قدر عظیم اور نگاہوں میں کھٹکنے والی ہے کہ معاویہ جیسا خاندان رسالت کا سخت ترین دشمن بھی اس پر اتنا بے چین ہوا کہ اس نے سمرہ بن جندب کو چار لاکھ روپے کی پیش کش کر کے کہا کہ اس آیت کو جعلی حدیث کے ذریعے عبدالرحمٰن ابن ملجم کی فضیلت میں بیان کر دو۔ اس ظالم منافق نے بھی ایسا کر دیا لیکن حسب توقع اس بناوٹی حدیث کو ایک شخص نے بھی قبول نہیں کیا۔

قابل توجہ امر یہ ہے کہ اس آیت میں بیچنے والا انسان ہے اور خریدنے والا خدا ہے۔ مال ومتاع نفس وجان ہے اور اس کی قیمت خوشنودیٔ پروردگار ہے۔ یہ آیت دیگر اُن آیات سے مختلف ہے جن میں لوگوں کی خدا سے تجارت بیان کی گئی ہے۔ وہاں قیمت بہشت اور دوزخ سے نجات ہے لیکن زیرِ نظر آیت میں مذکور گروہ جنّت کو نظر میں لاتے ہیں نہ دوزخ سے خوف زدہ ہیں (اگرچہ یہ دونوں چیزیں بڑی اہم ہیں) بلکہ ان کی پوری توجہ پروردگار کی خوشنودی کے حصول کی طرف ہے اور یہ سب سے بلند عمل ہے جو انسان انجام دے سکتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آیت "من تبعیضیۃ" یعنی "ومن النّاس" سے شروع ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کچھ افراد ہی ہیں جو یہ فوق العادہ کام کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ جب کہ دوسری آیات جن میں جان کے معاملے کے سلسلے میں جنّت کا حصول یا جہنم سے نجات کا ذکر ہے اور ان میں عمومیت اور ملکیت کے پہلو کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ اشترٰی من المؤمنین میں اسی طرف اشارہ ہے۔



۲۰۸۔ یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً ۖ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ○

۲۰۹۔ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْکُمُ الْبَیِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ○

ترجمہ

۲۰۸۔ اے ایمان والو! سب کے سب صلح و آشتی میں داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

۲۰۹۔ اور اگر (ان سب) نشانیوں اور واضح پروگراموں کے بعد بھی تم سے لغزش ہو جائے (اور تم گمراہ ہو جاؤ) تو جان لو کہ (تم خدائی عدالت کے چنگل سے فرار اختیار نہیں کر سکتے کیونکہ) خدا توانا اور حکیم ہے۔

تفسیر

عالمی صلح و آشتی صرف ایمان کے سائے میں ممکن ہے

"سلم" اور "سلام" لغت میں صلح و آشتی کے معنی میں ہے۔ یہ آیت تمام لوگوں کو امن و صلح کی دعوت دیتی ہے۔ آیت کا روئے سخن چونکہ مومنین کی طرف ہے اس لیے اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ صلح و آسائش صرف ایمان کے سائے میں ممکن ہے۔ ایمان کے بغیر یعنی مادی قوانین کے بھروسے پر دُنیا سے جنگ و جدل اور پریشانی اور اضطراب کا ہرگز خاتمہ نہیں ہو سکتا۔ ایمان کی معنوی قوت کے ذریعے اِس بات کا امکان ہے کہ انسان تمام اختلافات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے آپس میں بھائیوں کی طرح مل بیٹھیں اور عالمی حکومت تشکیل دیں اس طرح ہر دھرتی پر صُلح و آشتی کے ٹھنڈے سائے ڈالے جا سکتے ہیں۔

واضح ہے کہ مادی امور مثلاً زبان، نسل، ثروت و دولت، جغرافیائی حدود اور طبقہ بندی سب کے سب جدائی اور پراگندگی کے سرچشمے ہیں۔ ان کے ذریعے حقیقی عالمی امن قائم نہیں ہو سکتا کیونکہ حقیقی امن تو قلوب انسانی میں



کسی محکم رشتے کا محتاج ہے اور یہ محکم رشتہ اتصال صرف خدا پر ایمان کا نام ہے۔ یہی رشتہ تمام اختلافات سے بلند و بالا ہے۔ اسی لیے امن و صلح ایمان کے بغیر ممکن نہیں ہے جیسا کہ خود وجودِ انسانی میں اور اس کی روح میں اطمینان اور آسودگی ایمان کے بغیر میسر نہیں آسکتی۔

"ولا تتبعوا خطوات الشیطان"

اسی سورہ کی آیہ ۱۶۷ میں اشارہ ہو چکا ہے کہ کجرویاں اور شیطانی وسوسے تدریجی طور پر رونما ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک قرآنی تعبیر کے مطابق شیطان کے ایک قدم کی پیروی ہے۔ یہاں بھی اسی حقیقت کا تکرار کیا گیا ہے کہ انحراف حق، دشمنی، عداوت، نفاق، جنگ اور خون ریزی۔ انسان کے مزاج میں آہستہ آہستہ داخل ہوتے ہیں۔ صاحب ایمان افراد کو پہلے سے بیدار رہنا چاہیئے تاکہ وہ ان برائیوں کا مقابلہ کر سکیں۔

عربوں کی ایک مشہور ضرب المثل ہے۔

"ان بدو القتال اللطام"

"ایک تباہ کن جنگ کی ابتدا، ایک تھپڑ سے ہوتی ہے۔"

"انہ لکم عدو مبین"

شیطان کی انسان سے دشمنی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ ابتدائے آفرینش حضرت آدم علیہ السلام سے وہ انسان کی دشمنی کے لیے کمربستہ ہے اور اس نے سوگند کھائی ہے کہ وہ اس دشمنی کو اپنے حتمی نتیجے تک پہنچانے کے لیے زیادہ سے زیادہ کوشش کرے گا لیکن جیسا کہ اپنے مقام پر ہم کہہ چکے ہیں کہ یہ تضاد اور عداوت با ایمان لوگوں کو نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ بلکہ یہ ان کے تکامل وارتقاء کے لیے ایک رمز ہے۔

"فان زللتم من بعد ما جاءتکم البینات"

پروگرام، راستہ اور مقصد سب واضح ہیں تو پھر لغزشوں اور شیطانی وسوسوں کی گنجائش نہیں ہونا چاہیئے لیکن اگر تم ان سب چیزوں کے باوصف راستے سے ہٹ جاؤ۔ کجروی اختیار کرلو تو مسلّم ہے کہ اس میں تمہاری ہی کوتاہی ہے اور جان لو کہ خدا بھی عزیز (صاحب قدرت اور توانا) ہے اور کوئی شخص اس کی عدالت سے فرار اختیار نہیں کر سکتا اور وہ حکیم بھی ہے۔ خلافِ عدالت کوئی حکم اور فیصلہ صادر نہیں کرتا۔

۲۱۰۔ هَلْ يَنْظُرُونَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِىْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِىَ الْاَمْرُ ۚ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ○

لے "ظلل" جمع ہے "ظلة" کی۔ ظلة ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو سایہ فگن ہو۔ اس بنا پر "ظلل من الغمام" جو "سایہ فگن بادل"



ترجمہ

۲۱۰۔ کیا (شیطان کے پیروکار) یہ لوگ (ان تمام نشانیوں اور واضح پروگراموں کے بعد) پھر بھی منتظر ہیں کہ خدا اور فرشتے بادل کے سائے میں ان کے پاس آئیں (اور انہیں نئے دلائل پیش کریں جب کہ یہ امر محال ہے) اور تمام چیزیں انجام پا چکی ہیں اور تمام معاملات کی بازگشت خدا کی طرف ہے۔

تفسیر

یہ آیت اگرچہ قرآن کی پیچیدہ آیات میں سے نظر آتی ہے لیکن آیت کی تعبیرات میں دقت نظر اور غور و خوض سے ابہام دور ہو جاتا ہے۔ اس آیت میں صدائے دشمن پیغمبرؐ کی طرف ہے۔ گزشتہ بحث کے بعد خداوند عالم فرماتا ہے کیا یہ سب نشانیاں اور واضح دلائل انسان کو لغزش سے بچانے اور عدو مبین (شیطان) کے چنگل سے نجات دلانے کے لیے کافی نہیں ہیں؟ کیا وہ منتظر ہیں کہ خداوند عالم فرشتوں کی ہمراہی میں سایہ فگن بادلوں کی اوٹ میں ان کی طرف آئے اور انہیں زیادہ واضح دلائل پیش کرے؟ ایسا ہونا تو محال ہے کیونکہ خدا جسم نہیں ہے اور بغرض محال ایسا ہو بھی تو اس کی ضرورت کیا ہے جب کہ تمام چیزیں انجام پا چکی ہیں اور کوئی فروگذاشت واقع نہیں ہوئی (و قضی الامر) اور تمام چیزوں کی بازگشت خدا کی طرف ہے اور سب امور کا سرانجام وہی ہے (و الی اللّٰہ ترجع الامور)۔

اس بناء پر آیت کی ابتدا میں آنے والا استفہام، استفہام انکاری ہے یعنی ایسا ہونا ممکن نہیں (علاوہ ازیں ہم کہہ چکے ہیں کہ اس کی ضرورت بھی نہیں کیونکہ انسانی ہدایت کی ضرورت کو پہلے ہی پورا کیا جا چکا ہے)

اس تفسیر کی بناء پر آیت میں کسی قسم کی "تقدیر" موجود نہیں اور آیت کے اصل الفاظ کی تفسیر یہی ہے لیکن مفسرین کی ایک جماعت نے اس استفہام کو استفہام انکاری کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا اور اسے گناہگاروں اور شیطانی پروگراموں کی پیروی کرنے والوں کے لیے ایک طرح کی تہدید قرار دیا ہے (ان کے نزدیک یہ عذاب دنیا یا عذاب آخرت کی ایک دھمکی ہے) وہ لفظ 'اللّٰہ' سے پہلے لفظ 'امر' کو مقدر سمجھتے ہیں۔ اس سے آیت کا مجموعی مفہوم اور معنی یہ ہوگا

> کیا وہ ٹیڑھے اعمال بجا لا کر چاہتے ہیں کہ خدا کا حکم اور فرشتے انہیں سزا دینے اور ان پر عذاب نازل کرنے کے لیے آ پہنچیں، وہ دنیا و آخرت کے عذاب میں گرفتار ہو جائیں اور ان کے کام کا خاتمہ ہو جائے۔ جب کہ ان کے اعمال کا اس کے علاوہ اور کوئی نتیجہ بھی نہ ہوگا۔



۲۱۱- سَلْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ کَمْ اٰتَیْنٰھُمْ مِّنْ اٰیَةٍۭ بَیِّنَةٍ ؕ وَمَنْ یُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ○

ترجمہ

۲۱۱- بنی اسرائیل سے پوچھ لو، ہم نے انہیں کیسی واضح نشانیاں دی تھیں (لیکن انہوں نے خدا کی عطا کردہ مادی و معنوی نعمتوں کو غلط طور پر صرف کیا) اور جو شخص اللہ کی نعمت پاکر اُسے تبدیل کردے (اور اُسے غلط امور میں صرف کرے وہ خدا کے شدید عذاب میں گرفتار ہوگا کہ) خدا شدید العقاب ہے۔

تفسیر

یہ آیت بنی اسرائیل کی روش اور طور طریقوں کے بارے میں ہے کہ وہ واضح آیات اور نعمات الٰہی کے حصول کے بعد کیسے انہیں بدل دیتے تھے۔ کفران نعمت کرتے تھے اور نتیجے کے طور پر وہ عذاب میں گرفتار ہوگئے۔

نعمت کی تبدیلی ــــ کا مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنے پاس موجود وسائل، توانائیاں اور مادی و معنوی صلاحیتیں تخریبی اور انحرافی راستوں، گناہ اور ظلم وستم میں استعمال کرے۔ خداوند عالم نے بنی اسرائیل کو روحانی مربی بھی عطا فرمائے۔ ان میں سے طاقتور سربراہ بنائے اور ہر قسم کے مادی و معنوی اسباب اُن کے تصرف میں دے دیے لیکن وہ نعمت کی تبدیلی میں گرفتار ہوگئے۔ اسی سے اُن کی زندگی تباہ و برباد ہوگئی اور قیامت میں بھی دردناک عذاب اُن کے انتظار میں ہے۔

نعمت کی تبدیلی کا مسئلہ بنی اسرائیل میں منحصر نہیں۔ اس زمانے میں بھی دنیا نے صنعت اس عظیم بدبختی میں مبتلا ہے کیونکہ انسان کے اختیار میں اگرچہ آج بہت سی نعمتیں اور توانائیاں ہیں جو تاریخ کے کسی دور میں بھی انسان کو نصیب نہیں ہوئیں لیکن انبیاء و مرسلین کی آسمانی تعلیمات سے دوری کی وجہ سے وہ تبدیلی نعمت کے عمل میں گرفتار ہے اور ان سبی نعمتوں کو وحشت ناک حد تک اپنی فنا اور نابودی کی راہ میں صرف کر رہا ہے۔

" سَلْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ " ـــ یہ جملہ حقیقت میں اس لیے ہے کہ اُن سے نعمات الٰہی کا اعتراف کروایا جائے اور اس کے بعد انہیں پوچھا جائے کہ ان وسائل و ذرائع کے باوجود ایسا روز سیاہ تمہیں کیوں نصیب ہوا اور کیوں آج تم دُنیا میں پراگندہ و منتشر ہو۔

۲۱۲- زُیِّنَ لِلَّذِیْنَ کَفَرُوا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا وَیَسْخَرُوْنَ



مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ○

ترجمہ

۲۱۲۔ دنیاوی زندگی کو کافروں کے لیے مزین کیا گیا ہے (لہٰذا) وہ صاحب ایمان لوگوں کا (کہ جو کبھی کبھی تہی دست ہوتے ہیں) تمسخر اڑاتے ہیں حالانکہ اہل ایمان قیامت میں ان سے بالاتر ہوں گے (کیونکہ قدریں وہاں آشکار ہوں گی اور وہاں وہ اپنی اصلی صورت میں ہوں گی) اور خدا جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے روزی دیتا ہے۔

شان نزول

مشہور اسلامی مفسر ابن عباس کہتے ہیں کہ یہ آیت اشراف اور روسائے قریش کے ایک مختصر گروہ کے بارے میں نازل ہوئی کہ جن کی زندگی بہت شاہ خرچ اور خوشحال تھی۔ وہ صدر اول کے ثابت قدم عمار اور بلال جیسے مومنین کا تمسخر اڑاتے تھے کیونکہ وہ مادی لحاظ سے فقیر اور تہی دست تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر پیغمبرؐ کی کوئی شخصیت ہوتی اور وہ خدا کی طرف سے مبعوث ہوتے تو اشراف اور بڑے لوگ ان کی پیروی کرتے۔ اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی جس میں ان کی بے بنیاد باتوں کا جواب دیا گیا ہے۔

تفسیر

مذکورہ بالا شان نزول کے مطابق آیت قریش کے خود خواہ اور دنیا پرست اشراف کے بارے میں نازل ہوئی ہے لیکن یہ امر اس سے مانع نہیں کہ یہ گذشتہ آیت کی بحث کی تکمیل کرتی ہے جو یہودیوں کے بارے میں تھی نیز یہ اس سے بھی مانع نہیں کہ یہ ایک کلیہ قاعدہ کے طور پر ہے اور ایک عمومی حکم جو سب کے لیے ہے بیان کرتی ہے۔ اس کا عمومی مفہوم یہ ہے کہ کافروں کی نگاہ کا افق مادی دنیا کی چار دیواری سے بالاتر نہیں۔ ہے اس لیے ان کے لیے مادی زندگی بہت دلپذیر، خوبصورت اور زیبا ہے اور یہی زندگی ان کے نزدیک تمام قدروں کی قدر و قیمت کا تعین کرنے کے لیے ایک مقیاس و میزان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی پسماندہ، بیمار اور علیل فکر کے مطابق دولت و ثروت سے تہی افراد کی کوئی حیثیت و شخصیت نہ تھی لہٰذا وہ ان کا مذاق اڑاتے اور تمسخر کرتے۔ معنوی و انسانی اقدار ان کی نظر میں ہیچ تھیں حالانکہ ان دو طرح کی اقدار میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ان کی کوتاہ نظر ان بلندیوں اور زیبائشوں کو دیکھنے کی قدرت نہ رکھتی تھی۔ ان کے جواب میں قرآن دو نکات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

۱۔ دوسرے جہان میں جہاں معنوی اور روحانی حقائق اور کمالات اپنی اصلی اور حقیقی صورت اختیار کر لیں گے وہاں مومنین ان سے بلند درجات پر فائز ہوں گے کیونکہ یہ زمین کی تہوں میں چل رہے ہوں گے اور وہ آسمان کے اوپر ہوں گے



"والذین اتقوا فوقھم یوم القیامۃ"

۲۔ علاوہ ازیں مادی فوائد سے لطف اندوز ہونا کسی کی منزلت کی نشانی اور ایمانی قدر و قیمت کی علامت نہیں ہے کیونکہ اس جہاں میں روزی کی تقسیم کفر و ایمان اور معنوی و انسانی اقدار کی بنیاد پر نہیں ہے۔

"واللہ یرزق من یشآء بغیر حساب"

آیت کے اس جملے میں ممکن ہے ایک اور معنی کی طرف بھی اشارہ ہو کہ ان محرومیوں کی تلافی خداوند عالم یوں کرتا ہے کہ ان سے محروم افراد گناہ اور حرام سے آلودہ ہونے سے بچ جاتے ہیں یا پھر مخالفوں اور دشمنوں سے پُر ماحول میں بھی وہ ایمان لے آتے ہیں جس کے نتیجے میں انہیں آخرت کے گھر میں بے حساب رزق بخش جائے گا۔

یہاں ایک سوال باقی رہ جاتا ہے۔ وہ یہ کہ زُیِّنَ (زینت دیا گیا) ــــــ یہ لفظ فعلِ مجہول ہے، اس سے یہاں کیا مراد ہے اور اس کا فاعل کون ہے۔

کون ہے جو دنیاوی زندگی کو کافروں کی نگاہ میں زینت دیتا ہے۔ اس سوال کا جواب سورہ آل عمران کی آیہ ۱۴ کے ذیل میں ملاحظہ کیجئے گا۔

۲۱۳۔ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○

ترجمہ

۲۱۳ ــــ (ابتداء میں) لوگوں کا ایک ہی گروہ تھا (اور ان کے درمیان کوئی تضاد نہ تھا۔ رفتہ رفتہ گروہ اور طبقات پیدا ہوتے گئے) پھر ان میں اختلافات (اور تضادات) وجود میں آئے۔ خدا نے انبیاء کو بھیجا تاکہ وہ لوگوں کو بشارت دیں اور ڈرائیں نیز ان پر آسمانی کتاب بھی نازل کی جو انہیں حق کی



طرف دعوت دیتی تھی ، یہ کتاب لوگوں کے اختلافات کا فیصلہ کرنے کے لیے تھی (ایمان والوں نے تو اس سے اختلاف نہیں کیا) صرف ایک گروہ نے حق سے انحراف اور ستمگری کرتے ہوئے اس سے اختلاف کیا جب کہ انہیں کتاب دی گئی تھی اور واضح نشانیاں ان تک پہنچ چکی تھیں۔ جو لوگ ایمان لا چکے تھے خدا نے اختلافی چیزیں میں اپنے حکم سے اُن کی رہبری کی (لیکن بے ایمان لوگ اسی طرح گمراہی اور اختلاف میں باقی رہے) اور خدا جسے چاہتا ہے راہِ راست کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

تفسیر

ابتداء میں انسان کی زندگی اور معاشرہ سادہ تھا۔ رفتہ رفتہ جب انسانوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ منافع کا تضاد ابھرا اور اختلافات پیدا ہونے لگے۔ یہ مقام وہ تھا کہ راہنما اور قانون کی ضرورت پیدا ہوئی۔ سب سے پہلے ضروری تھا کہ خدا کے بھیجے ہوئے نمائندے لوگوں کو دوسرے جہاں کی زندگی کی طرف متوجہ کریں جو سیرِ تکامل اور سفرِ ارتقاء کا آخری مرحلہ ہے۔ ضروری تھا کہ وہ انہیں متنبہ کریں کہ موت کے بعد ایک اور جہان ہے جس میں لوگ اپنے کردار کی جزا و سزا سے دوچار ہوں گے۔ انبیاء کرام اس ذریعے سے اور ثواب کی بشارت اور بدکاروں کو عذاب سے ڈرانے کے طریقے سے لوگوں کو احکام الٰہی کی طرف راغب کرتے تھے (فبعث اللہ النبیین مبشرین و منذرین)۔

یہ وہ مقام ہے جہاں انسان محسوس کرتا ہے کہ اسے ایسے صحیح قوانین کی ضرورت ہے جو اس کی سعادت کا سبب بنیں۔ اسی لیے خداوند عالم نے انبیاء کے پاس سعادت بخش قوانین بھیجے تاکہ وہ لوگوں کے اختلافات کو ختم کریں۔ درحقیقت زیرِ نظر آیت ان مراحل کو بیان کرتی ہے جو انبیاء کی بعثت اور آسمانی احکام کے نزول پر منتہی ہوتے ہیں۔

پہلا مرحلہ:۔ یہ مرحلہ ابتدائی سادہ زندگی پر مشتمل ہے جب انسان اجتماعی زندگی کا عادی نہ ہوا تھا اور فطرتاً تضاد اور تصادم وقوع پذیر نہ ہوتا تھا۔ قانونِ فطرت کے مطابق خدا کی پرستش ہوتی تھی اور اس کے آسان و سادہ فرائض اس کی بارگاہ میں انجام دیئے جاتے تھے۔

دوسرا مرحلہ:۔ یہ وہ مرحلہ ہے جب انسانی زندگی اجتماعی شکل اختیار کر لیتی ہے اور ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا کیونکہ انسان تکامل و ارتقاء کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور اس تکامل کے لیے اجتماعی و معاشرتی زندگی ناگزیر ہے۔

تیسرا مرحلہ:۔ یہ تضاد و تصادم کا مرحلہ ہے اور معاشرتی زندگی میں اس سے بچا نہیں جا سکتا۔ اختلافات پیدا ہوتے ہیں اور نوع انسانی کے لیے انبیاء کے قوانین اور تعلیمات کی تشنگی محسوس ہوتی ہے۔

چوتھا مرحلہ:۔ اس مرحلے میں انبیاء خدا کی طرف سے نجات بشر کے لیے مامور کئے جاتے ہیں۔ افکار اور قلوب کو آمادہ کرنے کے لیے سب سے پہلے بشارت و نذارت کا پروگرام پیش کیا جاتا ہے (یہ نیکوکاروں کو جزا کی بشارت دینے اور بدکاروں کو سزا سے ڈرانے کا پروگرام ہے) حبِ ذات اور خود پرستی کے زیرِ سایہ جب انسان نے بشارت



اور نذارت کا پروگرام تسلیم کرلیا اور اس نے محسوس کرلیا کہ انبیاء کے پاس ایسی تعلیم ہے جو انسانی سرنوشت سے براہِ راست مربوط ہے تو آسمانی کتب، احکام اور قوانین نازل ہونا شروع ہوئے تاکہ تضادات اور مختلف کشمکش (جو فکری، اجتماعی، اخلاقی اور نظریاتی بنیادوں پر تھیں) ختم ہوجائیں۔

" وما اختلف فیه الا الذین اوتوه من بعد ما جاءتهم البینات بغیا."

یہ جملہ دراصل تعلیمات انبیاء کے آغاز کے بعد کے مرحلے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس میں اس اعتراض کا جواب ہے کہ اگر انبیاء فکری، اجتماعی اور عقائد کے اختلافات کے حل کے لیے آتے ہیں تو ان کے آجانے کے بعد بھی کم و بیش اختلافات کیوں باقی رہتے ہیں۔

آیت کہتی ہے کہ موجودہ اختلاف اور پہلے تضاد میں فرق ہے۔ پہلے اختلافات کا سرچشمہ جہالت، نادانی اور بے خبری تھی اور یہ وجہ بعثت انبیاء سے ختم ہوگئی۔ لیکن بعد ازاں اختلافات کی بنیاد دیگر چیزیں مثلاً "بغی" یعنی ظلم و ستم، ہٹ دھرمی وغیرہ بن گئیں جن کی وجہ سے بعض لوگوں نے اختلافی راہ پر اپنے سفر کو جاری رکھا ("من بعد ما جاءتهم البینات بغیا بینهم.")

یہاں آکر لوگ دو مختلف گروہوں میں بٹ گئے۔

مومنین ــــ جو ہدایت اور حق کی راہ پر چل کھڑے ہوئے۔ انہوں نے اپنے اختلافات کو ختم کردیا (فهدی الله الذین اٰمنوا ــــ)۔ انہوں نے حکم خدا صراطِ مستقیم کو طے کرلیا۔ لیکن ــــ

کفار ــــ جو ان کے تول اپنے اختلافات میں باقی ہیں۔

"والله یهدی من یشاء الی صراطٍ مستقیم." یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ خدا کی مشیت نیک اعمال اور لوگوں کی پاکیزگی کے مطابق ہے یعنی جو افراد حقیقت تک پہنچنا چاہتے ہیں خدا بھی انہیں راہ راست کی ہدایت کرتا ہے۔ انکی روشن فکری اور راہ راست کو پالینے کی توفیق میں اضافہ کرتا ہے اور انہیں انبیاء کی وساطت سے راہِ نجات اور راہِ راست دکھاتا ہے۔

دین اور معاشرہ

مندرجہ بالا آیت سے ضمنی طور پر یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ دین اور انسانی معاشرہ دو ایسی حقیقتیں ہیں جو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوسکتیں۔ کوئی معاشرہ مذہب اور قیامت پر ایمان رکھے بغیر صحیح زندگی نہیں گزار سکتا۔ ایسے انسانی قوانین جن کا سرچشمہ ایمان نہیں وہ فقط ذاتی ذمہ داریوں کی نشاندہی تک محدود ہیں۔ وہ انسانی وجود پر گہرا اثر مرتب نہیں کرتے۔ ایسے قوانین اختلافات اور منافع کے تضاد کو ختم نہیں کرسکتے۔ ان آخری صدیوں کی آزمائشوں میں انسانی معاشروں میں یہی حقیقت اچھی طرح ثابت ہوچکی ہے۔ ایمان سے بے بہرہ وہ دنیا جسے اصطلاح میں متمدن کہا جاتا ہے بہت سی



ایسی قباحتوں اور گناہوں کی مرتکب ہو رہی ہے جو تھوڑا بہت ایمان رکھنے والے گذشتہ پس ماندہ معاشروں میں دکھائی نہیں دیتے۔

زیر نظر آیت سے ضمناً یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ حقیقی دین و مذہب کی پیدائش انسانی پیدائش کے ساتھ ساتھ نہیں ہوئی بلکہ معاشرے کے وجود کے ساتھ حقیقی دین و مذہب بھی وجود پذیر ہوا۔ اس بناء پر اس میں کوئی تعجب نہیں کہ سب سے پہلے اولوالعزم اور صاحب دین و شریعت پیغمبر حضرت نوح علیہ السلام تھے نہ کہ حضرت آدم علیہ السلام۔

۲۱۴۔ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۭ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاۗءُ وَالضَّرَّاۗءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ○

ترجمہ

۲۱۴۔ کیا تم گمان کرتے ہو کہ تم جنت میں جاؤ گے اور تمہیں وہ حوادث پیش نہیں آئیں گے جو گذشتہ لوگوں کو درپیش ہوئے۔ وہی لوگ جنہیں دشواریاں اور تکلیفیں درپیش ہوئیں اور وہ ایسے دکھ درد میں مبتلا ہوئے کہ پیغمبر اور ان کے ساتھ اہل ایمان کہنے لگے خدا کی مدد کہاں ہے (اور سب نے اس وقت اللہ سے مدد کا تقاضا کیا لیکن ان سے کہہ دیا گیا کہ) آگاہ رہو کہ خدا کی مدد قریب ہی ہے۔

شان نزول

بعض مفسرین کہتے ہیں جنگ احزاب میں جب مسلمانوں پر ڈر اور شدید خوف غالب آیا اور وہ محاصرے میں آگئے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ اس میں انہیں صبر و استقامت کی دعوت دی گئی اور نصرت و مدد کا وعدہ کیا گیا۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ جنگ احد میں جب مسلمان شکست کھا گئے تو عبداللہ ابن ابی نے ان سے کہا کہ کب تک اپنے آپ کو قتل کرواتے رہو گے اگر محمدؐ پیغمبر ہوتا تو خدا اس کے اصحاب و انصار کو قید و بند اور قتل میں گرفتار نہ کرتا۔ اس موقع پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی۔

تفسیر

سخت حوادث خدائی سنت ہیں

مندرجہ بالا آیت سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مومنین کا ایک گروہ یہ سمجھتا تھا کہ جنت میں داخل ہونے کا



حقیقی عامل اور سبب یہ ہے کہ خدا پر ایمان کا صرف اظہار کر دیا جائے اور اس کے بعد انہیں کسی قسم کی تکلیف، زحمت اور رنج والم اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ اُن کی کوششوں کے بغیر ہی خدا اُن کے امور کو راہ پر ڈال دے گا اور اُن کے دشمنوں کو نابود کر دے گا۔

اس غلط طرزِ فکر کے مقابلے میں قرآن حقیقی سنت اور خدا کی دائمی روش کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ قرآن کے مطابق تمام مومنین کو راہِ ایمان میں پیش رفت کے لیے مشکلات اور تکالیف کا استقبال کرنا پڑے گا۔ اس راہ میں فداکاری کرنا پڑے گی۔ یہ مشکلات تو دراصل آزمائش اور امتحان ہیں۔ ان کے ذریعے حقیقی اور غیر حقیقی ایمان میں امتیاز پیدا ہوتا ہے۔ قرآن اس حقیقت کی بھی تصریح کرتا ہے کہ یہ آزمائشیں اور مشکلات عمومی قوانین کے تحت ہیں اسی بناء پر گذشتہ اُمتیں بھی ان سے دوچار ہوئیں۔

مثلاً فرعونیوں کے استعمار سے نجات کے لیے بنی اسرائیل کو خاص طور پر مصر سے نکلنا پڑا۔ وہ دریا اور لشکرِ فرعون کے درمیان گھِر گئے تھے جس کی وجہ سے وہ بہت سی مشکلات اور مصائب میں گرفتار ہوئے۔ یہاں تک کہ ان میں سے بہت سے تو اپنے ہاتھ پاؤں گنوا بیٹھے۔ لیکن سخت لمحات میں خدا کا لطف اُن کے شاملِ حال ہوا انہیں دشمنوں پر کامیابی نصیب ہوئی۔ یہ بات بنی اسرائیل سے مخصوص نہ تھی مندرجہ بالا آیت میں الذین خلوا من قبلکم (وہ جو تم سے پہلے گزرے ہیں) کے الفاظ اسی امر کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے سب کی سرنوشت ایک جیسی تھی۔ گویا یہ ایک سنتِ الٰہی ہے جو تکامل، ارتقاء اور تربیت کی ایک رمز ہے۔ تمام امتوں کو حوادث کی سخت بھٹیوں میں ڈالا جانا چاہیئے، انہیں پگھل کر فولاد کی طرح بھٹی سے باہر آنا چاہیئے اور پھر زیادہ اہم اور سخت تر حوادث سے دوچار ہونے کے لیے تیار رہنا چاہیئے تاکہ زیادہ قابل افراد پہچانے جاسکیں اور نا اہل لوگ الگ ہو جائیں اس طرح تصفیہ و تطہیر ہو جائے۔

دوسرا نکتہ جس کی طرف یہاں توجہ دی جانا چاہیئے وہ یہ ہے کہ آیت کے مطابق گذشتہ امتوں کو شدائد اور مشکلات اس طرح گھیر لیتی تھیں کہ اہلِ ایمان اور انبیاء ہم صدا ہو کر کہتے تھے: خدا کی مدد کہاں ہے؟ واضح ہے کہ ان کی مراد بارگاہِ قدرت پر اعتراض کرنا نہ تھی بلکہ یہ تعبیر خود ایک قسم کی دعا اور تقاضا ہے۔

۲۱۵۔ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۭ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ○

ترجمہ

۲۱۵ـــ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں۔ کہہ دو کہ ہر خیر و نیکی (اور فائدہ بخش مادی و معنوی سرمایہ) جو



تم خرچ کرتے ہو وہ ماں باپ، قریبیوں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہونا چاہیئے اور جو کار خیر بھی تم کرتے ہو خدا اس سے آگاہ ہے (اور ضروری نہیں کہ اسے ظاہر کرتے پھرو اور اسے یا اُسے بتاتے پھرو)۔

شانِ نزول

عمرو بن جموح ایک بوڑھا رئیس اور دولت مند تھا۔ اس نے نبی اکرمؐ کی خدمت میں عرض کی کہ کس چیز سے اور کس کس کو صدقہ دوں۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔

تفسیر

قرآن مجید میں بہت سی آیات راہ خدا میں خرچ کرنے کے بارے میں آئی ہیں۔ پروردگار عالم مختلف طریقوں سے مسلمانوں کو خرچ کرنے اور محتاج و بے نوا لوگوں کی مدد کرنے کا شوق دلاتا ہے لیکن محل بحث آیت کی وضع کچھ اور ہی ہے۔ بعض افراد چاہتے تھے کہ انہیں معلوم ہو جائے کہ کس قسم کا مال خرچ کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا کچھ خرچ کریں۔

جواب میں اس سوال کی وضاحت کے علاوہ ایک اور اہم مسئلہ کی طرف بھی اشارہ ہوا ہے اور وہ ہے مواقع اور اشخاص جن پر خرچ کرنا چاہیئے۔ آیت کی شان نزول سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں مسئلے (کیا کچھ خرچ کریں اور کن کن پر خرچ کریں) محل سوال تھے۔

پہلے معاملے کے ذیل میں خرچ کرنے کے لیے "خیر" کا لفظ استعمال کر کے سوال کا ایک کامل، جامع اور وسیع جواب دیا گیا ہے۔ یعنی ہر قسم کا کام، سرمایہ اور موضوع جو خیر ہو اور لوگوں کے لیے سود مند ہو، خرچ کرنے کے قابل ہے۔ اس میں ہر طرح کا مادی و معنوی سرمایہ شامل ہے۔

سوال کے دوسرے رُخ کے ضمن میں یعنی کن کن پر خرچ کیا جائے فرمایا گیا ہے کہ سب سے پہلے نزدیکی رشتے داروں پر اور اُن سے بھی پہلے ماں باپ پر خرچ کیا جائے۔ اس کے بعد یتیم، مساکین اور ابنائے سبیل (وہ مسافر جو دوران سفر میں اپنا زاد راہ خرچ کر بیٹھے ہوں) پر خرچ کیا جائے۔ واضح ہے کہ نزدیکی رشتے داروں پر خرچ کرنا دیگر آثار کے علاوہ صلۂ رحمی اور رشتے ناتوں کے استحکام کا بھی باعث بنتا ہے۔

"وما تفعلوا من خير فان الله به عليم"

یہ جملہ تو گویا اس مطلب کی طرف اشارہ ہے کہ خرچ کرنے والے اس بات پر اصرار نہ کریں کہ لوگ ان کا کام جان لیں۔ کیا ہی عمدہ ہے کہ زیادہ خلوص کی بنا پر اپنی عنایات اور عطیات کو پنہاں رکھیں کیونکہ وہ ذات جو بدلہ اور ثواب دے گی ان سب چیزوں سے آگاہ ہے۔ اسی کے ہاتھ میں جزا ہے اور اسی کے پاس سب کا حساب ہے۔

۲۱۶۔ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا



شَیْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

ترجمہ

۲۱۶۔ راہِ خدا میں جہاد کرنا تم پر فرض کیا جاچکا ہے جب کہ تم اس سے اکراہ کرتے ہو اور اُسے
ناپسند کرتے ہو جب کہ اسی میں تمہاری بھلائی ہوتی ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تم جسے پسند کرتے ہو
اس میں تمہاری بُرائی ہوتی ہے اور خدا جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

تفسیر

گذشتہ آیت انفاق اور خرچ کے بارے میں تھی اور یہ آیت خون اور جان کی قربانی پیش کرنے کے بارے میں ہے فداکاری کے میدان میں یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کے دوش بدوش ہیں۔

آیت بیان کرتی ہے کہ دشمن سے جنگ کرنا تمہارے لیے حکماً ضروری ہے۔ اس عمل کا بجالانا تمہارے لیے لکھ دیا گیا ہے اور واجب قرار دے دیا گیا ہے لیکن انسان کو فطری طور پر سختی کے مواقع پر تکلیف ہوتی ہے اور وہ شدائد اور مشکلات کو پسند نہیں کرتا۔ اُس کی رغبت خوشی اور راحت و آرام کی طرف زیادہ ہوتی ہے۔ عسیٰ ان تکرھوا شیئًا وھو خیرٌ لکم یہ جملہ اسی انسانی مزاج کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ دشمن سے جنگ اور نبرد آزمائی کا نتیجہ موت، جسمانی تکلیف اور مالی نقصان ہوتا ہے۔ جنگ بدامنی اور بے آرامی کا باعث بنتی ہے اس لیے اصولی طور پر انسان کی نظر میں یہ سخت اور ناپسندیدہ ہے۔ لیکن ہمیشہ کچھ ایسے فداکار ضرور ہوتے ہیں جو مقدس مقاصد کیلئے کسی قسم کی جان کی بازی سے دریغ نہیں کرتے لیکن اکثر لوگ مذکورہ وجوہات کی بنا پر جہاد کو پسند نہیں کرتے پروردگارِ عالم قطعی لب ولہجہ میں اس طرزِ فکر کی مذمت کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ اُن کے سامنے ایک دریچۂ نہاں کھولتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم کاموں کے مصالح سے باخبر نہیں ہو۔ تمہیں یہ کیسے پتہ چلا کہ تمہاری پسندیدہ چیز کے پیچھے شر اور تمہاری ناپسندیدہ چیز کے پیچھے خیر نہیں ہے۔ خدا ہی اسرارِ مخفی سے آشنا ہے۔ البتہ مسلّم ہے کہ متقی اور زیرک لوگ (نہ کہ سطحی نظر رکھنے والے) ان احکام کے بعض اسرار سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔ یہ آیت خدا کے تکوینی اور تشریعی قوانین کی ایک بنیاد کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ان قوانین کے پیش نظر یہ آیت انسان میں انضباط اور تسلیم کی روح کی پرورش کرتی ہے۔ آیت کے مطابق انہیں یہ نہیں چاہیئے کہ انسان اپنی تشخیص و دریافت کا دار و مدار قضاوت اور فیصلے پر رکھے۔ یہ مسلّم ہے کہ انسان کا علم ہر لحاظ سے محدود اور ناچیز ہے۔ انسانی مجہولات کے مقابلے میں انسانی علم دریا کے سامنے قطرے کی طرح ہے۔ اس لیے وہ قوانین جن کا سرچشمہ علمِ الٰہی ہے اور جو ہر لحاظ سے لامتناہی ہے انسان کو اس سے کبھی روگردانی نہیں کرنی چاہیئے۔ بلکہ انسان کو جان لینا چاہیئے کہ یہ تمام قوانین اُس کے فائدے اور منفعت کے لیے ہیں چاہے وہ تشریعی قوانین و احکام ہوں جیسے جہاد اور زکوٰۃ وغیرہ یا تکوینی ہوں جو بلا اختیار زندگی میں رونما ہوتے ہیں اور ان سے بچنا ممکن نہیں جیسے موت، دوستوں اور عزیزوں کی مصیبت یا آئندہ کے اسرار کا انسان سے مخفی ہونا وغیرہ۔



۲۱۷۔ يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ ۖ قُلْ قِتَالٌ
فِيهِ كَبِيرٌ ۖ وَصَدٌّ عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَكُفْرٌ بِهِ وَالْمَسْجِدِ
الْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ عِندَ اللَّهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ
مِنَ الْقَتْلِ ۗ وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتَّىٰ يَرُدُّوكُمْ عَن
دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا ۚ وَمَن يَرْتَدِدْ مِنكُمْ عَن دِينِهِ
فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا
وَالْآخِرَةِ ۖ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ○
۲۱۸۔ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي
سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ
رَّحِيمٌ ○

ترجمہ

۲۱۷۔ ماہ حرام میں جنگ کرنے کے بارے میں تم سے سوال کیا جاتا ہے۔ کہیئے کہ اس میں جنگ کرنا بڑا (گناہ) ہے۔ لیکن راہ خدا اور دین حق سے لوگوں کو روکنا، اللہ سے کفر اختیار کرنا، مسجد الحرام کی بے حرمتی کرنا اور اس میں رہنے والوں کو نکال دینا خدا کے نزدیک اس سے بھی بڑھ کے بُرا ہے اور فتنہ برپا کرنا (اور ایسے ناساعد حالات پیدا کرنا جو لوگوں کو کفر کی طرف راغب کریں اور ایمان سے روکیں) قتل سے بدتر ہے مشرکین تم سے ہمیشہ لڑتے ہی رہتے ہیں یہاں تک کہ ان کے بس میں ہو تو تمہیں دین سے برگشتہ کردیں لیکن جو شخص دین سے پھر جائے اور حالتِ کفر میں مرجائے اُس کے (گذشتہ) تمام نیک اعمال دنیا و آخرت میں برباد ہو جائیں گے اور یہی اہل دوزخ ہیں اور اس میں سدا رہیں گے۔

۲۱۸۔ جو ایمان لے آئے ہیں، جنہوں نے ہجرت کی ہے اور راہِ خدا میں جہاد کیا ہے وہی رحمتِ خداوندی کے امیدوار ہیں اور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔



شانِ نزول

کہتے ہیں یہ آیت عبداللہ بن جحش کے سریہ[1] کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ واقعہ کچھ یوں ہے:

جنگ بدر سے پہلے پیغمبر اسلامؐ نے عبداللہ بن جحش کو بلایا۔ اُسے ایک خط دیا اور مہاجرین میں سے آٹھ آدمی اس کے ساتھ کئے۔ اُسے حکم دیا کہ دو دن راستہ چلنے کے بعد خط کو کھولنا اور اس کے مطابق عمل کرنا۔ اس نے دو دن کے سفر کے بعد خط کھولا تو اس میں لکھا تھا۔

جب خط کھولو تو نخلہ (مکہ اور طائف کے درمیان ایک جگہ) تک آگے جانا۔ وہاں قریش کے حالات پر نظر رکھنا اور جو کچھ صورتِ حال ہو ہمیں اس کی اطلاع دینا۔

عبداللہ نے اپنے ساتھیوں سے واقعہ بیان کیا اور مزید کہا کہ پیغمبرؐ نے راہ پر چلنے کے لیے تمہیں مجبور کرنے سے منع کیا ہے اس لیے جو شہادت کے لیے تیار ہے وہ میرے ساتھ آئے۔ دوسرے لوگ واپس چلے جائیں۔ سب اس کے ساتھ چل پڑے جب وہ نخلہ پہنچے تو قریش کے ایک قافلے کا سامنا ہوا۔ اس میں عمرو بن حضرمی بھی تھا۔ ماہ رجب (جو ماہِ حرام ہے) کا چونکہ آخری دن تھا اس لیے اُن پر حملہ کرنے کے سلسلے میں انہوں نے آپس میں مشورہ کیا۔

بعض کہنے لگے کہ اگر آج ہم اُن سے دستبردار رہے تو وہ حدودِ حرم میں داخل ہو جائیں گے اور پھر ہم اُن سے تعرض نہیں کر سکیں گے۔ بالآخر انہوں نے اُن پر بڑی بہادری سے حملہ کر دیا۔ عمرو بن حضرمی کو قتل کیا اور قافلہ دو قیدیوں کے ساتھ پیغمبرؐ کی خدمت میں لے آئے۔

آنحضرتؐ نے فرمایا میں نے تمہیں یہ حکم تو نہیں دیا تھا کہ حرام مہینوں میں جنگ کرو۔ آپؐ نے مالِ غنیمت اور قیدیوں میں کوئی تصرف نہ کیا۔ مجاہدین کو بڑا رنج ہوا۔ دیگر مسلمانوں نے بھی انہیں سرزنش کی۔ مشرکوں نے بھی زبانِ طعن کھولی اور کہنے لگے کہ محمدؐ نے حرام مہینوں میں جنگ، خون ریزی اور قید و بند کو حلال شمار کیا ہے۔

اِس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔ جب یہ آیت نازل ہو چکی تو عبداللہ بن جحش اور اُس کے ساتھیوں نے یہ اظہار کیا کہ اُنہوں نے اس راستے میں جہاد کا ثواب حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اُنہوں نے پیغمبرؐ سے پوچھا کیا اُنہیں مجاہدین کا اجر ملے گا، اس پر دوسری آیت نازل ہوئی۔ ("انّ الذین اٰمنوا والذین ھاجروا ....") [2]

تفسیر

جیسا کہ شانِ نزول سے ظاہر ہے یہ آیت حرام مہینوں میں جہاد کے بارے میں سوالات کا جواب ہے۔ قرآن صراحت سے حرام مہینوں میں حرمتِ جنگ کی خبر دیتا ہے اور اسے بہت بڑا گناہ شمار کرتا ہے ("قتل قتال فیہ کبیر")

---

[1] سریہ اسلامی جنگ کرنے والے اس گروہ کو کہتے ہیں جس میں خود پیغمبرؐ شریک نہ ہوں۔ بعض کے نزدیک پانچ سے تین سو افراد تک کے لشکر کو سریہ کہتے ہیں۔ توجہ رہے کہ "سریہ" "سری" سے ہے جس کا معنی ہے نفیس اور گراں بہا چیز۔ چونکہ جس لشکر کے ذمے یہ امر ہو وہ خصوصی اور منتخب ہوتا ہے لہذا اُسے یہ نام دیا گیا ہے۔ مطرزی کہتا ہے "سریہ" "سری" سے ہے اور اس کا معنی ہے رات کو چلنا۔ ایسے لشکر چونکہ عموماً رات کو چلتے تھے اسے اس لیے سریہ کہتے ہیں۔ منتقعات میں اس بات کو قبول کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "سریہ" اُس دستے کو کہتے ہیں جو رات کے وقت روانہ ہو۔

[2] سیرۃ ابن ھشام، جلد ۲، صفحہ ۲۵۲۔



لیکن قرآن تاکید کرتا ہے کہ وہ مسلمان دستہ جس نے اشتباہ سے حرام مہینے میں جنگ کی پر اعتراض کا حق اُن مشرکین کو نہیں پہنچتا جو ایسے بڑے بڑے گناہوں سے آلودہ ہیں جیسے خدا سے کفر کرنا، راہ راست کی ہدایت سے لوگوں کو روکنا، مکہ میں ٹھہرے ہوئے اور سکونت پذیر افراد کو وہاں سے نکال دینا اور خدا کے حرم امن کے احترام کو پاؤں تلے روندنا جب کہ وہاں حیوانات اور گھاس تک کو محفوظ رہنا چاہیئے۔

علاوہ ازیں مشرکین فتنہ برپا کرتے ہیں یعنی فاسد ماحول پیدا کرنے کے درپے ہیں جس میں کفر اور بت پرستی کی آمیزش ہے وہ حقیقت کے متلاشی لوگوں پر دباؤ ڈال کر انہیں دین توحید کی طرف راغب ہونے سے روکنے کا گناہ کرتے ہیں۔ ان کا یہ عمل ماہِ حرام میں جنگ کرنے سے بڑھ کر ہے (" والفتنة اکبر من القتل ")

اس کے بعد قرآن کا روئے سخن مسلمانوں کی طرف ہے۔ مسلمانوں کو مشرکوں کے پراپگنڈا سے بچانے کے لیے قرآن انہیں متنبہ کرتا ہے کہ مشرک تو ہمیشہ اس کے درپے ہیں کہ اگر ہو سکے تو تمہیں دین اسلام سے پھیر لے جائیں۔ اس سلسلے میں پیشبندی کے طور پر قرآن الزام دیتا ہے کہ جو مسلمان دین حق سے پھر گیا اور حالت کفر میں جا مرا، کفر کے سبب اُس کے تمام نیک اعمال کا اجر اس جہان میں اور اُس جہان میں باطل ہو جائے گا۔ کفر ان اعمال کو ختم کر دے گا اور انکی خاصیت کو بدل دے گا۔ اس بنا پر ایسا شخص ہمیشہ ہمیشہ کے لیے عذاب الٰہی میں مبتلا رہے گا۔

یہ آیت اس نکتے کی طرف اشارہ ہے کہ ممکن ہے بعض مجاہدین راہ خدا مطلع نہ ہونے کی بنا پر یا کافی احتیاط نہ کرنے کی وجہ سے اشتباہات کے مرتکب ہوں۔ عبداللہ بن جحش کا واقعہ اس کی نظیر ہے لیکن خدا اُن کی بڑی خدمات اور صحیح مجاہدات کی بناء پر انہیں بخش دے گا (" واللہ غفور رحیم ")

حبط، احباط اور تکفیر

۱۔ حبط —— کا معنی ہے عمل باطل اور بے اثر ہو جانا جیسا کہ قرآن میں آیا ہے:

" وحبط ما صنعوا فیھا و باطل ما کانوا یعملون "

" اُنہوں نے جو کچھ تیار کر رکھا تھا وہ باطل اور بے اثر ہو گیا۔ (ہود — ۱۶)

۲۔ احباط —— جیسا کہ متکلمین اور علماء عقائد نے کہا ہے، اس کا معنی ہے گذشتہ اعمال کا ثواب بعد کے گناہوں کی وجہ سے جاتا رہنا۔

۳۔ تکفیر —— اس کے بارے میں بھی کہا گیا ہے کہ اسکا مفہوم یہ ہے کہ گذشتہ گناہوں کی سزا نیک اعمال کے اثر سے ختم ہو جاتی ہے

کیا حبط صحیح ہے؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ کفر و ارتداد حبط عمل کا سبب ہیں۔ قرآن کی دیگر آیات اور محل بحث آیت بھی اس بات کی گواہ ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی شخص حالت کفر میں دنیا سے چل بسے تو اس کے اعمال ختم ہو جاتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کفر کا گناہ اتنا زیادہ ہے کہ گذشتہ تمام تر ثواب سے بڑھ جاتا ہے۔



اسی طرح اگر ایمان گناہوں کے بعد ہو اور آخر عمر تک باقی رہے تو گذشتہ گناہوں کو ختم کر دیتا ہے لیکن بحث اس بات پر ہے کہ وہ صاحب ایمان افراد جنہوں نے گناہ بھی کئے ہیں اور حکم خدا کی اطاعت بھی کی ہے اور بغیر توبہ کیئے دنیا سے چلے گئے ہیں اُن کے بُرے اعمال اُن کے نیک اعمال کے ثواب کو ختم کر سکتے ہیں یا نہیں ۔

اِس ضمن میں متکلمین اور علمائے عقائد کے درمیان اختلاف ہے ۔

کچھ کہتے ہیں کہ احباط باطل ہے ۔ اپنے اس نظریے پر علماء عقلی اور نقلی دونوں قسم کی دلیلوں سے استدلال کرتے ہیں

عقلی استدلال

جیسا کہ خواجہ نصیرالدین طوسی نے کتاب تجرید العقائد میں کہا ہے کہ احباط ظلم کی ایک قسم ہے ۔ کیونکہ کسی انسان کے پاس ثواب کم ہے اور گناہ زیادہ تو احباط کے بعد اس شخص کی طرح ہو جائے گا جس نے بالکل نیک کام نہ کیا ہو اور یہ اس کے لئے ایک قسم کا ظلم شمار ہوگا ۔

نقلی استدلال

قرآن مجید کی بہت سی آیات نشاندہی کرتی ہیں کہ انسان اس جہان میں اپنے ہر نیک و بد عمل کا نتیجہ دیکھے گا ۔ جب کہ مسئلہ احباط اس سے مختلف صورت پیش کرتا ہے ۔ سورہ زلزال میں آیا ہے ۔

" فمن يعمل مثقال ذرة خيرا يره ومن يعمل مثقال ذرة شرا يره ." سورة زلزال

" یعنی جو شخص جتنی مقدار نیکی یا بدی کی کرے گا اسے دیکھے گا "

دوسرا گروہ معتزلہ کا ہے ۔ یہ لوگ احباط کے قائل ہیں ۔ انہوں نے آیات قرآن سے استدلال کیا ہے ۔ سورہ جن کی آیت ۲۳ میں ہے ۔

" ومن يعص الله و رسوله فان له نار جهنم خالدين فيها ابدا ."

" جو شخص خدا اور رسول کی نافرمانی کرے گا وہ ہمیشہ کے لیے جہنم کی آگ میں معذب ہوگا ۔

ابوہاشم معتزلی نے احباط و تکفیر کو ملا کر موازنہ کیا ہے ۔ اس کے نزدیک گناہ اور ثواب کو ملا کر دیکھا جائے گا ۔ زیادہ سے کم کو تفریق کر کے باقی مقدار دیکھی جائے گی ۔ اس سلسلے میں کچھ اور نظریات بھی ہیں جن سے یہاں بحث نہیں ہو سکتی لیکن حق وہی ہے جسے علامہ مجلسی نے بحارالانوار میں اختیار کیا ہے ۔ علامہ مجلسی کہتے ہیں ۔

ثواب کا سقوط اس کفر کے ذریعے جو آخر عمر تک باقی رہے اور اس طرح سزا کا سقوط اس ایمان کے وسیلے سے جو موت تک ساتھ دے قابلِ انکار نہیں ہے ۔ بہت سی احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ بہت سے ایسے گناہ ہیں جن سے بہت سی اطاعتیں جاتی رہتی ہیں اور بہت سی اطاعتیں ایسی ہیں جو بہت سی برائیوں کو تلف کر دیتی ہیں اور اس سلسلے میں متواتر اخبار و احادیث ہیں [1]

توجہ رہے کہ سورۂ ہود کی آیت ۱۱۴ بھی اسی مفہوم پر دلالت کرتی ہے ۔ وہاں نماز کا حکم دینے کے بعد ایک قانون

---

[1] بحار، جلد ۵ جدید، ص ۳۳۲ ، ۳۳۴ ۔



کلی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ۔

"ان الحسنات یذھبن السیئات"

"نیکیاں برائیوں کو لے جاتی ہیں"

سورہ حجرات میں آیا ہے

"ولا تجھروا لہ بالقول کجھر بعضکم لبعض ان تحبط اعمالکم ......"

جیسے ایک دوسرے کو بلند آواز سے پکارتے ہو پیغمبر کو اس طرح سے آواز نہ دو ورنہ تمہارے سارے اعمال حبط ہو جائیں گے۔ (حجرات — ۲)

پیغمبر اسلام سے منقول ہے کہ آپ نے ابوذر سے فرمایا۔

"اتق اللہ حیث کنت وخالق الناس بخلق حسن واذا عملت سیئۃ فاعمل حسنۃ تمحوھا."

جہاں کہیں اور جس حال میں ہو خدا سے ڈرو اور لوگوں سے اچھے اخلاق سے پیش آؤ اور جب کبھی کوئی برا کام انجام دے بیٹھو تو بعد ازاں کوئی اچھا کام بجا لاؤ جو اُسے محو کر دے[1]

نیک اعمال بُرے اعمال کے ذریعے نابود ہو جاتے ہیں۔ اس بارے میں بھی پیشوائے اسلام سے روایات پہنچی ہیں مثلاً "ایاکم والحسد فان الحسد یأکل الحسنات کما تأکل النار الحطب"[2]

حسد سے ڈرو کیونکہ حسد نیکیوں کی اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑیوں کو کھا جاتی ہے۔

لیکن یہ تمام گناہوں اور اطاعتوں کے بارے میں کوئی قانون کلی نہیں صرف ان میں سے بعض سے مخصوص ہے اس طرح سے تمام آیات اور روایات کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

۲۱۹۔ يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۖ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا ۗ وَيَسْئَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ ۖ قُلِ الْعَفْوَ ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ۝

ترجمہ

۲۱۹۔ تم سے شراب اور قمار بازی کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ کہہ دو کہ ان میں بہت بڑا گناہ ہے (مادی نگاہ سے) لوگوں کے لیے ان میں منافع (بھی) ہیں (لیکن) ان کا گناہ ان کے نفع سے زیادہ ہے

[1] بحار، جلد ۷۱، ص ۲۴۲ [2] بحار، جلد ۷۳، ص ۲۵۵



اور تم سے سوال کرتے ہیں کہ کیا کچھ خرچ کریں ۔ کہہ دو کہ تمہاری ضرورت سے جو زیادہ ہو ۔ اس طرح خدا تمہارے لیئے آیات کو واضح کرتا ہے شاید تم فکر کرو ۔

شانِ نزول

اصحاب کا ایک گروہ پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا ۔ عرض کرنے لگا کہ شراب اور قمار کے بارے میں حکم بیان فرمایئے کیونکہ یہ عقل کو زائل اور مال کو تباہ کرنے والی چیزیں ہیں ۔ اس موقع پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی ۔

تفسیر

خمر کا معنی ہے "ڈھکنا" ۔ ہر وہ چیز جو دوسری کو چھپا دے اور مخفی کرے اسے خمار کہتے ہیں ۔ اصطلاح شریعت میں ہر بہنے والی مسکر (مست کرنے والی) چیز کو خمر کہتے ہیں ، چاہے وہ انگور سے لی جائے یا کشمش اور کھجور سے ۔ بلکہ ہر قسم کا الکحل مشروب اس کے مفہوم میں شامل ہے ۔ البتہ لفظ خمر کا استعمال مائعات مسکر (یعنی بہنے والی نشہ آور چیزوں) پر اس کے لغوی معنی کی مناسبت سے ہوتا ہے کیونکہ نشہ آور مائعات عقل پر پردہ ڈال دیتی ہیں اور اچھے برے کی تمیز ختم کر دیتی ہیں ۔

" میسر" کا مادہ ہے " یسر" اس کا معنی ہے سہل و آسان اور قمار بازی بظاہر لگتا ہے کہ اس کا حقیقی معنی سہل اور آسان ہی ہے اور چونکہ قمار باز شخص چاہتا ہے کہ مال و ثروت آسانی سے حاصل کرے اس بناء پر قمار کو بھی میسر کہا جاتا ہے

"قل فیھما اثم کبیر و منافع للناس و اثمھما اکبر من......"

خداوند کریم نے آیت کے اس حصے میں حرمت شراب کے حکم کو نرمی اور مدارات کی آمیزش سے بیان فرمایا ہے ۔ خدا اپنے پیغمبر کو حکم دیتا ہے کہ ان کے جواب میں کہو یہ دونوں بڑے گناہ ہیں اگرچہ ان میں لوگوں کے لیے منفعت بھی ہے لیکن ان کا فائدہ ان کے نقصان کی نسبت بہت ہی کم ہے اور کوئی عقلمند شخص تھوڑے سے نفع کے لیے اتنا بڑا نقصان اٹھانا گوارا نہیں کر سکتا ہے ۔

اثم کیا ہے

" اثم " اس حالت کو کہتے ہیں جو انسان کی عقل اور روح میں وجود پذیر ہوتی ہے اور اُسے نیکیوں اور کمالات تک پہنچنے سے روکتی ہے ۔ اس نکتے کے پیش نظر آیت کا معنی کچھ یوں بنتا ہے کہ شراب اور قمار کی بدولت انسانی جسم اور روح بہت زیادہ نقصانات اور ضرر کا سامنا کرتے ہیں ۔

اِن دونوں برائیوں کے نقصانات کی طرف مزید توجہ دلانے کے لیے ہم علماء نفسیات اور ڈاکٹروں کی تازہ ترین تحقیق قدرے تفصیل سے بیان کرتے ہیں ۔

الکحل کے مشروبات کے نقصانات

الکحل کا انسانی عمر پر اثر : مغرب کے ایک مشہور اسکالر کا نظریہ ہے کہ ۲۱ سے ۲۳ سالہ نوجوانوں میں شراب کے عادی ۵۱



مرنے والوں کے مقابلے میں شراب نہ پینے والوں میں سے دس افراد بھی نہیں مرتے ۔

ایک اور مشہور اسکالر نے ثابت کیا ہے کہ بیس سالہ نوجوان جن کے بارے میں توقع ہوتی ہے کہ وہ پچاس سال تک زندہ رہیں گے شراب پینے کی وجہ سے ۳۵ سال سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتے ۔

بیمہ کمپنیوں کے تجربات سے ثابت ہو چکا ہے کہ شرابیوں کی عمر دوسروں کی نسبت ۲۵ سے ۳۰ فیصد کم ہوتی ہے ۔

شماریات کے ایک ادارے کے مطابق شرابیوں کی اوسط ۳۵ سے ۵۰ سال ہے جبکہ اصول صحت کے تحت یہ اوسط ۶۰ سال سے زیادہ ہے ۔

نسل انسانی میں شراب کا اثر : انعقادِ نطفہ کے وقت مرد نشے میں ہو تو الکوحل (ALCOALISM) کی ۲۵ بیماریاں بچے کی طرف منتقل ہوتی ہیں ۔ عورت اور مرد دونوں نشے میں ہوں تو الکوحل (ALCOALISM) کی سو فیصد بیماریاں بچے میں ظاہر ہوتی ہیں ۔ اس بنا پر ضروری ہے کہ اولاد کے بارے میں شراب کے اثرات پر زیادہ توجہ دی جائے ۔

ہم یہاں کچھ مزید اعداد و شمار پیش کرتے ہیں ۔

طبیعی وقت سے پہلے پیدا ہونے والے بچوں میں ۴۵ فیصد ماں باپ دونوں کی شراب نوشی کی وجہ سے ہوتے ہیں ۳۱ فیصد باپ کی شراب نوشی کے باعث ہوتے ہیں ۔

پیدائش کے وقت زندگی کی توانائی سے عاری بچوں میں ۶ شرابی باپ کی وجہ سے اور ۴۵ شرابی ماں کی وجہ سے اس طرح ہوتے ہیں ۔

شرابی ماں کی وجہ سے ۷۵ فیصد اور شرابی باپ کی وجہ سے ۴۵ فیصد بچے کوتاہ قد پیدا ہوتے ہیں ۔

شرابی ماؤں کی وجہ سے ۷۵ فیصد اور شرابی باپوں کی وجہ سے بھی ۷۵ فیصد بچے کافی عقلی اور روحانی توانائی سے محروم ہوتے ہیں ۔

اخلاق پر شراب کے اثرات : شرابی شخص گھر والوں سے ہمدردی اور محبت کے جذبے سے عاری ہوتا ہے بیوی اور اولاد سے شرابی کی محبت کمزور ہوتی ہے ۔ بارہا دیکھا گیا ہے کہ شرابی باپ اپنی اولاد کو قتل کر دیتے ہیں ۔

شراب کے اجتماعی نقصانات : ایک انسٹیٹیوٹ کے ڈاکٹر کے مہیا کردہ اعداد و شمار کے مطابق ۱۹۶۱ میں نیویارک شہر کے شرابیوں کے اجتماعی جرائم کچھ اس طرح ہیں ۔

عام قتل	: ۵۰ فیصد
مار پیٹ اور زخمی کرنے کے جرائم	: ۷۷.۸ فیصد
جنسی جرائم	: ۸۸.۸ فیصد

اِن اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ بڑے جرائم زیادہ تر حالتِ نشہ میں انجام پاتے ہیں ۔

شراب کے اقتصادی نقصانات : روحی امراض کے ایک ڈاکٹر کا کہنا ہے :

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ حکومتیں شراب کے مالیاتی فوائد اور منافع کا حساب تو کرتی ہیں لیکن ان



اخراجات کو نظر میں نہیں رکھتیں جو شراب کے بُرے اثرات کی روک تھام پر اٹھتے ہیں۔

روحانی بیماریوں کی زیادتی، تنزل پذیر معاشرے کے نقصانات، قیمتی اوقات کا ضیاع، حالت نشہ میں ڈرائیونگ کے حادثات، پاک نسلوں کی تباہی، سستی، بے راہ روی، ثقافت و تمدن کی پسماندگی، پولیس کی زحمتیں اور پکڑ دھکڑ، شرابیوں کی اولاد کے لیے پرورش گاہیں اور ہسپتال، شراب سے متعلقہ جرائم کے لیے عدالتوں کی مصروفیات، شرابیوں کے لیے قید خانے اور شراب نوشی سے ہونے والے دیگر نقصانات کو جمع کیا جائے تو حکومتوں کو معلوم ہوگا کہ وہ آمدنی جو شراب سے ہوتی ہے ان نقصانات کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔

علاوہ ازیں شراب نوشی کے افسوسناک نتائج کا موازنہ صرف ڈالروں سے نہیں کیا جا سکتا کیونکہ عزیزوں کی موت، گھروں کی تباہی، تمناؤں کی بربادی اور صاحبان فکر انسانوں کی دماغی صلاحیتوں کا نقصان۔ یہ سب کچھ پیسے کے مدمقابل نہیں تولے جا سکتے۔

خلاصہ یہ کہ شراب کے نقصانات اتنے زیادہ ہیں کہ ایک عالم کے بقول اگر حکومتیں یہ ضمانت دیں کہ وہ میخانوں کا آدھا دروازہ بند کر دیں گی تو یہ ضمانت دی جا سکتی ہے کہ ہم آدھے ہسپتالوں اور آدھے پاگل خانوں سے بے نیاز ہو جائیں گے۔

جو کچھ کہا جا چکا ہے اس سے محل بحث آیت کا معنی اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے شراب کی تجارت میں نوع البشر کے لیے کوئی فائدہ ہو یا فرض کریں تو چند لمحوں کے لیے انسان اس کی وجہ سے اپنے غموں سے بے خبر ہو جاتا ہے تب بھی اس کا نقصان کہیں زیادہ، بہت وسیع اور اس قدر طویل ہے کہ اس کے فائدے اور نقصانات کا آپس میں موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔

قمار بازی کے بُرے اثرات

ایسے افراد بہت کم ملیں گے جو قمار بازی کے زبردست نقصانات سے بے خبر ہوں۔ وضاحت کے لیے اس منحوس کاروبار اور گھروں کی بربادی کے باعث کام، کے چند گوشوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

قمار بازی ہیجان انگیزی کا بہت بڑا ذریعہ ہے: تمام علماء نفسیات کا یہ نظریہ ہے کہ روحانی ہیجانات اور اضطراب بہت سی بیماریوں کا باعث ہیں مثلاً وٹامن کی کمی، زخم معدہ، جنون و دیوانگی، کم و بیش اعصابی و روحانی بیماریاں وغیرہ۔

یہ بیماریاں زیادہ تر ہیجان ہی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ قمار بازی ہیجان کا سب سے بڑا عامل ہے۔ یہاں تک کہ امریکہ کا ایک اسکالر کہتا ہے کہ امریکہ میں ہر سال دو ہزار افراد صرف قمار بازی کے ہیجان سے مر جاتے ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ ایک لالو اوسطاً ایک پوکر[1] باز کا دل اوسطاً ایک منٹ میں سو سے زیادہ مرتبہ دھڑکتا ہے۔ کبھی کبھی قمار بازی سے دل و دماغ پر سکتہ بھی طاری ہو جاتا ہے۔ قمار بازی یقینی طور پر جلد بڑھاپا لانے کا باعث بنتی ہے۔

علاوہ ازیں علماء کے بقول جو شخص قمار بازی میں مشغول ہے اس کا دل ہی تشنج کا شکار نہیں ہوتا بلکہ اس کے تمام اعضائے جسم سخت حالت سے دوچار ہوتے ہیں۔ اس کے دل کی حرکت بڑھ جاتی ہے۔ شوگر کا مواد اس کے خون میں

---

[1] پوکر۔ یہ قمار بازی کی ایک قسم ہے



اخراجات کو نظر میں نہیں رکھتیں جو شراب کے بُرے اثرات کی روک تھام پر اٹھتے ہیں۔

روحانی بیماریوں کی زیادتی، تنزل پذیر معاشرے کے نقصانات، قیمتی اوقات کا ضیاع، حالت نشہ میں ڈرائیونگ کے حادثات، پاک نسلوں کی تباہی، سستی، بے راہ روی، ثقافت و تمدن کی پسماندگی پولیس کی زحمتیں اور پکڑ دھکڑ، شرابیوں کی اولاد کے لیے پرورش گاہیں اور ہسپتال، شراب سے متعلق جرائم کے لیے عدالتوں کی مصروفیات، شرابیوں کے لیے قید خانے اور شراب نوشی سے ہونے والے دیگر نقصانات کو جمع کیا جائے تو حکومتوں کو معلوم ہوگا کہ وہ آمدنی جو شراب سے ہوتی ہے ان نقصانات کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔

علاوہ ازیں شراب نوشی کے افسوسناک نتائج کا موازنہ صرف ڈالروں سے نہیں کیا جاسکتا کیونکہ عزیزوں کی موت، گھروں کی تباہی، تمناؤں کی بربادی اور صاحبان فکر انسانوں کی دماغی صلاحیتوں کا نقصان۔ یہ سب کچھ پیسے کے مدمقابل نہیں لائے جاسکتے۔

خلاصہ یہ کہ شراب کے نقصانات اتنے زیادہ ہیں کہ ایک عالم کے بقول اگر حکومتیں یہ ضمانت دیں کہ وہ میخانوں کا آدھا دروازہ بند کر دیں گی تو یہ ضمانت دی جاسکتی ہے کہ ہم آدھے ہسپتالوں اور آدھے پاگل خانوں سے بے نیاز ہوجائیں گے۔

جو کچھ کہا جا چکا ہے اس سے محل بحث آیت کا معنی اچھی طرح واضح ہوجاتا ہے شراب کی تجارت میں نوع البشر کے لیے کوئی فائدہ ہو یا فرض کریں تو چند لمحوں کے لیے انسان اس کی وجہ سے اپنے غموں سے بے خبر ہوجاتا ہے تب بھی اس کا نقصان کہیں زیادہ، بہت وسیع اور اس قدر طویل ہے کہ اس کے فائدے اور نقصانات کا آپس میں موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔

قمار بازی کے بُرے اثرات

ایسے افراد بہت کم ملیں گے جو قمار بازی کے زبردست نقصانات سے بے خبر ہوں۔ وضاحت کے لیے اس منحوس کاروبار اور گھروں کی بربادی کے باعث کام کے چند گوشوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

قمار بازی ہیجان انگیزی کا بہت بڑا ذریعہ ہے: تمام علماء نفسیات کا یہ نظریہ ہے کہ روحانی ہیجانات اور اضطراب بہت سی بیماریوں کا باعث ہیں مثلاً وٹامن کی کمی، زخم معدہ، جنون و دیوانگی، کم و بیش اعصابی و روحانی بیماریاں وغیرہ۔

یہ بیماریاں زیادہ تر ہیجان ہی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ قمار بازی ہیجان کا سب سے بڑا عامل ہے۔ یہاں تک کہ امریکہ کا ایک اسکالر کہتا ہے کہ امریکہ میں ہر سال دو ہزار افراد صرف قمار بازی کے ہیجان سے مرجاتے ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ ایک لالو اوسطاً ایک پوکر[1] باز کا دل اوسطاً ایک منٹ میں سو سے زیادہ مرتبہ دھڑکتا ہے۔ کبھی کبھی قمار بازی سے دل و دماغ پر سکتہ بھی طاری ہوجاتا ہے۔ قمار بازی یقینی طور پر جلد بڑھاپا لانے کا باعث بنتی ہے۔

علاوہ ازیں علماء کے بقول جو شخص قمار بازی میں مشغول ہے اس کا دل ہی تشنج کا شکار نہیں ہوتا بلکہ اس کے تمام اعضاء جسم سخت حالت سے دوچار ہوتے ہیں۔ اس کے دل کی حرکت بڑھ جاتی ہے۔ شوگر کا مواد اس کے خون میں

---

[1] پوکر۔ یہ قمار بازی کی ایک قسم ہے



گرتا ہے، داخلی غدودوں میں خلل واقع ہوتا، چہرے کا رنگ اڑ جاتا ہے اور بھوک ختم ہوجاتی ہے۔ قماربازی کے ختم ہونے پر جب جواباز سوتا ہے تو اس کے اندر اعصابی جنگ جاری ہوتی ہے اور جسم پر بحران کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ جواری اکثر اوقات اعصاب کی تسکین اور بدن کے آرام کے لیے شراب اور دوسری نشہ آور چیزوں کا سہارا لیتا ہے اس طرح شراب اور قماربازی کے نقصانات جمع ہوکر فزوں تر ہوجاتے ہیں۔

بعض محققین کہتے ہیں کہ قمارباز ایک بیمار شخص ہے۔ یہ ہمیشہ روح کی نگرانی کا محتاج ہے۔ اُسے ہمیشہ سمجھانا چاہیئے اور نفسیاتی ذریعوں سے اسے قماربازی سے روکنے کی کوشش کرنی چاہیئے شاید اس طرح وہ اپنی اصلاح کی طرف مائل ہوسکے۔

قماربازی کا جرائم سے تعلق: عالمی اعداد و شمار کے ایک بہت بڑے ادارے نے ثابت کیا ہے کہ ۳۰ فیصد جرائم کا تعلق قماربازی سے ہے اور ۷۰ فیصد دیگر جرائم کے عوامل میں بھی یہ حصہ دار ہے۔

قماربازی کے اقتصادی نقصانات: ایک سال میں کئی ملین بلکہ کئی ارب ڈالر کی دولت دنیا میں اس راستے سے برباد ہوتی ہے۔ انسانی توانائیوں کا اس راستے میں ضیاع اس پر مستزاد ہے بلکہ یہ عمل تو دوسری مصروفیات میں سے بھی لگن اور دلچسپی چھین لیتا ہے۔ مونٹ کارلو جو دنیا میں قماربازی کا مشہور مرکز ہے کے بارے میں اخبارات میں چھپا ہے کہ ایک شخص نے ۱۹ گھنٹے میں قماربازی میں ۵۰ لاکھ تومان[1] ہارے۔ جب قمارخانے کے دروازے بند ہوتے تو وہ سیدھا جنگل کی طرف گیا اور ایک ہی گولی سے اپنا دماغ پاش پاش کرلیا۔ اس طرح اس نے خودکشی کرلی۔ نامہ نگار مزید لکھتا ہے کہ

"مونٹ کارلو کے جنگل ان پاکبازوں کی کئی خودکشیوں کے شاہد ہیں۔"

قماربازی کے اجتماعی نقصانات: بہت سے جواباز جیت بھی جاتے ہیں بعض اوقات ایک ہی گھنٹے میں دوسروں کے ہزاروں روپے اُن کی جیب میں چلے جاتے ہیں۔ نتیجتاً وہ کوئی پیداواری اور اقتصادی کام کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔ اسطرح اجتماعی پیداوار اور اقتصادی حالت لنگڑی ہوجاتی ہے۔ صحیح غور کیا جائے تو یہ واضح ہوگا کہ قمارباز اور ان کے اہل و عیال معاشرے پر بوجھ ہیں۔ وہ معاشرے کو ذرہ بھر فائدہ پہنچائے بغیر اس کی کمائی کھاتے ہیں اور کبھی ہارنے کی صورت میں جواری چوری اور ڈاکہ زنی سے اپنی ہار کی تلافی کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ قماربازی کے نقصانات اتنے زیادہ ہیں کہ بعض غیر مسلمان ملکوں کو بھی اسے قانوناً ممنوع قرار دینا پڑا اگرچہ وہاں بھی عملاً وسیع پیمانے پر جوابازی کا کاروبار جاری ہے۔

مثلاً برطانیہ نے ۱۸۵۳ میں، امریکہ نے ۱۸۵۵ میں، روس نے ۱۸۵۴ میں اور جرمنی نے ۱۸۷۳ میں قماربازی کے ممنوع ہونے کا اعلان کیا۔

اس بحث کے آخر میں بعض محققین کے پیش کردہ ذیل کے اعداد و شمار پر ایک نظر ڈالنا مفید رہے گا۔

(۱) جیب تراشی کی وارداتیں : ۹۰ فیصد

(۲) اخلاقی جرائم : ۱۰ فیصد

---

[1] تومان ایرانی کرنسی ہے (مترجم)



(۳) دنگا فساد کے واقعات : ۴۰ فیصد
(۴) جنسی جرائم : ۱۵ فیصد
(۵) طلاقیں : ۳۰ فیصد
اور (۶) خودکشی کے واقعات : ۵ فیصد ـــــ قماربازی ہی کی بدولت ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

قماربازی کی جامع تعریف کرنا چاہیں تو یوں ہوگی :

- دوسروں کے مال پر دھوکا ، فریب اور جھوٹ سے قبضے کے لیئے
- تفریح کے نام پر
- اور کبھی بلا مقصد
- مال ، عزت اور آبرو کی قربانی ۔

یہاں تک تو ہم نے شراب اور قماربازی کے ناقابلِ تلافی نقصانات بیان کیے ہیں اب ایک اور نکتے کی طرف توجہ کرنا بھی ضروری ہے اور وہ یہ کہ خداوندِ عالم نے شراب پر سرزنش کیوں رکھی ہے اور اس کے ذکر کے وقت اس کے فوائد نقصانات کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔

ہوسکتا ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ زمانہ جاہلیت میں (ہمارے زمانے کی طرح) شراب اور قماربازی بہت عام تھی اور اگر اس طرف اشارہ نہ ہوتا تو ہوسکتا ہے بعض کوتاہ نظر یہ تصور کرتے کہ مسئلے کے ایک ہی پہلو کو مدِّنظر رکھا گیا ہے۔

علاوہ ازیں انسانی افکار ہمیشہ سود وزیاں کے محور کے گرد چکر لگاتے رہتے ہیں لہٰذا عظیم اخلاقی برائیوں کے چنگل سے نجات دلانے کے لیئے بھی اس انسانی منطق سے استفادہ کیا گیا ہے۔

ضمناً محلِ بحث آیت ان ڈاکٹروں کے موقف کا جواب بھی ہے جو شراب کو بعض بیماریوں کے لیے مفید سمجھتے ہیں کیونکہ اس قسم کے اجتماعی فوائد کا اس کے نقصانات سے موازنہ نہیں کیا جاسکتا ۔ اگر وہ ایک بیماری کے لیئے مثبت اثر ہو بھی تو بہت سی بیماریوں کا سرچشمہ بھی ہوسکتی ہے۔ نیز روایات میں یہ جو آیا ہے کہ :

" خدا تعالیٰ نے شراب میں شفا نہیں رکھی"

شاید اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہو۔ " و یسئلونك ماذا ینفقون ...."

تفسیر درمنثور میں آیت کے اس حصّے کی شانِ نزول کے بارے میں ابن عباس سے منقول ہے کہ جب خدا نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ دینِ حق کی ترقی کے لیئے خرچ کرو تو بعض اصحاب و انصارِ پیغمبرؐ نے آپؐ سے پوچھا کہ ہم نہیں جانتے کہ اپنے مال میں سے کتنی مقدار خرچ کریں ۔ کیا سارے کا سارا مال خرچ کریں یا اُس کا کچھ حصّہ۔

اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور انہیں " عفو" کا حکم دیا گیا ۔ اب دیکھتے ہیں کہ عفو سے یہاں کیا مراد ہے۔

"عفو" سے کیا مراد ہے

" عفو " کے لغت میں کئی معانی بیان کیئے گئے ہیں ۔



کی اہمیت۔

اور پھر یہ مفہوم اُن کے سوال کے بھی منافی نہیں ہے۔ انہوں نے مالی امور کے بارے میں سوال کیا تھا۔ وہ بعض اوقات ایسی چیز کے بارے میں سوال کرتے تھے جس سے زیادہ ضروری چیز کے بارے میں اُنہیں پوچھنا چاہیئے تھا تو قرآن سوال کے حوالے سے اُن کی آمادگی اور پذیرائی سے استفادہ کرتے ہوئے جواب میں اس چیز کا تذکرہ کرتا ہے جو اہم تر ہوتی ہے یعنی ان کے سوال سے قطع نظر کرتے ہوئے زیادہ اہم بات بیان کرتا ہے۔

یہ نظر نواز انداز قرآن ہی سے مخصوص نہیں کیونکہ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص ہم سے ایک مسئلے کے بارے میں سوال کرتا ہے جب کہ وہ اس سے اہم مسائل بھولے ہوئے ہوتا ہے تو ہم بجائے اس کے کہ آسان اور سادہ سوال کا جواب دیں۔ اس کی ضرورت کے اہم مسائل کو تفصیل سے بیان کر دیتے ہیں۔

دو قابلِ غور نکات

آیت کے آخری حصے میں ہے

"کذٰلک یبیّن اللہ لکم الأیات لعلکم تتفکرون."

"خدا اپنی آیات کو اسی طرح بیان کرتا ہے شاید تم غور وفکر کرو"

آیت کی ابتدا میں غور وفکر کی وضاحت یوں کی گئی ہے:

"فی الدنیا و الآخرۃ."

اس تعبیر سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔

پہلی یہ کہ انسان مامور ہے کہ خدا اور انبیاء کے سامنے سرِ تسلیم خم کردے اس کے باوجود اس کا فرض ہے کہ یہ اطاعت فکر و نظر سے انجام دے، نہ یہ کہ اندھا دھند اور بغیر سوچے سمجھے ان کی پیروی کرے۔ دوسرے لفظوں میں جتنا ہو سکے احکامِ الٰہی کے اسرار و رموز سے آگاہی حاصل کرے اور انہیں صحیح شعور سے بجا لائے۔

البتہ اس گفتگو کا یہ معنی نہیں ہے کہ احکامِ الٰہی کی اطاعت ان کے فلسفے کے سمجھنے سے مشروط ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ ان احکام کی اطاعت کے ساتھ ساتھ ان کی روح اور اسرار کو جاننے کی بھی کوشش کی جانی چاہیئے۔

دوسری بات یہ ہے کہ انسان کو یہ نہیں چاہیئے کہ وہ فقط عالمِ مادہ یا فقط عالمِ معنی ہی میں غور وفکر کرے، بلکہ دونوں پر غور وفکر کرے جسم کی ضروریات اور روح کے تقاضے دونوں ملحوظِ نظر رہیں دونوں کے تکامل اور پیش رفت کے وسائل کی تلاش کی جانا چاہیئے کیونکہ دُنیا و آخرت ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ ایک کی بربادی دوسرے کی ویرانی میں حصہ دار ہوتی ہے۔ رہی یہ بات کہ شراب اور قمار بازی کی حرمت کا حکم اور راہ خدا میں خرچ کرنے کی تشویق میں کیا ربط ہے ـــ تو ممکن ہے یہ اس لحاظ سے ہو:

۱۔ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے ان احکام کا فلسفہ اور ان کے اسرار انسانی فکر و نظر کو متاثر کرتے ہیں۔



۲۔ انفاق عمومی، مجموعی اور اُخروی پہلو رکھتا ہے اور شراب و قمار بازی زیادہ تر شخصی اور مادی پہلو رکھتے ہیں. لہذا ان احکام کے ذریعے انسان کو دنیا و آخرت کی فلاح کے لیئے غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے۔

۲۲۰- فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۗ وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَتَامَىٰ ۖ قُلْ إِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ۖ وَإِنْ تُخَالِطُوهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَأَعْنَتَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ○

ترجمہ

۲۲۰۔ (تاکہ) دنیا و آخرت میں (فکر کرو) اور تم سے یتیموں کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہہ دو کہ ان کے کام کی اصلاح کرنا بہتر ہے اور اگر اپنی زندگی کو ان کی زندگی میں ملا لو (تو کوئی حرج نہیں) وہ تمہارے دینی بھائی ہیں (اور ان سے ایک بھائی کا سا سلوک کرو) خدا مفسدین کو مصلحین میں سے پہچانتا ہے اور اگر خدا چاہے تو تمہیں زحمت و تکلیف میں ڈال دے (اور حکم دے دے کہ یتیموں کی سرپرستی کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی اور اموال کا ملاً ان کے مال سے جدا رکھو لیکن خدا ایسا نہیں کرتا) کیونکہ وہ توانا اور حکیم ہے۔

شانِ نزول

تفسیر قمی میں امام صادقؑ اور تفسیر مجمع البیان میں ابن عباس سے منقول ہے کہ جب آیت

"وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ"

یتیم کے مال کے نزدیک بھی نہ جانا۔ مگر یہ کہ یہ اس کے حق میں بہتر ہو۔ (بنی اسرائیل۔ ۳۴)

اور آیہ

"إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا"

جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھا جاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں بس انگارے بھرتے ہیں اور عنقریب واصل جہنم ہونگے (نساء۔ ۱۰)

نازل ہوئیں کہ جن میں یتیموں کے مال و دولت کے قریب جانے سے منع کیا گیا ہے سوائے اس کے کہ اُن کے لیے مفید ہو اور اُن کا مال کھانے سے روکا گیا ہے تو جن کے گھروں میں یتیم تھے انہوں نے ان کی کفالت سے ہاتھ اٹھا لیا اور انہیں اُن کے حال پر چھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ کچھ لوگوں نے تو انہیں اپنے گھر ہی سے نکال دیا اور جنہوں نے ایسا نہ کیا اُن کے گھر میں بھی یتیموں



کی کیفیت نکالے جانے سے مختلف نہ تھی۔ اُن کے مال سے پکایا گیا کھانا اپنے کھانے سے نہ ملاتے۔ اُن کے لیے الگ کھانا پکتا۔ یتیم اپنے کمرے کے کونے میں الگ سے کھانا کھاتا۔ اس کا بچا ہوا کھانا پڑا رہتا تاکہ پھر بھوک لگنے پر اسی کو کھائے۔ در کھانا خراب ہو جاتا تو پھینک دیا جاتا۔

یہ سب اہتمام اس لیے کیا جاتا کہ کہیں مال یتیم کھانے کا جرم سرزد نہ ہو۔ یہ صورت حال سرپرستوں اور یتیموں دونوں کے لیے بہت مشکلات کا باعث تھی۔ ان حالات میں متاثر افراد پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور حضورؐ کی خدمت میں اپنے احوال پیش کیے۔ اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی۔

تفسیر

قرآن مجید یتیموں کے سرپرستوں کو حکم دیتا ہے کہ یتیموں کی سرپرستی سے دست کش ہو جانا اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دینا درست نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ اُن کی سرپرستی قبول کرلو اور ان کے کام انجام دو اور جو کام اُن کے فائدے میں ہو اور جس میں ان کی اصلاح اور بہتری سمجھو، اسے انجام دو ("قل اصلاح لھم خیر")۔

اور اگر ان کی زندگی تمہاری زندگی سے مخلوط ہو تو ان سے ایک بھائی کا سا سلوک کرو۔ جب تمہارا مقصد ان کی بھلائی ہو تو ان کے مال اور کھانا تمہارے مال اور کھانے سے مل جائے تو کوئی اشکال نہیں (و ان تخالطوھم فاخوانکم")۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے کہ خدا تمہاری نیتوں سے واقف ہے۔ بھلائی کا اظہار صحت عمل کی دلیل نہیں بلکہ حقیقت میں اصلاح طلب ہو، تمہاری نیت یتیموں کی خدمت کرنا ہو ("واللہ یعلم المفسد من المصلح")

آیت کے آخر میں فرماتا ہے: خداوند عالم اگر چاہے تو تم پر معاملہ سخت کر سکتا ہے اور یتیموں کی سرپرستی کو لازمی قرار دینے کے باوجود تمہیں اپنے مال اور کھانے کو ان کے مال اور کھانے سے الگ رکھنے کا حکم دے سکتا ہے لیکن وہ قادر بھی ہے اور حکیم و دانا بھی ہے، کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنے بندوں پر سخت گیری کرے۔ ("ولو شاء اللہ لاعنتکم ان اللہ عزیز حکیم")۔

۲۲۱۔ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ۚ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ۚ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ۚ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۖ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ



وَالْمَغْفِرَةِ بِإِذْنِهِ ۖ وَيُبَيِّنُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ
يَتَذَكَّرُونَ ۝

ترجمہ

۲۲۱ ۔ مشرک اور بُت پرست عورتیں جب تک ایمان نہ لے آئیں اُن سے نکاح نہ کرو (اگرچہ تمہیں کنیزوں ہی سے رشتہ تزویج کیوں نہ قائم کرنا پڑے کیونکہ) ایماندار کنیزیں آزاد بُت پرست عورت سے بہتر ہیں اگرچہ ان کی زیبائی ، دولت ، شخصیت اور وقعت، تمہیں بھلی معلوم ہوتی ہو اور اپنی عورتیں بُت پرست مردوں سے نہ بیاہو جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں (اگرچہ تمہیں مجبوراً ایماندار غلاموں سے ہی کیوں نہ بیاہنا پڑیں کیونکہ) ایک صاحب ایمان غلام ایک بُت پرست مرد سے بہتر ہے اگرچہ (مال و مقام اور حسن و زیبائی میں) وہ تمہیں اچھا لگے ۔ وہ تو آگ کو دعوت دیتے ہیں جب کہ خدا جنت اور اپنے حکم کے ذریعے بخشش کی دعوت دیتا ہے اور اپنی آیات لوگوں کے لیے واضح کرتا ہے کہ شاید وہ یاد رکھیں ۔

شان نزول

"مرثد" جو ایک بہادر انسان تھا پیغمبر اکرمؐ نے اسے مدینے سے مکے کی طرف بھیجا اور حکم دیا کہ وہاں پر موجود مسلمانوں کی ایک جماعت کو ساتھ لے آئے ۔ وہ فرمانِ پیغمبرؐ کی انجام دہی کے لیے مکہ پہنچا ۔ وہاں اس کی ملاقات ایک خوبصورت عورت 'عناق' سے ہوگئی ۔ اسے وہ زمانہ جاہلیت سے پہچانتا تھا ۔ اس عورت نے گذشتہ زمانے کی طرح اسے گناہ کی دعوت دی لیکن مرثد چونکہ مسلمان ہو چکا تھا ، اس کی خواہش کو قبول نہ کر سکا ۔ اُس عورت نے نکاح کا تقاضا کیا تو مرثد نے کہا کہ یہ معاملہ پیغمبر اکرمؐ کی اجازت پر موقوف ہے ۔ وہ اپنی ڈیوٹی ادا کر کے مدینے پلٹ آیا اور وہ واقعہ آنحضرتؐ کے گوش گزار کیا ۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں بیان کیا گیا ہے کہ مشرک اور بت پرست عورتیں مسلمان مردوں کی ہمسری اور تزویج کے لائق نہیں ۔

تفسیر

لفظ "نکاح" لغت میں جنسی ملاپ اور عقد ازدواج دونوں معنی میں بیان کیا گیا ہے ۔ یہاں عقد ازدواج ہی مراد ہے ۔ اسلام کی نظر میں ازدواجی زندگی کی بہت اہمیت ہے یہی وجہ ہے کہ وراثت کے معاملات اور گھر کے تربیتی ماحول کے اولاد پر اثرات کے پیش نظر اسلام نے بیوی یا شوہر کے انتخاب میں مختلف شرائط معین کی ہیں ۔ مشرک عورت مسلمان مرد کی کفو اور بیوی بننے کے اہل نہیں اور بالفرض وہ بیوی بن جائے تو بچے اُس کے خیالات اور صفات بھی وراثت میں حاصل کریں گے اور اُسی کی گود میں تربیت پائیں گے (جیسا کہ اکثر ہوتا ہے) تو ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ بُرا ہی نکلے گا ۔ لہٰذا قرآن اِس آیت میں مشرک اور بُت پرست عورتوں سے شادی کرنے سے منع کرتا ہے ۔ اِس سے قطع نظر ایک پہلو یہ بھی ہے مشرکین اسلام سے بیگانہ ہوتے ہیں اگر وہ شادی کے ذریعے مسلمانوں کے گھروں میں راہ و رسم



پیدا کرلیں تو اسلامی معاشرہ ہرج ومرج اور داخلی دشمنوں کا شکار ہو جائے گا۔ اس طرح کفر و اسلام کی صفیں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکیں گی۔ قرآن تو مشرک عورتوں کو صاحب ایمان کنیزوں کا ہم پلہ بھی قرار نہیں دیتا لیکن قرآن نے اُن کے لیے دروازہ بند بھی نہیں کیا۔ اُن سے جنسی تعلق کے قیام کی صورت وہ یہ بتاتا ہے کہ اگر وہ ایمان لے آئیں تو اُن سے شادی بیاہ ہو سکتا ہے۔

مشرکین کون ہیں

قرآن میں "مشرکین" کا لفظ زیادہ تر بت پرستوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ لہٰذا جہاں کہیں یہ لفظ آئے۔ یہ تو مسلم ہے کہ اس کے مفہوم میں بت پرست ضرور شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کی بہت سی آیات میں مشرکین کا لفظ اہل کتاب (یہود۔ نصاریٰ اور مجوس) کے مقابلے میں آیا ہے۔

بعض مفسرین کا اعتقاد ہے کہ مشرک کے مفہوم میں یہود۔ نصاریٰ اور مجوس سمیت سب کفار شامل ہیں کیونکہ ان میں سے ہر فریق خدا کے شریک کا قائل ہے۔ نصاریٰ تثلیث کے قائل ہیں، مجوس ثنویت یا دوگانہ پرستی پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ اور یہودی عزیر کو خدا کا بیٹا سمجھتے ہیں۔

یہ عقائد اگرچہ شرک آور ہیں لیکن اس طرف دیکھتے ہوئے کہ قرآن کی بہت سی آیات میں مشرک، اہل کتاب کے مقابلے میں آیا ہے، قرآنی اصطلاح میں اس کا مفہوم بت پرست ہی نکلتا ہے۔

پیغمبر اسلامؐ سے منقول ایک مشہور حدیث ہے۔ اس میں آپؐ نے اپنی وصیتوں میں فرمایا ہے کہ مشرکین کو حتمی طور جزیرۃ العرب سے نکال دو۔ اس میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہے کیونکہ یہ مسلم ہے کہ اہل کتاب جزیرۃ العرب سے نہیں نکالے گئے اور وہ جزیہ ادا کرکے ایک مذہبی اقلیت کے طور پر اسلام کی پناہ میں زندگی بسر کرتے رہے۔

اس بناء پر مندرجہ بالا آیت میں اہل کتاب شامل نہیں ہیں۔

"و لا تنکحوا المشرکین حتّیٰ یؤمنوا و لعبد مؤمن خیر من مشرک و لو اعجبکم"

جس طرح مومن مردوں کو مشرک اور بت پرست عورتوں سے شادی کرنے سے منع کیا گیا ہے اس جملے میں کافر اور مشرک مردوں سے مسلمان عورتیں بیاہنے سے روکا گیا ہے۔ نیز جس طرح مومن کنیزیں کافر آزاد عورتوں سے شادی کی نسبت بہتر ہیں چاہے کافر عورتیں حسن و جمال اور مال و منال میں بالاتر ہی کیوں نہ ہوں اسی طرح صاحب ایمان غلام، خوبصورت اور بظاہر باحیثیت کافروں سے برتر اور بہتر ہیں لیکن مومن عورتوں کی شادی کافر مردوں سے اس وقت تک منع ہے جب تک وہ کافر ہیں اور اگر وہ ایمان قبول کرلیں تو اُن سے شادی کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔ یہ بازگشت کا ایک راستہ ہے جس کی طرف آیت کی ابتداء میں بھی اشارہ ہوا ہے۔

"اولٰئک یدعون الی النار واللہ یدعوا الی الجنۃ والمغفرۃ باذنہ"



اس جملے میں اہلِ ایمان کی مشرک اور بُت پرستوں سے شادی کرنے کی حُرمت کی وجہ بیان کی گئی ہے۔ وہ یہ کہ مشرک سے شادی کرنا اس لیے حرام ہے کہ مشرک انسان اپنے ساتھی کو بت پرستی اور ایسی ناپسندیدہ صفات کی دعوت دیتا ہے جن کا سرچشمہ بُت پرستی ہے خصوصاً بت پرست سے یہ معاشرت زنا کے حوالے سے بہت خطرناک ہے اور اس کے اثرات بہت زیادہ اور بہت گہرے ہیں۔ گویا بت پرست سے معاشرت کا انجام غضبِ خدا کی آگ کے سوا کچھ نہیں۔ خلاصہ یہ کہ بت پرستوں سے آشنائی خصوصاً شادی بیاہ کے دریچے سے خدا سے ناآشنائی کے مترادف ہے اور اُن سے نزدیکی خدا سے دُوری کا باعث ہے جب کہ مومنین اپنے ایمان اور سرچشمۂ ایمان سے پھوٹنے والی بلند صفات کی بدولت اپنے ساتھیوں کو ایمان اور فضیلت کی دعوت دیتے ہیں جس کا انجام جنت، مغفرت اور خدا کی بخشش ہے۔

مومنین کا رابطہ چونکہ خدا سے بہت گہرا ہے اس لیے آیت میں خدا نے مومنین کی بجائے اپنا نام لیا ہے۔ فرماتا ہے:

"واللّٰہ یدعوا الی الجنۃ والمغفرۃ باذنہ"

ممکن ہے خدا کی دعوت سے مراد بت پرستوں سے شادی کی حُرمت کا حکم ہی ہو، جس کا نتیجہ جنت اور خدا کی مغفرت ہے اور اس میں بھی کوئی مانع نہیں کہ آیت دونوں مفاہیم کی حامل ہو۔

۲۲۲۔ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ۭ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَاۗءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْھُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْھُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّـوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ○

۲۲۳۔ نِسَاۗؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۠ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۡ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ○

ترجمہ

۲۲۲۔ اور تم سے خونِ حیض کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دو کہ وہ نقصان دہ اور ناپاکی کی ایک حالت ہے۔ لہٰذا ماہواری کے دوران میں عورتوں سے کنارہ کشی اختیار کرو (اور ان سے ہم بستری نہ کرو)۔ جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں اُن کے قریب نہ جاؤ اور جب وہ پاکیزہ ہو جائیں تو جس راہ سے خدا نے تمہیں حکم دیا ہے اُن سے ملاپ کرو۔ خدا توبہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے اور پاک رہنے والوں کو بھی خدا دوست رکھتا ہے۔



۲۲۳۔ تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں۔ جب چاہو تم اُن سے ملاپ کرو لیکن کوشش کرو کہ اس طبیعی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نیک اولاد کی پرورش کرو، اِس طرح نیک تاثیر) اپنے لیے آگے بھیجو۔ خدا سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ اُس سے ملاقات ضرور ہونا ہے اور مومنین کو رحمت کی بشارت دو۔

شانِ نزول

عورتیں ہر ماہ میں کم از کم تین اور زیادہ سے زیادہ دس دن نماز، روزہ سے فارغ رہتی ہیں۔ ان دنوں میں فقہی کتب میں درج مخصوص اوصاف کا خون رحمِ عورت سے خارج ہوتا ہے۔ اس حالت میں عورت کو حائض کہتے ہیں اور اس خون کو خونِ حیض کہا جاتا ہے۔ یہود و نصاریٰ کا موجودہ دین حائض عورتوں سے مباشرت کے بارے میں ایک دوسرے سے متضاد احکام رکھتا ہے۔ یہ صورت ہر شخص کو سوال کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

یہودیوں کا ایک گروہ کہتا ہے کہ ایسی عورتوں کے ساتھ مردوں کا رہنا سہنا ہی بالکل حرام ہے۔ یہاں تک کہ ایک دسترخوان پر کھانے اور ایک کمرے میں رہنے تک کی اجازت نہیں ہے۔ ان کے مطابق جس جگہ حیض والی عورت بیٹھی ہو وہاں مرد کو نہیں بیٹھنا چاہیئے اور بیٹھ جائے تو اپنا لباس دھوئے ورنہ وہ نجس ہے اور اگر اس کے بستر پر سو جائے تو لباس بھی دھوئے اور غسل بھی کرے۔ خلاصہ یہ کہ ان ایام میں عورت کو ایک ناپاک شے اور لازم الاجتناب وجود سمجھا جاتا ہے۔

یہودیوں کے اس گروہ کے برعکس عیسائی کہتے ہیں کہ عورت کی حالتِ حیض اور غیر حیض میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں۔ حالتِ حیض میں بھی ان سے ہر طرح کی معاشرت، میل جول یہاں تک جنسی ملاپ پر بھی کوئی قدغن نہیں۔

مشرکینِ عرب، خصوصاً اہلِ مدینہ کم و بیش یہودیوں کے اخلاق و عادات سے مانوس تھے اور حائض عورتوں سے یہودیوں کا سا سلوک روا رکھتے تھے۔ ماہواری کے دنوں میں ان سے الگ رہتے تھے۔

اسی دینی اختلاف اور ناقابلِ معافی افراط و تفریط کے باعث بعض مسلمانوں نے پیغمبر اکرمؐ سے اس بارے میں سوال کیا اور جواب میں یہ آیت نازل ہوئی۔

تفسیر

ماہواری میں جنسی ملاپ کے نقصانات

"یسئلونک عن المحیض قل ھو اذی"۔

"محیض" مصدر میمی ہے اور یہاں حیض کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس لیے اِس کا مفہوم یہ ہوگا "اے پیغمبر! تم سے حیض اور اس کے احکام کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ ان کے جواب میں کہو "ھو اذی" یعنی وہ تکلیف دہ اور ناپاک چیز ہے۔ درحقیقت یہ جملہ ماہواری میں عورت سے جنسی ملاپ کے اجتناب کے حکم کا فلسفہ بیان کرتا ہے کیونکہ اس حالت میں عورتوں سے جنسی ملاپ تنفر کا باعث ہونے کے علاوہ بہت سے نقصانات کا بھی سبب بنتا ہے۔ ان نقصانات کو آج کی میڈیکل کی دنیا نے بھی ثابت کر دیا ہے۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں۔



۱ مرد اور عورت دونوں کا بانجھ ہونا

۲ آتشک اور سوزاک جیسی آمیزشی بیماریوں کے جراثیم کا پروان چڑھنا

۳ عورت کے تناسلی اعضا کی زبردست گرمی اور موادِ حیض کا مرد کے عضوِ تناسل میں داخل ہونا جب کہ یہ مواد بدن کے داخلی جراثیموں سے بھرا ہوتا ہے۔

اِن کے علاوہ بھی بہت سی بیماریاں اِس طرح سے پیدا ہوتی ہیں جن کی تفصیلات میڈیکل کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہیں انہی وجوہ کی بنیاد پر ڈاکٹر حائض عورتوں سے جنسی ملاپ سے منع کرتے ہیں۔

خونِ حیض کے دنوں میں رحم کی رگیں کھل جاتی ہیں اور اُن کا پانی بھی پتلا ہو جاتا ہے۔ اس عمل میں بچہ دانی بھی رحم کی رگوں سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔

تقریباً ماہواری کے آغاز پر ہی عورت کا نطفہ (OVUM) شیپور نالی (FALLOPIAN TUBE) سے گزر کر رحم میں داخل ہوتا ہے تاکہ مرد کا نطفہ داخل ہو تو ان کے اشتراک سے بچہ پیدا ہو سکے۔

مذکورہ خون کا ترشح ابتداء میں غیر منظم اور بے رنگ ہوتا ہے لیکن بہت جلد وہ منظم اور سرخ رنگ ہو جاتا ہے۔ آخر میں یہ پھر کم رنگ اور غیر مرتب ہوتا جاتا ہے[1]

اصولی طور پر ماہانہ عادت کے وقت نکلنے والا خون ہر ماہ رحم کی داخلی رگوں میں احتمالی بچے کی غذا کے لیے جمع ہو جاتا ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہر ماہ عورت کے رحم میں ایک چھوٹا سا انڈہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ رحم کی داخلی رگیں آمادگی کی حالت میں نطفہ کی غذا کے لیے خون سے پر ہو جاتی ہیں۔ اس وقت جب کہ انڈہ شیپور نالی سے گزر کر رحم میں داخل ہوتا ہے اگر اسپر ماٹوزئیڈ[2] یعنی مرد کا نطفہ موجود ہو تو بچہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہاں رگوں میں موجود خون اُس کی غذا میں صرف ہونے لگ جاتا ہے اگر ایسا نہ ہو تو رحم کا پانی پتلا ہونے لگتا ہے، رحم کی رگیں کھل جاتی ہیں اور وہاں موجود خون، خونِ حیض کی صورت میں خارج ہو جاتا ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان ایام میں جنسی ملاپ کیوں نقصان دہ اور ممنوع ہے۔ کیونکہ اس خون کے اخراج کی حالت میں عورت کے رحم میں نطفہ قبول کرنے کے لیے کوئی طبیعی آمادگی نہیں ہوتی اور اسی بناء پر اس سے تکلیف ہوتی ہے۔

"فاعتزلوا النساء فی المحیض و لا تقربوهن"

اِس آیت کا پہلا حصہ جس میں حائض عورتوں سے علیحدگی اعتزال اور جنسی رابطے سے ممانعت ہے۔ پہلی نظر میں یہودی مذہب کے موجودہ احکام سے شباہت رکھتا ہے لیکن "فاذا تطهرن فأتوهن من حيث امركم الله" کے قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ کنارہ کشی سے مراد فقط جنسی ملاپ ہے کیونکہ اس حصے میں خونِ حیض پاک ہونے کے بعد عورتوں سے جنسی ملاپ کی اجازت دی گئی ہے۔

دیکھا جائے تو اسلام عورتوں کی ماہواری کے معاملے میں درمیانی راہ اختیار کرتا ہے۔ اسی طرح ہر مقام پر اسلام کی راہ اور روش اعتدال پر مبنی ہے۔ اسلام افراط و تفریط سے پاک ہے۔ یہاں بھی یہودیوں کی تندروی پر اسلام نے گرفت کی ہے۔

---

[1] اعجاز قرآن ص۵۵، ص۵۶ [2] SPERMATZIOD



اسلام کے مطابق ماہواری کے عالم میں عورتوں سے معاشرت، میل جول اور نشست و برخاست میں کوئی مضائقہ نہیں۔ فقط جنسی ملاپ کی ممانعت ہے۔ اسلام نے اس موقع پر عیسائیوں کے طرزِ عمل کو بھی اختیار نہیں کیا جن کے نزدیک حیض اور غیر حیض ہر حالت میں عورتوں سے یکساں قسم کے تعلقات رکھنے کی کھلی چھٹی ہے۔ اس طرح اسلام نے عورت کے احترام، اس کی شخصیت کی حفاظت اور اسے حقیر نہ سمجھنے اور دونوں کی صحت کے ضمن میں نقصان دہ امور سے بچنے کے لیئے تدابیر اختیار کی ہیں۔

جنسی ملاپ کی اجازت

"فاذا تطهرن فاتوهن من حيث امركم الله."

جب وہ پاک ہو جائیں تو جس راہ سے خدا نے حکم دیا ہے اُن سے ملاپ کرو

آیت کا یہ حصہ حقیقت میں عورتوں سے جوازِ مباشرت کی وضاحت کے لیے ہے "اذا تطهرن" سے معلوم ہوتا ہے کہ ماہواری سے پاک ہو جانے پر ہی عورتوں سے مباشرت جائز ہے کیونکہ یہ جملہ خونِ حیض کو آلودگی قرار دینے کے بعد آیا ہے یعنی جب وہ اِس ناپاکی اور آلودگی سے پاک ہو جائیں تو حکمِ امتناعی ختم ہو جاتا ہے۔ "تطهرن" کا مفہوم ظاہراً عورتوں کا غسل کر لینا نہیں لیا جا سکتا کیونکہ آیت کی ابتداء میں وجوبِ غسل کے سلسلے میں کوئی بات نہیں کی گئی۔

دوسرے لفظوں میں حتّٰى يطهرن جو اس سے پہلے آیا ہے کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ ممنوعیت عورت کی ناپاکی کے زمانے میں ہے یعنی پاک ہونے کے بعد یہ ممنوعیت برطرف ہو جاتی ہے۔ یہی مفہوم ہمارے بزرگ فقہاء نے فقہی مسائل میں لیا ہے۔ انہوں نے فتویٰ دیا ہے کہ خون سے پاک ہو جانے کے بعد غسل سے پہلے بھی جنسی ملاپ جائز ہے۔

مندرجہ بالا توضیح سے ثابت ہو چکا ہے کہ لفظ تطهرن "غسل کرنے پر دلالت نہیں کرتا جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے۔ وجوبِ غسل تو ایک دوسری دلیل کے ذریعے ثابت ہوا ہے۔

"من حيث امركم الله" اِس بعد والے حصے میں حکم دیا گیا ہے جس طریق سے خدا نے حکم دیا ہے مباشرت کرو۔ ہو سکتا ہے یہ حصہ آیت کے گذشتہ حصے کی تاکید ہو یعنی صرف عورت کے پاک ہونے کی حالت میں مجامعت کرو۔ اس کے علاوہ نہ کرو۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا زیادہ وسیع اور کلی مفہوم ہو یعنی پاک ہونے کے بعد بھی مباشرت کا عمل حکمِ پروردگار کی حدود کے اندر ہونا چاہیئے۔

ہو سکتا ہے اس فرمان میں پروردگار کا تکوینی حکم بھی شامل ہو اور تشریعی بھی کیونکہ خدا نے نوعِ انسانی کی بقاء کے لیے دو مخالف صنفوں میں ایک دوسرے کے لیے کشش رکھی ہے اس لیے جنسی ملاپ دونوں کے لیے ایک لذت رکھتا ہے لیکن مُسلّم ہے کہ درحقیقت مقصد بقاءِ نسل تھا اور کشش اور لذت تو اس مقصد کے حصول کے لیے مقدمہ اور تمہید کی حیثیت سے ہے لہٰذا لذت جنسی کا حصول بقاءِ نسل کے حوالے سے ہی ہونا چاہیئے۔ اسی بناء پر استمنا یعنی جنسی ملاپ کے علاوہ منی نکالنا اور لواطت یعنی مرد کا مرد سے بدکاری کرنا اور ایسے دیگر افعال جو اس تکوینی حکم سے انحراف قرار پاتے ہیں ممنوع ہیں کیونکہ وہ کسی طرح بھی جنسی



ملاپ کے اصلی مقصد کو پورا نہیں کرتے جب کہ اس کے علاوہ بھی ان اعمال کے شدید نقصانات ہیں ۔

"اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَ یُحِبُّ الْمُتَطَہِّرِیْنَ"

خدا توبہ کرنے والوں اور پاک بازوں کو دوست رکھتا ہے ۔

"توبہ" کا معنی ہے گناہ سے پلٹنا اور خدا کی نافرمانی سے پشیمان ہونا ۔ توبہ کے تین بنیادی ارکان ہیں ۔

۱ ۔ یہ جاننا کہ میں پہلے خدا کی نافرمانی کر چکا ہوں ۔

۲ ۔ اِس عمل پر پشیمان اور نادم ہونا ۔

۳ ۔ آئندہ اُسے ترک کرنے کا عزم بالجزم کرنا اور جو ہو چکا ہے اس کی تلافی اور ازالہ کرنا ۔

کسی شخص میں یہ کیفیت پائی جائے تو اُسے تائب کہتے ہیں اور اس کے عمل کو توبہ کہا جاتا ہے (توبہ اور اس کی شرائط کے بارے میں مزید تشریح متعلقہ آیات میں بیان کی جا چکی ہے) ۔

اِس آیت میں تطہیر سے مراد گناہ سے آلودہ نہ ہونا اور اپنے آپ کو خدا کی نافرمانی سے بچانا ہے آیت کے آخر میں اس جملے کا استعمال ہو سکتا ہے اس لیے کہ بعض لوگ اپنے کمزور مزاج پر ضبط نہ کرتے ہوئے ایامِ حیض میں عورتوں سے عدمِ مباشرت کے خدائی حکم کی خلاف ورزی کر بیٹھیں اور آلودہ گناہ ہو جائیں ، بعد ازاں اپنے اس عمل پر ان کی نظر پڑے تو وہ ناراحت اور افسردہ ہوں اور وہ اپنے تئیں غضبِ خدا کا حقدار سمجھیں تو ایسے میں یہ نہ ہو کہ اُنہیں اپنی بازگشت کا کوئی راستہ ہی سجھائی نہ دے اور وہ رحمتِ الٰہی سے مایوس ہو جائیں ، اللہ تعالیٰ متوجہ کرتا ہے کہ اگر وہ توبہ کر لیں تو کسی حد تک لطفِ خدا سے بہرہ ور ہو سکتے ہیں ۔ البتہ جو لوگ ابتداء ہی سے اپنے نفس پر ضبط برقرار رکھیں اور اس گناہ سے پاک رہیں تو اُن کے لیے پروردگار کے اس لُطف و محبت کا حصّہ زیادہ ہے ۔

نوعِ بشر کی حفاظت کا ذریعہ

"نِسَآؤُکُمْ حَرْثٌ لَّکُمْ فَاْتُوْا حَرْثَکُمْ اَنّٰی شِئْتُمْ"

اِس آیت میں عورتوں کو کھیتی سے تشبیہ دی گئی ہے ۔ ہو سکتا ہے بعض لوگوں کے نزدیک یہ تشبیہ عورتوں کے بارے میں بوجھل ہو اور وہ سوچیں کہ اسلام نے آدھی انسانیت کے لیئے یہ لفظ کیوں استعمال کیا ہے حالانکہ اس تشبیہ میں ایک باریک سا نکتہ پنہاں ہے ۔ درحقیقت قرآن چاہتا ہے کہ اس طرح سے عورت کو متعارف کروا کر انسانی معاشرے میں اُس کے وجود کی ضرورت کو اجاگر کرے اور یہ واضح کرے کہ عورت فقط آتشِ شہوت کو سرد کرنے کا ذریعہ نہیں بلکہ نوعِ بشر کی بقا کا وسیلہ ہے ۔

جیسے انسان اپنی بقاء کے لیے غذا کا محتاج ہے اور یہ احتیاج کاشتکاری اور زراعت کے بغیر پوری نہیں ہو سکتی ، اِس طرح بقاءِ نوعِ انسانی عورت کے بغیر ممکن نہیں ۔ یہ بات اُن لوگوں کے لیے ایک تنبیہ کی حیثیت رکھتی ہے جو عورت کو ایک کھلونا اور ہوس پرستی کا ہدف سمجھے بیٹھے ہیں ۔



"حرث" مصدر ہے۔ یہ "بیج ڈالنا" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ بعض اوقات زراعت کی جگہ مزرعہ کے مفہوم میں بھی بولا جاتا ہے۔

لفظ "انّی" "اسماءِ شرط" میں سے ہے اور زیادہ تر "متی" کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے اور "متی" کا معنی ہے "زمانہ" اِس صورت میں اسے "انّی زمانیہ" کہتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ "مکان" کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ سورہ آل عمران کی آیہ ۳۷ میں ہے۔

"یا مریم انّٰی لک ھٰذا قالت ھو من عند اللہ"

حضرت زکریاؑ جب مریمؑ کے پاس جاتے تو اُن کے پاس تیار شدہ کھانے دیکھتے تو پوچھتے "انّٰی لک ھٰذا" یعنی یہ کھانا تمہارے پاس کہاں سے آیا۔
جناب مریمؑ جواب دیتیں "من عند اللہ" یعنی خدا کے ہاں سے (مراد بہشتی جنت سے)۔

لفظ "انّی" اگر زمانی ہے تو عورتوں سے مباشرت کے وسیع زمانے کا مفہوم حاصل ہوگا۔ یعنی شب و روز، تمام اوقات میں اس کی اجازت دی گئی ہے اور اگر یہ مکانی ہو تو پھر مراد یہ ہوگی یہ مکان، مقام اور کیفیت تمام امور میں وسعت دی گئی ہے۔

"وقدموا لانفسکم"

یہ جملہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ جنسی ملاپ کا اصل مقصد صرف حصول لذت اور تکمیل خواہش نہیں بلکہ صاحب ایمان افراد کو چاہیئے کہ وہ اس عمل سے لائق اور شائستہ اولاد کے حصول کی خواہش کریں اور پھر اُس کی تربیت کی ذمہ داری پوری کریں اور اس مقدس تربیتی خدمت کو ایک معنوی سرمائے کے طور پر اپنے کل کے لیئے آگے بھیجیں۔ اس لیے قرآن تنبیہ کرتا ہے کہ بیوی کے انتخاب میں ایسے اصول پیش نظر رکھیں جن کا نتیجہ اچھی اولاد کی پرورش اور عظیم اجتماعی و انسانی سرمائے کا حصول ہو۔ پیغمبر اکرمؐ سے ایک حدیث منقول ہے جس میں آپؐ نے ارشاد فرمایا ہے۔

"اذا مات الانسان انقطع عملہ الا عن ثلاث: صدقۃ جاریۃ وعلم ینتفع بہ و ولد صالح یدعو لہ"

جب اِنسان مر جاتا ہے اُس کا دفتر عمل بھی بند ہو جاتا ہے۔ مرنے کے بعد انسان اپنے لیے کوئی بچت مہیا نہیں کر سکتا البتہ تین چیزیں ایسی ہیں جو موت کے بعد بھی اُس کے لیے نتیجہ بخش ہوں گی۔

(۱) صدقہ جاریہ ، (۲) آثار علمی اور (۳) نیک اولاد کی تربیت

صدقہ جاریہ سے مراد ایسے آثار خیر ہیں جو اجتماعی فوائد کے لیئے استعمال ہوتے رہتے ہیں جیسے مسجد، مدرسہ، ہسپتال لائبریری یا ایسی دیگر چیزیں۔ آثار علمی سے مراد کتاب کی تالیف اور شاگردوں کی تربیت۔ نیک اولاد جو اپنے ماں باپ کے لیے عملی یا زبانی طور پر طلب بخشش کرے۔



" واتقوا اللہ واعلموا انکم ملاقوہ و بشر المومنین "

زیرِ نظر موضوع ــــ جنسی ملاپ ــــ چونکہ بہت ہی اہم ہے اور انسانی غرائز میں سے سب سے زیادہ پُرکشش غریزہ جنسی ہی ہے اس لیے اِس جملے کے ذریعے خدا تعالیٰ انسان کو جنسی ملاپ کے معاملے میں دقتِ نظر کی دعوت دیتا ہے اور اپنے احکام کی طرف متوجہ کرتا ہے اور فرماتا ہے " واتقوا اللہ " یعنی اللہ کی نافرمانی سے ڈرو۔

اِس کے بعد متوجہ کرتا ہے کہ تمہیں قیامت کے دن پروردگار سے ملاقات اور اپنے اعمال کے نتائج کی طرف جانا ہوگا
" واعلموا انکم ملاقوہ "

آخر میں ایمانداروں کو بشارت دیتا ہے کیونکہ صاحبان ایمان اُس کے احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کئے ہوئے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ احکام ان کی مادی اور روحانی زندگی کے لیے مفید ہیں " و بشر المومنین "

۲۲۴۔ وَلَا تَجۡعَلُوا اللّٰهَ عُرۡضَةً لِّاَيۡمَانِكُمۡ اَنۡ تَبَرُّوۡا وَتَتَّقُوۡا وَتُصۡلِحُوۡا بَيۡنَ النَّاسِ‌ؕ وَاللّٰهُ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ○

۲۲۵۔ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغۡوِ فِىۡۤ اَيۡمَانِكُمۡ وَلٰكِنۡ يُّؤَاخِذُكُمۡ بِمَا كَسَبَتۡ قُلُوۡبُكُمۡ‌ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ حَلِيۡمٌ ○

ترجمہ

۲۲۴۔ خدا کو اپنی قسموں میں نہ لاؤ۔ نیکی کرنے، تقویٰ اختیار کرنے اور لوگوں میں صُلح صفائی کے عمل میں قسمیں نہ کھاتے رہو اور خدا سننے والا جاننے والا ہے۔

۲۲۵۔ بے توجہ قسمیں کھانے پر تو خدا تمہارا مواخذہ نہیں کرے گا البتہ جو کچھ تم دل و دماغ سے کرتے ہو (اور وُہ قسمیں جو تم ارادہ اختیار سے کھاتے ہو) اُس پر ضرور باز پُرس ہوگی اور خدا بخشنے والا صاحب حلم ہے۔

شانِ نزول

پیغمبرِ اکرمؐ کے ایک صحابی عبداللہ بن رواحہ کے داماد اور بیٹی میں اختلاف ہوگیا تو اُس نے قسم کھائی کہ اُن میں صلح کے لیے وہ دخل اندازی نہیں کرے گا اور اس بارے میں کوئی قدم نہیں اٹھائے گا۔ اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور ایسی قسموں کو ممنوع اور بے بنیاد قرار دے دیا۔

تفسیر

" ایمان " " یمین " کی جمع ہے۔ اس کا معنی ہے " قسم "

" عرضۃ " کا معنی ہے کسی چیز کا معرض قرار دینا۔ مثلاً کوئی جنس بازار میں بیچنے کے لیے لاتے ہیں اور اسے معاملے کے معرض میں قرار دیتے ہیں یعنی اسے معاملے کے بیچ میں لاتے ہیں تو اُسے عُرضہ کہتے ہیں۔ بعض اوقات



موانع اور رکاوٹوں کو بھی عرضہ کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ معرض انسان میں واقع ہوتے ہیں اور انسان کے راستے میں حائل ہوتے ہیں
"عرضۃ" کے مذکورہ مفہوم کو نظر میں رکھتے ہوئے آیت کی تفسیر کچھ اس طرح ہو گی : خدا کو اپنی قسموں کے معرض میں نہ لاؤ اور ہر چھوٹے بڑے کام کے لیے قسم نہ کھاؤ۔ خدا کے نام کو معمولی نہ بنا دو۔ اہم مقاصد کے علاوہ یوں قسم کھانا غیر مناسب اور غیر مطلوب کام ہے۔ یہ بات بہت سی احادیث میں بھی بیان کی گئی۔ ان میں سے امام صادق علیہ السلام کا ایک فرمان ملاحظہ کیجئے ، آپ نے فرمایا۔

"ولا تحلفوا باللہ صادقین ولا کاذبین فانہ سبحانہ یقول
لا تجعلوا اللہ عرضۃ لایمانکم"

خدا کی قسم کبھی نہ کھانا ۔ چاہے تم سچے ہو یا جھوٹے کیونکہ خدا فرماتا ہے کہ خدا اپنی قسموں میں نہ لاؤ ۔

اس صورت میں شان نزول کے ساتھ اس کی مناسبت یوں ہو گی کہ اچھے کاموں میں بھی قسم کھانا پسندیدہ عمل نہیں ہے چہ جائیکہ انسان کسی اچھے کام مثلاً لوگوں کے درمیان صلح صفائی وغیرہ ترک کرنے کے معاملے میں قسم کھائے ۔ اس تفسیر کے مطابق "ان تبروا و تتقوا و تصلحوا بین الناس" اس طرف اشارہ ہے کہ نیک کاموں اور لوگوں کے درمیان مصالحت کرانے میں بھی قسم نہ کھاؤ ۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "عرضۃ" آیت میں رکاوٹ اور مانع کے معنی میں ہو یعنی خدا کے نام کی قسم کو نیک عمل اور لوگوں کے درمیان صلح کروانے میں رکاوٹ نہ بناؤ اور ایسی ہر قسم کی کوئی قیمت اور اعتبار نہیں ۔ شان نزول سے اس تفسیر کی مناسبت مکمل طور پر واضح ہے ۔

"لا یؤاخذکم اللہ باللغو فی ایمانکم ولکن یؤاخذکم بما
کسبت قلوبکم"

اس آیت میں اللہ تعالیٰ دو طرح کی قسموں کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔

پہلی قسم — لغو قسموں کی ہے ، جن کا کوئی اثر نہیں اور جن کی پرواہ نہیں کرنا چاہیئے ۔ یہ وہ قسمیں ہیں جو لوگ بغیر توجہ کے کھاتے ہیں ۔ بعض لوگ تکیہ کلام اور عادت کے طور پر قسمیں کھاتے ہیں ۔ ہر کام میں " لا واللہ " اور " بلیٰ واللہ " یعنی نہ بخدا اور ہاں بخدا کہتے ہیں ۔ ایسی قسمیں لغو ہیں • **لغو** لغت میں ان تمام کاموں اور باتوں کو کہتے ہیں جن کا ہدف اور مقصد معین نہ ہو یا جو قصد و ارادہ سے سرزد نہ ہوں ۔

اس لیے وہ قسمیں لغو کہلائیں گی جو انسان غضب اور غصے کی حالت میں کھاتا ہے (جب کہ حالتِ غضب میں وہ عام حالت میں نہ رہے) ۔

مندرجہ بالا آیت کے مطابق ایسی قسمیں جو قصد و ارادہ سے انجام پذیر نہ ہو ان میں مؤاخذہ نہیں ہے اور نہ وہ کوئی اثر رکھتی ہیں ۔ البتہ یہ بات اہم ہے کہ انسان کی تربیت اس طرح سے ہونا چاہیئے کہ وہ ایسی قسموں سے بھی کنارہ کش رہے ۔



دوسری قسم ــــ ان قسموں کی ہے جو قصد و ارادہ کے ماتحت ہوں اور قرآن کی تعبیر کے مطابق اس میں کسب قلبی موثر ہے۔ ایسی قسم معتبر ہے اور اس کی پابندی کرنا چاہیئے اور اس کی مخالفت نہ فقط گناہ ہے بلکہ اس کا کفارہ بھی دینا پڑتا ہے۔ مگر اس کی کچھ شرائط ہیں جن کی طرف ہم بعد میں اشارہ کریں گے۔

قسمیں ــــ جو قابلِ اعتبار نہیں

اسلام کی نظر میں قسم کھانا اصولی طور پر اچھا نہیں ہے جیسا کہ اوپر بھی بیان کیا جا چکا ہے لیکن یہ فعل حرام بھی نہیں ہے بلکہ بعض اوقات اہم مقاصد کے لیے قسم کھانا مستحب یا واجب بھی ہو جاتا ہے۔

بعض قسمیں تو اسلام کی نگاہ میں بالکل لغو اور بے اعتبار ہیں مثلاً وہ قسم جو غیر خدا کے نام کی ہو۔ ایسی قسمیں جن میں خدا کا نام نہیں ہے بالکل بے اثر ہیں اور ان کے مطابق عمل کرنا ضروری نہیں ہے۔ اسی طرح حرام یا مکروہ فعل انجام دینے کے لیے کھائی جانے والی قسمیں بھی بے اثر ہیں۔ مثلاً کوئی شخص قسم کھالے کہ وہ کسی کا قرض ادا نہیں کرے گا یا جہاد سے بھاگ جائے گا وغیرہ وغیرہ۔ اگر کوئی ایسی قسم کھائے تو اس کی پرواہ نہ کرے اور اپنی ذمہ داری پوری کرے اور اس کے ذمہ ایسی قسم کا کوئی کفارہ بھی نہیں "لا یؤاخذکم اللہ باللغو فی ایمانکم" کی تفسیر میں ایک یہی مفہوم مضمر ہے۔

ایسی قسمیں جو خدا کے نام پر کھائی جائیں اور ان کا مقصد کوئی اچھا کام ہو یا کم از کم فعل مباح ہو تو اسے پورا کرنا ضروری ہے اور اس کی مخالفت پر کفارہ دینا پڑے گا۔ سورہ مائدہ آیہ ۸۹ کے مطابق اس کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا یا انہیں لباس پہنانا یا ایک غلام آزاد کرنا ہے۔

۲۲۶۔ لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

۲۲۷۔ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○

ترجمہ

۲۲۶ ــــ جو لوگ اپنی عورتوں سے تعلق نہ رکھنے کی قسم کھاتے ہیں (یعنی ان سے جنسی ملاپ نہ کرنے کی سوگند کھاتے ہیں) وہ چار ماہ تک انتظار کا حق رکھتے ہیں (اور ان چار ماہ کے دوران میں اپنی بیوی کے ساتھ زندگی گزارنے یا اسے طلاق دینے کے بارے میں اپنا ارادہ اور کیفیت واضح کریں، اب اگر اس وقفہ میں) رجوع کر لیں (تو کوئی حرج نہیں کہ خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

۲۲۷ ــــ اور اگر علیحدگی کا مصمم ارادہ کر لیں (وہ بھی اس کی پوری شرائط کے ساتھ تو بھی حرج نہیں)



خدا سننے والا اور جاننے والا ہے ۔

تفسیر

زمانہ جاہلیت کے ایک طرز عمل کا خاتمہ

"ایلاء" وہ رسم ہے جو زمانہ جاہلیت میں میاں بیوی کے درمیان جدائی کے سلسلے میں عام تھی۔ "ایلاء" کا مفہوم ہے کہ میاں بیوی والے تعلقات ترک کرنے کی قسم کھانا حکم طلاق نازل ہونے سے پہلے نو مسلموں میں بھی یہ رسم باقی تھی ۔

زمانہ جاہلیت میں جب کوئی مرد اپنی بیوی سے متنفر ہو جاتا تو بعض اوقات قسم کھالیتا کہ وہ اس سے ہمبستری نہیں کریگا اس طرح وہ اپنی بیوی کو اپنے اس غیر انسانی سلوک سے ایک شدید عذاب میں مبتلا کر دیتا ۔ نہ رسمی طور پر طلاق دیتا کہ وہ آزادی سے اپنے لئے کسی دوسرے شوہر کا انتخاب کر کے اپنی خواہشات پوری کر سکے نہ اس قسم کے بعد وہ خود تیار ہوتا کہ اس سے صلح کر کے ایک شوہر کی طرح زندگی بسر کرے ۔

زیر نظر آیت میں اس سلسلے میں اسلام کا معین کردہ طریق کار بیان کیا گیا ہے ۔ فرمایا گیا ہے کہ شوہر کو چار ماہ کی مہلت دی جاتی ہے کہ وہ اپنی بیوی کو اس مصیبت اور عذاب سے نجات دے ۔ اس عرصے میں وہ اپنی قسم کو ترک کر دے اور اپنی بیوی کے ساتھ زندگی بسر کرے یا اُسے طلاق دے کر آزاد کر دے ۔

پہلی راہ کا انتخاب یعنی گھر کے ماحول کو خرابی سے بچانا بلا شبہ عقل و دانش کا تقاضا بھی ہے اور رضائے پروردگار کے حصول کا ذریعہ بھی ، اسی لیے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے

"فان فاءو فان اللہ غفور رحیم"

اگر اپنے ارادے کو ترک کر دیں تو خدا بخشنے والا مہربان ہے

(فان اللہ غفور رحیم) ـــ یہ جملہ دلالت کرتا ہے کہ اس قسم کو ترک کرنا کوئی گناہ نہیں ، اگرچہ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ قسم کھانا خود بھی ایک پسندیدہ عمل نہیں ہے ۔

اگر مرد علیحدگی کا ارادہ کرے اور طلاق دے دے تو اس صورت میں بخشش و مغفرت مسلّم نہیں ہے ۔ خدا جو تمام اسرار سے آگاہ ہے ، جانتا ہے کہ ہوس پرستی نے شوہر کو قانون طلاق سے غلط فائدہ اٹھانے پر ابھارا ہے یا اس کے حالات کا یہی تقاضا تھا ۔ ظاہری طلاق جاری کرنے کے بارے میں ، اس کا سبب اور محرک سب کچھ خدا کے علم میں ہے اسی لیے آیت کے آخر میں فرماتا ہے ۔

"وان عزموا الطلاق فان اللہ سمیع علیم"

اور اگر وہ طلاق ہی کا ارادہ کرلیں تو اللہ تعالیٰ سننے والا اور جاننے والا ہے ۔

توجہ رہے کہ اسلام نے " ایلاء " کو بالکل تو ختم نہیں کیا البتہ اس کے بُرے آثار کو ختم کر دیا ہے کیونکہ وہ کسی کو اجازت نہیں دیتا کہ " ایلاء " یا بیوی سے مباشرت ترک کرنے کی قسم کھانے سے وہ اپنی بیوی سے جدا ہو جائے ۔

اسلام نے ایلاء کرنے والے کے لئے مدت کا تعین اس لیے نہیں کیا کہ واقعاً قسم کھانے سے ازدواجی حقوق



میں سے کوئی حق باطل ہو جاتا ہے۔ بلکہ یہ اس لیے ہے کہ واجب شرعی ہونے کے لحاظ سے مباشرت چار ماہ میں ایک مرتبہ ضروری ہے (البتہ یہ بھی اس صورت میں ہے کہ عورت طویل مدت کی وجہ سے گناہ کا شکار نہ ہو ورنہ اس صورت کے علاوہ خصوصاً جوان عورتوں کے بارے میں کہ جہاں خطرہ ہو کہ وہ گناہ میں مبتلا ہو جائیں گی، ضروری ہے کہ عدم مباشرت کی مدت کم کر دی جائے تاکہ اس کی جنسی ضرورت پوری ہو سکے)

حکم اسلام اور دنیائے مغرب کا ایک تقابل

"ایلاء" کی رسم پر اسلام کی گرفت اور زمانہ جاہلیت کی گذشتہ تاریخ میں ایلاء کی طرح سے بدنی علیحدگی (یورپی ممالک میں جس کی تائید کی جا چکی ہے) پر نظر کی جائے تو اسلام اور قرآن میں عورت کے حقوق کی کیفیت سے کافی آگاہی ہو سکتی ہے۔

وضاحت کچھ یوں ہے کہ فرانس کے عظیم انقلاب کے بعد اہل فرانس کو طلاق کے لیے اس صورت کی بھی اجازت دی گئی تھی کہ وہ ایک دوسرے سے بدنی جدائی اختیار کر لیں اس قانون کے مطابق جو عورت مرد ایک دوسرے سے مصالحت نہیں کر سکتے تھے ان کے لیے ممکن تھا کہ وقتی طور پر ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں اور علیحدہ گھروں میں زندگی بسر کریں (البتہ روابط اور حقوق برقرار رہتے تھے صرف شوہر کے ذمے اخراجات نہ رہتے اور عزت و پذیرائی عورت کے ذمہ نہ رہتی) لیکن اس قانون کی رو سے مرد دوسری بیوی نہ کر سکتا تھا اور عورت دوسرا شوہر کرنے کی مجاز نہ تھی۔ اس جدائی کی مدت زیادہ سے زیادہ تین سال تھی۔ تین سال کے بعد میاں بیوی مجبور تھے کہ مل جل کر زندگی بسر کریں اور علیحدگی ترک کر دیں۔ اسی طرح سے زمانہ جاہلیت کا ایک طرز عمل اس معاشرے کا حصہ بن گیا۔

دنیائے مغرب نے تو اس علیحدگی کی اجازت تین سال تک کے لیے دی ہے لیکن اسلام چار ماہ سے زیادہ جدائی کی اس کیفیت کو روا نہیں جانتا (جب کہ قسم نہ بھی کھائی جائے تب بھی مباشرت میں اس مدت تک کی تاخیر مباح ہے)۔ اگر اس مدت کے اختتام پر بھی مرد ٹال مٹول سے کام لے اور اپنے پروگرام کو واضح نہ کرے تو حکومت اسلامی اسے طلب کر سکتی ہے اور مخالفت کی صورت میں اسے مجبور کر سکتی ہے کہ وہ معاملے کو طے کرے۔

۲۲۸۔ وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ



عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۗ
وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝

ترجمہ

۲۲۸۔ طلاق یافتہ عورتیں تین مرتبہ ماہواری دیکھنے (اور پاک ہونے) کا انتظار کریں (اور اس طرح عدت پوری کریں) اور اگر خدا اور روز جزا پر ایمان رکھتی ہیں تو اُن کے لیے حلال نہیں کہ جو کچھ خدا نے ان کے رحم میں پیدا کیا ہے اُسے چھپائیں اور ان کے شوہر اس مدت میں اُن کی طرف رجوع کرنے (اور ازدواجی عہد و پیمان کی نئے سرے سے بحالی کے دوسروں سے زیادہ حق دار ہیں اگر (واقعاً) وہ صلح چاہتے ہیں اور جیسے عورتوں کے کندھوں پر فرائض عائد ہیں ایسے ہی ان کے لیئے شائستہ حقوق مقرر کئے گئے ہیں اور مرد ان پر برتری رکھتے ہیں۔ اور خدا توانا اور حکیم ہے۔

تفسیر

اکثر گھریلو معاملات کی خرابی معاشرتی ڈھانچے کے لیئے ناقابل تلافی نقصانات کا باعث بنتی ہے۔ اس لیے اسلام نے ایسے قوانین اور احکام وضع کئے ہیں کہ امکان کی آخری حد تک گھریلو رشتے ٹوٹنے سے بچ جائیں۔ ایک طرف اسلام نے طلاق کو مباح اور حلال چیزوں میں سب سے زیادہ قابل نفرت قرار دیا ہے اور دوسری طرف گھریلو اختلافات کے لیے خاندانی عدالت کا تصور دیا ہے۔ یہ عدالت رشتہ داروں پر ہی مشتمل ہوتی ہے تاکہ طرفین کے قریبی رشتہ داروں کے ذریعے صلح و آشتی کی کوئی صورت نکل آئے۔ طلاق کے معاملے کو تاخیر والتوا میں ڈالنے اور اس فیصلے کو متزلزل کرنے کے لیئے "عدت" مقرر کی گئی ہے جس کی مدت "تین قرو" ہے جس کا ذکر زیر نظر آیت میں کیا گیا ہے۔

"قروء" سے کیا مراد ہے

"قروء" کا واحد ہے "قرء" یہ لفظ "ماہواری کی عادت" اور اس سے پاک ہونے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اگرچہ بہت سی روایات میں تصریح کی گئی ہے کہ "ثلاثۃ قروء" عدت کی حد ہے اور اس کا مفہوم ہے عورت کا خون حیض سے تین مرتبہ پاک ہونا، ان روایات سے قطع نظر خود اس آیت کا یہ مفہوم دو طرح سے معلوم ہوتا ہے۔

۱۔ "قرء" کی دو جمع ہیں "قروء" اور "اقراء" وہ قرء جس کی جمع قروء ہے پاک ہونے کے معنی میں ہے اور جس کی جمع "اقراء" ہے اس کا مطلب ہے "حیض"

اس لیے زیر بحث آیت میں چونکہ "قروء" آیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مراد عورت کے پاک ہونے کے دن ہیں نہ کہ حیض کے ایام۔



۲۔ لغت میں "قرو" کا اصلی معنی "طہر" اور بہ معنی پاکی سے ہی زیادہ مناسبت رکھتا ہے کیونکہ یہی وہ موقع ہے جب خون رحم میں جمع ہوجاتا ہے جب کہ عادت کے دنوں میں تو پراگندہ ہوکر باہر نکل آتا ہے۔

عدت ــــ صلح اور بازگشت کا ذریعہ ہے

بعض اوقات مختلف عوامل کی وجہ سے نفسیاتی طور پر حالات ایسے پیدا ہوجاتے ہیں کہ ایک معمولی سا اختلاف اور چھوٹی سی وجہ نزاع جذبۂ انتقام بن کر بھڑک اٹھتی ہے اور عقل و وجدان کی روشنی بجھ جاتی ہے۔ گھریلو جدائیاں زیادہ تر ایسے ہی حالات کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس کشمکش کے تھوڑی مدت بعد ہی عورت اور مرد اپنے کیئے پر پشیمان ہوجاتے ہیں خصوصاً جب وہ گھریلو نظام کی ابتری اور گوناگوں پریشانیوں کا شکار ہوتے ہیں تو ندامت محسوس کرتے ہیں۔ ایسے ہی موقع کے لیے زیر بحث آیت کہتی ہے کہ عورت کو ایک مدت تک عدت میں رہنا چاہیے اور صبر کرنا چاہئیے تاکہ یہ تیز لہریں گزر جائیں اور نزاع و کش مکش کے سیاہ بادل ان کی زندگی کے فلک سے چھٹ جائیں۔ اس سلسلے میں وہ حکم خاص طور پر اہمیت رکھتا ہے جو اسلام نے زمانۂ عدت میں عورت کو گھر سے باہر جانے پر پابندی کی صورت میں دیا ہے۔ ایسے میں جذبۂ فکر برانگیختہ ہوتا ہے اور یہ جذبہ شوہر سے عورت کے روابط کی درستی اور اصلاح میں بہت مؤثر ثابت ہوتا ہے۔ اسی لیے سورہ طلاق کی پہلی آیت میں ہے۔

"لا تخرجوهنّ من بيوتهنّ .... لا تدری لعلّ الله يحدث بعد ذٰلك امرًا"

انہیں ان کے گھروں سے نہ نکالو .... تمہیں کیا معلوم کہ شاید خدا کوئی کشائش پیدا کردے اور ان میں صلح ہوجائے۔

طلاق سے پہلے کی زندگی کی گرمئ جذبات اور شیریں لمحات کی یاد اس بات کے لیے کافی ہے کہ دلوں میں خلوص و محبت لوٹ آئے اور کمزور پڑ جانے والا دائرہ محبت قوی ہوجائے۔

عدت ــــ حفاظتِ نسل کا ذریعہ ہے

عدت کا ایک اور فلسفہ یہ ہے کہ اگر عورت حاملہ ہے تو یہ کیفیت واضح ہوجائے۔ یہ درست ہے کہ ایک مرتبہ ماہواری دیکھنے ہی سے عموماً عورت کے حاملہ نہ ہونے کا یقین ہوجاتا ہے لیکن بعض اوقات دیکھا گیا ہے کہ حاملہ ہونے کے باوجود ابتدائے حمل میں عورتوں کو خون حیض آنے لگتا ہے۔ اس لیے اس معاملے کی پوری وضاحت کے لیے حکم دیا گیا ہے کہ عورت تین مرتبہ ماہواری دیکھے اور پاک ہوجائے تاکہ حتمی طور پر پہلے شوہر سے اس کا حاملہ نہ ہونا واضح ہوجائے اور پھر وہ نئے سرے سے کہیں شادی کرسکے۔

"ولا يحلّ لهنّ ان يكتمن ما خلق الله فى ارحامهنّ"



قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ عدت کے دنوں کی ابتداء اور انتہا کس طرح معلوم کی جائے۔ اسلام نے اس معاملے میں خود عورت کی بات کو مستند قرار دیا ہے۔ اسی لیے مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"قد فوض اللہ الی النساء ثلاثۃ اشیاء الحیض و الطہر والحمل"

یعنی تین باتیں عورت پر چھوڑ دی گئی ہیں ایک ماہواری دوسرا پاکیزگی تیسرا حمل

یہ بات مندرجہ بالا آیت سے بھی ظاہر ہوتی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ عورت کے لیے جائز نہیں کہ اس حق سے غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے خلاف واقعہ بات کہے یعنی عورت کی بات مستند اور قابل قبول ہے۔

"ان یکتمن ما خلق اللہ" —— یہ جملہ دو مفاہیم دیتا ہے ایک بچے کے حمل کو چھپانا اور دوسرا ماہواری کی عادت کو پوشیدہ رکھنا یعنی اگر عورت حاملہ ہے تو اسے اپنا حمل چھپاتے ہوئے عدت کی مدت کم کرنے کے لیے یہ دعویٰ نہیں کرنا چاہیئے کہ وہ ماہواری کے ایام میں ہے (کیونکہ حاملہ عورت کی عدت تو وضع حمل ہی ہے) اور اس طرح پاک ہونے یا ماہواری کی عادت میں ہونے کے بارے میں بھی غلط بیانی سے کام نہیں لینا چاہیئے۔

"وبعولتھن احق بردھن فی ذلک ان ارادوا اصلاحاً"

جب عورت طلاق رجعی کی عدت میں ہو تو شوہر کو رجوع کرنے کا حق ہے تاکہ اگر وہ چاہے تو بلا تکلف اپنی بیوی کے ساتھ اپنی زندگی جاری رکھ سکتا ہے البتہ آیت نے "ان ارادوا اصلاحاً" کی قید لگائی ہے اور اس سے یہ حقیقت بیان کی ہے کہ حکم یک طرفہ نہ ہو۔ یعنی ایسا نہ ہو کہ مرد آزادانہ بلا شرط حق رجوع رکھتا ہو اور چاہے زمانہ جاہلیت کی طرح اپنی طاقت سے غلط فائدہ اٹھاتا رہے اور عورت پر سختی اور تکلیف روا رکھے لہٰذا یہ حق اسے اس صورت میں ہے کہ وہ واقعاً اپنے طرز و طریقے سے پشیمان ہو اور وہ واقعاً اپنی زندگی کا نئے سرے سے آغاز چاہتا ہو تب وہ اصطلاح کے مطابق رجوع کا حق رکھتا ہے، مقصد یہ ہے کہ وہ عورت کو ضرر، دکھ اور تکلیف نہ پہنچانا چاہتا ہو۔

ضمنی طور پر یہ بھی ملحوظ نظر رہنا چاہیے کہ آیت کے آخر میں جو مسئلہ رجوع بیان ہوا ہے آیت کے شروع میں بیان ہونے والے حکم عدت ہی سے مربوط ہے اگرچہ ابتداء میں یہ ایک کلی حکم نظر آتا ہے۔ اس لیے آیت صرف طلاق رجعی کے بارے میں سمجھی جائے گی اور اس کے علاوہ طلاق کے کسی طریقے کے بارے میں یہ خاموشی ہے لہٰذا یہ امر اس بات کے منافی نہیں کہ عدت اور مدت انتظار کے بارے میں جو کچھ یہاں بیان کیا گیا ہے طلاق کی کچھ اقسام اس سے مختلف بھی ہیں۔

"ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف وللرجال علیھن درجۃ"

گذشتہ مسائل کے بعد یہ جملہ عورت اور مرد کے باہمی احترام کے بارے میں ہے جسے طلاق اور عدت کے مسئلے سے بالاتر قرار دیا گیا ہے۔ اس میں شخصی اور اجتماعی حقوق کی طرف راہنمائی ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ جیسے مرد کے حقوق وضع کئے گئے ہیں تاکہ عورت ان حقوق کا احترام کرے اسی طرح عورت کے مختلف حقوق بھی مرد کے ذمہ ہیں جن کی ادائیگی کا وہ ذمہ دار ہے۔ "بالمعروف" کا لفظ اس سلسلۂ آیات میں بارہ ۱۲ مرتبہ آیا ہے یہ سب اس لیے ہے کہ کوئی اپنے حقوق سے



غلط فائدہ نہ اٹھائے ۔ عورت اور مرد دونوں کو مصلحت اندیش ہونا چاہیئے اور باہمی حقوق مناسب طریقے سے ادا کرنے چاہیئں ۔

حقوق و فرائض

قرآن یہاں پر ایک بنیادی بات بیان کر رہا ہے اور وہ یہ کہ ہر فرض اور ذمہ داری کے پہلو میں ایک حق بھی ہے یعنی ذمہ داری اور فرض کبھی حق سے جدا نہیں ہوتے ۔ مثلاً ماں باپ پر اولاد کے بارے میں کچھ فرائض اور ذمہ داریاں عائد ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ اولاد کے ذمے ان کے کچھ حقوق بھی ہوں گے ۔ اس طرح قاضی کی ذمہ داری ہے کہ وہ عدل و انصاف کو عام کرنے کی کوشش کرے ۔ اس کے بدلے قاضی کے لیے بہت سے حقوق بھی مقرر کئے گئے ہیں ۔ اس طرح انبیاء اور امتوں کا معاملہ بھی ہے زیر نظر آیت میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ جیسے عورتوں کے فرائض اور ذمہ داریاں ہیں اسی طرح اُن کے لیے کچھ حقوق بھی مقرر کیے گئے ہیں اور ان حقوق و فرائض میں مساوات کی وجہ سے ان میں "عدالت کا اجرا" عملی صورت اختیار کر سکتا ہے ۔

اسی طرح اگر کسی کے لیے کوئی حق مقرر کیا گیا ہے اُس کے مقابلے میں اُس پر فرائض بھی عائد کئے گئے ہوں گے لہٰذا کوئی ایسا شخص میسر نہیں آسکتا کہ اس کا کوئی حق ہو اور اُس کے کندھے پر کوئی فرض اور ذمہ داری نہ ہو ۔

" وللرّجال علیھنّ درجۃ واللّٰہ عزیز حکیم "

یہ جملہ گذشتہ قانون کی تکمیل کرتا ہے ۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ گذشتہ جملے میں عورت کے بارے میں قانون عدالت مرد کی طرح جاری ہے لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ مرد اور عورت تمام فرائض اور ذمہ داریوں میں اور پھر ان کے پس منظر میں تمام حقوق میں سو فیصد برابر اور ہم دوش ہوں ۔

عورت اور مرد کی جسمانی و روحانی قوت و استعداد میں جو وسیع فرق ہے اُسے مد نظر رکھتے ہوئے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے چونکہ عورت کے ذمہ ماں کا حساس فریضہ اور معاشرے کے لیے آبرو مند نسلوں کی پرورش ہے لہٰذا اُس میں احساسات و جذبات زیادہ پائے جاتے ہیں ۔ عورت میں احساسات کی اسی برتری کے پیش نظر ضروری ہے کہ بعض اجتماعی فرائض جن میں زیادہ فکری اور نظری قوت درکار ہے ان میں مرد بلند مرتبے کے حامل ہوں ۔ کیونکہ ان امور کو جذبات سے بالاتر ہونا چاہیئے ۔ حکومت، قضاوت گھریلو معاملات کی سرپرستی ایسے امور ہی کی مثالیں ہیں ۔ البتہ ان امور کی وجہ سے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں کہ بعض خواتین اپنے علم و تقویٰ کے سبب کسی مرحلے میں بہت سے مردوں سے بلند تر ہوں ۔

اگر اس پروگرام پر عمل نہ کیا جائے یعنی ہم تمام حقوق اور حالات کے بارے میں ایک ہی قسم کا حکم لاگو کرنے لگیں تو یہ " الرّجال قوامون علی النّساء " کے کلی قانون کی بھی خلاف ورزی ہوگی عدالت کے اس حکم کو " ولھنّ مثل الّذی علیھنّ " کے بھی خلاف ہوگا کیونکہ ہر شخص کو اپنا حق ملنا چاہیئے " کا مفہوم یہ ہے کہ عورت اور مرد میں سے ہر ایک اپنی مخصوص استعداد، صلاحیتوں، غرائز اور ساخت کے مطابق اپنی ذمہ داری انجام دے ۔ جو کام مرد سے نہیں ہو سکتے عورت اس کی مدد کرے اور جو کام عورت سے نہیں ہو سکتے مرد اس کی مدد کے لیے اٹھ کھڑا ہو ۔ قانون نظم کا تقاضا ہے کہ احساسات و نرم مزاجی کے



حامل افراد زیادہ فکر و نظر رکھنے والے افراد کی سرپرستی میں ہوں لہٰذا گھر کی سرپرستی مرد کے ذمے ہے اور عورت کے ذمے ہے کہ گھر کا نظام چلانے میں اس کی معاون ہو۔

عورت اور اس کے حقوق کی تاریخ

پوری تاریخِ انسانی میں عورت ایک عجیب دردناک داستان رکھتی ہے۔ عورت کی یہ داستان آج انسانی سوسائٹی کی شناخت کی اہم ترین بحث شمار ہوتی ہے۔ مجموعی طور پر عورت کی زندگی کو دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلا دور :۔ ماقبل تاریخ کا ہے جس کے متعلق آج ہمارے پاس کوئی صحیح اطلاع نہیں کہ اس زمانے میں عورت کے حالات کیا تھے ہو سکتا ہے کہ اس دور میں عورت زیادہ ترطبیعی اور فطری حقوق سے بہرہ ور ہو۔

دوسرا دور :۔ آغاز تاریخ سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور کے بعض معاشروں میں عورت تمام اقتصادی، سیاسی اور اجتماعی حقوق میں ایک غیر مستقل شخصیت کے حوالے سے پہچانی جاتی تھی۔ یہی کیفیت بعض ممالک میں آخری صدیوں تک جاری رہی۔

عورت کے بارے میں یہ طرزِ فکر فرانس کے قانون مدنی جسے ترقی یافتہ کہا جاتا ہے تک میں نظر آتا ہے۔ نمونے کے طور پر شوہر اور بیوی کے مالی روابط کے سلسلے میں بعض ضوابط کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے:

آرٹیکل نمبر ۲۱۵ اور ۲۱۷ سے ظاہر ہوتا ہے کہ شوہردار عورت اپنے شوہر کی اجازت اور دستخط کے بغیر کوئی مالی امور انجام نہیں دے سکتی اور اس کا ہر قسم کا لین دین شوہر کی اجازت کا محتاج ہے البتہ یہ اس صورت میں ہے کہ شوہر اپنے اختیار سے غلط فائدہ نہ اٹھائے اور کسی معقول سبب کے بغیر اجازت دینے سے انکار نہ کرے۔

آرٹیکل نمبر ۱۴۲۲ کے مطابق شوہر حق رکھتا ہے کہ وہ اکیلا اس مال میں جو عورت اور مرد کے درمیان مشترک ہے جیسا چاہے تصرف کرے اور اس میں عورت کی اجازت کی بھی ضرورت نہیں البتہ جو کام انتظام و اہتمام کی حدود سے خارج ہے اس میں عورت کی موافقت ضروری ہے[1]

وہ سرزمین جہاں سے اسلام کا آغاز ہوا یعنی حجاز میں بھی پیغمبرِ اسلامؐ کے ظہور سے پہلے عورت کے ساتھ ایک محکوم اور غیر مستقل انسان کا سا سلوک روا تھا۔ ان کا طرزِ عمل نیم وحشی انسانوں کا سا تھا کیونکہ عورت سے رُسوا کن مقاصد حاصل کیے جاتے تھے۔ عورت اس ماحول میں اس قدر بے ارادہ و بے اختیار تھی کہ بعض اوقات اپنے شوہر کے اخراجات کے لیے کرائے پر پیش کی جاتی تھی۔ تمدن سے محرومیت اور فقروفاقہ کی ابتلاء نے انہیں عجیب و غریب سختی اور خشونت میں مبتلا کر رکھا تھا جس کے زیرِ اثر وہ عورت کو زندہ گاڑنے کے مشہور جرم کا ارتکاب کرتے تھے۔

عورت کی زندگی میں نیا مرحلہ

ظہورِ اسلام اور اس کی مخصوص تعلیمات کے ساتھ عورت کی زندگی ایک نئے مرحلے میں داخل ہوئی جو پہلے دو مراحل سے بہت مختلف تھا۔ یہ وہ دور تھا جس میں عورت مستقل اور تمام انفرادی، اجتماعی اور انسانی حقوق سے بہرہ ور ہوئی۔ عورت

[1] حقوق زن در اسلام و اروپا



کے بارے میں اسلام کی بنیادی تعلیمات وہی ہیں جن کا تذکرہ زیر بحث آیات میں ہے۔ "ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف۔" ـــــ یعنی عورت کے معاشرے میں جس قدر فرائض اہم ہیں اسی قدر قابل توجہ حقوق کی بھی مالک ہے۔

اسلام عورت کو مرد کی طرح کامل انسانی روح اور ارادہ و اختیار کی حامل سمجھتا ہے اور اسے سیر تکامل اور ارتقاء کے عالم میں دیکھتا ہے جو کہ مقصد خلقت ہے اسی لیے اسلام دونوں کو ایک ہی صف میں قرار دیتا ہے اور دونوں کو "یا ایھا الناس" اور "یا ایھا الذین اٰمنوا" میں مخاطب کرتا ہے۔ اسلام نے دونوں کے لیے تربیتی، اخلاقی اور علمی پروگرام لازمی قرار دیے ہیں۔ ارشادِ الٰہی ہے:

"ومن عمل صالحًا من ذکرٍ او انثٰی وھو مؤمنٌ فاولئك یدخلون الجنۃ۔"

یعنی جو بھی مرد یا عورت عمل صالح بجا لائے وہ مومن ہے اور ایسے ہی لوگ جنّت میں جائیں گے۔ (مومن ـ ۴۰)

ایسی سعادتیں ہر دو اصناف حاصل کر سکتی ہیں۔ قرآن حکیم کہتا ہے:

"من عمل صالحًا من ذکرٍ او انثٰی وھو مؤمن فلنحیینہ حیوۃً طیبۃً ولنجزینھم اجرھم باحسن ما کانوا یعملون۔"

مرد اور عورت میں سے جو بھی نیک کام کرے گا اور وہ ایمان دار بھی ہوگا تو ہم اسے پاک و پاکیزہ زندگی عطا کریں گے اور جو کچھ وہ کرتے رہے ہوں گے اس کا اچھے سے اچھا اجر و ثواب عطا کریں گے۔ (النحل ـ ۹۷)

یہ آیات صراحت کرتی ہیں کہ مرد اور عورت میں سے ہر ایک اسلام کے پروگراموں پر عمل درآمد کے ذریعے معنوی اور مادی تکامل کی منزل پا لیتا ہے اور ایک طیب و پاکیزہ زندگی میں قدم رکھتا ہے۔ جو کہ آرام و سکون کی منزل ہے۔

اسلام عورت کو مرد کی طرح مکمل طور پر آزاد سمجھتا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

"کلّ نفس بما کسبت رھینۃ۔"

ہر کوئی اپنے اعمال کے بدلے رہن ہے۔ (مدثر ۳۸)

سورہ جاثیہ میں ارشاد ہے:

"من عمل صالحًا فلنفسہ ج ومن اساء فعلیھا۔"

جو بھی اچھا کام کرے تو یہ اُس کے اپنے فائدے میں ہے اور جو بُرا کام کرے وہ بھی اس کا نتیجہ خود بھگتے گا۔ (جاثیہ ـ ۱۵)



یہ آیات بلاتفریق مرد اور عورت سب کے لیئے ہیں ۔ اسی لیے سزاؤں کے بارے میں ایک آیت میں ہے ۔

"الزّانیۃ والزّانی فاجلدوا کلّ واحد منہما مأۃ جلدۃ"

زانیہ اور زانی میں سے ہر ایک کو سو سو کوڑے مارو ۔ (نور ـ ۲)

ایسی دیگر آیات میں بھی دونوں کے لیے ایک جیسے گناہ پر ایک جیسی سزا کا حکم سنایا گیا ہے ۔

ارادہ واختیار سے استقلال پیدا ہوتا ہے ۔یہی استقلال اسلام اقتصادی حقوق میں لاتا ہے ۔اسلام بغیر کسی رکاوٹ کے ہر قسم کے مالی رابطے عورت کے لیے روا جانتا ہے اور عورت کو اس کی درآمد اور سرمائے کا مالک شمار کرتا ہے سورہ نساء میں ہے ۔

"للرّجال نصیب ممّا اکتسبوا وللنّساء نصیب ممّا اکتسبن"

مرد جو کمائیں وہ ان کا حصّہ ہے اور عورتیں جو کمائیں وہ ان کا حصّہ ہے ۔ (نساء ـ ۳۲)

لغت میں اکتساب کا معنیٰ کسب کے برعکس ہے ۔اکتساب کا نتیجہ کسب کرنے اور حاصل کرنے والے سے تعلق رکھتا ہے [۱] اسی طرح قانون کلی ہے کہ :

"النّاس مسلّطون علی اموالھم"

یعنی ـ تمام لوگ اپنے مال پر مسلّط ہیں ۔

اس قانون کو نظر میں رکھتے ہوئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح اسلام عورت کے اقتصادی استقلال کا احترام کرتا ہے اور عورت و مرد میں اُس نے کوئی فرق نہیں رکھا ۔

خلاصہ یہ کہ اسلام کی نظر میں عورت معاشرے کا ایک بنیادی رکن ہے اور اسے ایک بے ارادہ ، محکوم اور قیّم و نگران کا محتاج وجود ہرگز نہیں سمجھنا چاہیئے ۔

مساوات کے مفہوم میں اشتباہ نہ ہو

اسلام نے مساوات کی طرف خاص توجہ دی ہے اور ہمیں بھی متوجہ ہونا چاہیئے لیکن خیال رہے کہ بعض لوگ بے سوچے سمجھے جذبات کی رو میں بہہ کر افراط و تفریط کا شکار ہو جاتے ہیں اور مرد اور عورت کے روحانی وجسمانی فرق اور ان کی ذمہ داریوں کے اختلاف تک سے انکار کر بیٹھتے ہیں ۔

ہم جس چیز کا چاہے انکار کریں تاہم اس حقیقت کا انکار نہیں کر سکتے کہ ان دو صنفوں میں جسمانی و روحانی طور پر بہت فرق ہے ۔مختلف کتب میں اس کی تفصیلات موجود ہیں اور یہاں ہمیں اس کی تکرار کی ضرورت نہیں ۔ خلاصہ یہ ہے کہ عورت وجود انسانی کی پیدائش کا ظرف ہے ۔نونہالوں کا رُشد اسی کے دامن میں انجام پاتا ہے ۔ جیسے وہ جسمانی طور پر آنے والی نسلوں کی پیدائش ، تربیت اور پرورش کے لیے پیدا کی گئی ہے اسی طرح روحانی طور پر بھی اسے عواطف ، احساسات اور جذبات

[۱] مفردات راغب دیکھئے ، البتہ یہ مفہوم ان مواقع پر ہے جہاں کسب اور اکتساب ایک دوسرے کے مدّمقابل ہوں ۔



کا زیادہ حصّہ دیا گیا ہے ۔

اِن وسیع اختلافات کی موجودگی میں کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ مرد اور عورت کو تمام حالات میں ہم قدم ہونا چاہیئے اور تمام کاموں میں اُنہیں سو فیصد مساوی ہونا چاہیئے ۔

کیا عدالت اور مساوات کے حامیوں کو معاشرے کے تقاضوں کے حوالے سے بات کرنا چاہیے؟ کیا یہ عدالت نہیں کہ ہر شخص اپنی ذمہ داری ادا کرے اور اپنے وجود کی نعمتوں اور خوبیوں سے بہرہ مند ہو؟ اِس لیے ۔ کیا عورت کا ایسے کاموں میں دخیل ہونا جو اس کی روح اور جسم سے مناسبت نہیں رکھتے ، خلافِ عدالت نہیں ؟

یہی وہ مقام ہے جہاں ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام جو عدالت کا ہی طرفدار ہے مرد کو کئی ایک اجتماعی کاموں میں سختی یا زیادہ دقت نظر کی ضرورت ہے مثلاً گھر کے معاملات کی سرپرستی وغیرہ میں مقدم رکھتا ہے اور معاونت و کمک کا مقام عورت کے سپرد کر دیتا ہے ایک گھر اور ایک معاشرے کو منتظم کی ضرورت ہے اور نظم و ضبط کا آخری مرحلہ ایک ہی شخص تک انجام پذیر ہونا چاہیے ورنہ کشمکش اور ہرج مرج پیدا ہوگا ۔

اگر تمام تعصبات سے بے نیاز ہو کر غور کیا جائے تو یہ واضح ہوگا کہ مرد کی ساخت کے پیش نظر ضروری ہے کہ گھر کی سرپرستی اس کے ذمے رکھی جائے اور عورت اس کی معاون ہو ۔ اگرچہ کچھ لوگ ان حقائق سے چشم پوشی اختیار کرنے پر مصر ہیں ۔

آج کی دنیا میں بھی بلکہ اِن اقوام میں بھی جو عورتوں کو مکمل آزادی و مساوات دینے کا دعویٰ کرتے ہیں ، خارجی حالات زندگی نشاندہی کرتے ہیں کہ عملی طور پر وہی بات ہے جو ہم بیان کر چکے ہیں اگرچہ باتوں میں اس کے برخلاف کہتے ہیں ۔

۲۲۹ - اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ۭ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْھَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○

ترجمہ

۲۲۹ — طلاق (جس میں رجوع ہے) دو مرتبہ ہے (اور ہر مرتبہ) مناسب طریقے سے اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھے (اور صلح کرلے) یا نیکی کے ساتھ اسے چھوڑ دے (اور اس سے الگ ہو جائے) اور تمہارے لیے حلال نہیں کہ انہیں جو چیز دی ہے وہ اُن سے واپس لو ۔ مگر یہ کہ دونوں (میاں بیوی) اس سے ڈریں کہ وہ حدود الٰہی



کی پاسداری نہیں کر سکیں گے اگر انہیں خوف ہے کہ وہ حدودِ الٰہی کا لحاظ نہ کر سکیں گے تو پھر ان کے لیے کوئی حرج نہیں کہ عورت فدیہ اور عوض دے دے (اور طلاق لے لے) یہ حدود اور خدائی سرحدیں ہیں۔ ان سے تجاوز نہ کرو اور جو شخص ان سے تجاوز کرے وہ ظالم ہے۔

تفسیر

گذشتہ آیت کی تفسیر میں کہا جا چکا ہے کہ عدت اور رجوع کا قانون خاندانوں کی اصلاح اور جدائی کو روکنے کے لیے ہے لیکن اسلام لانے والے نئے مسلمان اس سے غلط فائدہ اٹھاتے تھے اور بیوی کو تکلیف اور سختی پہنچانے کے لیے پے در پے طلاق دیتے اور عدت ختم ہونے سے قبل رجوع کر لیتے۔ اس طرح وہ عورت پر سختی کرتے اور اسے مصیبت میں مبتلا رکھتے۔

زیرِ بحث آیت اس غیر انسانی فعل کو روکتی ہے۔ ارشاد ہے کہ دو مرتبہ تک طلاق اور رجوع صحیح ہے لیکن اگر تیسری مرتبہ طلاق انجام پذیر ہوئی تو پھر رجوع کا حق نہیں ہے۔ اور آخری طلاق یہی تیسری طلاق ہے۔ البتہ "الطلاق مرتان" سے مراد ہے وہ طلاق جس میں رجوع ممکن ہے اور جس کے بارے میں "امساک بمعروف" صادق آتا ہے جو دو سے زیادہ نہیں اور تیسری طلاق میں رجوع نہیں ہے، جیسا کہ آیت گواہی دیتی ہے۔

"امساک" کا معنی ہے۔ روکے رکھنا اور "تسریح" کا معنی ہے چھوڑ دینا۔ جب کشمکش، طلاق اور پھر صلح اور رجوع کی نوبت دو مرتبہ ہو گزرے تو پھر مرد کو چاہیئے کہ معاملے کو ایک طرف کرے۔

یہاں دو نکات قابلِ توجہ ہیں:۔

١۔ جس طرح رجوع کرنے اور عورت کو روک رکھنے میں "معروف" کی شرط ہے۔ یعنی رجوع اور روکے رکھنا صلح و صفائی اور خلوص و محبت کی بنیاد پر ہو اسی طرح جدائی بھی "احسان" کے ساتھ مقید ہے یعنی علیحدگی اور جدائی ہر طرح کے ناپسندیدہ امر سے پاک ہو مثلاً انتقام، غیض، غضب اور کینہ سے مبرا ہو اور کہا جا سکتا ہے کہ آیت کا یہ حصہ احسان ہی کی وضاحت کے لیے ہے۔

"لا یحل لکم ان تأخذوا مما آتیتموھن شیئا۔"

٢۔ "الطلاق مرتان" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دو یا تین طلاقیں ایک ہی مجلس میں انجام نہیں پا سکتیں اور چاہیئے کہ وہ متعدد مواقع پر واقع ہوں۔ خصوصاً جب تعددِ طلاق کا مقصد یہ ہے کہ رجوع کا زیادہ موقع مل سکے اور شاید پہلی کشمکش کے بعد صلح و صفائی برقرار ہو جائے اور اگر پہلی مرتبہ صلح و آشتی نہ ہو سکے تو شاید دوسری مرتبہ ہو جائے۔ لیکن ایک ہی موقع پر متعدد طلاقوں سے یہ راستہ بالکل مسدود ہو جاتا ہے اور میاں بیوی ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں اور اس طرح تعددِ طلاق عملی طور پر بے اثر ہو کر رہ جاتا ہے۔

مکتبِ تشیع میں یہ مسئلہ متفق علیہ ہے لیکن اہلِ سنت کے درمیان اس سلسلے میں اختلافِ نظر ہے۔ البتہ زیادہ تر کا عقیدہ یہی ہے کہ تین طلاقیں ایک ہی مجلس میں دی جا سکتی ہیں۔



تفسیر المنار کے مولف مسند احمد ابن حنبل اور صحیح مسلم (جیسی اہل سنت کی بنیادی کتب) سے نقل کرتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ کے زمانے سے لے کر حضرت عمر کی خلافت کے دو سال تک ایک مجلس کی تین طلاقیں ایک ہی طلاق شمار ہوتی تھیں اور یہ مسئلہ سب اصحاب پیغمبرؐ کے نزدیک متفق علیہ تھا لیکن اُس وقت خلیفہ دوم نے حکم دیا کہ ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں واقع ہوجاتی ہیں۔

اہل سُنت کے مفتی اعظم نے شیعہ نظریہ تسلیم کرلیا

خلیفہ دوم کے حکم کے باوجود یہ مسئلہ اہل سنت کے ہاں متفق علیہ نہیں رہا۔ اہل سُنت کے بہت سے علماء نے دیگر علماء سے اختلاف کرتے ہوئے شیعہ نقطۂ نظر کو انتخاب کیا ہے۔ ان میں سے جامعہ الازہر کے سابق رئیس اور اہل سنت کے مفتی اعظم شیخ محمود شلتوت لکھتے ہیں:

> میں ایک عرصہ تک مشرق کے کالج میں مذاہب کی تحقیق اور اُن کے درمیان موازنہ و مقایسہ میں مصروف رہا۔ کئی مرتبہ ایسا ہوتا کہ میں کئی ایک مسائل میں مختلف مذاہب کی آراء و نظریات کی طرف رجوع کرتا۔ بہت سے مقامات پر میں نے شیعہ مذہب کے استدلالات کو محکم اور استوار دیکھا تو ان کے سامنے جھکا اور میں نے ان میں شیعہ نظریے کو انتخاب کرلیا۔

اس سلسلے میں چند مثالوں کے ذیل میں وہ مزید لکھتے ہیں:

> ایک ہی مجلس کی تین طلاقیں اہل سنت کے چاروں مذاہب میں تین ہی شمار ہوتی ہیں۔ لیکن شیعہ امامیہ عقیدے کے مطابق وہ ایک سے زیادہ طلاقیں شمار نہیں ہوتیں اور چونکہ واقعاً قانون کی نظر اور ظاہر آیات قرآن کی نظر سے اہل تشیع کی رائے حق ہے۔ اس لیے اہل سنت کا نظریہ فتوے کی حیثیت سے اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھا ہے[1]

"ولا یحل لکم ان تاخذوا مما اٰتیتموھن شیئا:"

گذشتہ جملے میں کہا جا چکا ہے کہ علیحدگی احسان کی بنیاد پر ہونا چاہیئے۔ زیر نظر جملہ گذشتہ جملے کی وضاحت بھی ہے اور ایک مستقل حکم بھی نیز یہ ان مواقع کے لیے ایک نمونہ بھی ہے جو احسان کی بنیاد پر علیحدگی کی تشریح کرتے ہیں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شوہر جو چیز حق مہر کے طور پر بیوی کو دے چکا ہے وہ واپس نہیں لے سکتا۔ سورہ نساء آیات ۲۰ و ۲۱ میں یہ حکم زیادہ تشریح کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

"الّا ان یخافا الّا یقیما حدود اللّٰہ فان خفتم الا یقیما حدود اللّٰہ فلا جناح علیھما فیما افتدت بہ."

صرف ایک صورت میں حق مہر واپس لینے میں کوئی حرج نہیں اور وہ یہ کہ جب عورت خود ازدواجی زندگی کو جاری رکھنا نہ چاہتی ہو۔ اب اگر اس کے عدم میلان اور نفرت کی وجہ سے اندیشہ ہو کہ عورت اور مرد حدود الٰہی کی حفاظت نہ کرسکیں گے تو اس صورت میں کوئی حرج نہیں کہ حق مہر (عوض کے طور پر) شوہر کو دے دیا جائے تاکہ وہ عورت کو طلاق دے دے[2]

---

[1] رسالۃ الاسلام شمارہ ۱، سال ۱۱، قسط بحوالہ حاشیہ کنز العرفان جلد ۲ ص ۲۶۲ [2] اس طلاق کو طلاق خلع کہتے ہیں جس کی تفصیلات کتب فقہ میں مذکور ہیں۔



"تِلْكَ حُدُودُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا ۚ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ"

"تلک" ان احکام کی طرف اشارہ ہے جو گذشتہ جملوں میں بیان کیے جا چکے ہیں۔ حقیقت میں یہ احکام اجتماعی، اخلاقی اور فقہی نکات کا مجموعہ ہیں جنہیں پروردگار نے اجتماعی روابط کے استحکام کے لیے وضع اور بیان فرمایا ہے۔

زیر نظر جملے میں کہا گیا ہے کہ اگر بعض لوگ افراط کا شکار ہوں اور ناجائز میلانات کی وجہ سے حدود الٰہی سے بے پرواہ ہو جائیں تو ان کا شمار ستمگروں اور ظالموں میں ہوگا۔

یہ اشخاص کس پر ظلم کرتے ہیں؟ اس کی وضاحت اس آیت میں موجود نہیں البتہ سورہ طلاق کی پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے:

"من یتعد حدود اللّٰہ فقد ظلم نفسہ."

جو شخص حدود خدا سے تجاوز کرتا ہے وہ اپنے ہی نفس پر ظلم کرتا ہے

اور واقعاً ایسا ہی ہے کیونکہ قانون خداوندی کی سرحدوں سے تجاوز کرنے کا نقصان سب سے پہلے تجاوز کرنے والوں ہی کو پہنچتا ہے۔ کیونکہ اسی قانون کے سائے میں ان کے حقوق کی بھی حفاظت ہوتی تھی۔ اب اگر قانون شکنی اور سرحد سے تجاوز کرنا رواج ہو جائے تو اس کا نقصان ان لوگوں کے دامن کو بھی آئے گا جنہوں نے اس کام میں پیش قدمی کی ہے۔

خدائی سرحدیں

اس آیت اور قرآن مجید کی دیگر بہت سی آیات میں قوانین الٰہی کے بارے میں ایک لطیف تعبیر نظر آتی ہے اور وہ ہے حد اور سرحد۔ اس طرح قوانین کی نافرمانی اور مخالفت سرحد سے تجاوز شمار ہوتا ہے حقیقت میں انسان جو کام انجام دیتا ہے اس میں ان مقامات ممنوعہ کا ایک سلسلہ موجود ہوتا ہے جہاں داخل ہونا بہت زیادہ خطرناک ہے۔ قوانین و احکام الٰہی ان مقامات کی نشاندہی کرتے ہیں اور ان مقامات کی پہچان کیلئے ان قوانین میں بہت سی علامات بیان کی گئی ہیں۔ سورہ بقرہ کی آیت ۱۸۷ میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

"تلک حدود اللّٰہ فلا تقربوھا."

یہ خدائی سرحدیں ہیں ان کے قریب نہ جاؤ۔

کیونکہ ان سرحدوں کے قریب جانے والا گرنے کے بھی نزدیک ہو جاتا ہے۔ اہل بیتؑ کے طریقوں سے مروی احادیث میں ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے مشتبہ مقامات پر جانے سے منع فرمایا ہے اور ارشاد فرمایا ہے کہ ایسا کرنا سرحد کے قریب جانے کے مترادف ہے ممکن ہے کہ سرحد کے قریب پہنچ کر انسان قدم اس طرف رکھ لے۔ اور ہلاکت و نابودی کا شکار ہو جائے۔

۲۳۰۔ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ۗ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ



اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ○

ترجمہ

۲۳۰۔ اگر (دو مرتبہ طلاق دینے اور پھر رجوع کر لینے کے بعد پھر) اسے طلاق دے تو اس کے بعد وہ عورت اس پر حلال نہیں ہوگی مگر یہ کہ اس کے علاوہ کسی شوہر سے شادی کرے (اور وہ اس سے جنسی ملاپ کرے۔ بعد ازاں وہ دوسرا شوہر بھی) اسے طلاق دے دے تو کوئی حرج نہیں کہ وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف رجوع کریں (اور عورت اپنے پہلے شوہر سے پھر سے شادی کرلے) جب کہ انہیں اُمید ہو کہ وہ حدودِ الٰہی کا احترام کریں گے اور یہ اللہ کی حدود ہیں جنہیں خدا آگاہ لوگوں سے بیان کرتا ہے۔

شانِ نزول

ایک عورت پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ کہنے لگی: میں اپنے چچازاد رفاعہ کی بیوی تھی۔ اس نے مجھے تین مرتبہ طلاق دی تو میں نے ایک اور شخص عبدالرحمن سے شادی کرلی۔ اتفاقاً اس نے بھی مجھے طلاق دے دی لیکن اس دوران میں اس نے مجھ سے ہم بستری نہیں کی۔ کیا اب میں پہلے شوہر کی طرف لوٹ سکتی ہوں؟

آنحضرتؐ نے نفی میں جواب دیا اور فرمایا کہ پہلے شوہر سے تیری شادی اسی صورت میں صحیح ہے جب نئے شوہر نے تجھ سے مباشرت کی ہو۔

اس واقعے کے بعد مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی

تفسیر

گذشتہ آیت میں اجمالی طور پر یہ نکتہ بیان کیا جا چکا ہے کہ دوسری طلاق کے بعد عورت اور مرد الفت و صلح کی راہ اپنالیں یا ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔

یہ آیت حقیقت میں ایک تبصرہ ہے جو گذشتہ آیت سے منسلک ہے۔ آیت کہتی ہے کہ جدائی کا حکم ہمیشہ کے لیے ہے لیکن عورت دوسری شادی کرے، اور دوسرے شوہر سے مباشرت کے بعد طلاق لے لے تو اس صورت میں چاہے تو پہلے شوہر سے صلح کر سکتی ہے اور امید رکھے کہ اگر وہ حالات کو سازگار رکھیں اور حدودِ الٰہی کا احترام کریں تو کوئی حرج نہیں۔

اسلام کے عظیم رہبروں سے جو روایات پہنچی ہیں اُن میں فرمایا گیا ہے کہ یہ دوسرا نکاح دائمی ہو اور نکاح کے بعد میاں بیوی کے تعلقات بھی عملی طور پر انجام پائیں۔ روایات سے قطع نظر یہ دونوں شرطیں خود آیت سے بھی ظاہر ہوتی ہیں کیونکہ لفظ نکاح جنسی عمل کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور صیغہ عقد کے اجراء کے لیے بھی جیسا کہ آیت کی شانِ نزول میں اس کی صراحت ہو چکی ہے۔

نیز "فَاِنْ طَلَّقَهَا" سے دوسری شرط یعنی نکاح کا دائمی ہونا بھی معلوم ہو جاتا ہے کیونکہ نکاح موقت تو طلاق کا محتاج نہیں ہوتا۔



بے راہ روی سے روکنے کا ایک عامل

بعض حیلہ باز محلل کے اس حکم کو غلط مقاصد کے لیے دستاویز بناتے ہیں اور کچھ بے خبر لوگوں کی جہالت اور جذبات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس بارے میں اسلام پر نامردانہ حملے کرتے ہیں لیکن احکام طلاق میں غور کرنے اور ان کے فلسفے کی طرف متوجہ ہونے سے حقیقت کے متلاشی اس قانون کے ایک عجیب نقش سے آشنا ہوتے ہیں۔

اس کی وضاحت کچھ یوں ہے کہ گزشتہ آیات کی تفسیر میں کہا جا چکا ہے طلاق کبھی مخصوص حالات میں شادی کی طرح ایک حیاتی عمل اور ضروری امر شمار ہوتی ہے۔ اسی لیے اسلام نے اسے جائز قرار دیا ہے۔ لیکن خاندانوں میں جدائیاں عموماً فرد اور معاشرہ دونوں کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان کا باعث ہوا کرتی ہیں۔ لہٰذا مختلف طریقوں کے ذریعے طلاق کے عمل سے حتی الامکان بچنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

محلل کا عمل یا ثانی شادی کرنا ان طریقوں میں سے ایک ہے کیونکہ تین طلاقوں کے بعد عورت کا رسمی طور پر نکاح کرنا طلاق کے عمل کو جاری رکھنے کی راہ میں ایک بہت بڑا بند اور رکاوٹ ہے۔ جو شخص اپنی بیوی کو تین طلاقیں دینا چاہے گا جب اس کے ذہن میں یہ خیال آئے گا کہ اس طرح اس کی بیوی ہمیشہ کے لیے اس سے جدا ہو جائے گی تو اس کا ارادہ ضرور متزلزل ہوگا اور جب تک وہ مجبور نہ ہوگا اس قسم کا کام نہیں کرے گا۔ حقیقت میں محلل کا طریقہ جسے زیادہ صحیح لفظوں میں عورت کا دوسرے شوہر سے نیا نکاح کہا جاسکتا ہے، طلاق کے عمل میں ایک رکاوٹ ہے اور یہ ہوس پرست اور فریب کار مردوں کے لیے رکھا گیا ہے تاکہ وہ عورت کو اپنی سرکش ہوس کا کھلونا نہ بنائیں اور قانون طلاق و رجوع سے لامحدود فائدہ نہ اٹھاتے رہیں۔

دوسرے نکاح کی شرائط مثلاً اس کا دائمی ہونا یہ واضح کرتا ہے کہ اس رشتے کا مقصد یہ نہیں کہ اس کے ذریعہ پہلے شوہر اور بیوی کے پھر سے ملنے کا ذریعہ بن جائے۔ لہٰذا اس قانون سے غلط فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا اور نکاح موقت کے ذریعے رکاوٹ دور نہیں کی جاسکتی۔

بعض مفسرین نے ایک روایت نقل کی ہے جو اس مفہوم کو بہت ہی واضح کر دیتی ہے۔ اس روایت کے مطابق جو لوگ اس مسئلے کی انحرافی صورت پر عمل کرتے ہیں یعنی شادی اس مقصد کے لیے کرتے ہیں کہ عورت پہلے شوہر کے پاس واپس جاسکے وہ رحمتِ خدا سے دور ہیں۔

"لعن اللہ المحلّل والمحلّل لہ۔"

خدا کی لعنت ہر محلل پر اور اس پر جس کے لیے یہ محلل بنا ہے [1]

اس بناء پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ مقصد یہ تھا کہ تین طلاقوں کے بعد مرد اور عورت ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں اور پھر اپنی مرضی سے نئی زندگی کی تشکیل کریں اور شادی جو بذات خود ایک مقدس امر ہے پہلے شوہر کے شیطانی رجحانات کا کھلونا نہ بن جائے۔

البتہ چونکہ اسلام ہمیشہ عاقلانہ خواہشات کا احترام کرتا ہے اور اصلاح کے ہر دریچے سے استفادہ کرتا ہے۔ لہٰذا ارشاد

[1] المنار: ج ۲،



ہوتا ہے: اگر یہ نیا رشتہ بھی ٹوٹ جائے اور سابق میاں بیوی دوبارہ ایک دوسرے سے تعلق پیدا کریں اور حتمی طور پر گھریلو فرائض کی انجام دہی کا پختہ ارادہ کرلیں تو پھر رجوع کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں اور یہ نیا نکاح تحریم کے حکم کو ختم کر دے گا۔ اسی لیے اسے محلل کا نام دیا گیا ہے۔

یہاں سے واضح ہوتا ہے کہ محلل ایک بنیادی مسئلے اور حکم کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ یہاں نئے نکاح کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ آیت کے علاوہ روایات سے بھی واضح طور پر یہی معنیٰ نکلتا ہے۔ ایک سرسری مطالعے سے یہ نکتہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ یہاں پر بحث ایک حقیقی اور حتمی ازدواج کے بارے میں ہے لیکن اگر کوئی شخص پہلے ہی سے دائمی نکاح کا مقصد نہ رکھتا ہو اور صرف ظاہری طور پر ایسا کرے تاکہ محلل کی صورت پیدا ہو جائے تو یہ نکاح بے اثر ہے کیونکہ اس صورت میں دوسرا نکاح بھی باطل ہوگا اور پہلا شوہر بھی پھر سے عورت کے لیے حلال نہیں ہوگا۔ ہوسکتا ہے مذکورہ حدیث "لعن اللہ المحلل والمحلل لہ" اسی قسم کے محلل کی طرف اشارہ ہو۔

۲۳۱۔ وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ۠ وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۠ وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝

ترجمہ

۲۳۱۔ جب عورتوں کو طلاق دو اور وہ عدت کے آخری دنوں کو پہنچ جائیں تو یا انہیں صحیح طریقے سے اپنے ہاں رکھ لو اور (اُن سے صلح کرلو) اور یا انہیں پسندیدہ طریقے سے چھوڑ دو اور انہیں کسی طرح بھی نقصان پہنچانے اور ان سے زیادتی کرنے کے لیے ان سے صلح نہ کرو اور جو ایسا کرے گا اس نے گویا اپنے ہی اوپر ظلم کیا (اور ان اعمال اور قوانین سے غلط فائدہ اٹھا کر) آیات خدا کا مذاق نہ اڑاؤ اور اپنے اوپر نازل ہونے والی نعمت الٰہی، کتاب آسمانی اور علم و دانش کو یاد کرو اور انہیں ان کے ذریعے جو وعظ و نصیحت کی گئی ہے اسے یاد کرو اور خدا سے ڈرو اور جان لو کہ خدا ہر چیز سے آگاہ ہے (اور وہ ان لوگوں کی نیتوں سے باخبر ہے جو قوانین الٰہی سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں)۔



تفسیر

گذشتہ آیات کے بعد اس آیت میں اسلام طلاق کے بارے میں وضع کردہ حدبندیوں کو بیان کرتا ہے تاکہ حقوق اور عورت کے احترام سے چشم پوشی نہ کی جا سکے ۔

آیت کہتی ہے کہ جب تک عدت کی مدت ختم نہ ہو اگرچہ اس کا آخری دن باقی ہو مرد کو اجازت ہے کہ وہ اپنی بیوی سے صلح کرے اور دونوں خلوص و محبت سے زندگی بسر کرنے لگیں " فامسکوھن بمعروف " اگر حالات ناساعد ہیں تو اسے چھوڑ دے " او سرحوھن بمعروف " لیکن توجہ رہے کہ رجوع یا علیحدگی ہر صورت میں احسان اور نیکی ملحوظ رہے اور جذبہ انتقام سے یہ کام انجام نہیں پانا چاہیئے ۔

" ولا تمسکوھن ضرارا لتعتدوا ومن یفعل ذالک فقد ظلم نفسہ "

یہ جملہ " معروف " کی تفسیر ہے یعنی رجوع صدق و صفا اور خلوص و محبت کی بنا پر ہو ۔ چونکہ زمانہ جاہلیت میں طلاق اور رجوع کو انتقام لینے کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا لہذا آیت قطعی لہجے میں کہتی ہے کہ عورت کو آزار و تعدی کے مقصد سے زوجیت کی قید میں نہ رکھا جائے کیونکہ ایسا کرنا اس پر نہیں بلکہ خود تمہارے نفس پر بھی ظلم ہے ۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ بیوی پر ظلم کرنا کس طرح اپنے نفس پر ظلم کرنے کے مترادف ہے ۔ اس کی وجوہ یہ ہو سکتی ہیں ۔

۱۔ حق کشی کی بنیاد پر کیئے جانے والے رجوع میں کوئی سکون و آرام میسر نہیں آسکتا ۔

۲۔ قرآن کی نگاہ میں مرد اور عورت نظام خلقت میں ایک پیکر کے دو جز ہیں اس بناء پر عورت پر ظلم کرنا اپنے ہی حقوق پامال کرنے کے مترادف ہے ۔

۳۔ جو شخص کسی پر ظلم کرتا ہے در اصل وہ خدا کے عذاب کی طرف بڑھ رہا ہوتا ہے اور حقیقت میں اس طرح وہ اپنے اوپر ہی ظلم کر رہا ہوتا ہے ۔

خدا کے قوانین کا مذاق نہ اڑاؤ

" ولا تتخذوا آیات اللہ ھزوا واذکروا نعمت اللہ علیکم وما انزل علیکم من الکتاب والحکمۃ یعظکم بہ "

" ھزو " اور " ھزوء " کا معنی تمسخر کرنا ہے ۔

عموماً ہزاروں لوگ شرعی احکام کی خلاف ورزیاں کرتے ہوئے وجدانی دباؤ سے بچنے کے لیئے اور (اپنے خیال میں) عذاب الٰہی سے فرار کے لیئے شرعی حیلے بہانے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور آیات و احکام کے ظواہر کو اپنے لیئے دستاویز بنا لیتے ہیں ۔ اس روش کو قرآن آیات قرآن اور احکام الٰہی سے استہزاء اور تمسخر قرار دیتا ہے یہ



بات باعث افسوس ہے کہ بہت سے احکام کے بارے میں ایسا انحراف عموماً نظر سے گزرتا رہتا ہے۔ طلاق کے معاملے میں بھی اس کی مثال ملتی ہے۔ جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے مرد کے لیے حق رجوع ازدواج اور شادی کو زیادہ سے زیادہ پائدار بنانے کے لیئے ہے لیکن بعض لوگ اس مقصد کے برعکس اقدام کرتے ہیں یعنی رجوع حق کی اجازت کو عورت سے انتقام لینے اور اسے آزار پہنچانے کے لیے استعمال کرتے ہیں اور اس طرح قانون پر عمل کرنے کے پردے میں اپنے حقیقی ظالمانہ چہرے کو چھپاتے ہیں اسی کو قرآن اور قانون کا تمسخر اڑانا کہتے ہیں۔ محل بحث آیت کہتی ہے: آیات خدا کو کھلونا نہ بناؤ اور خدا کی عظیم نعمت دین اور آسمانی کتاب کو یاد رکھو جو تمہاری سعادت کے لیے آئے ہیں۔

دین اور اس کے تمام قوانین و احکام کا سرچشمہ جہانِ ثابت کا نظام ہے جسے نوعِ انسانی کے حقیقی مصالح کی روشنی میں بنایا گیا ہے اس لیے مصالح سے چشم پوشی اختیار کرتے ہوئے بعض احکام کے ظاہری طریقوں کو اپنا کر بے روح سانچے نہ بناؤ۔ کہیں یہ طرزِ عمل خود تمہارے فوائد بھی خطرے میں ڈال دے گا اور آیات خدا کے سامنے منہ ٹیڑھا کرنے کا جرم بھی شمار نہ کر لیا جائے۔

"واتقوا اللّٰہ واعلموا انّ اللّٰہ بکلّ شیءٍ علیم"

آیت کے آخر میں عورت کے حقوق کی حفاظت کے لیے احکام الٰہی سے غلط فائدہ اٹھانے والوں کی گرفت کی گئی ہے اور ایسے لوگوں سے کہا گیا ہے کہ خدا سے ڈرو اور جان لو کہ وہ تمہارے کاموں اور اس جہان کے تمام اسرار سے آگاہ ہے

۲۳۲۔ وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○

ترجمہ

۲۳۲۔ اور جب عورتوں کو طلاق دے دو اور ان کی عدت تمام ہو جائے تو اگر پسندیدہ طریقے اور باہمی رضا مندی سے وہ اپنے (پہلے) شوہروں سے شادی کرنا چاہیں تو انہیں اس سے نہ روکو۔ اس حکم سے تم سے بس وہ لوگ نصیحت حاصل کرتے ہیں (اور اس پر عمل کرتے ہیں) جو خدا اور روزِ جزا پر ایمان رکھتے ہیں یہ (احکام) تمہارے (خانوادوں کے) نشو و نما کے لئے زیادہ موثر اور آلودگیوں کو دھونے کے لیے زیادہ مفید ہیں اور خدا جانتا ہے (لیکن) تم نہیں جانتے۔



شانِ نزول

معقل بن یسار پیغمبر اکرمؐ کا ایک صحابی تھا ۔ اس کی ایک بہن جملاء تھی ۔ عاصم بن عدی اس کی بہن کا پہلا شوہر تھا ۔ وہ عاصم سے اپنی بہن کی دوبارہ شادی کی مخالفت کرتا تھا کیونکہ عاصم نے قبل ازیں اسے طلاق دے دی تھی ۔

اس بناء پر آیت نازل ہوئی جس میں اس قسم کی مخالفت سے منع کیا گیا ہے ۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جابر بن عبد اللہ نے اپنی چچازاد کی پہلے شوہر سے دوبارہ شادی کی مخالفت کی تھی شاید زمانہ جاہلیت میں اکثر اوقات قریبی رشتہ داروں کو یہ حق دیا جاتا تھا ۔

(اس میں شک نہیں کہ ہماری فقہ میں بھائی اور چچازاد اپنی بہن یا چچا کی بیٹی پر ایسا حق نہیں رکھتے لیکن مندرجہ بالا آیت جیسا کہ ذکر آئے گا ۔ ایک کلی مفہوم کی حامل ہے اور اس کے مطابق ولی یا غیر ولی کوئی شخص بھی یعنی باپ ۔ ماں ، چچازاد بھائی اور دوسرے لوگوں میں سے کوئی یہ حق نہیں رکھتا کہ وہ ایسی شادی کی مخالفت کرے) ۔

تفسیر

ایک اور زنجیر ٹوٹ گئی

جیسا کہ گذشتہ مباحث میں گزر چکا ہے ۔ زمانہ جاہلیت میں عورتیں پابندیوں اور زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھیں ۔ ان کے ارادے ۔ فکر و نظر اور میلان و رغبت کی کوئی حیثیت نہ تھی اور وہ خود سر مردوں کے ارادہ و میلان کے تابع تھیں ۔ اس کیفیت کا ایک نمونہ انتخاب شوہر کا مسئلہ بھی تھا جس میں عورتوں کی خواہش و رغبت کا کوئی دخل نہ تھا ۔ اس روش میں معاملہ یہاں تک جا پہنچا تھا کہ اگر عورت رسمی نکاح بھی کر لیتی اور اس کے بعد اس شوہر سے علیحدگی ہو جاتی تو نئے سرے سے اُس سے وابستگی بھی ولی (یا اولیاء) کے ارادے پر موقوف تھی ۔ بعض اوقات اگر میاں بیوی اپنی سابقہ ازدواجی زندگی کو برقرار رکھنا چاہتے تو ان کے اولیاء اپنے منافع کی خاطر یا خیالات و موہومات کی بناء پر اس تعلق میں حائل ہو جاتے ۔

قرآن صراحت سے اس روش کو مذموم قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اولیاء اور دیگر افراد ہرگز ایسا کوئی حق نہیں رکھتے کیونکہ جب میاں بیوی جو شادی کے دو اصلی اور بنیادی رکن ہیں وہ ایک دوسرے سے موافقت رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ علیحدگی کے بعد پھر شادی کر لیں تو دوسروں کی مخالفت کوئی معنی نہیں رکھتی ۔

گذشتہ آیت میں " بلوغ اجل " کا معنی ہے عورت کے آخری دنوں تک پہنچنا لیکن اس آیت میں نئے سرے سے ازدواج کے قرینے سے " بلوغ اجل " سے مراد آخری دن کا گزر جانا ہے ۔ اصطلاح کے مطابق گذشتہ آیت میں غایت " مغیّا " کا جزء تھی اور یہاں " مغیّا " سے خارج ہے ۔

اس بناء پر آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ شیبہ عورتیں یعنی جنہوں نے ایک دفعہ شادی کر لی ہے وہ دوبارہ شادی کے لیے اولیاء کی تائید حاصل کرنے کی بالکل محتاج نہیں ہیں یہاں تک کہ اُن کی مخالفت بھی بے اثر ہے لیکن کیا باکرہ لڑکیاں ولی کی اجازت کی محتاج ہیں یا نہیں ، اس بارے میں آیت خاموش ہے ۔ اس کی تشریح کتب فقہ میں موجود ہے ۔ آیت کا آخری حصّہ کہتا ہے



کہ احکام کا یہ سلسلہ جو تمہارے نفع کے لیے بیان ہوا ہے ایسے لوگوں کے بارے میں ہے جو کائنات کے پیدا کرنے والے اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتے ہیں ۔ جب تک انسان خدا پرستی اختیار کر کے خود پرستی سے نجات حاصل نہ کرلے اپنے میلانات پر ہرگز کنٹرول نہیں کرسکتا اور کج روی سے بالکل نہیں بچ سکتا۔

"ذٰلکم ازکیٰ لکم واطھر واللّٰہ یعلم وانتم لا تعلمون"

یہ جملہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ان احکام پر عمل کرنے کا نتیجہ سو فیصد تمہارے حق میں ہے ۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ اطلاعات کی کمی کی وجہ سے تمہیں احکام کے فلسفہ سے واقفیت حاصل نہ ہو لیکن وہ خدا جو تمام اسرار سے آگاہ ہے اس نے یہ احکام تمہارے منافع کے تحفظ، خاندانوں کی طہارت اور پاکیزگی کے لیے جاری کیے ہیں ۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ خداوند عالم نے اس جملے میں ان احکام پر عمل کرنے کا نتیجہ تزکیہ بھی اور طہارت بھی قرار دیا ہے " ازکی لکم و اطھر" اس کا مفہوم یہ ہے کہ ان احکام پر عمل کرنا ایک تو ان مختلف آلودگیوں اور ناپاکیوں کو دور کرتا ہے جو غلط کاموں کے سبب خاندانوں کے دامن گیر ہو جاتی ہیں اور دوسرا اس کا حاصل یہ ہے کہ انہیں نشو و نما، تکامل اور خیر و برکت نصیب ہوتی ہے ۔ یاد رہے کہ تزکیہ کا اصلی لغوی معنی نمو پانا اور بڑھنا ہی ہے۔

۲۳۳۔ وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ ۖ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ ۚ وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَارَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُودٌ لَهُ بِوَلَدِهِ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَٰلِكَ ۗ فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ۗ وَإِنْ أَرَدْتُمْ أَنْ تَسْتَرْضِعُوا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا سَلَّمْتُمْ مَا آتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوفِ ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝

ترجمہ

۲۳۳ ۔ مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلاتی ہیں (یہ) اس کے لیے ہے جو دودھ پلانے کے دور کی تکمیل کرنا چاہے اور اس (باپ) کے لیے جس کے ہاں بچہ پیدا ہوا ہے ضروری ہے وہ ان (ماؤں) کو (دودھ پلانے کی مدت میں) مناسب طریقے سے خوراک اور لباس دے (اگرچہ وہ طلاق لے چکی ہوں)۔



کسی شخص کی ذمہ داری اس کی قوت و طاقت سے زیادہ نہیں ہے نہ ماں بچے کو (اس کے باپ سے اختلاف کی وجہ سے) ضرر پہنچانے کا حق رکھتی ہے اور نہ باپ اور اس کے وارث پر ایسا کرنا لازم ہے (کہ وہ دودھ پلانے کی مدت میں ماں کے اخراجات مہیا کرے) اور اگر وہ دونوں باہمی رضامندی اور مشورے سے بچے کا دودھ (زیادہ جلدی) چھڑوا دیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں ہے اور اگر (طاقت نہ رکھنے یا ماں کے موافق نہ ہونے سے) اپنے بچوں کے لیے کوئی آیا لے آؤ تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ بشرطیکہ ماں کا گذشتہ حق شائستہ اور مناسب طریقے سے ادا کر دو اور خدا سے ڈرو اور جان لو کہ جو کچھ تم انجام دیتے ہو خدا اُسے دیکھنے والا ہے۔

تفسیر

لغتِ عرب میں "والدہ" ماں کو کہا جاتا ہے لیکن لفظ "اُم" بہت وسیع معنی کا حامل ہے۔ یہ لفظ کبھی ماں کے لیے اور کبھی ہر چیز کی جڑ اور بنیاد کے لیے بولا جاتا ہے۔

اس آیت میں قرآن نومولود بچوں کو دودھ پلانے کے لیے مختلف طریقے اور اس سلسلے میں مختلف حقوق بیان کرتا ہے ان کا تعلق ماں، بیٹا اور باپ سے ہے۔ اس آیت سے مجموعی طور پر سات احکام حاصل ہوتے ہیں۔

نوزائیدہ بچوں کو دودھ پلانے کے بارے میں سات احکام

۱۔ دودھ پلانے کے دو سالوں میں دودھ پلانے کا حق ماں سے مخصوص ہے اور وہی اس مدت میں بچے کو دودھ پلا سکتی ہے اور وہی دیکھ بھال بھی کرے گی۔ اگرچہ چھوٹے بچوں کی ولایت باپ کے ذمہ ہے لیکن نوزائیدہ بچے کو ماں کی دیکھ بھال اور سرپرستی میں دے دیا گیا ہے کیونکہ نومولود کے جسم و روح کی غذا کے طور پر ماں کا دودھ اور شفقت مادری درکار ہے۔ بچے اور ماں کا یہ انمٹ رشتہ ہے ایک پہلو یہ ہے کہ ماں کے جذبات کا بھی لحاظ رکھا جانا چاہیئے کیونکہ ایسے حساس لمحات میں ماں اپنی گود کو خالی نہیں دیکھ سکتی اور وہ بچے کی حالت دیکھ کے آرام سے نہیں رہ سکتی۔ اس لیے اس عرصے میں دیکھ بھال اور دودھ پلانے کا حق ماں کو دیا گیا ہے۔ یہ حکم دو پہلوؤں کا حامل ہے۔ اس میں بچے اور ماں دونوں کی حالت کو ملحوظ رکھا گیا ہے "والوالدات یرضعن اولادھن حولین کاملین"

۲۔ ضروری نہیں کہ بچے کو دودھ پلانے کی مدت پورے دو سال ہی ہو۔ دو سال تو اس صورت میں ہے اگر جو وہ دودھ پلانے کے اس دور کو مکمل کرنا چاہئیں ("لمن اراد ان یتم الرضاعۃ")

لیکن مائیں حق رکھتی ہیں کہ نومولود کی حالت و کیفیت اور سلامتی کو مدنظر رکھتے ہوئے اس میں کمی کر دیں۔ اہل بیت علیہم السلام سے جو روایات ہم تک پہنچی ہیں ان میں دودھ پلانے کا مکمل دور دو سال بیان فرمایا گیا ہے اور نا مکمل دور ۲۱ ماہ بتایا گیا ہے۔ بعید نہیں کہ یہ معنی زیر نظر آیت اور سورہ احقاف کی آیہ ۱۵ کو ایک دوسرے میں ضم کرنے سے پیدا ہوتا ہو۔ کیونکہ سورہ احقاف میں ہے: "وحملہ و فصالہ ثلثون شھرا"

اور اس کا حمل اور دودھ پلانے کی مدت ۳۰ ماہ ہے۔



ہم جانتے ہیں کہ حمل کی مدت عموماً ۹ ماہ ہوتی ہے۔ اس لیے باقی ۲۱ ماہ دودھ پلانے کی عام مدت ہو گی اور چونکہ سورہ احقاف کی مذکورہ آیت میں بھی مسئلہ وجوب کی صورت میں نہیں آیا لہٰذا مائیں حق رکھتی ہیں کہ بچے کی سلامتی کو نظر میں رکھتے ہوئے چاہیں تو دودھ پلانے کی مدت ۲۱ ماہ سے بھی کم کر دیں۔

۳ــ "وعلی المولود لہٗ رزقھن وکسوتھن":

یہاں لفظ "الاب" جس کا معنی باپ ہے استعمال نہیں ہوا بلکہ "المولود لہٗ" کی تعبیر استعمال کی گئی ہے جس کا معنی ہے "وہ شخص جس کا بچہ پیدا ہوا ہے"۔ یہ بات یہاں قابل توجہ ہے۔ یہ تعبیر گویا اس لیے استعمال کی گئی ہے کہ اس ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے پدری جذبات کو زیادہ سے زیادہ تحریک دی جائے یعنی اگر بچے اور اس کی ماں کے اخراجات مرد کے ذمے رکھے گئے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس کا بیٹا ہے اور اس کے دل کا میوہ ہے نہ کہ ایک اجنبی فرد۔

اس مقام پر "معروف" کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ ماں کی غذا اور لباس رائج معیار کے مطابق اور شایان شان ہو۔ اس سلسلے میں سختی درست ہے نہ فضول خرچی۔

اس کے بعد اس سلسلے میں ہر قسم کے ابہام کو دور کرنے کے لیے مزید وضاحت فرمائی گئی ہے کہ ہر باپ اپنی طاقت کے مطابق ذمہ دار ہے کیونکہ خداوند عالم کسی کی توانائی سے زیادہ اس پر ذمہ داری نہیں ڈالتا "لا تکلف نفس الا وسعھا"۔

۴ــ خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ ماں باپ اپنے بچے کی تقدیر اپنے اختلافات کی بھینٹ نہ چڑھا دیں اور ان اختلافات کے ذریعے نوزائیدہ بچے کی روح رواں پر ناقابل تلافی ضربیں نہ لگا دیں "لا تضار والدۃ بولدھا ولا مولود لہٗ بولدہٖ"۔

دودھ پلانے کے دوران میں بچوں کی دیکھ بھال کا حق ماؤں کو حاصل ہے۔ مردوں کو چاہیئے کہ ان سے یہ حق چھین کر پامال نہ کریں اور مائیں بھی جنہیں یہ حق دیا گیا ہے اس سے غلط فائدہ نہ اٹھائیں اور مختلف موہوم بہانوں سے دودھ پلانے سے پہلو تہی نہ کریں اور یونہی مرد کو بچے کی ملاقات سے محروم نہ کر دیں۔

اس جملے کے مفہوم کے بارے میں اور تفسیریں بھی کی گئی ہیں لیکن جو کچھ یہاں بیان کیا گیا ہے وہ گذشتہ جملوں سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

۵ــ باپ کی موت کے بعد وارثوں کو چاہیئے کہ وہ اس ذمہ داری کو اپنے ذمہ لیں اور بچے کو دودھ پلانے کے دوران میں ماں کی ضرورت کو پورا کریں۔

۶ــ بچے کو دودھ چھڑوانے کا اختیار ماں باپ کو دیا گیا ہے۔ گذشتہ آیت میں اگرچہ بچے کو دودھ پلانے کی مدت کا تعین ہو چکا ہے لیکن ماں باپ بچے کی جسمانی کیفیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک دوسرے کے صلاح و مشورہ اور باہمی رضامندی سے مناسب موقع پر بچے کا دودھ چھڑوا سکتے ہیں "فان ارادا فصالا عن تراض منھما و تشاور



فلا جناح علیھما۔" یعنی اگر ماں باپ باہمی رضامندی اور مشورے سے بچے کا دودھ چھڑوانا چاہیں کوئی حرج نہیں ماں نوزائیدہ بچے کو دودھ پلانے پر مجبور نہیں ہے اور وہ جب چاہے دودھ پلانے سے انکار کر سکتی ہے لیکن کیا خوب ہے کہ بچے کے رشد و تکامل کے لیے وہ اپنی بعض خواہشات کو قربان کر دے اور اس سلسلے میں شوہر کی ہمفکری اور موافقت سے ہاتھ نہ اٹھائے اور "تراضی" اور "تشاور" یعنی ایک دوسرے کو راضی رکھنے اور آپس میں مشورہ کرنے کے حکم کو عملی جامہ پہنائے۔

ماں کے دودھ پلانے اور دیکھ بھال کرنے کے حق کو ہرگز نہیں روکا جا سکتا۔ لیکن اگر ماں خود انکار کر دے یا اس میں کوئی رکاوٹ حائل ہو جائے تو اس صورت کے لیے ارشاد فرماتا ہے:

"وان اردتم ان تسترضعوا اولادکم ولا جناح علیکم اذا سلمتم ما اٰتیتم بالمعروف۔"

تمہیں حق پہنچتا ہے کہ بچے کی دیکھ بھال اور اسے دودھ پلانے کا کام کسی مناسب آیا کے سپرد کر دو یا پھر کچھ مدت کے لیے دودھ پلانے کا کام اسے سونپ دو تا کہ ماں کے لیے مدد و اعانت ہو سکے۔

(اذا سلمتم ما اٰتیتم بالمعروف۔) اس جملے کا معنی ہے کہ ماں کی بجائے دودھ پلانے کے لئے دوسری عورت کا انتخاب طرفین کی رضامندی اور مشورے کے ساتھ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں لیکن شرط یہ ہے کہ ماں کے گذشتہ حقوق اور جتنا دودھ اس نے پلایا ہے اس کا حق پامال نہ ہو جائے بلکہ جو مروج طریقہ ہے اُس کے مطابق ہر حق ادا کیا جائے۔

"واتقوا اللہ واعلموا ان اللہ بما تعملون بصیر۔"

بعض اوقات عورت اور مرد کے مابین اختلافات انتقامی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں ان کی اپنی یا بے چارے بچوں کی زندگی خطرے سے دوچار ہو جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف کوئی سازش کر رہے ہوں لہٰذا ان تمام احکام کے آخر میں فرماتا ہے: خدا سے ڈرو اور پرہیزگاری اختیار کرو اور جان لو کہ خدا تمہارے تمام اعمال کو دیکھتا ہے اور وہ بینا ہے۔

۲۳۴- وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ○



ترجمہ

۲۳۴۔ اور تم سے جو لوگ وفات پا جاتے ہیں اور اپنی بیویاں پیچھے چھوڑ جاتے ہیں تو ان بیویوں کو چار مہینے اور دس دن انتظار کرنا چاہیے (اور عدت گزارنا چاہیے) اور جب وہ یہ مدت پوری کر چکیں تو تم پر اس کا کوئی گناہ نہیں وہ اپنے بارے میں جو چاہیں مناسب طور پر انجام دیں (اور اپنی خواہش کے مطابق کسی سے نکاح کر لیں) اور تم جو کچھ عمل کرتے ہو خدا اس سے آگاہ ہے۔

تفسیر

شوہر کی وفات کے بعد دوسری شادی عورت کے لیے بنیادی اور مشکل مسائل میں سے ہے۔ پہلے شوہر کی وفات کے بعد فوری طور پر دوسری شادی کرنا سابق شوہر کی محبت، دوستی اور احترام کے منافی ہے۔ نیز یہ یقین پیدا کرنا بھی ضروری ہے کہ عورت کا رحم پہلے شوہر کے نطفے سے خالی ہے۔ علاوہ ازیں فوری طور پر دوسری شادی مرنے والے کے لواحقین کے جذبات کے مجروح ہونے کا سبب بھی ہے لہٰذا مندرجہ بالا آیت میں عورتوں کے لیے یہ شرط عائد کی گئی ہے کہ نئے نکاح کے لیے چار مہینے اور دس دن کی عدت گزاریں۔

شوہر کے مرنے کے بعد بھی ازدواجی زندگی کے حریم کا احترام ایک فطری امر ہے۔ اس لیے مختلف قبائل میں اس مقصد کے لیے طرح طرح کے آداب و رسوم رہے ہیں اگرچہ بعض اوقات یہ بات زیادتی اور افراط کی شکل اختیار کر جاتی ہے اور عملی طور پر عورتیں قید و بند میں ڈال دی جاتی ہیں۔ بعض اوقات تو ایسی عورتوں پر بہت زیادہ ظلم روا رکھا جاتا رہا ہے۔ بعض لوگ تو شوہر کے انتقال کے بعد عورت کو جلا دیتے تھے یا مرد کے ساتھ ہی زندہ دفن کر دیتے تھے۔

لوگوں میں یہ رسم بھی رہی ہے کہ عورت کو نئی شادی سے یکسر محروم کر کے گوشہ نشینی پر مجبور کر دیا جاتا۔ بعض قبائل میں یہ رواج تھا کہ شوہر کے انتقال کے بعد عورت ایک مدت تک سیاہ اور بوسیدہ خیمہ قبر شوہر پر لگاتی اور اس میں پھٹے پرانے اور کثیف لباس میں وقت گزارتی، ہر طرح کی آرائش و زیور یہاں تک کہ نہانے دھونے سے بھی دور رہتی اور یونہی اس کے شب و روز گزر جاتے۔[1]

زیر نظر آیت نے ان تمام خرافات پر خط بطلان کھینچ دیا ہے اور شائستہ طور پر حریم زوجیت کی بنیاد کی حفاظت کے لیے "عدت" مقرر کر دی ہے۔

"والّذین یتوفون منکم و یذرون ازواجًا یتربصن بانفسھن اربعۃ اشھر و عشرًا"۔

لفظ "توفّٰی" قرآن میں بہت سے مواقع پر استعمال ہوا ہے۔ اس کا معنی ہے "گرفت میں لینا" لفظ "یذر" ماضی کا صیغہ نہیں ہے اور اس کا معنی ہے "چھوڑنا"۔ آیت کہتی ہے: جن عورتوں کے شوہر چل بستے ہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ چار مہینے اور دس دن عدت میں رہیں اور اس عرصے میں نئی شادی سے اجتناب کریں۔

---

[1] اسلام و عقائد بشری



رہبرانِ اسلام سے ہم تک پہنچنے والی روایات کے مطابق عورتوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس مدت میں حالتِ سوگواری میں رہیں یعنی آرائش وزیبائش ہرگز نہ کریں اور سادگی میں رہیں۔ عدت مقرر کرنے کا فلسفہ بھی اس بات کو ضروری قرار دیتا ہے۔ اسلام نے عورتوں کو زمانہ جاہلیت کے آداب ورسوم سے اس حد تک نجات بخشی کہ بعض لوگوں نے خیال کیا کہ شاید وہ اِس عدت کے دوران میں بھی شادی کر سکتی ہیں۔ جن عورتوں کا یہ خیال تھا اُنہی میں سے ایک عورت پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ وہ نئی شادی کے لیے اجازت کی طلب گار تھی۔ اُس نے پیغمبر اکرمؐ سے سوال کیا:

"کیا آپ اجازت دیتے ہیں کہ میں سُرمہ لگاؤں اور اپنے آپ کو آراستہ وپیراستہ کروں؟

آنحضرتؐ نے فرمایا: تم عورتیں بھی عجیب وغریب مخلوق ہو۔ اسلام سے پہلے تو وفاتِ شوہر کے بعد مدتِ عدت سخت ترین حالات میں بھی پورا کرتی تھیں یہاں تک کہ بعض اوقات مرتے دم تک یہ مدت تمہارے ساتھ چلتی تھی۔ اب جب کہ خاندان کے احترام اور حقِ زوجیت کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے حکم دیا گیا ہے کہ تھوڑی سی مدت صبر کر لو تو اب اسے بھی برداشت نہیں کرتی ہو[1]

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اسلام میں اس بات کی تصریح کی جا چکی ہے کہ اگر عورت کے حاملہ ہونے کا کوئی احتمال نہ بھی ہو پھر بھی اُسے شوہر کی وفات کے بعد عدت پوری کرنا چاہیے۔ اسی لیے عورت کے لیے عدت کی ابتداء شوہر کی وفات سے نہیں ہوتی بلکہ یہ مدت اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب عورت کو شوہر کے انتقال کی خبر ملے۔ چاہے یہ خبر کئی ماہ کے بعد ہی کیوں نہ ملے۔ اِس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس حکم کی تشریع ہر چیز سے پہلے زوجیت کے احترام وحریم کی حفاظت کے لیے ہے اگرچہ احتمالی طور پر عورت کا حاملہ ہونا بھی اس قانون میں ضمنی طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے۔

"فاذا بلغن اجلھن فلا جناح علیکم فیما فعلن فی انفسھن بالمعروف"

"بلوغ اجل" کا مفہوم ہے "مہلت کا انجام کو پہنچنا" آیت کے اس حصے کے مطابق اِس مدتِ عدت کے خاتمے پر عورتیں اپنی خواہش کے مطابق شادی کر سکتی ہیں۔

بعض اوقات اولیاء خرافات اور موہوم افکار کی بناء پر عورت کے نکاحِ ثانی میں حائل ہوتے ہیں اس لیے آیت انہیں مخاطب کرکے کہتی ہے: اِس سلسلے میں اب تمہاری کوئی ذمہ داری نہیں، تم انہیں چھوڑ دو کہ وہ اپنی پسند کے مردوں سے رشتۂ نکاح صحیح بنیاد پر قائم کر لیں۔

"واللّٰہ بما تعملون خبیر"

اور اولاد کے امور کے بارے میں دخل اندازی نہ کریں کیونکہ پروردگار تمام چیزوں سے باخبر ہے اور وہ ہر شخص کو اس کے اچھے اور بُرے اعمال کی جزا دے گا۔

۲۳۵۔ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۚ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ

[1] المنار ج ۲۔



سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ؕ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِىْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝

ترجمہ

۲۳۵۔ اور اس بات کا تم پر کوئی گناہ نہیں اور اس میں کوئی حرج نہیں کہ اشارے کنائے سے تم ان عورتوں سے، خواستگاری کرو (جن کے شوہر وفات پا چکے ہیں) یا بلا اظہار دل میں اس کے لیے پختہ ارادہ کرلو۔ خدا جانتا تھا کہ تم ان کی یاد میں گرفتار ہو جاؤ گے (اور وہ معقول طریقے سے ظاہر ہونے والی تمہاری فطری خواہش کا مخالف نہیں)، لیکن ان سے پوشیدہ طور پر مباشرت کا وعدہ نہ کرو ہاں مگر (کنایہ کے طور پر) پسندیدہ طریقے سے اظہار کرو (لیکن ہر حالت میں) ان کی عدت ختم ہونے تک شادی کا اقدام نہ کرو اور جان لو کہ جو کچھ تمہارے دل میں ہے خدا اُسے جانتا ہے۔ اس کی مخالفت سے ڈرو اور جان لو کہ خدا بخشنے والا اور بردبار ہے (اور بندوں کو سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا)۔

تفسیر

کیا دورانِ عدت عورتوں سے خواستگاری کی جاسکتی ہے؟

قرآن یہ چاہتا ہے کہ سابق زوجیت کا احترام بھی زائل نہ ہو اور نہ ہی عورت اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے سے محروم رہے۔ اس بناء پر اس سلسلے میں مندرجہ بالا آیت میں ایک قابل توجہ حکم دیا ہے جو عادلانہ بھی ہے اور اس میں طرفین کا مکمل احترام بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ آیت کہتی ہے کہ اگر کوئی شخص دورانِ عدت عورت سے خواستگاری کرنا چاہے تو اس میں کوئی حرج نہیں لیکن وہ پوشیدہ طور پر اور اشارہ وکنایہ کی صورت میں ہو نہ کہ آشکار اور صریح (ولا جناح علیکم فیما عرضتم بہ من خطبۃ النساء۔)

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے کہ بغیر اظہار کے (جس میں صراحت ہو نہ کنایہ) ان سے عدتِ وفات کے بعد نکاح کرنے کے ارادے میں بھی کوئی گناہ نہیں (اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِىْٓ اَنْفُسِكُمْ)۔

عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ

آیت کے اس حصے کے مطابق یہ حکم اس بناء پر ہے کہ اُن کے شوہروں کے اس دنیا سے اجل لینے کے بعد یہ فطری امر ہے کہ بعض افراد اُن سے شادی کرنے کی فکر میں پڑجاتے ہیں اور چونکہ اسلام فطری اور معقول خواہشات کی مخالفت نہیں کرتا



لہٰذا اس نکر کو وہ گناہ شمار نہیں کرتا۔

"وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا"

آیت کے اس حصے میں سمجھایا گیا ہے کہ کھلے بندوں خواستگاری ہی سے رکنا کافی نہیں بلکہ مخفی طور پر عدت کے دوران میں عورت سے بالصراحت خواستگاری نہیں کرنا چاہیئے البتہ اس سلسلے میں گفتگو واقعاً اس طرح ہو کہ معاشرتی آداب اور فوت شدہ شوہر کے احترام سے ہم آہنگ ہو۔ قرآن کی اصطلاح میں "معروف" یعنی پسندیدہ ہو۔ اس سے مراد یہ ہے کہ پردے اور کنائے سے ہو۔

اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں رہبران اسلام نے سر بستہ خواستگاری اور قول معروف کی وضاحت کے لیے کئی ایک مثالیں ارشاد فرمائی ہیں جو ہم بطور نمونہ درج کرتے ہیں۔

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں

قول معروف یہ ہے کہ شلاً مرد جس عورت کو نگاہ میں رکھے ہوئے ہے اس سے کہے کہ میں عورتوں کا احترام کرتا ہوں۔ تم سے دلی لگاؤ رکھتا ہوں اس لیے کسی اور کو مجھ پر ترجیح نہ دینا ؎۱

"ولا تعزموا عقدة النكاح حتّٰى يبلغ الكتاب اجله......"

آیت کے اس حصے میں صراحت سے فرمایا گیا ہے کہ جب تک عدت ختم نہ ہو نکاح نہ کیا جائے۔

اس کے بعد مزید ارشاد فرمایا گیا ہے کہ خدا تمہارے مخفی بھیدوں سے آگاہ ہے لہٰذا اس کے فرمان کی مخالفت سے ڈرتے رہو۔ لیکن خدا یہ بھی نہیں چاہتا کہ جو بندے کبھی کبھار اس کی مخالفت کر بیٹھیں وہ بالکل اس کی رحمت سے مایوس ہو جائیں۔ لہٰذا فرماتا ہے: جان لو کہ خدا بخشنے والا ہے اور وہ بندوں کو سزا دینے میں جلد بازی سے کام نہیں لیتا۔

"واعلموا انّ الله يعلم ما فى انفسكم فاحذروه واعلموا انّ الله غفور حليم."

۲۳۶۔ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۖ وَّمَتِّعُوْهُنَّ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ○

ترجمہ

۲۳۶۔ اگر مباشرت اور تعیین مہر سے قبل (لوجوہ) عورتوں کو طلاق دے دو تو تم پر کوئی گناہ نہیں (اس موقع پر) انہیں (مناسب ہدیہ کی صورت میں) بہرہ مند کرو۔ جو شخص طاقت رکھتا ہے وہ اس کے

؎۱ نور الثقلین ج ۱۔ اس آیت کی ذیل میں۔



مطابق اور جو تنگ دست ہے وہ اپنے حسبِ حال شائستہ ہدیہ (جو لینے والے اور دینے والے دونوں کے شایانِ شان ہو) دے اور یہ نیکوکاروں کے لیے ضروری ہے۔

تفسیر

لغت میں "مس" کا معنی ہے "چھونا"۔ یہاں مباشرت کے عمل سے کنایہ ہے۔ زیرِ نظر آیت دو نکات پر مشتمل ہے

ا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ مباشرت اور تعیینِ حقِ مہر سے قبل طلاق دینا صحیح نہیں۔ آیت نے اُن کے خیال کی تردید کی ہے اور فرمایا ہے کہ اس میں کسی قسم کا کوئی حرج نہیں ہے۔

"لا جناح علیکم ان طلقتم النساء ما لم تمسوھن او تفرضوا لھن فریضۃ"

البتہ اس کی صورت یہ ہے کہ طرفین عقد کے بعد مباشرت سے قبل کسی ایک وجود کی بنیاد پر یہ سمجھیں کہ وہ ایک ساتھ زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ اس موقع پر طرفین طلاق کے ذریعے ایک دوسرے سے جدا ہو سکتے ہیں۔

۲۔ مباشرت سے قبل طلاق کی صورت میں اگر حقِ مہر معین شدہ نہ ہو تو ایسا ہدیہ جو کہ عورت کے شایانِ شان ہو اُسے ادا کیا جائے (متعوھن)۔

حقِ مہر معین ہو چکا ہو تو اس صورت میں کیا کرنا چاہیے؟ اس کی وضاحت اگلی آیت میں آئے گی۔ اس بیان کے مطابق لفظ "او" "واؤ" کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

ہدیہ دینے کے بارے میں لوگوں کی طاقت اور استطاعت کو مدِنظر رکھتے ہوئے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے:

"علی الموسع قدرہ و علی المقتر قدرہ"

"موسع" کا معنی ہے "تونگر" اور "مقتر" کا معنی ہے "تنگدست"[1] اس لیے آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ صاحبِ ثروت اپنی حیثیت کے مطابق اور تنگدست اپنی استطاعت کے مطابق ہدیہ ادا کرے۔

"متاعًا بالمعروف" یعنی یہ ہدیہ شائستہ طور پر ہو۔ اسراف و بخل دونوں سے پاک ہو۔ دینے والے اور لینے والے ہر دو کے حسبِ حال ہو۔

یہ ہدیہ اہم تاثیر کا حامل ہے۔ جذبہ انتقام کو ختم کرنے اور عورت کو کئی ایک مشکلات سے بچانے کے لیے یہ اہم کردار ادا کر سکتا ہے (یہ مشکلات اس رشتہ ازدواج کے ٹوٹنے سے پیدا ہو سکتی ہیں) لہٰذا آیت میں اس عمل کو نیکی اور احسان کے جذبے سے وابستہ کر دیا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے "(حقًا علی المحسنین) یعنی نیک لوگوں کے لیے یہ عمل ضروری ہے۔ یعنی اسے نیکی اور صلح و صفائی کے جذبے سے سرشار ہونا چاہیے۔

یہ بات بن کہے بھی واضح ہے کہ "محسنین" کی تعبیر کا یہ مقصد نہیں کہ مذکورہ ہر حکم الزامی و ضروری نہیں بلکہ اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے لوگوں کے جذبات و احساسات کو تحریک دینے کے لیے یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے ورنہ جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے یہ حکم بجا لانا لازمی اور ضروری ہے۔

[1] "قتر" کا مادہ بخل کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسے "وکان الانسان قتورا" لیکن یہاں زیرِ نظر آیت میں یہ معنی مراد نہیں۔



دوسرا اہم نکتہ جو اس آیت سے سامنے آتا ہے یہ ہے کہ مرد کی طرف سے عورت کو دیے جانے والے اس ہدیے کو "متاع" کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔ لغت میں متاع کا معنی ہے وہ چیزیں جن سے انسان فائدہ اٹھاتا ہے اور ان سے متمتع ہوتا ہے۔ یہ لفظ زیادہ تر نقدی کے علاوہ چیزوں پر بولا جاتا ہے کیونکہ روپے پیسے سے براہ راست فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا بلکہ ضروری ہے کہ وہ متاع میں تبدیل ہو۔ اسی بنا پر قرآن ہدیے کو متاع سے تعبیر کرتا ہے۔

یہ بات نفسیاتی طور پر خاص اثر رکھتی ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ وہ ہدیہ جو قابل استعمال اجناس کی صورت میں ہو مثلاً خوراک، لباس وغیرہ کتنا ہی کم قیمت کیوں نہ ہو دل و دماغ پر ایسا اثر ڈالتا ہے کہ اگر انہیں نقدی میں تبدیل کر دیا جائے تو وہ ہرگز نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ائمہ اطہار علیہم السلام سے پہنچنے والی روایات میں زیادہ تر لباس، غذائی اجناس اور زرعی زمین جیسی چیزوں کا ہدیے کے نمونوں کے طور پر ذکر آیا ہے۔

ضمناً آیت سے یہ بھی اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ نکاح دائمی میں پہلے سے حق مہر کا معین ہونا ضروری نہیں اور طرفین میں بعد ازاں بھی اس پر اتفاق ہو سکتا ہے۔[1]

آیت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مہر معین ہونے اور مباشرت سے پہلے طلاق ہو جائے تو حق مہر واجب نہیں ہوگا اور مذکورہ ہدیہ حق مہر کا قائم مقام ہو جائے گا۔

۲۳۷۔ وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۚ وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۚ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ○

ترجمہ

۲۳۷۔ اور اگر عورتوں کو چھونے (اور ان سے ہمبستری کرنے) سے قبل طلاق دے دو جب کہ حق مہر معین ہو چکا ہو تو (ضروری ہے کہ) معین شدہ کا نصف (انہیں دے دو) مگر یہ کہ وہ (اپنا حق) بخش دیں یا (اگر وہ صغیر اور سفیہ ہیں تو ان کا حق) جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے اسے بخش دے اور اگر تم درگذر کرو (اور تمام مہر انہیں ادا کر دو) تو پرہیزگاری کے زیادہ نزدیک ہے۔ نیز درگذر اور پرہیزگاری کو اپنے درمیان سے فراموش نہ کرو کیونکہ تم جو کچھ انجام دیتے ہو خداوند عالم اس سے بینا ہے۔

---

[1] لیکن اگر عقد دائمی میں مہر معین نہ کیا گیا ہو تو مہر ساقط نہیں ہو جاتا بلکہ مہر مثل (وہ مہر جو اس جیسی عورتوں کو دیا جاتا ہے) ہی مقرر سمجھا جائے گا۔ مباشرت سے پہلے طلاق کی صورت میں اگر مہر معین نہ ہو تو صرف ہدیہ واجب ہوگا جس کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے۔



تفسیر

اِس آیت میں بھی طلاق کے بارے میں حکم بیان کیا گیا ہے۔ گذشتہ صورت کی طرح اگر مباشرت کا عمل نہیں ہوا لیکن حق مہر معین ہو چکا ہے تو اس سلسلے میں آیت پہلے قانونِ اسلام کی نگاہ میں جو حکم ہے اسے بیان کرتی ہے اور وہ یہ کہ مرد کو چاہیئے کہ مقرر شدہ حق مہر سے آدھا ادا کرے (" فنصف ما فرضتم ")۔ قانونی حکم جو اجتماعی نظام کی حقیقی بنیاد ہے اسے بیان کرنے کے بعد اخلاقی پہلو بیان کئے گئے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: آدھے حق مہر کی ادائیگی کا حکم تو عفو اور بخشش سے صرف نظر کرتے ہوئے ہے لیکن اگر عورت اپنے مسلمہ حق سے درگزر کرے تو پھر شوہر پر کچھ واجب نہیں ہے۔ اِسی طرح اگر جس کے ہاتھ میں نکاح کا معاملہ ہے وہ حق مہر سے چشم پوشی کرلے تو شوہر پر کوئی چیز واجب نہیں ہوگی۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ " الذی بیدہ عقدۃ النکاح " (یعنی جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے) اس سے کون شخص مراد ہے۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اس سے مراد شوہر ہے۔ لیکن آیت پر غور و خوض کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس سے عورت کے اولیاء مراد ہیں۔

ابتداء سے روئے سخن کیونکہ شوہروں کی طرف ہے اس لیے فرمایا ہے " و ان طلقتموھن " اگر تم انہیں طلاق دے دو) اور آیت کے آخر میں بھی روئے سخن شوہروں کی طرف ہے " وان تعفوا اقرب للتقوٰی " اگر تم معاف کر دو تو یہ پرہیزگاری کے زیادہ نزدیک ہے) اس لیئے او یعفو الذی بیدہ عقدۃ النکاح " کا جملہ جو فعل غائب کی شکل میں ہے یقیناً شوہروں سے مربوط نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس سے مقصود عورت کے اولیاء ہی ہیں۔ وہی حق مہر کے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ مثلاً اگر بیوی نادان یا بچی ہو تو اس صورت میں اولیاء حق مہر بخشنے یا لینے کے بارے میں اس کے منافع کو پیش نظر رکھتے ہوئے فیصلہ کر سکتے ہیں۔

معصوم پیشواؤں سے مروی روایات میں بھی آیت کا یہی مفہوم بیان کیا گیا ہے۔ شیعہ مفسرین نے بھی آیت کے مضمون اور روایات اہل بیتؑ کو مدنظر رکھتے ہوئے اسی نظریے کو انتخاب کیا ہے اور ان کے نزدیک بھی اس عبارت سے بیوی کے اولیاء مراد ہیں۔

" و ان تعفوا اقرب للتقوٰی "۔ یہ جملہ مرد اور اس کے انسانی فرائض کے بارے میں ایک اور حکم بیان کرتا ہے اور وہ یہ کہ بہتر ہے مرد درگزر کی راہ اپنائے اور اگر تمام حق مہر ادا کر چکا ہے تو اس میں سے کچھ واپس نہ لے اور اگر ادا نہیں کیا تو سارے کا سارا ادا کر دے اور اپنے آدھے حق سے صرف نظر کرلے۔ آیت کے اس حصے میں بتایا گیا ہے کہ اگر مرد عفو اور درگذر سے کام لے تو یہ پرہیزگاری کے نزدیک ہے۔

عقد کے بعد اور رخصتی سے قبل شوہر سے جدا ہو جانے والی لڑکی اور عورت بہت سی معاشرتی اور نفسیاتی مشکلات سے دوچار ہو جاتی ہے اور مسلّم ہے کہ مرد اگر درگذر سے کام لے اور تمام حق مہر ادا کر دے تو یہ اس کے زخموں کے لیے ایک طرح کا مرہم ہو سکتا ہے۔



"ولا تنسوا الفضل بینکم ان اللہ بما تعملون بصیر"

اسلام چاہتا ہے کہ جدائی اور علیحدگی کا مرحلہ بھی "معروف" اور "احسان" کی بنیاد پر انجام پذیر ہو۔ یعنی انتقام ہی سے خالی نہ ہو بلکہ مرد اور عورت دونوں عظمت و بزرگی کی روح کو بھی فراموش نہ کریں۔ فرماتا ہے: اپنے درمیان سے کبھی نیکی، عظمت اور احسان کو فراموش نہ کرو۔ کیونکہ خدا تمہارے اعمال کو دیکھنے والا ہے۔

۲۳۸۔ حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلَوٰةِ الْوُسْطَىٰ وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ ○

۲۳۹۔ فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا فَإِذَا أَمِنتُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا عَلَّمَكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ○

ترجمہ

۲۳۸۔ تمام نمازوں کی انجام دہی اور (خصوصاً) نمازِ وسطیٰ (نمازِ ظہر) کی ادائیگی میں کوشاں رہو اور خضوع و اطاعت کے ساتھ خدا کے لیے قیام کرو۔

۲۳۹۔ اور اگر (جنگ یا کسی اور خطرے کی وجہ سے) تمہیں خوف ہو تو (نماز کو) پیادہ یا سواری کی حالت میں انجام دو لیکن جب حالت امن لوٹ آئے تو خدا کو یاد کرو (اور نماز کو معمول کے مطابق ادا کرو) جیسا کہ اس نے تمہیں ان چیزوں کی تعلیم دی ہے جنہیں تم نہیں جانتے تھے۔

شانِ نزول

بعض منافقین نے گرمی کا بہانہ تراشا اور مسلمانوں کی صفوں میں تفرقہ ڈالنے کے لیے وہ نماز باجماعت میں شرکت نہیں کرتے تھے۔ ان کے دیکھا دیکھی اور لوگوں نے بھی جماعت میں شرکت ترک کر دی۔ اس طرح مسلمانوں کی جماعت میں کمی آگئی۔ اس پر پیغمبر اکرمؐ بہت پریشان تھے۔ آپؐ نے انہیں سخت سزا کی دھمکی دی۔ زید بن ثابت سے منقول ہے کہ پیغمبر اسلام سخت ترین گرمی میں بھی دوپہر ہوتے ہی نماز ظہر جماعت کے ساتھ ادا کرتے تھے۔ یہ عمل آپؐ کے اصحاب کے لیے بہت گراں تھا۔ اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی جس میں نماز کی اہمیت بالعموم اور نماز ظہر کی اہمیت بالخصوص بیان ہوئی۔

تفسیر

نماز انسان کو خالق کائنات سے مربوط کرنے کا ایک ذریعہ ہے اور اگر وہ اپنی صحیح شرائط کے ساتھ انجام پا جائے تو دل کو عشق خدا سے معمور کر دیتی ہے اور اس کے ذریعے انسان بہتر طور پر گناہوں، آلودگیوں اور پروردگار کی نافرمانیوں سے محفوظ ہو سکتا ہے۔ لہٰذا یہ آیت تاکید کرتی ہے کہ مسلمان اس فریضہ کو قائم کرنے میں کوشاں رہیں اور خشوع و خضوع اور پوری توجہ سے بجا لائیں۔ خصوصاً نمازِ وسطیٰ کی حفاظت کریں۔



صلوٰۃ وسطیٰ کون سی نماز ہے

صلوٰۃ وسطیٰ کے بارے میں مفسرین نے مختلف آراء پیش کی ہیں لیکن ہمارے پیش نظر جو قرائن ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ اس سے مراد نماز ظہر ہی ہے۔ کیونکہ علاوہ اس کے کہ نماز ظہر دن کے وسط اور درمیان میں بجالائی جاتی ہے۔ آیت کی شان نزول بھی گواہی دیتی ہے کہ نماز ظہر کی تاکید اس لیے ہے کہ لوگ گرمی کی وجہ سے اس میں کوتاہی کرتے تھے۔ اس سے قطع نظر کئی ایک روایات میں تصریح کی گئی ہے کہ نماز وسطیٰ سے مراد نماز ظہر ہی ہے [۱]

"وقوموا للّٰہ قانتین": قنوت کے دو معانی ہیں۔

۱۔ پیروی اور اطاعت کرنا۔

۲۔ خشوع و خضوع۔

یہ بھی ممکن ہے کہ بعض اوقات دونوں معانی مراد ہوں جیسا کہ امام صادق علیہ السلام نے اس جملے کی تفسیر میں دونوں معانی بیان فرمائے ہیں۔

ایک حدیث میں ہے:

"وقوموا للّٰہ قانتین" ـــــ کا مفہوم ہے کہ نماز کو خضوع اور پروردگار کی طرف توجہ کرتے ہوئے بجا لاؤ۔

ایک اور حدیث میں ہے:

"وقوموا للّٰہ قانتین" یعنی "مطیعین" (اطاعت کرتے ہوئے)

فان خفتم فرجالاً او رکباناً۔ "رجال" یہاں "راجل" کی جمع ہے جس کا معنی ہے پا پیادہ اور "رکبان" "راکب" کی جمع ہے جس کا معنی ہے سوار یعنی میدان جنگ یا ایسے کسی اور موقع پر خوف کے عالم میں تم پیدل چلتے ہوئے یا سواری و حرکت کی حالت میں بھی نماز ادا کرتے ہو۔

اس آیت میں تاکید کی گئی ہے کہ سخت ترین حالات حتیٰ کہ جنگ میں نماز کو ترک نہیں کرنا چاہیئے۔ البتہ فرق یہ ہے کہ خطرے کی حالت میں نماز کی بہت سی شرائط ساقط ہو جاتی ہیں مثلاً قبلہ رو ہونا۔ متعارف اور معمول کے طریقے سے رکوع و سجود بجالانا اور اس قسم کی دیگر چیزیں۔ ایسی حالت میں رکوع و سجود کو اشارے سے بھی بجالایا جا سکتا ہے۔ منقول ہے کہ حضرت امیرالمومنین علیہ السلام نے حکم دیا تھا کہ جب تک جنگ ہوتی رہے ایماء اور اشارے سے نماز پڑھتے رہو۔ [۲]

ایک اور حدیث میں ہے:۔

"ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم صلی یوم الاحزاب ایماناً۔"

پیغمبر اکرمؐ نے جنگ احزاب میں اشارے سے نماز پڑھی تھی۔

---

[۱] اس بارے میں مزید تفصیلات کتب فقہ میں ملاحظہ فرمائیں۔ [۲] تفسیر نور الثقلین۔



امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے پوچھا گیا۔

اگر کوئی شخص کسی درندے کی گرفت میں آجائے اور بالکل حرکت نہ کر سکتا ہو۔ نماز کا وقت بھی تنگ ہو تو اس کی ذمہ داری کیا ہے۔

آپؑ نے فرمایا :۔

جس حالت میں ہے اسی حالت میں نماز پڑھے چاہے قبلہ کی طرف پشت ہی کیوں نہ ہو۔ [1]

اسے نمازِ خوف کہتے ہیں۔ فقہ میں اس کے بارے میں فقہاء نے مفصل بحث کی ہے۔

آیت کہتی ہے کہ نماز کا پروگرام اور دل ہر حالت میں خدا سے مربوط رہے تاکہ ہر حالت میں خدا سے دل بستگی رہے اور اسی سے انسان کی اُمید بندھی رہے تاکہ میدانِ جنگ تک میں نماز اور خدا کی طرف توجہ ترک نہ ہونے پائے۔

ہوسکتا ہے کچھ لوگ تصور کریں کہ نماز کے بارے میں اس قدر تاکید اور اصرار ایک طرح کی سخت گیری ہے اور ایسے حالات میں یہ انسان کو اپنے اہم دفاعی فرائض سے غافل کر سکتی ہے۔ دراصل یہ بہت بڑا اشتباہ ہے کیونکہ عموماً اِن حالات میں انسان ہر چیز سے زیادہ روحانی تقویت کا محتاج ہوتا ہے اور اگر خوف و ہراس، وحشت اور روحانی کمزوری اِس پر غالب آجائے تو اس کی شکست تقریباً یقینی ہوتی ہے۔ لہٰذا نماز اور خدا سے رشتہ جوڑنے سے بہتر عمل کونسا ہو سکتا ہے۔ کیونکہ تمام جہانِ ہستی پر خدا ہی کا حکم کارفرما ہے اور تمام چیزیں اس کے ارادے کے سامنے سہل، معمولی اور آسان ہیں۔ وہ طاقت رکھتا ہے کہ مجاہد سپاہیوں اور خطرے میں گھرے ہوئے لوگوں کی روح کو تقویت بخش دے۔

صدرِ اوّل کے بہت سے مجاہدات میں پیش آنے والے شواہد سے قطع نظر یہودیوں سے مسلمانوں کی حالیہ چوتھی جنگ جو اس سال (۱۳۹۳ ہجری) کے ماہ رمضان میں ہوئی کی خبروں پر نظر کریں تو معلوم ہوگا کہ نماز اور احکام اسلام کی طرف توجہ نے مسلمانوں کو بہت روحانی تقویت بخشی جو دشمنوں پر کامیابی کے لیے بہت مؤثر تھی۔

"فاذا امنتم فاذكروا الله كما علمكم مالم تكونوا تعلمون"

آیت کا یہ حصہ نشاندہی کرتا ہے کہ پیدل چلتے ہوئے اور سواری پر نماز کی ادائیگی حالتِ خوف و خطر سے مخصوص ہے اور جب امن و امان قائم ہو جائے اور راحت و آرام میسر آجائے تو پھر عام حالت کی طرح نماز ادا کرنا چاہیئے "فاذا امنتم فاذكروا الله"۔

اس کے بعد مزید ارشاد فرمایا گیا ہے کہ تم بہت سی چیزوں کو نہیں جانتے تھے اور خدا نے تمہیں ان کی تعلیم دی ہے۔ امن اور خوف میں نماز پڑھنے کا طریقہ بھی اس نے تمہیں سکھایا ہے۔ واضح ہے کہ اس تعلیم کا شکرانہ یہی ہے کہ اس کے مطابق عمل کیا جائے اور جیسا حکم دیا جائے ویسا عمل کیا جائے "كما علمكم مالم تكونوا تعلمون"۔

۲۴۰۔ وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا وَصِيَّةً لِّأَزْوَاجِهِم

[1] "وسائل الشیعہ" ج ۵، ابواب صلوة الخوف۔



مَتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِىْ مَا فَعَلْنَ فِىْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۗ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○

ترجمہ

۲۴۰۔ اور تم میں سے جو لوگ آستانۂ موت تک جا پہنچتے ہیں اور اپنی بیویاں پیچھے چھوڑ جاتے ہیں ۔ ان کے لیے وصیت کرنی چاہیئے کہ ایک سال تک انہیں (زندگی کے اخراجات سے) بہرہ مند کریں بشرطیکہ وہ (شوہر کے گھر سے) باہر نہ نکلیں (اور نئی شادی کے لیے اقدام نہ کریں) اور اگر وہ باہر چلی جائیں (تو مصارف حیات لینے کا حق نہیں رکھتیں لیکن) ان پر اس بارے میں کوئی گناہ (بھی) نہیں کہ وہ اپنے لیے کوئی شائستہ اقدام کریں اور خدا توانا و حکیم ہے ۔

تفسیر

آیت کے پہلے حصے میں حکم دیا گیا ہے کہ وہ لوگ جو موت کے آستانے تک جا پہنچیں اور اپنی بیویاں پیچھے چھوڑ جائیں تو انہیں وصیت کرنا چاہیے کہ ان کے پسماندگان ایک سال تک ان کے مال سے ان کی بیویوں کے اخراجات ادا کریں ۔ اس لیے لفظ "یتوفون" مرنے کے معنی میں نہیں بلکہ ذکر وصیت کے قرینہ سے موت کے آستانے پر جا پہنچنا مراد ہے البتہ اس شرط کے ساتھ کہ عورت بھی شوہر کی موت کے بعد ایک سال تک اس کے گھر میں رہے اور اس سے باہر نہ نکلے "غیر اخراج"

"فان خرجن فلا جناح علیکم فیما فعلن فی انفسھن".

یہ جملہ دو معانی پر منطبق ہوسکتا ہے ۔

۱۔ عورت کا حق ہے کہ مرد کے وارث ایک سال تک اس کے مصارف ادا کریں لیکن اگر عورت اپنی خوشی سے ایک سال کا خرچ نہ لے اور شوہر کے گھر میں بھی نہ رہے تو پھر کوئی اس کا جواب دہ نہیں ہے اور اگر عورت دوسری شادی کرے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں ۔ اس تفسیر کے مطابق آیت میں اجازت دی گئی ہے کہ عورت پہلے سال کے دوران میں نان نفقہ سے صرف نظر کرکے سابق شوہر کے گھر سے چلی جائے ۔

۲۔ اگر عورت ایک سال تک صبر کرے اور یہ مدت پوری کرنے کے بعد شوہر کے گھر سے نکلے اور پھر نئی شادی کرے تو کوئی حرج نہیں ۔

دوسرے معنی کے مطابق ایک سال تک کی مدت گزارنا عورت پر لازمی ہے دوسرے لفظوں میں ایک سال تک مکمل عدت گزارنا عورت کے لیے "حکم" کی حیثیت رکھتا ہے نہ کہ یہ اس کا حق ہے جیسا کہ پہلے مفہوم میں ظاہر



ہوتا ہے ۔اب دیکھنا یہ ہے کہ ان میں سے کونسی تفسیر آیت کے مفہوم سے میل کھاتی ہے اور مناسب ہے۔

کیا یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے؟

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ آیت اسی سورہ کی آیت ۲۳۴ کے ذریعے منسوخ ہوگئی ہے ۔اس میں عدتِ وفات چار ماہ اور دس دن معین کی گئی ہے۔ اگرچہ وہ آیت تنظیم اور ترتیب کے اعتبار سے پہلے آئی ہے ۔لیکن ہم جانتے ہیں کہ سورتوں کی آیات کی تنظیم تاریخ نزول کے مطابق نہیں ہے ۔بلکہ بعض اوقات وہ آیات جو بعد میں نازل ہوئی ہیں سورہ کے آخر میں ہیں اور ایسا آیات کی مناسبت کے اعتبار سے کیا گیا ہے اور یہ فرمان پیغمبرؐ کے مطابق ہی ہے اس کی وضاحت یہ ہے کہ جیسا آیت ۲۳۴ کی تفسیر میں گزر چکا ہے زمانہ جاہلیت میں عدتِ وفات ایک سال سمجھی جاتی تھی اور اس مدت میں عورت کے لیے خرافات پر مبنی اور تکلیف دہ رسوم رائج تھیں ۔اسلام نے جاہلیت کی اس رسم کو ختم کر دیا۔ پہلے عدت کو ایک سال کے لیے قرار دیا بعد ازاں اس ایک سال کی مدت کو ختم کر کے چار مہینے اور دس دن کی عدت معین کی اور اس عرصے میں عورت کو صرف زیب و زینت سے منع کیا گیا۔

لیکن آیت کی منسوخی کے بارے میں یہ دلائل قابل قبول نہیں کیونکہ نسخ تو اس وقت ہو سکتا ہے جب ہم آیت کے دوسرے معنی مراد لیں یعنی اس آیت کا مفہوم یہ سمجھیں کہ ایک سال تک گھر سے نہ نکلنا عورت کے ذمے فرض ہے، یہ عورت کا حق نہیں ہے ۔اگر پہلا مفہوم مراد لیا جائے جب کہ وہ آیت سے بہت زیادہ مناسبت بھی رکھتا ہے تو پھر نسخ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کیونکہ اس آیت میں اخراجات کے حصول اور مکان سے فائدہ اٹھانے کو ایک سال تک کی عدت سے مشروط کر دیا ہے ۔اس میں عورت کو حق دیا گیا ہے کہ اگر وہ چاہے تو چار ماہ اور دس دن بعد شوہر کے گھر سے چلی جائے اور نئی شادی کرلے لہٰذا اس صورت میں فطری طور پر اس کی زندگی کے مصارف پہلے شوہر کے مال سے منقطع ہو جائیں گے ۔

اصطلاح کی رُو سے چار ماہ دس دن کی عدت رکھنا عورت کے لیے ایک حکم الزامی ہے اور اس میں عورت کا انتخاب کوئی اثر نہیں رکھتا البتہ ایک سال تک اسے جاری رکھنا یہ عورت کا حق ہے اور وہ اس حق سے استفادہ کر سکتی ہے اور یہ عدت اختیار کر کے اپنے لیے اخراجات حاصل کر سکتی ہے اور اُسے یہ بھی حق پہنچتا ہے کہ ان سے صرف نظر کر کے شوہر کے گھر سے چلی جائے اور نئی شادی کر لے ۔

"مِنْ مَّعْرُوْفٍ ." یہ تعبیر اس بات کی طرف کو اشارہ ہے کہ عورتیں مجاز ہیں کہ ہر شائستہ اور مناسب اقدام کر سکیں (یہاں اس سے مراد شادی کرنا ہے)، اور اس سلسلے میں انہیں مکمل آزادی حاصل ہے ۔

"وَاللّٰہُ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ." آیت کے آخر میں اس بناء پر کہ ایسی عورتیں اپنی آئندہ کی زندگی سے پریشان نہ ہوں، ان کی دلجوئی کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے : خدا قادر ہے کہ پہلے شوہر کی وفات کے بعد ان کے لیے کوئی اور راہ کھول دے اور انہیں کوئی مصیبت پہنچی ہے تو اس میں کوئی حکمت تھی ۔ خلاصہ یہ کہ اگر خداوند



عالم حکمت کی وجہ سے ایک دروازہ بند کرتا ہے تو اپنے لطف وکرم سے دوسرا کھول دیتا ہے اور پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

۲۴۱۔ وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ○

۲۴۲۔ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيَاتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ○

ترجمہ

۲۴۱۔ (شوہر کی طرف سے) تمام مطلقہ عورتوں کو ہدیہ دیا جانا مناسب ہے۔ یہ پرہیزگار مردوں پر حق ہے۔

۲۴۲۔ اس طرح خدا اپنی آیات تمہارے سامنے بیان کرتا ہے کہ شاید تم غور وفکر کرو۔

تفسیر

جیسا کہ پہلے اشارہ ہو چکا ہے ایسے مواقع پر متاع سے مراد ہدیہ ہے جو مرد عورت کو طلاق کے بعد دیتا ہے۔ یہ آیت احکام طلاق کا خاتمہ ہے اسمیں بھی جذبۂ انتقام کو زیادہ سے زیادہ ختم کرنے کے لیے اور بغض وکینہ کے خاتمے کے لیے مطلقہ عورتوں کے بارے میں پھر سفارش کی گئی ہے۔ آیت کہتی ہے کہ مردوں کے فرائض میں داخل ہے کہ جب اپنی بیوی کو طلاق دیں تو انہیں ہدیہ پیش کریں اور یہ فریضہ تمام پرہیزگار مردوں پر عائد کیا گیا ہے۔ البتہ اس آیت کا ظاہری مفہوم سب عورتوں کے بارے میں ہے لیکن جیسا کہ آیت ۲۳۶ میں کہا جا چکا ہے کہ ہدیہ دینا صرف اس صورت میں واجب ہے کہ حق مہر معین نہ ہوا ہو اور رخصتی بھی نہ ہوئی ہو۔ اس بنا پر یہ حکم باقی صورتوں کے لیے مستحب ہوگا۔ دراصل اسلام کا یہ حکم انسانی پہلو کا حامل ہے۔

"كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيَاتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ"

آیات اور اسلامی روایات کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ عقل کا ذکر زیادہ تر ایسے مواقع پر آتا ہے جہاں فہم وادراک کا تعلق عواطف واحساسات سے بھی ہو اور اس کے بعد عمل کا موقع ہو مثلاً قرآن خداشناسی کے بہت سے مباحث میں اس عجیب وغریب جہان کے نظام کو بیان کرتا ہے اور اس کے بعد کہتا ہے کہ ہم ان آیات اور نشانیوں کو اس لیے بیان کرتے ہیں کہ ("لعلكم تعقلون") شاید تم تعقل وتفکر کرو تو اس سے مقصود یہ نہیں کہ فقط نظام طبیعت کی معلومات کو دماغ میں جگہ دو۔ کیونکہ طبیعی ومادی علوم کے ساتھ دل اور احساس کا تعلق پیدا نہ ہو اور خالق کائنات کی محبت، دوستی اور آشنائی میں یہ کام نہ آئیں تو پھر مسائل توحید اور خداشناسی سے ان کا کوئی ربط نہ ہوگا۔

اس طرح عملی پہلو رکھنے والی معلومات بھی ہیں۔ ان پر بھی تعقل کا اطلاق اسی صورت میں ہوگا جب وہ عملی پہلو



کی حامل ہوں گی۔

تفسیر المیزان میں ہے کہ تعقل وہاں بولا جاتا ہے جہاں فہم وادراک کے بعد انسان مرحلۂ عمل میں داخل ہو۔

وَقَالُوْا "لو کنا نسمع او نعقل ما کنا فی اصحاب السعیر"

اور دوزخی کہیں گے کہ اگر ہمارے سننے والے کان ہوتے اور تعقل کرتے
تو اہل جہنم کی صف میں نہ ہوتے۔ (ملک - ۱۰)

"افلم یسیروا فی الارض فتکون لھم قلوب یعقلون بھا"

کیا انہوں نے زمین میں سیروسیاحت نہیں کی تاکہ اس کے ذریعے
ان کے دل سمجھ لیتے۔ (حج - ۴۶)

ایسی آیات گواہ ہیں کہ اگر مجرم قیامت کے دن دنیا میں تعقل کرنے کی آرزو کریں گے تو اس سے مراد وہ تعقل ہے جس میں عمل شامل ہے۔ اس طرح جب خدا کہتا ہے کہ لوگ سیروسیاحت کریں اور غوروفکر کے ذریعے اور دُنیا کی کیفیت و وضعیت کے مطالعے سے کچھ چیزیں سمجھیں تو اس سے مراد بھی ایسا فہم وادراک ہے جس کی مدد سے اپنا راستہ بدل لیں اور سیدھی راہ پر گامزن ہوں۔

۲۴۳۔ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ وَھُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَھُمُ اللّٰہُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْیَاھُمْ اِنَّ اللّٰہَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَی النَّاسِ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْکُرُوْنَ ○

ترجمہ

۲۴۳۔ کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو موت کے خوف سے اپنے گھروں سے بھاگ کھڑے ہوئے اور وہ ہزاروں افراد تھے (جنہوں نے طاعون کی بیماری کا بہانہ کرکے میدان جہاد میں شرکت سے پہلوتہی کی) خدا نے اُن سے کہا کہ مرجاؤ (اور جس بیماری کا اُنہوں نے بہانہ کیا تھا اُسی سے وہ مرگئے) خدا نے پھر اُنہیں زندہ کیا (اور ان کی اس زندگی کے واقعے کو آنے والوں کے لیے عبرت قرار دیا) خدا تو اپنے بندوں پر احسان کرتا ہے لیکن زیادہ تر لوگ شکر بجا نہیں لاتے۔

شانِ نزول

شام کے ایک شہر میں طاعون کی بیماری پیدا ہوگئی۔ بڑی عجیب اور سرسام آور تیزی سے لوگ مرنے لگے کچھ لوگ موت سے بچنے کے لیے وہ شہر اور علاقہ چھوڑ گئے۔ علاقے سے فرار اور موت سے نجات نے اُن میں یہ



احساس پیدا کر دیا کہ وہ بہت قدرت و استقلال کے مالک ہیں۔ ارادۂ الٰہی سے بے پرواہ ہو کر فقط طبیعی عوامل پر نظر رکھتے ہوئے وہ غرور اور فریب میں مبتلا ہوئے لہٰذا پروردگار نے انہیں اسی بیماری کے ذریعے اسی بیابان میں نیست و نابود کر دیا۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بیماری در اصل مکافات عمل کا مظہر تھی اور سزا کے طور پر آئی تھی کیونکہ ان کے پیشوا اور رہبر نے ان سے جہاد کے لیے شہر سے نکلنے کا حکم دیا تو انہوں نے بہانہ کیا کہ جنگی علاقے میں طاعون کی بیماری پھیلی ہوئی ہے اور اس طرح انہوں نے جنگ میں جانے کے حکم سے روگردانی کی۔ اس پر ہوا یوں کہ جس چیز سے وہ ڈرتے تھے اور جس بہانے سے وہ جنگ سے فرار چاہتے تھے انہیں اسی میں مبتلا کر دیا گیا ان میں طاعون کی بیماری پھیل گئی۔ وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر طاعون سے نجات کے لیے بھاگ کھڑے ہوئے لیکن سب کے سب بیابان میں پہنچ کر نابود ہو گئے۔

اس واقعے کے ایک عرصے بعد بنی اسرائیل کے ایک نبی حضرت حزقیل[۱] وہاں سے گزرے انہوں نے خدا سے خواہش کی کہ انہیں زندہ کر دے۔ خدا نے ان کی دعا قبول کر لی اور وہ دوبارہ زندہ ہو گئے۔

تفسیر

ادبیات عرب کا طریقہ ہے کہ جب کسی مفہوم کو زیادہ مجسم انداز میں پیش کرنا چاہیں اور اس کی بہتر تصویر کشی مطلوب ہو تو "الم تر" استعمال کرتے ہیں یعنی کیا تو نے نہیں دیکھا۔

اس مقام پر بظاہر تو یہ پیغمبر اکرم سے خطاب ہے لیکن در حقیقت یہ سب لوگوں سے فرمایا جا رہا ہے۔ پیغمبر اکرم کی طرف خطاب کا رخ اس تاکید اور زیادہ اہمیت کے پیش نظر ہے۔

"الم تر" کے بعد آیت میں ایک گروہ کی کیفیت بیان کی گئی ہے کہ وہ موت کے ڈر سے اپنے گھروں کو چھوڑ گیا اور پھر وہ سب لوگ خدا کے حکم سے مر گئے اور انہیں بھاگ جانے کا کوئی فائدہ نہ ہوا "الم تر الی الذین خرجوا من دیارھم و ھم الوف حذر الموت فقال لھم اللّٰہ موتوا......" یہ بات واضح ہے کہ لفظ 'الوف' جس کا معنی ہے ہزاروں۔ یہ یہاں کسی خاص تعداد کی طرف اشارہ نہیں ہے بلکہ اس گروہ کی زیادتی اور کثرت کی طرف اشارہ ہے۔ اسی لیے بعض روایات میں ان کی تعداد دس ہزار اور بعض میں ستر ہزار بیان کی گئی ہے۔

یہ بھی واضح ہے کہ "موتوا" یعنی 'مر جاؤ' سے ادحکم لفظی نہیں بلکہ خدا کا امر تکوینی ہے جو تمام عالم ہستی اور جہان حیات پر حکم فرما ہے۔ یعنی خدا نے ان کی موت کے اسباب فراہم کیے اور سب کے سب بڑی تیزی سے مر گئے یہ امر اس امر کی طرح ہے۔

"انما امرہ اذا اراد شیئًا ان یقول لہٗ کن فیکون"

اس کا حکم صرف یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کے ہونے کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو جا اور وہ فوراً ہو جاتی ہے (یٰس ۸۲)

"ثم احیاھم" آیت کے اس حصے میں اس گروہ کی موت کے بعد پھر زندگی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے شان نزول میں بیان کیا جا چکا ہے کہ ایسا حضرت حزقیل (جو پیغمبر تھے) کی دعا سے ہوا۔

"ان اللّٰہ لذو فضل علی الناس ولکنّ اکثر الناس لا یشکرون"

۱۔ بعض روایات کے مطابق حضرت موسیٰؑ کے بعد حضرت حزقیلؑ بنی اسرائیل کے تیسرے راہنما تھے۔



ان کی دوبارہ زندگی خدا کی ایک واضح دلیل اور نشانی تھی اس لیے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے : صرف یہ ایک نعمت نہ تھی جو خدا نے انہیں عطا فرمائی ، خدا تمام لوگوں کے لیے بخشنے والا اور مہربان ہے اور سب کو اپنی نعمتوں اور احسانات سے نوازتا رہتا ہے ۔ لیکن یہ بات باعثِ افسوس ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ ان نعمتوں کا شکر نہیں بجالاتے ۔

چند اہم نکات

۱۔ ایک درسِ عبرت : آیت دراصل سب لوگوں کے لیے ایک درسِ عبرت بیان کرتی ہے تاکہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ ذمہ داریوں سے فرار اور بہانہ سازیوں کے ذریعے وہ مامون ہوسکتے ہیں ۔ وہ یہ خیال نہ کریں کہ قدرت پروردگار بلکہ طبیعی ومادی قوانین جو دنیا پر حاکم ہیں ان سے وہ زیادہ طاقتور ہیں ۔ اگر وہ دشمنوں سے جنگ کرنے سے پہلو تہی کریں اور جہاد سے فرار حاصل کریں ، جب کہ یہ خود انہی کی سربلندی کا ذریعہ ہے پھر بھی ممکن ہے خداوند عالم انہیں کسی اور دشمن کے سامنے کر دے ۔ کیا ہے وہ ایسا چھوٹا دشمن ہو جو آنکھوں سے دیکھا بھی نہ جا سکے ۔

دُوربین سے دیکھے جانے والے چھوٹے دشمن جنہیں جراثیم کہتے ہیں ، انہی کے ذریعے طاعون یا کوئی اور وبا پھیل سکتی ہے جو اتنی تیزی اور برق رفتاری سے انہیں مار ڈالتی ہے کہ کوئی خطرناک دشمن بھی میدان جنگ میں ان سے ایسا سلوک نہیں کرسکتا ، پھر بھی لوگ کیوں عبرت حاصل نہیں کرتے اور اپنی ذمہ داریوں سے فرار کرتے ہیں ۔

۲۔ یہ تاریخ ہے یا تمثیل : جو داستان یہاں بیان کی گئی ہے کیا یہ ایک تاریخی واقعہ ہے جس کی طرف قرآن نے سربستہ طور پر اشارہ کیا ہے جبکہ روایات میں اس کی تفصیل آئی ہے یا اسے ایک تمثیل کے طور پر بیان کیا گیا ہے اور عقلی حقائق کی حسی طور پر تصویر کشی کی گئی ہے ۔

مذکورہ واقعے میں کئی ایک غیر معمولی پہلو ہیں اور بعض مفسرین کے لیے مشکل تھا کہ وہ اسے جوں کا توں گوارا کرلیں ۔ لہٰذا اُنہوں نے اس کے وقوع پذیر ہونے سے انکار کردیا ہے ان کے نزدیک یہ واقعہ بطور تمثیل ذکر ہوا ہے جس میں ایک ایسے گروہ کا تذکرہ ہے جو دشمن سے مقابلے میں سُستی کرتا ہے اور نتیجۃً شکست کھا جاتا ہے ۔ پھر عبرت حاصل کرتے ہوئے بیدار ہوجاتا ہے ۔ قیام اور مقابلہ پھر سے شروع کرتا ہے اور آخر کار کامیاب ہوجاتا ہے ۔

اس تفسیر کے مطابق " مُوتُوا " کا لفظ سستی اور تساہل کے نتیجے میں شکست کھانے سے کنایہ ہے اور " اَحْیَاھُمْ " (یعنی خدا نے انہیں زندہ کیا) ان کی آگاہی و بیداری کے بعد کامیابی کی طرف اشارہ ہے ۔ اس تفسیر کے مطابق اِس سلسلے میں وارد ہونے والی روایات جعلی ہیں اور اسرائیلیات میں سے ہیں ۔

لیکن ــــ یہ کہنا پڑے گا کہ سستی و بیداری کے نتیجے میں شکست و کامیابی کا معاملہ جاذب نظر تو ہے لیکن اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ظاہر آیت ایک تاریخی واقعے کا بیان ہے نہ کہ ایک تمثیل کا ذکر ۔

آیت میں گذشتہ لوگوں کے ایک گروہ کی حالت بیان کی گئی ہے ۔ یہ لوگ ایک وحشت ناک حادثے کے نتیجے میں مر



گئے تھے ۔ خداوند عالم نے انہیں پھر سے زندہ کیا ۔ کوئی واقعہ غیر عادی یا غیر معمولی ہونے کی وجہ سے توجیہ و تاویل کے قابل سمجھا جائے تو پھر انبیاء کے تمام معجزات کے ساتھ یہی سلوک کیا جائے خلاصہ یہ کہ اگر ایسی توجیہات اور تفاسیر کو قرآن کی طرف گھسیٹا جانے لگا تو انبیاء کے معجزات کے انکار کے علاوہ قرآن کے بہت سے تاریخی مباحث کا انکار کرنا پڑے گا اور انہیں تمثیل یا سمبالک (SYMBOLIC) قرار دینا پڑے گا ۔ مثلاً ہابیل و قابیل کی سرگذشت کو عدالت و حق کی جستجو اور قساوت و سنگدلی کے مقابلے کی مثال سمجھنا پڑے گا اور اس صورت میں قرآن کے تمام تاریخی مباحث اپنی قدر و قیمت کھو دیں گے ۔
علاوہ ازیں اس تعبیر سے یہ نہیں ہوسکتا کہ اس آیت کی تفسیر میں وارد ہونے والی تمام روایات سے چشم پوشی کر لی جائے کیونکہ ان میں سے بعض تو معتبر اسناد سے منقول ہیں اور انہیں جعلی و اسرائیلی قرار نہیں دیا جاسکتا ۔

۳ ۔ رجعت کی طرف اشارہ : اس آیت میں ایک اور نکتے کی طرف بھی توجہ کرنا چاہیئے اور وہ یہ ہے کہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رجعت کا امکان ہے ۔ گذشتہ لوگوں کی تاریخ میں ایسے بہت سے افراد ہیں جو مرنے کے بعد دوبارہ اس جہاں میں پلٹ آئے ۔ جیسے بنی اسرائیل کی وہ جماعت جس کی طرف زیر بحث آیت میں اشارہ ہوا ہے ۔ اس بناء پر کہا جاسکتا ہے کہ اگر آئندہ کسی دور میں ایسے واقعے کا اعادہ ہو تو اس میں کیا مضائقہ ہے ۔
مشہور شیعہ عالم شیخ صدوق نے اسی آیت سے رجعت کے امکان کے مسئلہ پر استدلال کیا ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے عقائد میں سے ایک عقیدہ رجعت ہے البتہ رجعت کا تناسخ سے کوئی تعلق نہیں ۔ اس مسئلے کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی ۔

۲۴۴ ۔ وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ○
۲۴۵ ۔ مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَاعِفَهُ لَهُ أَضْعَافًا كَثِيرَةً ۚ وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْسُطُ ۠ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ○

ترجمہ

۲۴۴ ۔ اور راہ خدا میں جنگ کرو اور جان لو کہ خدا سننے والا جاننے والا ہے ۔
۲۴۵ ۔ کون ہے جو خدا کو قرض حسنہ دے (اور اس نے جو مال دیا ہے اس میں سے خرچ کرے) تاکہ خدا اس مال کو اس کے لیے کئی گنا کر دے اور خدا (بندوں کی روزی کو) محدود اور وسیع کرتا ہے (اور خرچ کرنے سے روزی میں کمی نہیں ہوتی) اور اس کی طرف لوٹ جاؤ گے (اور اپنا بدلہ اور جزا پالو گے) ۔



تفسیر

بنی اسرائیل کے بعض لوگوں کی سرگزشت جو گذشتہ آیت میں بیان ہوئی ہے ۔ یہ واضح ہو چکا ہے کہ موت و حیات پروردگار کے ہاتھ میں ہے ۔ اگر یہ واقع نظر میں رہے تو انسان یہ سمجھ سکتا ہے کہ جہاد سے بھاگ جانے اور جنگ میں سستی کرنے سے وہ موت سے نہیں بچ سکتا۔

زیر نظر آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ راہ خدا میں جہاد کرو اور جان لو کہ خدائے بزرگ و برتر تمام چیزوں سے باخبر ہے اور تمہارے باطن سے اٹھنے والے علل و اسباب کو جانتا ہے اور جنگ کے بارے میں تمہاری نیتوں سے آگاہ ہے ۔ وہ تمہاری بات چیت سنتا ہے اور کوئی چیز اس کی درگاہ سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی ۔

"من ذا الذی یقرض اللہ قرضا حسنا."

جیسے معاشرہ اپنے استقلال، پیش رفت اور سربلندی کے لیے مجاہد و مبارز افراد کا محتاج ہے اس طرح محروم انسانوں کی حمایت، عمومی منافع اور وسائلِ جہاد کے لیے بھی کمک کی ضرورت ہے ۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن راہ خدا میں خرچ کرنے کے معاملے پر خاص طور پر زور دیتا ہے ۔

خدا بندوں سے قرض لیتا ہے

یہ امر قابلِ غور ہے کہ قرآن اِس آیت میں اور چند دیگر آیات میں اس اجتماعی ذمہ داری کو قرض سے تعبیر کرتا ہے یہ نکتہ نگاہ میں رہے کہ تمام اموال کا حقیقی مالک پروردگار عالم ہے ۔ انسان تو صرف نمائندہ خدا ہونے کی حیثیت سے اس میں صرف کرتا ہے ۔ البتہ اِس سرپرستی اور نمائندگی کی شرط یہ ہے کہ اپنی ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے علاوہ عام لوگوں کی حاجات و ضروریات کو پورا کرنے کے لیے خرچ کرے ۔ جیسا کہ سورہ حدید کی آیہ ۷ میں ہے ۔

"اٰمنوا باللہ و رسولہ و انفقوا
مما جعلکم مستخلفین فیہ."

خدا پر ایمان لے آؤ اور جن اموال میں خدا نے تمہیں
اپنا نمائندہ بنایا ہے اُن میں سے خرچ کرو

لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود قرآن کہتا ہے کہ اس مادی کمک کو خدا کو قرض دینے کے حساب میں شمار کرو۔ اُس خالق کائنات کو قرض دو کہ جس کی طرف سے تمام چیزیں ہیں اور جب واپس لوگے تو کئی گنا ملے گا ("فیضاعفہ لہٗ اضعافا کثیرۃً.")

اس سے بندوں پر پروردگار کے انتہائی لطف و کرم کا اظہار ہوتا ہے اور انفاق اور خرچ کرنے کی کمال اہمیت اس سے عیاں ہوتی ہے ۔ باوجودیکہ وہی مالک اور بخشنے والا ہے ۔ پھر بھی اپنے بندے سے قرض کی خواہش کرتا ہے اور



قرض بھی ایسا کہ جس کے ساتھ اس قدر نفع بھی شامل ہو جائے یعنی خداوند کریم کا کرم بین اور لطف وعنایت (فیضاعفه له اضعافا کثیرة)۔

"اضعاف" "ضعف" (بروزن شعر) کی جمع ہے۔ اس کا معنی ہے کسی چیز کو دو برابر یا چند برابر کرنا۔ توجہ رہے کہ "اضعاف" جمع ہے "کثیرة" تاکید کے لیے ہے "یضاعف" تاکید مزید کے لیے ہے کیونکہ باعتبار لغت "یضاعف" "یضعف" کی نسبت زیادہ تاکید کا حامل ہے۔ ان تمام امور سے معلوم ہوتا ہے کہ انفاق اور خرچ کرنے کے مقابلے میں خدا تعالیٰ ایک بڑی مقدار عطا فرماتا ہے۔ جیسے ایک مستعد بیج کو جب زمین میں ڈالا جاتا ہے اور اس کی آبیاری کی جاتی ہے تو نشوونما کے بعد وہ ایک سے بہت زیادہ مقدار میں میسر آتا ہے جیسا کہ آیہ ۲۶۱ میں آئے گا

"واللہ یقبض و یبصط و الیه ترجعون"

آیت کے آخر میں یہ جملہ گویا اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہ خیال نہ کرنا کہ انفاق اور بخشش تمہارے اموال کو کم کر دیتے ہیں کیونکہ تمہارے سرمائے کی وسعت اور محدودیت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ وہی ہے جو آسمان اور زمین کی برکتوں سے تمہیں مالا مال کر سکتا ہے اور عطا کردہ اموال کی جگہ کئی گنا ثروت تمہیں بخش سکتا ہے۔ بلکہ معاشرتی روابط اور وابستگیوں کے انداز پر نظر کی جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہی عطا کردہ اموال آخرکار تمہاری طرف پلٹ آئیں گے۔

ان تمام چیزوں سے قطع نظر تمہیں بھولنا نہیں چاہیئے کہ تم نے خدا کی طرف پلٹ جانا ہے اور ایک اور جہان تمہارے آگے ہے جہاں تم اپنے ان انفاق اور مصارف کا ثمرہ پاؤ گے۔

۲۴۶۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ قَالَ هَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ؕ قَالُوْا وَمَا لَنَاۤ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِیَارِنَا وَاَبْنَآىِٕنَا ؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ ○

۲۴۷۔ وَقَالَ لَهُمْ نَبِیُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ



مَلِكًا ۚ قَالُوٓا أَنّٰى يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ
بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۚ قَالَ إِنَّ اللّٰهَ
اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِى الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۖ وَاللّٰهُ
يُؤْتِى مُلْكَهُ مَن يَشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ○
۲۴۸۔ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ ءَايَةَ مُلْكِهِۦٓ أَن يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ
فِيهِ سَكِينَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ ءَالُ مُوسٰى وَءَالُ
هٰرُونَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ۚ إِنَّ فِى ذٰلِكَ لَءَايَةً لَّكُمْ
إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ○
۲۴۹۔ فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيكُم بِنَهَرٍ
فَمَن شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّى وَمَن لَّمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ
مِنِّىٓ إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهِۦ ۚ فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا
قَلِيلًا مِّنْهُمْ ۚ فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ ءَامَنُوا مَعَهُ
قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِۦ ۚ قَالَ
الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلٰقُوا اللّٰهِ كَم مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ
غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةًۢ بِإِذْنِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِينَ ○
۲۵۰۔ وَلَمَّا بَرَزُوا لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِۦ قَالُوا رَبَّنَآ أَفْرِغْ عَلَيْنَا
صَبْرًا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِينَ ○
۲۵۱۔ فَهَزَمُوهُم بِإِذْنِ اللّٰهِ وَقَتَلَ دَاوُۥدُ جَالُوتَ وَءَاتٰىهُ اللّٰهُ



الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ
النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ
ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ ○
۲۵۲۔ تِلْكَ آيَاتُ اللّٰهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۚ وَإِنَّكَ
لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ○

ترجمہ

۲۴۶۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ بنی اسرائیل کا ایک گروہ موسیٰؑ کے بعد اپنے نبی سے کہنے لگا کہ ہمارے لیے کسی فرمانروا کا انتخاب کر دیں تاکہ (اُس کی قیادت میں) ہم راہ خدا میں جنگ کریں ۔ اُن کے پیغمبر نے کہا کہ ہو سکتا ہے کہ تمہیں جنگ کا حکم دیا جائے تو تم (رو گردانی کرو اور) راہ خدا میں جہاد نہ کرو ۔ انہوں نے کہا کہ کیسے ممکن ہے کہ ہم راہ خدا میں جنگ نہ کریں جب کہ ہمارے گھر اور اولاد ہم سے چھوٹ چکے ہیں (اور ہمارے شہروں پر دشمنوں نے قبضہ کر کے ہماری اولاد کو قید کر لیا ہے) لیکن جب انہیں جنگ کا حکم دیا گیا تو چند لوگوں کے علاوہ سب پھر گئے اور خدا ستمگروں کو جانتا ہے ۔

۲۴۷۔ ان کے نبی نے ان سے کہا کہ خدا نے طالوت کو تمہاری بادشاہی کے لیے (انتخاب کر کے) بھیجا ہے ۔ وہ کہنے لگے یہ ہم پر کیسے حکومت کر سکتا ہے جب کہ ہم اس سے زیادہ اہل ہیں اور اس کے پاس تو زیادہ دولت و ثروت بھی نہیں ہے ۔ اُس (نبی) نے کہا کہ اسے خدا نے علم اور جسمانی طاقت میں تم سے برتری کی بنیاد پر منتخب کیا ہے ۔ خدا جسے چاہتا ہے اپنا ملک بخش دیتا ہے اور خدا کا احسان وسیع ہے اور وہ (لوگوں کی اہلیت سے) آگاہ ہے ۔

۲۴۸۔ اور اُن کے نبی نے ان سے کہا کہ اس کی حکومت کی نشانی یہ ہے کہ "صندوق عہد" تمہاری طرف آئے گا ۔ (وہی صندوق کہ) جس میں آل موسیٰ اور آل ہارون کی یادگاریں ہیں جب کہ فرشتوں نے اُسے اُٹھا رکھا ہوگا اور اگر تم ایمان رکھتے ہو تو اس میں تمہارے لیے (واضح) نشانی ہے ۔

۲۴۹۔ اور جب طالوت بنی اسرائیل کے لشکر کی فرمانروائی کے لیے مقرر ہو گئے اور وہ لشکر کو باہر لے گئے تو اُن سے کہا کہ خدا تمہارا پانی کی ایک لہر کے ذریعے امتحان لے گا تو جو لوگ (پیاس کے وقت)



اسے پی لیں گے وہ مجھ سے نہیں ہیں اور جو اپنے ہاتھ سے ایک پیالے سے زیادہ نہیں پئیں گے وہ مجھ سے ہیں چند افراد کے علاوہ سب نے اس سے پانی پی لیا ۔ اس کے بعد وہ اور ان پر ایمان لانے والے (اور امتحان کی کسوٹی میں پورے اترنے والے) نہر سے گزر گئے (اب وہ اپنی تعداد کی کمی پر پریشان ہو گئے) اور ایک گروہ کے لوگ) کہنے لگے آج ہم جالوت اور اس کی فوج سے لڑنے کی طاقت نہیں رکھتے لیکن وہ جو جانتے تھے کہ خدا کی ملاقات ہوگی (اور وہ قیامت پر ایمان رکھتے تھے) کہنے لگے کہ کتنے ہی ایسے تھوڑے لوگ تھے جو حکمِ خدا سے بڑے بڑے گروہوں پر غالب آئے اور کامیاب ہو گئے اور خدا صابرین (اور استقامت دکھانے والوں) کے ساتھ ہے ۔

۲۵۰ ۔ اور وہ جالوت اور اس کے لشکر کے سامنے ڈٹ گئے تو کہنے لگے پروردگار! ہم پر شکیبائی اور استقامت نازل فرما اور ہمیں ثابت قدم رکھ اور ہمیں کافر قوم پر کامیابی عطا فرما ۔

۲۵۱ ۔ اس کے بعد انہوں نے خدا کے حکم سے دشمن کی فوج کو شکست سے دوچار کر دیا اور داؤد نے جو طالوت کے لشکر میں قوی اور شجاع نوجوان تھے) جالوت کو قتل کر دیا اور خدا نے انہیں حکومت اور علم و دانش عطا فرمائی اور جو کچھ اُس (اللہ) نے چاہا انہیں تعلیم دی اور اگر خدا بعض لوگوں کے ذریعے بعض کو دفع نہ کرے تو زمین فساد سے بھر جائے لیکن خدا تمام جہانوں پر لطف و احسان کرنے والا ہے ۔

۲۵۲ ۔ یہ خدا کی آیات ہیں جو ہم حق کے ساتھ تم پر پڑھتے ہیں اور تم مرسلین میں سے ہو ۔

تفسیر

خدائے بزرگ و برتر ان آیات میں ایک عبرتناک واقعہ بیان کرتا ہے ۔ اس میں بنی اسرائیل کے ایک گروہ کی سرگذشت بیان کی گئی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد وقوع پذیر ہوئی ۔ جہاد اور حریم دین خدا یعنی حریم انسانیت کے دفاع کا یہ تذکرہ مسلمانوں کی عبرت کے لیے ہے ۔ آیات کی تفسیر سے قبل ہم اس داستان کو بیان کرتے ہیں ۔

ایک عبرت خیز واقعہ

اہل فرعون کے زیر اثر رہ کر بنی اسرائیل کمزور و ناتواں ہو چکے تھے ۔ حضرت موسیٰؑ کی دانشمندانہ رہبری کے نتیجے میں اُنہیں اس افسوسناک حالت سے نجات ملی اور انہوں نے قدرت و عظمت حاصل کر لی ۔

اس پیغمبرؑ کی برکت سے خدا تعالیٰ نے انہیں بہت سی نعمات سے نوازا ۔ ان نعمات میں سے ایک صندوق عہد[1] بھی تھا یہودی اپنے لشکر کے آگے اُسے اٹھائے رکھتے تھے ۔ اس سے ان میں ایک طرح کا سکونِ قلب اور روحانی طاقت پیدا ہوتی تھی ۔ بنی اسرائیل کو یہ قدرت و عظمت حضرت موسیٰؑ کے بعد ایک مدت تک حاصل رہی لیکن یہی کامیابیاں اور نعمتیں رفتہ رفتہ ان کے غرور و تکبر کا باعث بن گئیں اور وہ قانون شکنی کرنے لگے ۔ اس کے نتیجے میں انہیں فلسطینیوں کے ہاتھوں شکست

---

[1] بہت جلد صندوق عہد، اس کی تاریخ اور اس میں موجود چیزوں کے بارے میں بحث کریں گے ۔



اٹھانا پڑی ۔ وہ اپنی قدرت وعظمت کھو بیٹھے اور صندوق عہد بھی ہاتھ سے گنوا بیٹھے ۔ پھر اس قدر پراگندگی اور اختلاف کا شکار ہوئے کہ چھوٹے سے چھوٹے دشمنوں سے بھی دفاع کے قابل نہ رہے یہاں تک کہ دشمنوں نے ان کے بہت سے لوگوں کو ان کی سرزمین سے نکال دیا اور اُن کی اولاد کو غلام اور قیدی بنالیا ۔ کئی برس تک یہ کیفیت رہی یہاں تک کہ خداوند عالم نے ان کی نجات اور ارشاد و ہدایت کے لیے حضرت اشموئیل کو پیغمبر بناکر مبعوث فرمایا ۔ بنی اسرائیل بھی دشمنوں کے ظلم وجور سے تنگ آچکے تھے اور کسی پناہ گاہ کی تلاش میں تھے لہٰذا ان کے گرد جمع ہوگئے اور ان سے خواہش کی کہ وہ ان کے لیے کوئی رہبر اور امیر مقرر کردیں تاکہ وہ اس کی قیادت میں ہم آواز اور ایک جان ہوکر دشمن سے جنگ کریں اور عزت رفتہ بحال ہوسکے ۔

اشموئیل ان کی اندرونی کیفیات اور سست ہمتی سے پوری طرح واقف تھے ۔ انہوں نے کہا ۔

مجھے ڈر ہے کہ جب جہاد کا حکم آئے تو تم کہیں امیر و رہبر کے حکم سے روگردانی نہ کرو اور دشمن سے مقابلے اور جنگ سے پہلو تہی نہ کرو ۔

وہ کہنے لگے

یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم امیر کے حکم سے منہ پھیر لیں اور اپنی ذمہ داری نبھانے سے دریغ کریں حالانکہ دشمن ہمیں ہمارے وطن سے نکال چکا ہے ۔ ہماری زمینوں پر قبضہ کرچکا ہے اور ہماری اولاد کو قیدی بنا کرلے گیا ہے ۔

حضرت اشموئیل نے دیکھا کہ وہ اپنی بیماری کی تشخیص کرچکے ہیں اور اب انہیں ایک طبیب کی ضرورت ہے ۔ گویا وہ اپنی پسماندگی کے راز سے واقف ہوچکے ہیں ۔ اس پر حضرت اشموئیل نے بارگاہِ الٰہی کا رُخ کیا اور قوم کی خواہش کو اس کے حضور پیش کیا ۔ وحی ہوئی :

"میں نے طالوت کو اُن کی سربراہی کے لیے منتخب کیا ہے"

حضرت اشموئیل نے عرض کیا :

خداوندا ! میں نے ابھی تک طالوت کو دیکھا ہے نہ اسے پہچانتا ہوں

ارشاد ہوا ؛

ہم اسے تمہاری طرف بھیجیں گے ۔ جب وہ تمہارے پاس آئے تو فوج کی کمان اُس کے حوالے کردینا اور علم جہاد اس کے ہاتھ میں دے دینا

طالوت کون تھے

طالوت ایک بلند قامت ، تنومند اور خوبصورت مرد تھے ۔ وہ مضبوط اور قوی اعصاب کے مالک تھے ۔ روحانی طور پر بھی بہت ہی زیرک ، دانشمند اور صاحب تدبیر تھے ۔ بعض لوگوں نے اُن کے نام "طالوت" کو بھی اُن کے طولانی قد کا سبب قرار دیا ہے ۔



اِن تمام صفات کے باوجود وہ مشہور نہیں تھے۔ اپنے والد کے ساتھ دریا کے کنارے ایک بستی میں رہتے تھے والد کے چوپایوں کو چراتے اور زراعت کرتے تھے۔

ایک دن کچھ جانور بیابان میں گم ہو گئے۔ طالوت اپنے ایک دوست کے ساتھ ان کی تلاش میں کئی دن تک سرگرداں رہے۔ انہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ شہر "صوف" کے قریب پہنچ گئے۔

اُن کے دوست نے کہا "ہم تو اشموئیلؑ کے شہر صوف میں آپہنچے ہیں۔ آیئے اُن کے پاس چلتے ہیں۔ شاید وحی کے سائے میں اور اُن کی رائے کی روشنی میں ہمیں کچھ پتہ چل سکے۔

شہر میں داخل ہوئے تو حضرت اشموئیلؑ سے ملاقات ہوگئی۔ جب اشموئیلؑ اور طالوت نے ایک دوسرے کو دیکھا تو گویا دل مل گئے۔ اشموئیلؑ نے اسی لمحے طالوت کو پہچان لیا۔ وہ جان گئے کہ یہ وہی نوجوان ہے جسے خدا نے ان لوگوں کی قیادت کے لیے منتخب کیا ہے۔

طالوت نے اپنی کہانی سنائی تو اشموئیلؑ کہنے لگے: وہ چوپائے تو اس وقت تمہاری بستی کی راہ پر ہیں اور تمہارے باپ کے باغ کی طرف جارہے ہیں۔ ان کے بارے میں فکر نہ کرو۔ میں تمہیں اس سے کہیں بڑے کام کے لیے دعوت دیتا ہوں۔ خدا نے تمہیں بنی اسرائیل کی نجات کے لیے مامور کیا ہے۔

طالوت پہلے تو اس پروگرام پر حیران ہوئے اور پھر اسے سعادت سمجھتے ہوئے قبول کرلیا۔ اشموئیلؑ نے اپنی قوم سے کہا:

> خدا نے طالوت کو تمہاری قیادت سونپی ہے لہٰذا ضروری ہے کہ تم
> سب اس کی پیروی کرو۔ اب اپنے تئیں دشمن سے مقابلے کے
> لیے تیار کرلو۔

بنی اسرائیل کے نزدیک تو حسب و نسب اور ثروت کے حوالے سے کئی خصوصیات فرمانروا کے لیے ضروری تھیں اور ان میں سے کوئی چیز بھی طالوت میں دکھائی نہ دیتی تھی اس انتخاب و تقرر پر وہ بہت حیران و پریشان ہو گئے۔ اُنہوں نے دیکھا کہ ان کے عقیدے کے برخلاف وہ نہ تو لاوی کی اولاد میں سے تھے جن میں سے نبی ہوتے تھے۔ نہ یوسف اور یہودا کے خاندان سے تھے جو گذشتہ زمانے میں حکمرانی کرتے تھے بلکہ ان کا تعلق تو بنیامین کے گمنام خاندان سے تھا اور پھر وہ مالی طور پر بھی تہی دست تھے۔

انہوں نے اعتراض کیا: وہ کیسے حکومت کر سکتا ہے جب کہ ہم اس سے زیادہ حقدار ہیں۔

اشموئیلؑ سمجھتے تھے کہ یہ بہت اشتباہ کر رہے ہیں کہنے لگے: انہیں خدا نے تم پر امیر مقرر کیا ہے نیز قیادت کے لیے ان کی اہلیت اور لیاقت کی دلیل یہ ہے کہ وہ جسمانی طور پر زیادہ طاقتور ہیں اور روحانی طاقت میں بھی سب سے بڑھ کر ہیں۔ اس لحاظ سے وہ تم سب پر برتری رکھتے ہیں۔

بنی اسرائیل نے خدا کی طرف سے اُس کے تقرر کے لیے کسی نشانی یا علامت کا مطالبہ کردیا۔ اس پر اشموئیلؑ بولے انبیاء بنی اسرائیل کی ہم یادگار تابوت (صندوق عہد)، جو جنگ میں تمہارے لیے اطمینان اور ولولے کا باعث تھا تمہارے



پاس لوٹ آئے گا اور اسے تمہارے آگے آگے چند فرشتوں نے اٹھا رکھا ہوگا ۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ صندوق عہد ان کے سامنے آگیا ۔ یہ نشانی دیکھ کر اُنہوں نے طالوت کی سربراہی قبول کرلی ۔

طالوت نے ملک کی باگ ڈور سنبھال لی

طالوت نے لشکر کی قیادت کا بیڑا اٹھایا ۔ اُنہوں نے تھوڑی ہی مدت میں امور سلطنت کی انجام دہی اور فوج کی تنظیم نو کے سلسلے میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا ۔ پھر آپ نے فوج کو دشمن سے مقابلے کی دعوت دی ۔ دشمن نے ان کی ہر چیز کو خطرے سے دو چار کر رکھا تھا

طالوت نے تاکید کرتے ہوئے کہا : میرے ساتھ وہ لوگ چلیں جن کی ساری توجہ جہاد پر مرکوز رہ سکے ۔ جن کی صحت ناقص ہو اور جو درمیان ہی میں ہمت ہار بیٹھنے والے ہوں ، اس جنگ میں شرکت نہ کریں ۔

بہت جلد ظاہراً ایک کثیر تعداد اور طاقتور فوج جمع ہوگئی اور وہ دشمن کی طرف چل پڑے ۔

سُورج کی تپش تھی ۔ گرمی میں چلتے چلتے انہیں سخت پیاس لگ گئی ۔ طالوت خدا کے حکم سے اُنہیں آزمانا چاہتے تھے اور ان کی تطہیر بھی کرنا چاہتے تھے ۔ اُنہوں نے کہا : جلد تمہارے راستے میں ایک نہر آئے گی ۔ اس کے ذریعے خدا تمہارا امتحان لے گا ۔ جو لوگ اس میں سے سیر ہوکر پانی پیئں گے ان کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں البتہ جو تھوڑا سا پانی پیئں گے وہ میرے ساتھی ہیں ۔ ان کی نظر نہر پر پڑی تو بہت خوش ہوئے ۔ جلدی سے وہاں پہنچے ۔ خوب سیر ہوکر پانی پیا ۔ تھوڑے سے فوجی اپنے عہد و پیمان پر قائم رہے ۔

طالوت نے دیکھا کہ ان کی فوج کی اکثریت بے ارادہ اور کمزور عہد و پیمان کی حامل ہے اور اس میں تھوڑے سے صاحب ایمان افراد موجود ہیں ۔ اُنہوں نے بے قاعدہ اور نافرمان اکثریت کو چھوڑ دیا اور اُنہی کم تعداد صاحب ایمان کو ساتھ لیا اور شہر سے گزر کر میدان جہاد کی طرف پیش قدمی جاری رکھی ۔

طالوت کی فوج نے اپنی کم تعداد دیکھی تو پریشان اور وحشت زدہ ہوئی ۔ فوجیوں نے اُن سے کہا : ہم میں تو اس طاقتور فوج کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں ہے ۔ لیکن کچھ ایسے بھی تھے جن کا دل خدا کی محبت سے معمور تھا وہ دشمن کی فوجی کثرت و قوت اور اپنی تھوڑی تعداد پر ہراساں نہ ہوئے اور بکمال شجاعت سے طالوت سے کہنے لگے : آپ جو مصلحت سمجھتے ہیں حکم دیجیے ۔ ہم ہر مقام پر آپ کا ساتھ دیں گے اور انشاءاللہ کم تعداد کے باوجود دشمن سے جہاد کریں گے کیونکہ یہ تو کئی مرتبہ ہو چکا ہے کہ کم تعداد خدا کے ارادہ و مشیت کے سہارے کثیر تعداد پر غالب آئی ہے اور خدا استقامت و پامردی دکھانے والوں کے ساتھ ہے ۔ طالوت ان کم تعداد اہل ایمان مجاہدین کے ساتھ آمادۂ کارزار ہوئے ۔ ان لوگوں نے درگاہ الٰہی سے شکیبائی اور کامیابی کی دُعا کی ۔

جنگ کی آگ بھڑک اٹھی ۔ جالوت اپنا لشکر لے کر باہر نکلا ۔ لشکروں کے مابین مبارز طلبی ہوئی ۔ اس کی بارعب پکار نے دلوں کو لرزا دیا ۔ میدان میں جانے کی جرأت کسی میں نہ رہی ۔ داؤد ایک کم سن نوجوان تھا ۔ شاید وہ جنگ کے لیے بھی



میدان میں نہ آیا تھا بلکہ اپنے جنگجو بڑے بھائیوں اور باپ کی خدمت کے لیے چلا آیا تھا لیکن چاک وچوبند اور توی تھا۔ فلاخن اس کے ہاتھ میں تھی اس کے ذریعے اس نے دو پتھر ایسے ماہرانہ انداز میں پھینکے کہ ٹھیک جالوت کی پیشانی اور سر میں پیوست ہوگئے۔ اس کے سپاہیوں پر وحشت اور تعجب کا عالم طاری تھا۔ وہ ان کے درمیان گرا اور مرگیا۔ جالوت کے قتل سے اس کی فوج میں عجیب خوف وہراس پیدا ہوگیا۔ جالوت کا لشکر بھاگ کھڑا ہوا اور بنی اسرائیل کامیاب وکامران ہوگئے۔ [1]

"الم تر الی الملاء من بنی اسرائیل ....."

لغت میں "ملاء" اُس چیز کو کہتے ہیں جس سے آنکھ بھر جائے اور دیکھنے والے کے تعجب کو برانگیختہ کر دے۔ اس لیے زیادہ جمعیت کو جو ہم رائے اور ہم عقیدہ ہو "ملاء" کہتے ہیں۔ نیز ہر قوم وملت کے اشراف اور بزرگوں کو بھی ملاء کہتے ہیں کیونکہ وہ ایک خاص مقام ومنزلت کے حاصل ہونے کی وجہ سے دیکھنے والے کی آنکھ کو بھر دیتے ہیں۔

جیسا کہ اشارہ ہو چکا ہے یہ آیت بنی اسرائیل کی ایک بڑی جمعیت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ان لوگوں نے یک آواز اپنے پیغمبر سے امیر ورہبر کا تقاضا کیا تاکہ اس کی قیادت میں جالوت کا مقابلہ کرسکیں جس نے ان کی دینی، اجتماعی اور اقتصادی حیثیت کو معرض خطر میں ڈال رکھا تھا۔ یہ واقعہ حضرت موسٰیؑ کے بعد رونما ہوا۔

"فی سبیل اللہ"

بنی اسرائیل اس دشمن کے تجاوز اور زیادتی سے نجات چاہتے تھے جس نے انہیں ان کی سرزمین سے نکال دیا تھا۔ اس کے لیے وہ آمادۂ جنگ تھے۔ اس کے باوجود اس پروگرام کو "فی سبیل اللہ" قرار دیا گیا تھا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ جو چیز انسانوں کی آزادی، ظلم کی سرکوبی اور تجاوز سے نجات کے لیے مددگار ثابت ہوسکے وہ "فی سبیل اللہ" میں شمار ہوتی ہے۔

"قال ھل عسیتم ان کتب علیکم القتال الا تقاتلوا"

ان کے پیغمبر چونکہ ان کی سستی وکاہلی سے واقف تھے اس لیے کہنے لگے: ممکن ہے جب تمہیں جہاد کا حکم دیا جائے تو تم عمل نہ کرو۔

"قالوا ومالنا الا نقاتل فی سبیل اللہ وقد اخرجنا من دیارنا وابنائنا"

وہ کہنے لگے: یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم دشمن کے ساتھ جنگ سے روگردانی کریں۔ حالانکہ اس نے ہمیں ہمارے شہر سے باہر نکال دیا ہے اور ہمارے بچوں کو ہم سے جدا کر دیا ہے۔

اسی طرح ان سے پیمان وفاداری لیا گیا لیکن خدا کا نام اس کا فرمان۔ اپنے وجود اور استقلال کی حفاظت کا تقاضا اور اولاد کی آزادی کی خواہش کوئی چیز بھی انہیں عہد شکنی سے نہ روک سکی اس لیے قرآن نے ساتھ ہی یہ فرمایا ہے:

"فلما کتب علیھم القتال تولوا الا قلیلا منھم" یعنی جب ان پر جہاد فرض ہوا تو تھوڑے سے افراد کے علاوہ سب لوگ روگرداں ہوگئے اور ان کے قائد نے ایک قلیل سی فوج لے کر جنگ کے عظیم میدان میں شرکت کی۔

---

[1] مجمع البیان [1] تفسیر مجمع البیان، "الدر المنثور" اور "قصص القرآن" سے اقتباس کی تلخیص



"واللہ علیمٌ بالظٰلمین":

خدا ان ظالموں کو جانتا ہے جنہوں نے اپنے آپ پر، معاشرے پر، آنے والی نسلوں پر اور اپنی اولاد پر ظلم کیا ہے۔ ان کے حسب حال سزا اب ان کا انتظار کر رہی ہے۔

"وقال لھم نبیھم ان اللہ قد بعث لکم طالوت ملکا":

اس آیت کے مطابق بنی اسرائیل کے لشکر کی بادشاہی اور سربراہی کے لیے خدا تعالیٰ نے طالوت کو منتخب کیا تھا اور شاید "بعث" کا لفظ اسی طرف اشارہ ہو جو کچھ اس واقعہ کی تفصیل میں بیان کیا گیا ہے یعنی غیر متوقع صورت حال کی وجہ سے طالوت پیغمبر کی مجلس تک آپہنچے۔

ضمنی طور پر آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ طالوت فقط لشکر کے کمانڈر ہی نہ تھے، ملک کے حکمران بھی تھے

"قالوا انّٰی یکون لہ الملک علینا ونحن احقّ بالملک منہ ولم یؤت سعۃ من المال":

بنی اسرائیل کی طرف سے یہ پہلی عہد شکنی ہے کہ انہوں نے اپنے پیغمبر کے سامنے طالوت کے انتخاب کے بارے میں اعتراض کیا۔ حالانکہ وہ تصریح کر چکے تھے کہ یہ انتخاب خدا کی طرف سے ہے لیکن وہ خدا کے انتخاب پر اعتراض کرنے سے بھی نہ چوکے اور کہنے لگے: ہم اس سے زیادہ حق دار ہیں کیونکہ عالی نسبی اور فراواں دولت تو ہمارے پاس ہے جو حکمرانی کی دو لازمی شرطیں ہیں۔

جیسا کہ ہم اس واقعے کی تفصیل میں دیکھ چکے ہیں کہ طالوت بنی اسرائیل کے ایک گمنام قبیلے سے تعلق رکھتے تھے اور مالی طور پر ایک عام زراعت پیشہ شخص سے زیادہ حیثیت نہ رکھتے تھے

قیادت کی شرائط

اس زمانے کے پیغمبر نے معترضین کو جو دندان شکن جواب دیا قرآن نے اسے یوں بیان کیا ہے: خدا نے اُسے تم پر حکمرانی کی خاطر اس لیے چنا ہے کہ وہ دانائی و مردانگی اور علم سے مالا مال ہے اور جسمانی طاقت کے لحاظ سے قوی اور صاحبِ قدرت ہے۔ یعنی تم اشتباہ کا شکار ہو اور رہبری کی بنیادی شرائط کو بھولے بیٹھے ہو۔

اس طرح قرآن نے قیادت کے لیے پیش کردہ ان کی شرائط کی نفی کر دی کیونکہ ان کی پیش کردہ دونوں شرائط میں سے کوئی بھی حقیقی امتیاز اور خصوصیت نہیں کہلا سکتی۔ آباؤ اجداد کی شخصیت اور دولت و ثروت دونوں اعتباری اور خارج از ذات امتیازات ہیں۔ لیکن علم و دانش اور جسمانی طاقت ذات میں داخل امتیازات اور خصوصیات ہیں۔

رہبر اپنے علم و دانش سے معاشرے کے لیے راہ سعادت کی نشاندہی کرتا ہے اور اس کے لیے اصول تبلاتا ہے نیز اپنی طاقت و قوت کے ذریعے اس کے اجراء کا اہتمام بھی کرتا ہے۔ اسی لیے تو فرمایا گیا ہے: "ان اللہ اصطفٰہ علیکم وزادہ بسطۃ فی العلم والجسم":



"بسطة" جس کا معنی "وسعت" ہے ضمنی طور پر علم و قدرت کے سائے میں انسانی وجود کی وسعت کی طرف اشارہ ہے یعنی علم و دانش اور فرزانگی نیز جسمانی قدرت و طاقت وجود و ہستی کے اعتبار سے انسان میں وسعت پیدا کرتی ہے اور جوں جوں یہ صفات وسیع ہوتی ہیں وجود ہستی میں بھی وسعت پیدا ہوتی رہتی ہے۔

"واللہ یؤتی ملکہ من یشاء"

ممکن ہے یہ جملہ رہبری کی تیسری شرط کی طرف اشارہ ہو جو یہ ہے کہ رہبر کے لیے مختلف اسباب و ذرائع کی فراہمی بھی درکار ہے کیونکہ ممکن ہے رہبر علم و قدرت سے تو کاملاً مالا مال ہو لیکن اس کا سابقہ ایسے حالات و اوقات سے ہو جو اس کے مقدس مقاصد کے لیے سازگار نہ ہوں۔ یہ طے شدہ بات ہے کہ ایسی رہبری واضح کامیابی حاصل نہیں کر سکتی۔ قرآن کہتا ہے کہ حکومت الٰہی جسے خدا چاہتا ہے بخش دیتا ہے یعنی اس ماحول کے لیے جو وسائل و ذرائع ضروری ہوں وہ اس کے لیے فراہم کر دیتا ہے۔

"واللہ واسع علیم"

یعنی خدا ایک وسیع اور لامتناہی ہستی ہے۔ اس کا فضل اور بخشش بھی اس کے وجود کی طرح لامتناہی ہے لیکن وہ علیم ہے اور جانتا ہے کہ کون سا منصب کسے بخشا جانا چاہیئے۔

"وقال لهم نبيهم ان اية ملكه ان يأتيكم التابوت"

یہ آیت نشاندہی کرتی ہے کہ بنی اسرائیل ابھی تک خدا کی طرف سے طالوت کی ماموریت پر مطمئن نہیں ہوئے تھے حالانکہ ان کے پیغمبر اشموئیلؑ تصریح کر چکے تھے کہ وہ اس کام کے لیے خدا کی طرف سے مامور ہوئے ہیں۔ انہوں نے اس کی نشانی اور دلیل کا تقاضا کیا۔ جواب میں اشموئیلؑ نے کہا: طالوت کے مامور من اللہ ہونے کی نشانی یہ ہے کہ تابوت (صندوق عہد) تمہاری طرف آئے گا۔

یہ بات بنی اسرائیل کے لیے کافی ہونا چاہیے تھی۔ بہر حال اب دیکھتے ہیں تابوت کیا چیز تھی۔

تابوت کیا ہے

"تابوت" کا لغوی معنی ہے وہ صندوق جسے لکڑی سے بنایا جائے۔ جنازے کے صندوق کو بھی اسی لیے تابوت کہتے ہیں لیکن تابوت مُردوں سے مخصوص نہیں بلکہ ہر قسم کے لکڑی کے صندوق کے لیے مستعمل ہے۔

بنی اسرائیل کا تابوت یا صندوقِ عہد کیا تھا، وہ کس کے ہاتھ سے بنا تھا اور اس میں کیا چیزیں موجود تھیں۔ اس سلسلے میں ہماری روایات و تفاسیر میں اور اسی طرح "عہد قدیم" (تورات) میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ سب سے زیادہ واضح چیز جو احادیث اہل بیتؑ اور بعض مفسرین مثلاً ابن عباس سے منقول ہے یہ ہے کہ یہ تابوت ..... وہی صندوق تھا جس میں حضرت موسیٰ کی والدہ نے انہیں لپٹا کر دریا میں پھینکا تھا۔ فرعون کے کارندوں نے اسے دریا میں سے پکڑ لیا۔ حضرت موسیٰ کو اس میں سے نکال لیا گیا اور صندوق جوں کا توں فرعون کے پاس محفوظ کر لیا گیا۔ بعد ازاں وہ بنی اسرائیل کے ہاتھ آیا تو وہ اس عجیب صندوق کو محترم شمار کرنے لگے اور اسے متبرک سمجھنے لگے۔



حضرت موسیٰؑ نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں وہ الواح مقدسہ جن پر احکام خدا لکھے ہوئے تھے اس میں رکھ دیں۔ نیز اپنی زرہ اور دوسری یادگار چیزوں کا بھی اس میں اضافہ کر دیا۔ صندوق آپؑ نے اپنے وصی حضرت یوشع بن نوع کے سپرد کر دیا۔ یوں صندوق کی اہمیت بنی اسرائیل کی نگاہ میں اور بڑھ گئی۔ لہٰذا وہ دشمنوں کے ساتھ جنگوں میں اسے ہمراہ لے جاتے اور اس کا ان پر نفسیاتی اور روحانی طور پر بہت اثر ہوتا۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ جب تک وہ دل انگیز صندوق اُن مقدس چیزوں کے سمیت ان کے ساتھ رہا وہ سربلند رہے اور آبرومندانہ زندگی بسر کرتے رہے لیکن رفتہ رفتہ ان کی دینی بنیادیں کمزور پڑ گئیں اور دشمن ان پر غلبہ حاصل کرتے رہے۔ وہ صندوق بھی ان سے چھن گیا۔

اِن آیات کے مطابق حضرت اشموئیل نے اُن سے وعدہ کیا کہ عنقریب صندوقِ عہد اُن کے قول کی سچائی کا مظہر بن کر واپس آجائے گا۔

"فیہ سکینۃ من ربکم و بقیۃ مما ترک اٰل موسٰی و اٰل ھٰرون"

اِس جملے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں صندوق عہد وہ ایسے تبرکات تھے جو حوادث کے موقع پر بنی اسرائیل کے لیے اطمینان بخش تھے اور معنوی و نفسیاتی اثرات کے حامل تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ بعد ازاں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کے خاندان کی کچھ یادگاریں بھی اس میں رکھ دی گئی تھیں۔

توجہ رہے کہ "سکینہ" سکون کے مادہ سے ہے اور تسکین و آرام کے معنی میں مستعمل ہے۔ یہاں اس سے مراد جان و دل کا سکون اور اطمینان ہے۔

حضرت اشموئیل نے بنی اسرائیل کو یہ بات دل نشین کرائی کہ صندوق عہد دوبارہ انہیں مل جائے گا اور جو سکون اور اطمینان وہ کھو بیٹھے ہیں دوبارہ حاصل کرلیں گے۔ معنوی و تاریخی پہلو کے حامل اس صندوق کی اہمیت دراصل بنی اسرائیل کے لیے ایک پرچم اور شعار سے بڑھ کر تھی۔ اسے دیکھ کر ان کی نظروں میں اپنی عظمت رفتہ کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ حضرت اشموئیل نے خبر دی کہ وہ صندوق لوٹ آئے گا۔ فطری امر ہے کہ یہ بنی اسرائیل کے لیے ایک بہت بڑی بشارت تھی۔

تحملہ الملٰئکۃ فرشتوں نے اُسے اٹھا رکھا ہوگا

فرشتے صندوق عہد کیسے لائے؟ اِس سلسلے میں مفسرین نے مختلف باتیں کی ہیں۔ ان میں سے زیادہ واضح تواریخ کے حوالے سے یہ ہے کہ جب صندوق عہد فلسطین کے بت پرستوں کے ہاتھ لگا اور وہ اسے اپنے بت خانے میں لے گئے اس کے بعد وہ بہت سی مصیبتوں اور ابتلاؤں کا شکار ہو گئے تو ان میں سے بعض کہنے لگے کہ یہ سب کچھ صندوق عہد کے آثار میں سے ہے لہٰذا انہوں نے طے کر لیا کہ اسے اپنے شہر اور علاقے سے باہر بھیج دیں گے۔ کوئی شخص اسے باہر لے جانے کو تیار نہ ہوا۔ مجبوراً دو بیل جوتے گئے اور صندوق عہد کو باندھ کر بیلوں کو بیابان میں جا کر چھوڑ دیا گیا۔ اتفاق سے یہ واقعہ ٹھیک اس وقت رونما ہوا جب طالوت کو بنی اسرائیل کا فرمانروا بنایا گیا۔

خدا کے فرشتوں کو حکم دیا گیا کہ وہ ان دو بیلوں کو اشموئیل کے شہر کی طرف ہانک کر لے جائیں۔ بنی اسرائیل نے



صندوق عہد کو دیکھا تو اسے طالوت کے خدا کی طرف سے مامور ہونے کی نشانی کے طور پر قبول کر لیا۔ اس لیے ظاہراً تو دو بیل اسے شہر میں لائے لیکن درحقیقت یہ کام خدائی فرشتوں کی وجہ سے انجام پذیر ہوا اسی وجہ سے صندوق اٹھا لانے کی نسبت فرشتوں کی طرف دی گئی ہے۔ اصولی طور پر فرشتہ اور ملک قرآن حکیم اور روایات میں ایک وسیع مفہوم کا حامل ہے۔ اس مفہوم میں روحانی عقل رکھنے والے موجودات کے علاوہ اِس جہان کی مخفی قوتوں کا ایک سلسلہ بھی شامل ہے۔

"انّ فی ذٰلک لاٰیۃ لّکم ان کنتم مؤمنین"

آیت کے آخر میں بنی اسرائیل کو یاد دھانی کرائی گئی ہے کہ صندوق عہد کی تمہارے پاس واپسی تمہارے لیے ایک واضح نشانی ہے بشرطیکہ تم ایماندار ہو۔ حقیقت میں یہ جملہ اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ اس روشنی اور نشانی کے باوجود تم میں ایسے افراد ہیں جو حق کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کریں گے۔ اس واقعے کے آخر میں یہ حقیقت واضح ہو جائے گی۔

"فلمّا فصل طالوت بالجنود قال انّ اللّٰہ مبتلیکم بنھر فمن شرب منہ فلیس منّی ومن لّم یطعمہ فانّہ منّی الّا من اغترف غرفۃً بیدہٖ فشربوا منہ الّا قلیلاً منھم۔

"فصل" کا معنی ہے "علیحدہ ہونا" اور "قطع ہونا"۔ "جُنُود" "جُند" کی جمع ہے۔ جند دراصل ایسی زمین کو کہتے ہیں جو بڑے بڑے پتھروں سے بھری ہو۔ تاہم ہر تکرانے والی اور آنکھوں میں کھبنے والی چیز کے لیے بھی یہ لفظ مستعمل ہے۔ اسی لیے عموماً لشکر کی کثیر تعداد کو جند کہتے ہیں۔

یہ بات وضاحت کی محتاج نہیں کہ ہر گروہ کی کامیابی رہبر اور کمانڈر کے حکم کے مطابق فوج کے نظم و ضبط اور ایمان کی مرہون منت ہے۔

اگر فوجی اپنے کمانڈر کی قابلیت اور حکم پر ایمان رکھتے ہوں تو اپنی ذمہ داری کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کرتے۔ طالوت جو بنی اسرائیل کو جہاد کے لیے لے جا رہے تھے ان کے لیے یہ جاننا ضروری تھا کہ ان کے اہل لشکر ان کے حکم کی کتنی اطاعت کرتے ہیں۔ خصوصاً جب کہ یہ وہ لشکر تھا جس نے تردد اور بددلی سے ان کی قیادت قبول کی تھی۔ اگرچہ وہ ظاہراً ان کی رہبری کو تسلیم کر چکے تھے لیکن اس بات کا امکان تھا کہ وہ فطرتاً ابھی شک و تردد کے عالم میں ہوں۔ لہٰذا فرمانِ الٰہی کے ذریعے انہیں حکم دیا گیا کہ انہیں آزمائیں۔ اس پر طالوت نے خبر دی کہ بہت جلد ایک نہر آئے گی۔ ساتھ ہی اُن سے کہہ دیا گیا کہ وہ پیاس کا مقابلہ کریں اور تھوڑا سا پانی پئیں تاکہ واضح ہو جائے کہ دشمن کی شمشیر آتش بار کے مقابلے میں جانے والا لشکر پیاس کو برداشت کرنے کی سکت رکھتا ہے یا نہیں۔

اِس واقعے کی تفصیل میں یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ اکثریت آزمائش کی اس کٹھالی سے صحیح سالم نہ نکل سکی۔

اِس طرح طالوت کا لشکر تطہیر کے دوسرے عمل سے گزرا۔ پہلی تطہیر وہ تھی جب انہوں نے عام لوگوں کو تیاری کے وقت کہا تھا کہ جو لوگ دل جمعی سے ساتھ نہ دے سکیں اور تکمیلِ مقصد تک قائم نہ رہ سکیں، وہ میرے ساتھ نہ آئیں۔



"فلما جاوزه هو والذين أمنوا معه قالوا لا طاقة لنا اليوم بجالوت وجنوده......"

یہ جملہ نشاندہی کرتا ہے کہ وہ تھوڑے سے افراد جو پیاس کی آزمائش پر پورے اترے وہی طالوت کے ساتھ گئے لیکن جب اس چھوٹے سے گروہ نے غور کیا کہ جلد ہی اُن کا دشمن کے عظیم اور طاقتور لشکر سے سامنا ہوگا تو اپنی تعداد کی کمی پر وہ بہت پریشان ہوئے۔ یہ وہ وقت تھا جب آزمائش کا تیسرا مرحلہ شروع ہوا۔

"قال الذين يظنون انهم ملاقوا الله كم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة."

"فئة" کا مادہ ہے "فیء" اس کا معنی ہے بازگشت۔ گروہ اور تشکیل شدہ جماعت کو بھی فئۃ کہتے ہیں کیونکہ وہ ایک دوسرے کی طرف پلٹ آتے ہیں اور ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔

آیت کہتی ہے کہ اس وقت قیامت پر ایمان راسخ رکھنے والے باقی ساتھیوں کو بیدار اور تنبیہ کرنے لگے کہ کسی جمعیت کی مقدار اور تعداد پر نگاہ نہیں کرنا چاہیئے بلکہ کیفیت اور جذبے کو دیکھنا چاہیے۔ کیونکہ بہت دفعہ ایسا ہوا ہے کہ ایک کم تعداد مگر باایمان اور عزم صمیم رکھنے والی جمعیت نے حکم خدا سے اپنے سے کہیں بڑی تعداد پر غلبہ پا لیا۔

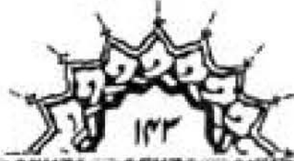
توجہ رہے کہ "یظنون" اس مقام پر "یعلمون" کے معنی میں ہے۔ یعنی جو قیامت پر یقین رکھتے ہیں نہ کہ قیامت کا گمان رکھتے ہیں کیونکہ "ظن" بہت سے مواقع پر یقین کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور اگر اسے گمان کے معنی میں لیا جائے تب بھی غیر مناسب نہیں ہے کیونکہ پھر آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ قیامت کا گمان (چہ جائیکہ علم ولیقین) بھی کافی ہے کہ وہ انسان کو مقاصد الٰہی کے سامنے راسخ العزم بنا دے کیونکہ زندگی میں کامیابی کا گمان رکھنے والے تمام لوگ مثلاً زراعت، تجارت، صنعت اور سیاست سے وابستہ لوگ صرف گمان کی بنیاد پر اپنا کام پختہ ارادے سے انجام دیتے ہیں قیامت کے دن لقائے پروردگار کا دن کیوں کہا گیا ہے اس سلسلے میں تفسیر نمونہ کی جلد اوّل کے اردو ترجمہ کے صفحہ ۱۸۳ پر گفتگو کی جا چکی ہے۔ "باذن الله" یعنی حکم خدا سے۔

عزم صمیم رکھنے والے ایمان دار لوگوں کی بہت سے بے ایمان گروہوں اور جماعتوں پر کامیابی ایک مسلّمہ امر ہے جو روحانی اور نفسیاتی عوامل سے مرلوط ہے پھر بھی قرآن اسے فرمان الٰہی سے منسلک قرار دیتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس عالم میں کسی بھی طرح کے آثار و نتائج ہوں سب آفرینش پروردگار کی برکت سے، اس کی طرف سے اور اس کے حسب فرمان ہیں۔ ایسی ہی تعبیر قرآن میں بہت سے مواقع پر نظر آتی ہے۔

"والله مع الصابرين"

یہ جملہ عزم صمیم رکھنے والے اہل ایمان کی طرف سے دوسروں کو صبر و استقامت کی دعوت کا حرف آخر ہے۔ یہ اہل ایمان انہیں بشارت دیتے تھے کہ خدا اہل صبر و استقامت کے ساتھ ہے۔

"ولما برزوا لجالوت وجنوده"



" بروز " کا معنی ہے ظہور " ۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی آمادۂ جنگ ہو اور میدانِ جنگ میں نکل آئے تو اس کے عمل کو" براز " کہتے ہیں اور جب کوئی دوسرے کو جنگ کی دعوت دے تو کہتے ہیں کہ وہ مبارز طلبی کر رہا ہے۔

یہ آیت کہتی ہے کہ جب طالوت اور اُن کا لشکر ایسی جگہ پر پہنچ گئے جہاں جالوت کا طاقتور لشکر نمایاں طور پر نظر آرہا تھا تو وہ اِس عظیم قوت کے سامنے صف بستہ ہوگئے اُنہوں نے دُعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اپنے تئیں پروردگار کی لامتناہی قدرت کے سپرد کر دیا اور اس سے استقامت اور صبر کا تقاضا کیا ۔

" ربنا افرغ علینا صبرًا "

" افراغ " کا مطلب ہے کسی سیال مادے کو برتن سے ایسے گرانا کہ برتن خالی ہو جائے حضرت طالوت کے ہمراہی دعا کے وقت کہتے ہیں کہ خداوندا ہم پر صبر و استقامت انڈیل دے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدا سے صبر، استقامت اور پامردی کا آخری درجہ طلب کر رہے ہیں جیسے کسی برتن کا سارا پانی کسی پر ڈال دیا جائے اور برتن خالی ہو جائے ۔

" و ثبت اقدامنا "

یعنی ہمیں ثابت قدم رکھ تاکہ ہمارے قدم اکھڑ نہ جائیں اور میدان سے بھاگ کھڑے نہ ہوں حقیقت میں پہلی دُعا باطنی پہلو کی حامل ہے اور یہ دُعا ظاہری پہلو رکھتی ہے اور یہ مُسلّم ہے کہ ثابت قدمی صبر و استقامت کی روح کا نتیجہ ہے

" وانصرنا علی القوم الکافرین "

دراصل یہ جملہ استقامت اور ثبات قدمی کا نتیجہ ہے جو گذشتہ دو جملوں میں بیان ہو چکی ہے یعنی خداوندا استقامت اور ثبات قدمی کے زیرِ سایہ ہمیں کفار پر فتح عطا فرما ۔

" فھزموھم باذن اللہ وقتل داؤد جالوت "

اِس آیت میں طالوت کی رہبری اور کمان میں بنی اسرائیل کی جالوت جیسے ظالم اور اس کے طاقتور لشکر سے جنگ کے آخری مرحلے کو بیان کیا گیا ہے جالوت کا لشکر آخر کار شکست کھا کر بھاگ کھڑا ہوا خود جالوت بھی حضرت طالوت کے لشکر کے ایک شخص داؤد کے ہاتھوں قتل ہوگیا ۔ داؤد کے ہاتھوں جالوت کے قتل کی تفصیلات گذشتہ اوراق میں بیان کی جا چکی ہیں ۔

زیرِ نظر آیت میں یہ صراحت موجود نہیں کہ یہ داؤد وہی پیغمبر ہیں جو حضرت سلیمانؑ کے والدِ گرامی ہیں یا کوئی اور شخص ۔ لیکن اس آیت سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مقامِ نبوت کے حامل ہوئے آیت کا اگلا حصہ یہ ہے ۔

" و اتٰہ اللہ الملک والحکمۃ وعلمہ مما یشاء "

یعنی ۔ خدا نے اُسے حکومت اور علم عطا کیا اور جو کچھ وہ چاہتا تھا اُسے سکھایا
ایسی تعبیر عام طور سے انبیاء کے متعلق ہی ہوتی ہے ۔
سورہ ص آیہ ۲۰ میں حضرت داؤد پیغمبر کے بارے میں ہے ۔



"وشددنا ملکه وآتیناه الحکمة."

اور ہم نے اس کی حکومت کو مضبوط کر دیا اور اسے علم ودانش عطا کیا ۔

اس آیت کے ذیل میں جو احادیث منقول ہیں ان سے بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ وہی مشہور پیغمبر حضرت داؤد تھے ۔

ضمناً "علمه مما یشاء" (جو علوم خدا چاہتا تھا اُسے سکھائے) سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء ومرسلین کے علوم اور حکمتیں اُس محدود مقدار کی حامل ہوتی ہیں جس کا خدا ارادہ کرتا ہے اگرچہ ان کے علم ودانش کا دائرہ بہت ہی وسیع ہوتا ہے پھر بھی وہ اس مقدار میں ہوتا ہے جو خدا چاہتا ہے ۔

تنازع لبقا کا مفروضہ

"ولولا دفع الله الناس بعضهم ببعض لفسدت الارض."

اس طرف توجہ رکھتے ہوئے کہ یہ آیت بنی اسرائیل کے مومنین کی ایک جماعت کے ہاتھوں ظالم جالوت اور اس کی فوج کی شکست کے بعد آئی ہے تفسیر خود بخود واضح ہو جاتی ہے کیونکہ اگر خداوند عالم بعض اوقات صاحب ایمان و استقامت لوگوں کے ذریعے ستمگروں اور ظالموں کی سرکوبی نہ کرے تو ممکن ہے کہ وہ تمام روئے زمین پر قدرت حاصل کرلیں ۔ پروردگار عالم کی سنت تو یہ ہے کہ دُنیا میں ارادہ و اختیار کی آزادی ہو اور لوگ خیر وشر کا راستہ اختیار کرنے میں آزاد ہوں ، لیکن جب ستم گروں کی سرکشی دُنیا کی عمومی تباہی کا باعث بن رہی ہو تو خدا اپنے بندوں میں سے کسی ایک گروہ کی مدد کرتا ہے جو راہِ سرکشی کو روک دیتے ہیں اور یہ پروردگار عالم کا اپنے بندوں پر ایک لطف وکرم ہے ۔

اس جملے کی نظیر سورہ حج آیت ۴۰ میں موجود ہے ارشاد ہوتا ہے :

"ولولا دفع الله الناس بعضهم ببعض لهدمت صوامع وبیع وصلوات ومساجد ......"

اگر خدا اپنے بعض بندوں کے ذریعے بعض دوسروں کو دفع نہ کرے تو گرجے ، کلیسے ، یہودیوں کے عبادت خانے اور مسلمانوں کی مسجدیں ویران ہو جائیں ۔

جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ بعض لوگوں کے گمان کے برخلاف آیت تنازعِ بقا سے کوئی رابطہ نہیں رکھتی ان کا خیال ہے کہ محل بحث آیت کہتی ہے کہ انسانوں میں ہمیشہ جنگ وجدال رہنا چاہیئے اور اگر ایسا نہ ہوا تو جمود ، سستی اور فساد پوری زمین کو اپنی گرفت میں لے لے گا اور نسلِ انسانی تنزل کا شکار ہو جائے گی لیکن نزاع اور دائمی جنگ وجدل کے باعث زیادہ طاقتور باقی رہ جاتے ہیں اور کمزور پامال ہو کر ختم ہو جاتے ہیں اور یوں زیادہ صلاحیت رکھنے والا منتخب ہو جاتا ہے جسے انتخابِ اصلح کہتے ہیں ۔

لیکن یہ تفسیر اس صورت میں ہی ممکن ہے کہ ہم آیت کو اس کے ماقبل سے بالکل منقطع کر دیں اور اس کی مشابہ سورہ حج کی آیت سے بھی صرف نظر کرلیں لیکن اگر ان پر توجہ رکھیں تو واضح ہو جاتا ہے کہ یہ ظالم اور سرکش لوگوں سے جنگ



کے بارے میں ہے اور اس میں اصولی طور پر جنگ کو مقدس و محترم قرار نہیں دیا گیا علاوہ ازیں تنازع بقاء کے قانون کے نام سے جو کچھ کہا جاتا ہے اور جو ڈاروں کے چیزوں کے تکامل و ارتقا کے چار یادگار اصولوں میں شمار ہوتا ہے وہ کوئی مسلّمہ علمی قانون نہیں ہے بلکہ ایک باطل شدہ مفروضہ ہے یہاں تک کہ تکامل انواع کے حامی بھی دُنیا میں تنازع بقاء کے قانون کا ہرگز سہارا نہیں لیتے اور جانوروں کے تکامل کو طبیعت و خلقت کے قانون سے مربوط سمجھتے ہیں [1]

ان تمام چیزوں سے قطع نظر اگر تنازع بقاء کے مفروضے کی کوئی علمی بنیاد تسلیم کرلی جائے تب بھی اس سے صرف جانوروں کی زندگی کے سلسلے میں استفادہ کیا جا سکتا ہے لیکن اسے انسانی زندگی کی بنیاد ہرگز قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ انسانی تکامل و ارتقاء تعاون بقاء کے ذریعے ہے نہ کہ تنازع بقاء کے زیر سایہ۔ اس طرح واضح ہوتا ہے کہ تنازع بقاء کے مفروضے میں نوعِ انسانی کو بھی شامل کرنا ایک طرح کی استعماری اور سامراجی طرزِ فکر ہے سرمایہ داری کے بعض حامی اپنی خونی جنگوں اور نفرت انگیز حکومتوں کی توجیہ اس طرزِ فکر سے کرتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ جنگ و جدل کو ایک فطری تقاضے اور انسانی معاشروں کی ترقی کے زینے کے طور پر متعارف کرائیں اور اپنے جرائم کو ایک علمی لبادہ اوڑھا دیں لہٰذا جن لوگوں نے اُن کے انسان دشمن افکار کے زیرِ اثر زیرِ بحث آیت کو ان کی فکر پر منطبق کیا ہے وہ یقینی طور پر قرآنی تعلیمات سے بہت دور چلے گئے ہیں کیونکہ قرآن صراحت سے کہتا ہے:

"یاایها الذین اٰمنوا ادخلوا فی السلم کافة": (البقرة آیت ٢٠٨)

اے ایمان والو! سب کے سب صلح و سلامتی میں داخل ہو جاؤ

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے:

"ولکنّ الله ذو فضل علی العالمین":

خدا عالمین پر لطف و رحمت کی نظر رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ روئے زمین پر فساد و بربادی کے پھیلنے اور لوگوں کو اس کی لپیٹ میں آنے سے روکتا ہے۔

"تلك اٰیات الله نتلوها علیك بالحق وانّك لمن المرسلین":

ہر آیت میں بنی اسرائیل کے بارے میں بیان کیے گئے متعدد واقعات کی طرف اشارہ موجود ہے ان میں سے ہر واقعہ پروردگار کی قدرت و عظمت کی نشانی ہے اور یہ واقعات خرافات اور ہر افسانوی رنگ سے پاک ہو کر پیغمبر اسلام پر نازل ہوئے اور یہ امر بذات خود پیغمبر اکرمؐ کی سچائی اور نبوت کی ایک علامت ہے وانّك لمن المرسلین

٢٥٣۔ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَاَيَّدْنَاهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ

[1] مزید وضاحت کے لیے "آخرین فرلفیسہ ہائے تکامل" کا مطالعہ فرمائیں۔



الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۟ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ۝

ترجمہ

۲۵۳۔ ان بعض رسولوں کو ہم نے بعض پر فضیلت دی ہے۔ ان میں سے بعض سے خدا نے (براہ راست) گفتگو کی ہے اور بعض کو برتر درجات عطا کیے ہیں اور عیسیٰ بن مریم کو ہم نے واضح نشانیاں دی ہیں اور ان کی تائید ہم نے روح القدس کے ذریعے کی (لیکن کسی پیغمبر کے مقام کی فضیلت سے امتوں کا اختلاف ختم نہ ہوا) اگر خدا چاہتا تو ان پیغمبروں کے بعد آنے والے لوگ واضح نشانیاں آجانے کے بعد ایک دوسرے سے جنگ و جدال نہ کرتے (لیکن خدا لوگوں کو مجبور نہیں کیا کرتا اور انہیں راہ سعادت طے کرنے کے لیے آزاد رہنے دیتا ہے) مگر ان امتوں نے آپس میں اختلاف کیا۔ بعض ایمان لے آئے اور بعض کافر ہو گئے (اور جنگ و جدال اور اختلاف کے درپے ہو گئے) پھر بھی اگر خدا چاہتا تو وہ آپس میں جنگ نہ کرتے لیکن خدا جو چاہتا ہے (حکمت کی بناء پر) انجام دیتا ہے۔

تفسیر

"تِلْكَ الرُّسُلُ":

"تِلْكَ" اشارۂ بعید کے لیے ہے لیکن جیسا کہ ہم جانتے ہیں کبھی کسی شخص یا چیز کے احترام کے لیے، اس کی حیثیت اور مقام کو مدنظر رکھتے ہوئے اشارہ بعید استعمال کیا جاتا ہے۔ یہاں بھی "رُسُل" سے پہلے "تِلْكَ" پیغمبران خدا کی عظمت اور بلند مقام کی طرف اشارہ ہے۔

"رُسُل" سے یہاں مراد تمام مرسلین اور پیغمبر ہیں یا پھر وہ رسول مراد ہیں جن کا ذکر اسی سورہ کی گذشتہ آیات میں آچکا ہے یا جن کے واقعات کی طرف اشارہ ہو چکا ہے۔ مثلاً ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ، داؤد اور اشموئیل۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد وہ تمام رسول ہوں جن کے نام قرآن میں اس آیت کے نزول سے پہلے آچکے تھے اس سلسلے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے لیکن زیادہ ترجیح معلوم ہوتا ہے کہ اس سے تمام پیغمبر مراد ہیں۔ کیونکہ اصطلاحی طور پر لفظ "الرسل" "جمع محلی باللام" ہے جو عمومیت پر دلالت کرتا ہے۔ لہٰذا سب رسولوں کے لیے ہے۔

"فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ":



یہ جملہ وضاحت کرتا ہے کہ اگرچہ نبوت و رسالت کے لحاظ سے تمام پیغمبر ایک دُوسرے کی مثل و نظیر ہیں لیکن مقام و منزلت میں یکساں نہیں ہیں کیونکہ ان کی ذمہ داریاں مختلف تھیں۔ فداکار تو وہ سب تھے لیکن ان کی فداکاری کے درجات مختلف ہیں۔ اسی لیے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ان میں سے بعض کو ہم نے بعض پر فضیلت دی ہے۔

"منھم من کلم اللّٰہ"

اِس جملے میں پیغمبروں کے بعض فضائل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ خُدا نے ان سے بعض کے ساتھ گفتگو کی ہے۔ واضح ہے کہ اس سے مراد حضرت موسیٰؑ ہیں چونکہ وہی ایسی شخصیت ہیں جو کلیم اللّٰہ کے نام سے مشہور ہیں۔ سُورہ نساء آیت ۱۶۴ میں اُن کے بارے میں ہے

"و کلم اللّٰہ موسٰی تکلیما"

یہ اخذ کرنا بہت بعید ہے کہ اس سے مراد پیغمبر اسلام ہیں اور (سُورہ شوریٰ آیت ۵۱ کے قرینے سے) اِس "تکلم" سے مراد وحی ہی ہے۔

"وَ رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ"

اِس جملے میں بعض پیغمبروں کی درجے اور مرتبے کے اعتبار سے فضیلت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ آیت کی ابتدا میں پیغمبروں کے درجات کے فرق کو بیان کیا گیا ہے۔ اس بات کو سامنے رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ زیرِ نظر جملے سے مراد ایک یا کئی مخصوص افراد ہیں جن کا کامل نمونہ پیغمبر اسلام ہیں کیونکہ آپؐ کی ذات بابرکات ایسی ہے جس کا لایا ہوا دین و آئین آخری اور کامل ترین تھا اور جس کی رسالت کامل ترین دین کی تبلیغ کیلئے ہے اُسے خود سب سے برتر ہونا چاہیئے اور خصوصاً یہ کہ قرآن اُن کے بارے میں کہتا ہے۔

"وجئنا بک علٰی ھٰؤلاء شھیدا"

قیامت کے دن ہر پیغمبر اپنی امت پر گواہ ہے اور تم تمام پیغمبروں پر گواہ ہو۔ (نساء ۴۱)

یہ آیت بھی مذکورہ مُوقف کی درستی پر دلالت کرتی ہے۔ گذشتہ جملے میں چونکہ حضرت موسیٰؑ کی فضیلت کیطرف اشارہ کیا گیا ہے اور بعد کا جملہ حضرت عیسیٰؑ کے مقام و منزلت کی صراحت کرتا ہے، لہٰذا بحث کی مناسبت سے یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ جملہ بھی پیغمبر اسلامؐ کی عظمت کی طرف اشارہ کرتا ہے کیونکہ یہ تینوں پیغمبر عالمی مذاہب کے پیشوا ہیں اور اگر پیغمبر اسلامؐ کا ذکر ان دونوں کے درمیان آیا ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ آپؐ ہی کا دین دیگر ادیان کے لیے حدِ وسط ہے اور اس میں ہر چیز اعتدال کے ساتھ موجود ہے جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

"وکذٰلک جعلنٰکم امۃ وسطا" (بقرہ - ۱۴۳)

اور اس طرح ہم نے تمہیں امت وسط قرار دیا

ان تمام چیزوں کے باوجود آیت کے آئندہ جملے نشاندہی کرتے ہیں کہ "و رفع بعضھم درجات" سے مراد بعض گذشتہ پیغمبر مثلاً حضرت ابراہیمؑ، حضرت نوحؑ اور بعض دیگر ہیں کیونکہ بعد میں فرمایا گیا ہے:



"ولو شآء اللّٰہ ما اقتتل الذین من بعدھم"

یعنی : اگر خدا چاہتا تو ان پیغمبروں کی امتیں ان کے بعد آپس میں جنگ و جدال نہ کرتیں۔

اس جملے سے ظاہر ہوتا ہے کہ گذشتہ جملے سابق پیغمبروں کے بارے میں ہیں۔

"واٰتینا عیسی ابن مریم البینات وایدناہ بروح القدس"

فرمایا گیا ہے کہ ہم نے عیسٰی کو واضح نشانیاں دیں مثلاً ناقابل علاج بیماروں کو شفا دینا، مُردوں کو زندہ کرنا، اعلٰی مذہبی معارف اور روح القدس کے ذریعے انہیں تائید و تقویت بخشی۔

اس بارے میں سورہ بقرہ کی آیت ۸۷ میں بحث ہو چکی ہے کہ روح القدس سے مراد وحی الٰہی پہنچانے والے جبرئیل ہیں یا کوئی مخفی معنوی قوت جو تمام مومنین میں مختلف درجے پر موجود ہے۔

"ولو شآء اللّٰہ ما اقتتل الذین من بعدھم من بعد ما جاءتھم البینات"

یہ جملہ اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ پیغمبروں کی عظمت ان پیروکاروں کے درمیان اختلاف میں رکاوٹ کا سبب نہیں بنی کیونکہ خدا نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے۔ تکامل و ارتقاء کے لیے ضروری ہے کہ انسان حق و فضیلت کے راستے کو اپنے ارادے سے طے کرے۔ اگر خدا چاہتا تو اس میں کوئی رکاوٹ نہ تھی کہ وہ انسان کو حیوانات کی طرح خاص غرائز و طبائع کے ساتھ پیدا کرتا اور ان کے زیر اثر وہ انبیا کی پیروی کرتا اور صلح و صفائی سے رہتا لیکن یہ مسلم ہے کہ پھر ان پیغمبروں کی پیروی کرنا یا صلح و آشتی سے رہنا اور جنگ و جدال سے بچنا فضیلت و فخر کا باعث نہ ہوتا کیونکہ اس میں جبر و اکراہ کا پہلو پایا جاتا ہے۔

"ولٰکن اختلفوا فمنھم من اٰمن ومنھم من کفر"

اس اختلاف کا سرچشمہ خود لوگ ہی تھے ورنہ انبیاء و مرسلین میں تو کوئی اختلاف نہ تھا۔ اُن سب کا تو ایک ہی ہدف اور مقصد تھا۔ ہوا یہ کہ بعض لوگ ان کی تعلیمات پر ایمان لے آئے اور بعض نے مخالفت کی اور یہ امر اختلافات کے ظہور کا باعث بنا۔

"ولو شآء اللّٰہ ما اقتتلوا ولٰکن اللّٰہ یفعل ما یرید"

دوبارہ تاکید کی گئی ہے کہ یہ کام خدا کے لیے آسان تھا کہ جبری طور پر اختلافات کو ختم کر دیتا لیکن خدا اپنے ارادے کے مطابق امور انجام دیتا ہے اور خدا کا ارادہ حکمت اور تکامل انسانی سے ہم آہنگ ہے۔ اُس نے انسان کو آزاد اور مختار قرار دیا ہے اگرچہ بعض لوگ اس آزادی سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں۔

کیا مختلف مذاہب اختلاف کا سبب ہیں؟

بعض مغربی مصنفین ادیان و مذاہب پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ انسانوں میں تفرقے اور نفاق کا باعث ہیں اور مذاہب کی راہ میں بہت زیادہ انسانی خون بہایا گیا ہے۔ تاریخ میں بہت سی مذہبی جنگوں کے تذکرے موجود ہیں۔



اِس اعتراض کے ذریعے وہ مذہب کی مذمت کرنا چاہتے ہیں اور اسے جنگ و جدال کا موجب قرار دیتے ہیں
اِس کے مقابلے میں یہ امور قابلِ توجہ ہیں ۔

اوّلاً جیسکہ مندرجہ بالا آیت نشاندہی کرتی ہے کہ حقیقت میں سچے پیروکاروں اور حقیقی مذاہب کے درمیان کوئی اختلاف نہ تھا بلکہ اختلاف تو پیروانِ مذہب اور مخالفین مذہب کے درمیان تھا اور یہ جو مختلف مذاہب کے پیروکاروں میں جنگ و جدال دکھائی دیتا ہے وہ اُن کی مذہبی تعلیمات کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ مذاہب میں تحریف ، نارِوا تعصبات اور آسمانی مذاہب میں خرافات کی آمیزش ہے ۔

ثانیاً آج جب کہ بیشتر انسانی معاشروں میں سے مذہب یا کم از کم اس کی تاثیر ختم ہو چکی ہے تو پھر جنگوں میں وحشتناک ترین صورت میں وسعت کیوں آگئی ہے ۔آج یہ وحشت ناک جنگیں دنیا کے وسیع علاقوں میں جاری و ساری ہیں کیا اس کا الزام بھی مذہب کو دیا جائے گا یا پھر یہ تسلیم کرلیا جائے گا کہ انسانوں کے ایک گروہ کا سرکش نفس ان جنگوں کا حقیقی سرچشمہ ہے ۔ ہاں البتہ یہ لوگ کبھی مذہب کا بھیس بدل لیتے ہیں ، کبھی سیاسی و اقتصادی مکاتب کا لباس پہن لیتے ہیں اور کبھی کسی اور سانچے میں ڈھل کر سامنے آجاتے ہیں اس لیے قصور مذہب کا نہیں ہے ۔ یہ سرکش لوگ ہیں جو اصل مجرم ہیں جو حیلے بہانوں سے جنگوں کی آگ بھڑکاتے رہتے ہیں

ثالثاً آسمانی مذاہب بالخصوص اسلام نسل پرستی اور قوم پرستی کے مخالف ہیں اسیلے انہوں نے بہت سی نسلی ، جغرافیائی اور قبائلی سرحدوں کو ختم کردیا ہے اور جن جنگوں کا سرچشمہ یہ امور تھے وہ فطرتاً ختم ہو گئی ہیں ۔یوں جنگوں کا ایک حصہ انسانی زندگی کے مذہب کے زیر اثر آنے کے باعث تاریخ سے حذف ہو گیا ہے ۔علاوہ ازیں صلح و سلامتی ، اچھے اخلاق و اوصاف تمام آسمانی مذاہب کی توجہ کا مرکز ہیں اور مختلف قوموں میں دشمنیوں اور نفرتوں کو کم کرنے میں مذاہب کی اِس تعلیم نے گہرا اثر مرتب کیا ہے ۔

رابعاً مذاہب آسمانی کا ایک پیغام محروم اور ستم رسیدہ طبقات کی آزادی تھا ۔ اسی لیے ابنیاء اور ان کے پیروکاروں نے جو جنگیں ستمگروں ، ظالموں ، فرعونوں اور نمرودوں سے لڑیں وہ دراصل انسانوں کی آزادی کے لیئے جہاد کا مرتبہ رکھتی ہیں اور یہ مذاہب کے لیے کسی عیب یا نقص کا موجب نہیں بلکہ ان کی قوت و طاقت کا نقطہ ہیں ۔ایک طرف مشرکین عرب اور مکّہ کے سود خواروں اور دوسری طرف کسریٰ و قیصر سے پیغمبر اکرم کی جنگ بھی اسی سلسلے کی کڑی تھی ۔

۲۵۴ - يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْآ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○

ترجمہ

۲۵۴ ۔ اے ایمان والو ! جو کچھ ہم نے تمہیں رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کرو ، اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خرید و فروخت ہو سکتی ہے تاکہ تم اپنے لیے سعادت اور سزا سے



نجات خرید سکو، اور نہ دوستی (اور عام رفاقتیں وہاں سود بخش ہوں گی) اور نہ ہی شفاعت (کیونکہ تم شفاعت کے لائق نہ ہو گے) اور کافر تو ظالم ہیں (وہ اپنے اوپر بھی ظلم کرتے ہیں اور معاشرے پر بھی)

تفسیر

گزشتہ آیات میں پہلی اُمتوں کی سرنوشت، جہاد اور حکومت کا ذکر تھا۔ اب اس آیت میں مسلمانوں کی ذمہ داریوں کا بیان ہے نیز حکومت اور معاشرے کے لیے دفاعی بنیادوں کی تقویت کیطرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اے صاحب ایمان لوگو! ہم نے جو روزی تمہیں دی ہے اس میں سے خرچ کرو۔ بعید نہیں کہ اس آیت میں انفاق سے مراد انفاقِ واجب یعنی زکوٰۃ ہو کیونکہ اس کے بعد اس سے منہ موڑنے والوں کو روزِ قیامت سزا کی دھمکی دی گئی ہے۔ علاوہ ازیں انفاقِ واجب ہی دراصل بیت المال اور حکومت کی بنیاد کو تقویت پہنچاتا ہے۔ ضمنی طور پر "مما" سے معلوم ہوتا ہے کہ انفاق واجب ہمیشہ مال کے ایک حصے پر مشتمل ہوتا ہے نہ کہ سارے مال پر۔

"من قبل ان یاتی یوم لابیع فیہ ولا خلۃ ولا شفاعۃ"

آج جب کہ تم میں توانائی ہے انفاق کر لو اور خرچ کر لو چونکہ دوسرا جہان تو یہاں بوئے گئے کے کاٹنے کی جگہ ہے۔ وہاں معاملہ تمہارے ہاتھ سے نکل چکا ہوگا وہاں خرید و فروخت کا معاملہ انجام نہ دے سکو گے کہ جس کے ذریعے اپنے لیے سعادت و نجات خرید سکو اور نہ اِس جہان میں سرمائے کے ذریعے مادی دوستیاں حاصل کی جا سکتی ہیں کہ جو وہاں فائدہ بخش ہو سکیں اور شفاعت بھی تمہارے لیے سودمند نہ ہو گی کیونکہ تم واجب ادائیگیوں سے بھی عہدہ برآ نہیں ہوتے اس لیے تم پر نجات کے سارے دروازے بند ہو جائیں گے۔

"والکافرون ھم الظالمون"

اِس جملے میں قرآن یہ حقائق واضح کرنا چاہتا ہے:

۱۔ کافر اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں کیونکہ انفاق اور واجب مخارج نیز دیگر دینی اور انسانی فرائض ترک کر کے خود کو عظیم ترین سعادتوں سے محروم کر دیتے ہیں۔ ان کے یہی اعمال اُس جہان میں ان کے دامن گیر ہوں گے اور یہ خدا کی طرف سے کوئی ظلم نہ ہو گا۔

۲۔ کافر اپنے معاشرے پر بھی ظلم کرتے ہیں۔ اصولی طور پر کفر ہی قساوت، سنگدلی، مادہ پرستی اور دنیاداری کا منبع ہے۔ یہی چیزیں ظلم و ستم کے اصلی سرچشمے ہیں۔

یہاں اِس نکتے کی یاد آوری بھی ضروری ہے کہ کفر کا لفظ اس آیت میں حکمِ انفاق کے بعد آیا ہے۔ لہٰذا یہاں یہ لفظ روگردانی، گناہ اور حکم خدا کی خلاف ورزی کے معنی میں ہے اور اس معنی میں یہ لفظ قرآن و حدیث میں بہت مقامات پر آیا ہے۔

۲۵۵۔ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ



يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ○

ترجمہ

۲۵۵۔ اُس خدائے یگانہ کے سوا کوئی معبود نہیں جو زندہ ہے اور اپنی ذات سے قائم ہے اور باقی موجودات اُس کے ساتھ قائم ہیں۔ اُسے کبھی اُونگھ اور نیند نہیں آتی (اور لمحہ بھر کے لیے بھی وہ جہانِ ہستی کی تدبیر سے غافل نہیں ہوتا) جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اسی کی طرف سے ہے۔ کون ہے جو اُس کے حضور اس کے فرمان کے بغیر شفاعت کرے (اس لیے شفاعت کے اہل لوگوں کے لیے شفاعت کرنے والوں کی شفاعت اس کے مالکِ مطلق ہونے میں کوئی کمی نہیں کرسکتی)۔ جو کچھ ان (بندوں) کے سامنے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اُسے وہ جانتا ہے (اور لوگوں کے گذشتہ اور آئندہ حالات یکساں طور پر اسکے علم میں ہیں) اور سوائے اس مقدار کے جسے وہ چاہے کوئی شخص اس کے علم سے واقف نہیں ہوسکتا (وہ ایسی ذات ہے کہ جو تمام چیزوں سے آگاہ ہے اور دوسروں کا محدود علم و دانش اسی کے لامتناہی اور لامحدود علم کا پرتو ہے) اور اُسکی (حکومت کی) کرسی آسمانوں اور زمین کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے اور ان (آسمانوں اور زمین) کی نگہداری اس کے لیے گراں نہیں ہے اور بلندئ مقام اور عظمت اسی سے مخصوص ہے۔

تفسیر

"اللہ لا الٰہ الا ھو الحی القیوم ......"

یعنی وہ ذات جو یگانہ اور تنہا ہے اور تمام صفاتِ کمال کی جامع ہے وہی عالمِ ہستی کو پیدا کرنے والی ہے۔ لہٰذا عالمِ وجود میں کوئی اس کے علاوہ پرستش کے لائق نہیں ہے۔ لا الہ الا اللہ۔ اس ارشاد میں قرآن خلّاقِ عالم کی وحدت و یگانگی کو جو اسلام کی بنیاد ہے بیان کرتا ہے لیکن جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے لفظ "اللہ" میں بھی یہ حقیقت پوشیدہ ہے اس بناء پر کہا جاسکتا ہے کہ لا الہ الا اللہ اس حقیقت کی تاکید ہے۔

"حیّ" کا معنی ہے زندہ اور یہ لفظ ہر صفت مشبہ کی طرح دوام و ہمیشگی پر دلالت کرتا ہے۔ خدا کی حیات



حقیقی ہے کیونکہ اس کی حیات عین ذات ہے نہ کہ عارضی یا کسی دوسرے سے لی ہوئی۔ سورہ فرقان آیہ ۵۸ میں ہے۔

"وَ تَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ"

یعنی اس زندہ ذات پر بھروسہ کرو جسے کبھی موت نہ آئے گی

ایک یہ پہلو ہے اور دوسرا یہ ہے کہ حیات کامل وہ زندگی ہے جس میں موت کا تصور نہ ہو۔ اس لیے حقیقی حیات اسی کی ہے جو ازل تا ابد قائم و دائم ہے۔ رہی انسان کی زندگی خصوصاً اس جہان میں جہاں موت بھی ہے، یہ حقیقی حیات نہیں ہوسکتی اسی لیے سورہ عنکبوت کی آیت ۶۴ میں ہماری نظر سے یہ عبارت گزرتی ہے۔

"وما هٰذه الحيٰوة الدنيا الّا لهو و لعب و ان الدار الاٰخرة لهي الحيوان"

اس جہان کی زندگی لہو و لعب کے سوا کچھ نہیں ؛ ایک لحاظ سے حقیقی زندگی تو دارِ آخرت کی زندگی ہے۔

ان دو وجوہ کی بناء پر حقیقی زندگی خدا ہی کیلئے مخصوص ہے۔

خدا کے زندہ ہونے کا مفہوم

عام طور پر موجود زندہ اس چیز کو کہتے ہیں جو نمو، تغذیہ، تولید مثل، جذب و دفع اور کبھی کبھی حس و حرکت رکھتی ہو لیکن اس نکتے کی طرف توجہ رہے کہ ممکن ہے کوتاہ نظر افراد خدا کے بارے میں بھی ایسی ہی حیات سمجھتے ہوں حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ خدا تعالیٰ میں ایسی کوئی صفت موجود نہیں۔ یہی قیاس انسان کو خداشناسی کے بارے میں اشتباہ میں مبتلا کردیتا ہے کیونکہ وہ خدا کی صفات کو اپنی صفات پر قیاس کرنے لگتا ہے۔ حیات اپنے وسیع اور واقعی معنی کے لحاظ سے علم و قدرت سے عبارت ہے لہذا جو وجود لامتناہی علم و قدرت کا حامل ہے، وہ حیات کامل رکھتا ہے۔ خدا کی حیات اس کے علم و قدرت کا مجموعہ ہے اور درحقیقت علم و قدرت ہی کے ذریعے موجود زندہ اور غیر زندہ میں امتیاز کیا جاسکتا ہے۔ رہا نمو، حرکت، تغذیہ اور تولید مثل تو یہ ناقص اور محدود موجودات کے آثار ہیں اور یہ آثار نقائص پر دلالت کرتے ہیں۔ کیونکہ غذا، تولید مثل اور حرکت دراصل کسی نہ کسی کمی کو پورا کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ لیکن وہ ذات کہ جس میں کوئی نقص اور کمی نہیں اس میں یہ امور نہیں پائے جاتے۔

کیا خالق کا بھی کوئی خالق ہے؟

مادہ پرستوں کا مشہور اعتراض ہے کہ سب چیزوں کو تو خدا نے پیدا کیا ہے تو پھر خدا کو کس نے پیدا کیا ہے۔

مندرجہ بالا بحث سے یہ مسئلہ خود بخود حل ہو جاتا ہے کیونکہ اس اعتراض کی بنیاد یہ بے بنیاد مفروضہ ہے کہ ہر



موجود ایک پیدا کرنے والے کا محتاج ہے حالانکہ مسلمأیہ کوئی کلیہ قاعدہ نہیں ہے کیونکہ وہ موجودات جو پیدا کرنے والے کے محتاج ہیں وہ ایسے ہیں کہ جن کے وجود کا سرچشمہ ان کی ذات سے خارج ہو اصطلاح میں کہا جاتا ہے کہ جن کی حیات اور وجود ان کی ذات کا جزء نہیں یعنی جو ممکن الوجود ہیں لیکن وہ وجود جس کی ہستی اُس کی ذات سے ہے یا بہتر الفاظ میں جس کی ہستی اُس کا عینِ وجود ہے ایسی ذات کو پیدا کرنے والے کی کوئی احتیاج نہیں، اسے کوئی حیات دینے والا نہیں، وہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی اور اس کی ذات کے لیے موت کا کوئی تصور ہی نہیں کہ کہا جاسکتا کہ وہ پیدا کرنے والے کی محتاج ہے. گویا وہ واجب الوجود ہے۔

آسان تر عبارت میں کہا جاسکتا ہے کہ جو حقیقت بھی اس جہان میں وجود رکھتی ہے آخر کار اُس کا کوئی سرچشمہ اور منبع ہے۔ مثلاً اگر سوال کیا جائے کہ یہ کمرہ کیوں روشن ہے، ہم جواب دیں گے کہ نور نے اُسے روشن کیا ہے۔ اب اگر یہ سوال ہو کہ نور کیوں روشن ہے تو ہم کہیں گے کہ نور کے لیے یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ وہ کیوں روشن ہے کیونکہ یہ تو اس کی ذاتی خاصیت ہے۔

یہی بات موجوداتِ عالم کی ہستی کے بارے میں بعینہٖ ثابت ہے۔ انسان، سبزہ زار اور تمام جہان خلقت وجود میں آئے ہیں۔ ہم کہیں گے کہ ان سب کو خدا نے پیدا کیا ہے اور ان کی حیات خدا کی طرف سے ہے لیکن اگر یہ سوال ہو کہ خدا نے کس طرح وجود پایا ہے تو ہم کہیں گے کہ ہستی اس کی عینِ ذات ہے اور وہ جہانِ ہستی کا سرچشمہ ہے۔[1]

القیوم

"قیوم" مبالغے کا صیغہ ہے۔ اس کا مادّہ "قیام" ہے۔ اسی بناء پر اس کا معنی ہے "وہ وجود جس کا قیام اپنی ذات کے ساتھ ہے اور تمام موجودات کا قیام اس کے ساتھ ہے۔" دوسرے لفظوں میں عالم ہستی کے تمام موجودات اُسی کے بھروسے اور سہارے پر قائم ہیں۔

واضح ہے کہ قیام کا معنی ہے کھڑا ہونا۔ روز مرّہ میں یہ لفظ اسی مخصوص ہیئت وکیفیت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس معنی کا خدا کے لیے کوئی مفہوم نہیں کیونکہ وہ جسم اور صفاتِ جسمانی سے منزہ ہے اس لیے اس سے مراد تخلیق، تدبیر اور نگہداری کے لیے قیام کرنا ہے۔ صرف وہی ذات ہے جس نے تمام موجودات کو پیدا کیا ہے اور اسی نے ان کی نگہداری و تربیت اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔ وہ کبھی اس کام کی انجام دہی میں غفلت نہیں کرتا اور وہ ہمیشہ سے بغیر کسی وقفے کے ان امور کو انجام دینے کے لیے قیام کیے ہوئے ہے۔

اِس بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ "قیوم" حقیقت میں تمام صفاتِ فعل کی بنیاد ہے۔ صفاتِ فعل سے مراد وہ صفات ہیں جو کسی موجود سے خدا کے ارتباط کو بیان کرتی ہیں، مثلاً پیدا کرنے والا، روزی دینے والا۔ زندہ کرنے والا، ہدایت کرنے والا وغیرہ۔

موجوداتِ عالم کی خلقت و تدبیر کے لیے قیام کرنے میں یہ تمام امور شامل ہیں۔ وہی ہے جو روزی دیتا ہے، وہی

---

[1] مزید وضاحت کے لیے کتاب "جستجوئے خدا" کی طرف رجوع فرمائیں۔



ہے جو زندہ کرتا ہے، وہی ہے جو مارتا ہے، وہی ہے جو ہدایت کرتا ہے۔ اس لیے خالق، رازق اور محی وغیرہ صفات سب قیوم میں جمع ہیں۔

لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ

"سِنَةٌ" مخصوص سستی ہے جو نیند کی ابتدا میں عارض ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اُونگھ یا نیند کے جھونکے کو سنة کہتے ہیں۔

"نوم" کا معنی ہے نیند یعنی وہ حالت جب انسان کے کچھ حواس طبیعی عوامل کے ذریعے کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔

"لا تاخذہ سنة و لا نوم" دراصل خدا کے قیوم ہونے کی تاکید کرتا ہے کیونکہ عالم ہستی کے لیے کامل و مطلق قیام کا تقاضا ہے کہ ایک لمحہ بھر کی غفلت نہ ہو یعنی حکومت مطلقہ اور عالم ہستی کے امور کی تدبیر کے لیے خدا تعالیٰ لمحے بھر کی غفلت نہیں کرتا۔ لہٰذا ہر وہ چیز جو خدا کی اصل "قیومیت" کے ساتھ سازگار اور مناسب نہیں اس کی خود بخود اللہ کی بارگاہِ مقدس سے نفی ہو جاتی ہے۔

یہ سوال بھی اُٹھتا ہے کہ "اونگھ" کا ذکر آیت میں "نیند" سے پہلے کیوں ہے جب کہ قوی چیز کا ذکر پہلے ہونا چاہیئے تھا پھر ضعیف کا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی وجہ فطری ترتیب ہے۔ پہلے اونگھ کی حالت پیدا ہوتی ہے، اس کے بعد گہری نیند کا مرحلہ آتا ہے۔

یہ جملہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ خدا کا فیض اور لطف دائمی ہے اور یہ ایک لمحے کے لیے بھی اس کے وجود سے منقطع نہیں ہوتا۔ وہ بندوں کی طرح نہیں ہے کہ نیند یا دیگر عوامل کے زیر اثر دوسروں سے غافل ہو جائے۔

"لا تأخذہ" (یعنی اسے نہیں پکڑ سکتی) یہ بھی ایک جاذب نظر اور موثر تعبیر ہے اس سے انسان پر نیند کے تسلط کی کیفیت مجسم ہو کر سامنے آجاتی ہے گویا نیند ایک طاقت ور پنجے کی مانند ہے جو انسان کو مضبوطی سے جکڑ لیتا ہے اور اسیر کر لیتا ہے۔ بیداری کے برعکس نیند کے عالم میں قوی ترین انسانوں کی جو حالت ہوتی ہے اس کا احساس کیا جا سکتا ہے۔

خدا کی مالکیتِ مطلقہ

"لہٗ ما فی السمٰوات وما فی الارض"

آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان میں ہے اسکی مالکیت کے بغیر امور عالم کی تدبیر کے لیے قیام ممکن نہیں۔ اس لیے خدا کی قیومیت کا ذکر کرنے کے بعد اس حقیقت کی تصریح کی گئی ہے کہ تمام عالم اُس کا ملکِ خاص ہے، عالم ہستی میں جو بھی تصرف ہو اُسی کی طرف سے ہے۔

اس بناء پر جو کچھ انسان کے اختیار میں ہے اور جن چیزوں سے وہ استفادہ کرتا ہے وہ اس کی حقیقی ملکیت نہیں ہیں۔ انسان ان چیزوں سے مالکِ حقیقی کی معین کردہ شرائط کے تحت ایک محدود مدت کے لیے حق تصرف رکھتا ہے۔ اس



وجہ سے عام مالک کی ذمہ داری ہے کہ مالکِ حقیقی کی طرف سے جو شرائط معین ہوئی ہیں ان کا پورا لحاظ رکھے اگر ایسا نہ کرے تو اس کی ملکیت باطل ہو جاتی ہے اور تصرف جائز نہیں رہتا۔ ملکِ خدا میں تصرفات کی شرائط وہی ہیں جو قوانینِ اسلامی کے ذریعے لوگوں تک پہنچی ہیں۔

بنا بریں واضح ہے کہ اس مفہوم کی طرف توجہ کرنا حقیقت میں ایک اہم تربیتی عامل ہے کیونکہ اگر انسان میں یہ عقیدہ پیدا ہو جائے کہ جو کچھ اس کے پاس ہے وہ دراصل اس کا نہیں ہے بلکہ چند روز کے لیے اُسے عاریتاً ملا ہے تو یقیناً یہ عقیدہ اسے دوسروں کے حقوق میں تجاوز، استثمار، ذخیرہ اندوزی، حرص، طمع اور بخل سے باز رکھے گا۔ کیونکہ ممکن ہے شدید دنیا پرستی کی وجہ سے یہ چیزیں انسان میں پیدا ہو جائیں۔ یہ عقیدہ انسان کی یہ تربیت کرتا ہے کہ وہ اپنے شرعی حقوق پر راضی رہے۔

"من ذا الذی یشفع عندہٗ الا باذنہ"

اصطلاحی طور پر یہ جملہ استفہام انکاری ہے یعنی کوئی شخص بھی خدا کے حکم کے بغیر اس کی بارگاہ میں شفاعت و سفارش نہیں کر سکتا۔ یہ جملہ درحقیقت تمام موجوداتِ عالم حتیٰ پر خدا کی قیومیت اور مالکیتِ مطلقہ کے مفہوم کی تکمیل کرتا ہے یعنی اگر کچھ لوگ بارگاہِ الٰہی میں شفاعت کرتے نظر آتے ہیں تو یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ کسی چیز کے مالک ہیں اور وہ تاثیر میں استقلال رکھتے ہیں بلکہ یہ مقامِ شفاعت بھی انہیں خدا نے عطا کیا ہے۔ ان کی شفاعت چونکہ حکمِ خدا سے ہے اس لیے یہ خود خدا کی قیومیت اور مالکیت پر ایک دلیل ہے۔

شفاعت کوئی پارٹی بازی نہیں ہے

"شفاعت" کا مفہوم ہے ایک قوی موجود کا ضعیف تر موجود کی مدد کرنا تاکہ وہ آسانی سے تکامل وارتقا کے مراحل طے کر سکے۔ البتہ عموماً یہ لفظ گنہگاروں کی شفاعت کے بارے میں استعمال ہوتا ہے لیکن شفاعت کے وسیع تر معنی میں عالمِ ہستی کے تمام عوامل اور علل و اسباب شامل ہیں۔ مثلاً زمین، پانی، ہوا اور سورج کی روشنی چار عامل ہیں جو دانے کو ایک مکمل درخت یا مکمل سبزے کے مرحلے تک پہنچانے میں شفاعت اور ہدایت کرتے ہیں۔ اب اگر مذکورہ آیت کو اس وسیع معنی میں دیکھا جائے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ عالمِ ہستی کے مختلف عوامل و اسباب کا وجود خدا کی مالکیتِ مطلقہ کو ہرگز محدود نہیں کرتا اور اس میں کسی قسم کی کمی نہیں کرتا۔ کیونکہ ان تمام اسباب کی تاثیر اس کے حکم سے ہے اور دراصل اس کی قیومیت اور مالکیت کی نشانی ہے۔

بعض لوگ سمجھتے ہیں شفاعت بھی بلاوجہ کسی کی سفارش کرنے کی طرح ہے اور ایک طرح کی پارٹی بازی ہے کہا جاتا ہے کہ اس کا مفہوم یوں ہے کہ لوگ جو چاہیں گناہ کریں اور جب سر سے پاؤں تک گناہوں میں ڈوب جائیں تو شفیع کا دامن پکڑ لیں اور اس طرح کہتے پھریں!

؎ ان دم کہ مرداں بہ شفیعی زنند دست
ماییم و دست و دامنِ اولادِ فاطمہؑ



یعنی جب دوسرے لوگ کسی شفیع کا دامن تھامیں گے تو ہم اولادِ فاطمہؑ کا ہاتھ اور دامن تھام لیں گے۔

اعتراض کرنے والوں نے شفاعت کے بارے میں دین کی منطق کو نہیں سمجھا اور نہ ہی اس گنہگار، جسور اور بے پروا گروہ نے اسے سمجھا ہے جو ایسی باتیں کرتا ہے کیونکہ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے شفاعت جو خدا کے خاص بندے کریں گے شفاعتِ تکوینی کی طرح ہے جو طبیعی عوامل کے ذریعے انجام پاتی ہے۔ جیسے ایک دانے میں اگر عامل حیات اور زندگی کے سیل LIFE CELLS موجود نہ ہوں تو ہزاروں سال تک سورج کی تپش، بادِ نسیم اور بارش کے حیات بخش قطرے اسے نشو و نما اور رُشد نہیں دے سکتے، اس طرح اولیاء خدا کی شفاعت بھی نالائق افراد کے لیے بے اثر ہے یعنی اصولی طور پر وہ ایسے افراد کی شفاعت نہیں کریں گے۔

شفاعت ایک طرح کے معنوی ربط کی محتاج ہے۔ یہ ربط شفاعت کرنے والے اور جس کی شفاعت ہو رہی ہے اُس کے درمیان درکار ہے۔ اس لیے جو شفاعت کی اُمید رکھتا ہے اس کا فرض ہے کہ اس جہاں میں اُس شخص سے معنوی رابطہ پیدا کرے جس سے وہ شفاعت کی توقع رکھتا ہے اور حقیقت میں یہ ربط ہی شفاعت حاصل کرنے والے کے لیے تربیت کا ایک ذریعہ ہوگا یہ تعلق اسے شفاعت کرنے والے کے افکار، اعمال اور مکتب کے قریب کرے گا اور اس کے نتیجے میں وہ شفاعت کے اہل ہو جائے گا۔

اس سے واضح ہوا کہ شفاعت ایک عامل تربیت ہے نہ کہ پارٹی بازی یا فرائض سے فرار کا ذریعہ یہ بھی واضح ہو گیا کہ شفاعت گنہ گار کے بارے میں پروردگار کے ارادے میں تغیر و تبدل پیدا نہیں کرتی بلکہ گنہگار ہی شفاعت کرنے والے سے معنوی ربط کے ذریعے ایک تکامل و تربیت حاصل کرتا ہے اور ایسی سرحد میں جا پہنچتا ہے جہاں وہ عفوِ خدا کے اہل ہو جاتا ہے (غور کیجئے گا) ؎

"یعلم ما بین ایدیھم وما خلفھم"

گذشتہ جملے میں بیان کیا گیا ہے کہ شفاعت بارگاہ الٰہی میں حکم خدا ہی سے ممکن ہے زیر نظر جملے میں اس کی دلیل کے طور پر فرمایا گیا ہے کہ خدا شفاعت کرنے والوں کے گذشتہ اور آئندہ حالات سے آگاہ ہے اور جو کچھ ان سے پنہاں ہے اُسے جانتا ہے اس لیے وہ خدا کے سامنے جن کی شفاعت کر رہے ہیں ان کے بارے میں کوئی ایسی بات پیش نہیں کر سکتے جس سے خدا ناواقف ہو اور جس کی وجہ سے وہ ان کے سلسلے میں اپنے حکم میں نظر ثانی کرے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ سفارش کا عام اسلوب یہ ہے کہ سفارش کرنے والا جس کی سفارش کر رہا ہے اس کی اہلیت و لیاقت کا ذکر کرتا ہے یا پھر جس کی سفارش کر رہا ہے اس سے اپنا ارتباط بیان کرتا ہے تاکہ جس سے سفارش کی جا رہی ہے وہ سفارش کرنے والے کی خاطر اپنے حکم میں تبدیلی کر سکے۔ واضح ہے کہ دونوں صورتوں میں سفارش کرنے والا دراصل نئی معلومات فراہم کر رہا ہوتا ہے لیکن جس سے سفارش کی جا رہی ہے اگر وہ ہر چیز اور ہر شخص کے بارے میں پہلے ہی پوری طرح سے آگاہ ہے تو پھر کوئی شخص بھی اس کی بارگاہ میں کسی کی سفارش نہیں کر سکتا کیونکہ وہی شفاعت کے لیے اہل لوگوں کی تصدیق کرنے والا ہے اور وہی شفاعت

؎ تفسیر نمونہ جلد اوّل (اردو ترجمہ) کے صفحہ ۱۸۱ سے ۱۹۰ تک مسئلہ شفاعت کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی جا چکی ہے۔



کی اجازت دینے والا ہے۔

"یعلم ما بین ایدیھم و ما خلفھم" پروردگار کی قدرتِ کاملہ اور اس کے مقابلے میں دوسروں کا قدرت سے تہی ہونے پر تاکید بھی ہے کیونکہ جو اپنے گذشتہ اور آئندہ سے بے خبر ہے اور آسمانوں اور زمین کے غیب کا علم نہیں رکھتا اُس کی قدرت بہت ہی محدود ہوگی لیکن وہ ذات جو ہر دور میں ہر چیز سے آگاہ ہے اس کی قدرت ہر لحاظ سے لامتناہی ہے اس لیے ہر اقدام یہاں تک کہ شفاعت بھی اس کے فرمان کے تابع ہے۔

اِس جملے کا ربط آیت کے گذشتہ جملوں اور مسئلہ شفاعت سے واضح ہے۔ اب یہ سوال باقی ہے کہ ما بین ایدیھم" (ان کے سامنے)" و ما خلفھم" (اور اُن کے پیچھے) سے کیا مراد ہے۔ اس سلسلے میں یاد رکھنا چاہیے کہ یہ دونوں تعبیریں قرآن مجید میں کبھی مکان کے بارے میں اور کبھی زمان کے بارے میں استعمال ہوئی ہیں۔ مثلاً سورہ آل عمران آیہ ۱۷۰ میں ہے۔

"و یستبشرون بالذین لم یلحقوا بھم من خلفھم"

شہیدانِ راہِ خدا انہیں بشارت دیتے ہیں جو ابھی ان سے ملحق نہیں ہوئے۔

واضح ہے کہ یہاں تقدیم و تاخیر زمانی ہے۔ لیکن سورہ اعراف آیہ ۱۷ میں ہے۔

"ثم لا تینھم من بین ایدیھم و من خلفھم وعن ایمانھم

وعن شمائلھم"

میں اُن کے سامنے سے، ان کے پیچھے سے، ان کی دائیں طرف سے اور اُن کی بائیں طرف سے آؤں گا۔

یہ سامنے اور پیچھے مکان کے لحاظ سے ہے۔ البتہ محلِ بحث آیت میں ہوسکتا ہے جامع معنی ہو جس میں زمان و مکان دونوں شامل ہوں۔ یعنی خداوند عالم گذشتہ اور آئندہ سے اسی طرح لوگوں کے سامنے اور پس پشت جو کچھ ہے اگرچہ لوگوں سے پوشیدہ و پنہاں ہے۔ سب کچھ جانتا ہے اور سب سے آگاہ ہے۔ اس کی بارگاہِ علم میں زمان و مکان کی وسعت اور پہنائی واضح ہے اور شفاعت کرنے والے اُس کے سامنے کوئی نئی اطلاع پیش نہیں کرسکتے۔

"و لا یحیطون بشیءٍ من علمه الا بما شاء":

یہ جملہ بھی درحقیقت سابقہ جملے کی تاکید کے طور پر ہے اور علمِ خدا کے مقابلے میں شفاعت کرنے والوں کے محدود علم کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ وہ پروردگار کے علم پر احاطہ نہیں رکھتے اور خدا جس قدر چاہے وہ اتنا ہی باخبر ہوتے ہیں۔

اِس جملے سے ضمناً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص بھی اپنی طرف سے کوئی علم نہیں رکھتا اور انسان کے تمام علوم



خدا کی طرف سے ہیں۔ وہی ہے جو رفتارِ زمانہ کے ساتھ ساتھ تدریجاً جہانِ آفرینش کے حیرت انگیز اسرار سے پردہ اٹھاتا ہے اور نئے حقائق انسان کے ہاتھ میں دیتا ہے اور اس کی معلومات میں وسعت پیدا کرتا ہے
اس جملے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ممکن ہے خدا بعض علومِ غیب بعض منتخب لوگوں کو دے دے اور کچھ لوگوں کو اسرارِ غیب سے آگاہ کر دے۔ اس بناء پر یہ بات ان لوگوں کا جواب ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ علمِ غیب تو انسان کے لیے ممکن ہی نہیں بنیز یہ ان آیات کی بھی تفسیر ہے جو لبشر کے لیے علمِ غیب کی نفی کرتی ہیں یعنی انسان ذاتی طور پر اسرارِ غیب میں سے کسی چیز کو نہیں جانتا مگر یہ کہ خدا علم دے اور جس قدر دے وہ اس قدر جان لیتا ہے (مزید وضاحت انشاء اللہ غیب سے مربوط آیات کے ذیل میں آئے گی)

عرش وکرسی سے کیا مراد ہے؟

"وسع کرسیه السمٰوٰت والارض"

لفظ کرسی اصل لغت کے لحاظ سے "کرس" (بروزن اِرث) سے ہے جس کا معنیٰ ہے اصل، اساس اور بنیاد۔ بعض اوقات ہر اس چیز کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے جو ایک دوسرے سے پیوستہ اور ترکیب شدہ ہو اسی بناء پر چھوٹے تخت کو کرسی کہتے ہیں۔ اس کا نقطۂ مقابل "عرش" ہے جس کا معنی ہے "چھت والی چیز" یا "چھت" یا "بلند پایہ تخت"۔

چونکہ استاد اور معلم، تدریس وتعلیم کے وقت کرسی پر بیٹھتا ہے لہٰذا بعض اوقات لفظ کرسی "علم" کے لیے کنایہ کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ کرسی چونکہ انسان کے اختیار اور کنٹرول میں ہوتی ہے اس لیے کبھی کبھار یہ لفظ حکومت وقدرت اور فرمانروائی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا آیت میں ہے کہ خدا کی کرسی تمام آسمانوں اور زمین کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ یہاں لفظ "کرسی" چند معانی میں ممکن ہے:

۱۔ قلمرو اور حکومت کا علاقہ: یعنی خدا تمام آسمانوں اور زمین پر حکومت کرتا ہے اور اس کا نفوذ تمام جہوں پر محیط ہے۔ اس معنی میں خدا کی کرسی سے مراد عالمِ مادہ کا مجموعہ ہے چاہے وہ زمین ہو یا ستارے، کہکشائیں ہوں یا بادل۔

یہ فطری امر ہے کہ کرسی کا یہ مفہوم ہو تو عرش اس جہانِ مادہ سے کسی بالاتر اور عالی تر مرحلے کا نام ہونا چاہیے کیونکہ یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ عرش کا معنی کرسی کے برعکس لغت میں چھت، سائبان اور بلند پایہ تخت ہے۔ اس صورت میں عرش کا معنی عالمِ ارواح، ملائکہ اور جہانِ ماوراءِ طبیعت ہوگا۔ البتہ یہ اس صورت میں ہے جب عرش وکرسی ایک دوسرے کے مدِمقابل ہوں تاکہ ایک عالمِ مادہ وطبیعت اور دوسرا عالمِ ماوراءِ طبیعت کہلا سکے لیکن جیسا کہ سورہ



اعراف کی آیہ ۵۳ کے ذیل میں آئے گا کہ عرش کے کچھ اور معانی بھی ہیں خصوصاً اگر وہ کرسی کے مقابلے میں نہ ہو تو پھر ممکن ہے کہ اس کا معنی تمام عالم ہستی ہو۔

۲۔ وسعتِ علم کا علاقہ: یعنی خدا کا علم تمام آسمانوں اور زمین پر محیط ہے اور کوئی چیز بھی اس کی حکومت علم سے باہر نہیں۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ کرسی بعض اوقات علم کے لیے کنایہ ہوتی ہے۔ کئی ایک روایات میں بھی یہی مفہوم بیان کیا گیا ہے۔ حفص بن غیاث امام صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

میں نے آنحضرتؑ سے پوچھا کہ

"وسع کرسیه السمٰوٰت والارض" سے کیا مراد ہے۔

آپؑ نے فرمایا:

اس سے مراد اس کا علم ہے [1]

۳۔ آسمانوں اور زمین سے وسیع تر چیز: یعنی ایک ایسا موجود جو آسمانوں اور زمین سے زیادہ وسعت رکھتا ہے جو ہر طرف سے ان پر محیط ہے۔ اس طرح آیت کا معنی ہو گا کہ خدا کی کرسی تمام آسمانوں اور زمین کو اٹھائے ہوئے ہے اور ان پر محیط ہے۔ ایک حدیث میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے یہی تفسیر منقول ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں:

"الکرسیّ محیط بالسمٰوٰت والارض وما بینهما وما تحت الثریٰ":

یعنی۔ کرسی زمین و آسمان جو کچھ ان میں ہے اور جو کچھ زمین کی گہرائیوں میں ہے سب پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔

یہاں تک کہ کچھ روایات میں معلوم ہوتا ہے کہ کرسی آسمانوں اور زمین سے اس قدر وسیع تر ہے کہ وہ سب کے سب کرسی کے مقابلے میں اس انگوٹھی کی طرح ہیں جو وسط بیابان میں پڑی ہو۔ امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے۔

"ما السمٰوٰت والارض عند الکرسی الا کحلقة خاتم فی فلاة وما الکرسی عند العرش الا کحلقة فی فلاة":

آسمان اور زمین کرسی کے مقابلے میں بیابان میں پڑی ہوئی انگشتری کے حلقے کی طرح ہیں اور کرسی بھی عرش کے مقابلے میں بیابان میں پڑی ہوئی انگشتری کے حلقے کی طرح ہے۔

پہلا اور دوسرا معنی تو قابل فہم اور واضح ہے لیکن تیسرا معنی ایسا ہے کہ ابھی تک علم و دانش بشر اس سے پردہ نہیں اٹھا سکے کیونکہ ایسے عالم کا وجود جو آسمانوں اور زمین پر بھی محیط ہو اور ہمارے جہان سے کہیں زیادہ وسعت رکھتا ہو ابھی تک مروج علمی ذرائع سے ثابت نہیں ہو سکا۔ اگرچہ اس کی نفی پر بھی کوئی دلیل موجود نہیں۔ جدید علوم کے تمام ماہرین معترف ہیں کہ

[1] "نور الثقلین" ج: اول۔



علوم و مطالعاتِ نجوم کے وسائل اور ذرائع کی ترقی کے ساتھ ساتھ آسمان و زمین کی وسعت ہماری نظر میں بڑھتی جا رہی ہے اور کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ عالم ہستی کی وسعت بس اتنی ہے جتنی آج کے علم نے بتائی ہے بلکہ قوی احتمال ہے کہ بے شمار عالم ایسے ہوں جو آج کے وسائل اور ذرائع کی نگاہ سے اوجھل ہوں۔

یہ بات کہے بغیر نہ رہ جائے کہ مندرجہ بالا تینوں تفاسیر ایک دوسرے سے کوئی اختلاف نہیں رکھتیں اور "وسع کرسیه السمٰوٰت والارض" ان تمام معانی کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے۔ یعنی

— پروردگار کی حکومت مطلقہ اور قدرت کا نفاذ،

— علمی نفوذ و احاطہ اور

— ایسا وسیع ترجہان جو آسمانوں اور زمین پر محیط ہو۔

بہرصورت یہ جملہ آیت کے پہلے جملوں کی تکمیل کرتا ہے جو پروردگار کے علم کی وسعت کے بارے میں تھے۔ خلاصہ اور نتیجہ یہ کہ پروردگار کا تختِ حکومت و قدرت تمام آسمانوں اور زمین کو گھیرے ہوئے ہے۔ اس کے علم و دانش کی کرسی تمام عالمین پر محیط ہے اور کوئی چیز اس کی حکومت اور علم سے خارج نہیں۔

"ولا یؤدہ حفظھما":

"یؤدہ" "اود" (بروزن قول) سے ہے۔ اس کا معنی ہے "سنگینی" یعنی آسمانوں اور زمین کی حفاظت اور نگرانی خداتعالیٰ کے لیے کسی قسم کی سنگینی، بوجھ اور مشقت کا باعث نہیں کیونکہ وہ اپنی مخلوق اور بندوں کی طرح نہیں کہ جن کی قدرت محدود ہے۔ کیونکہ بندے تو بعض اوقات کسی چیز کی حفاظت سے تھک کر عاجز آ جاتے ہیں جب کہ اس کی قدرت لامحدود ہے اور لامحدود قدرت کے لیے اصولی طور پر سنگینی و آسانی، مشقت و راحت کا کوئی مفہوم نہیں۔ یہ سب مفاہیم تو محدود قوتوں پر صادق آتے ہیں۔

اوپر ہم جو کچھ کہہ چکے ہیں اس سے واضح ہوتا ہے کہ "یؤدہ" کی ضمیر خدا کی طرف لوٹتی ہے آیت کے سابقہ و لاحقہ جملے بھی اسی کے شاہد ہیں کیونکہ ان کی ضمیریں بھی سب خدا کی طرف لوٹتی ہیں۔ اس بناء پر یہ احتمال بہت ضعیف دکھائی دیتا ہے جس کے مطابق یہ ضمیر کرسی کی طرف لوٹتی ہے اور جس کے مطابق معنی یہ ہوتا ہے کہ آسمانوں اور زمین کی حفاظت کرسی کے لیے سنگین اور بوجھل نہیں۔

"وھو العلی العظیم":

یہ جملہ دراصل سابقہ جملوں کی دلیل کے طور پر ہے یعنی وہ خدا جو برتر اور بالاتر ہے۔ ہر طرح کے شبیہ اور شریک سے پاک ہے اور ہر قسم کی کمی، عیب اور نقص سے ماوراء ہے۔ وہ خدا جو عظیم، بزرگ اور لامتناہی ہے اس کے لیے کوئی کام بھی مشکل نہیں ہے اور وہ کسی وقت بھی جہانِ ہستی کو منظم کرنے اور اس کی تدبیر کرنے سے خستہ، عاجز، غافل اور بے خبر نہیں ہو سکتا اور اس کا علم تمام چیزوں پر محیط ہے۔



۲۵۶۔ لَاۤ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○

ترجمہ

۲۵۶۔ دین قبول کرنے میں کوئی جبر واکراہ نہیں ہے (کیونکہ) صحیح راستہ ٹیڑھے راستے سے جدا اور آشکار ہو چکا ہے اس بناء پر جو کوئی طاغوت (بت، شیطان اور ہر سرکش) سے منہ موڑ کر خدا پر ایمان لے آئے تو اس نے محکم کڑے کو تھاما ہے جو ٹوٹ نہیں سکتا اور خدا سننے والا جاننے والا ہے۔

شانِ نزول

مشہور مفسر طبرسی نے مجمع البیان میں اس آیت کی شانِ نزول یہ نقل کی ہے کہ مدینے میں ایک شخص حصین نامی تھا۔ اس کے دو بیٹے تھے۔ مدینہ میں مالِ تجارت لانے والے دو تاجروں نے ان لڑکوں سے ملاقات کی تو انہیں عیسائیت کی دعوت دی اور وہ بھی اس سے بہت متاثر ہوئے اور نتیجتاً عیسائی ہو گئے۔

حصین اس واقعے سے بہت پریشان ہوا اور پیغمبر اسلامؐ کو اس کی اطلاع دی اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں انہیں واپس اپنے مذہب میں لانا چاہتا ہوں اس نے سوال کیا کہ وہ جبری طور پر انہیں اپنے مذہب میں واپس لا سکتا ہے تو اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی جس میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ کسی مذہب کو اختیار کرنے میں کوئی جبر واکراہ نہیں ہے۔

تفسیر المنار میں لکھا ہے کہ حصین نے اپنے دونوں بیٹوں کو جبراً اسلام کی طرف پلٹانے کی کوشش کی تو وہ شکایت لے کر پیغمبر اکرمؐ کے پاس آئے۔ حصین نے عرض کیا کہ میں کیسے برداشت کر لوں کہ میرے بیٹے جہنم کی آگ میں جلیں اور میں دیکھتا رہوں۔ اس پر محلِ بحث آیت نازل ہوئی۔

تفسیر

"رُشد" لغت میں راستہ پانے اور واقع تک پہنچنے کے معنی میں ہے۔ اس کے برعکس "غی" حقیقت سے انحراف کرنے اور واقع سے دور ہونے کے معنی میں ہے۔ دین و مذہب کا تعلق چونکہ لوگوں کی فکر اور روح سے ہے اور اس کی اساس و بنیاد ایمان و یقین پر استوار ہے لہٰذا منطق و استدلال کے علاوہ اس کے لیے کوئی دوسرا راستہ صحیح نہیں۔ جیسا کہ آیت کی شانِ نزول سے معلوم ہوتا ہے بعض افراد پیغمبر اکرمؐ سے چاہتے تھے کہ آپؐ بھی جابر حکمرانوں کی طرح طاقت اور زور سے لوگوں کے عقائد تبدیل کرنے کے لیے عملی اقدامات کریں۔ مندرجہ بالا آیت نے اس پر صراحت



سے جواب دیا کہ دین و آئین ایسی چیز نہیں کہ جس کی جبری تبلیغ کی جائے۔

یہ آیت ان لوگوں کا دندان شکن جواب ہے جو اسلام کو زبردستی اور جبری پہلو کا حامل قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کی ترقی فوج اور تلوار کی مرہونِ منت ہے۔

جب اسلام باپ کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنے بیٹے کو مذہبی عقیدہ زبردستی بدلنے پر مجبور کرے تو دوسروں کی ذمہ داری اس سے واضح ہوجاتی ہے۔ اگر عقیدہ بدلنے کے لیے جبر ممکن اور جائز ہوتا تو ضروری تھا کہ سب سے پہلے باپ کو بیٹے کے بارے میں اجازت دی جاتی جبکہ اُسے یہ حق نہیں دیا گیا۔

مذہب جبری نہیں ہوسکتا

اصولی طور پر اسلام یا کوئی مذہب حق دو وجوہ کی بناء پر جبر و اکراہ کا متحمل نہیں ہوسکتا۔

۱۔ ان تمام واضح دلائل، منطقی استدلالات اور آشکار معجزات کے ہوتے ہوئے اس بات کی ضرورت ہی نہیں کہ جبر و اکراہ کا راستہ اختیار کیا جائے۔ جبر و اکراہ تو وہ اختیار کرتے ہیں جو منطق سے عاری ہوتے ہیں نہ کہ اسلام جیسا دین جو واضح اور قوی استدلالات کا حامل ہے۔

۲۔ اصولی طور پر دین جس کی بنیاد قلبی اعتقادات کا ایک سلسلہ ہے ممکن ہی نہیں کہ جبری ہو۔ زور، طاقت، تلوار اور فوجی قوت ہمارے جسمانی اعمال و حرکات پر تو اثر انداز ہوسکتے ہیں لیکن ہمارے افکار و عقائد کو نہیں بدل سکتے۔

جو کچھ کہا گیا ہے کلیسا کی زہریلی تبلیغ کا واضح جواب ہے کیونکہ قرآن کے ان الفاظ "لا اکراہ فی الدّین" سے بڑھ کر اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کہی جاسکتی۔ البتہ یہ لوگ اسلامی جنگوں کو غلط رنگ دینے کے درپے رہتے ہیں جب کہ ان اسلامی جنگوں کے مطالعے سے پوری طرح واضح ہوجاتا ہے کہ ان میں سے بعض تو دفاعی تھیں اور بعض ابتدائی جہاد کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ان میں کشور کشائی اور لوگوں کو دین اسلام کے لیے مجبور کرنے کا کوئی پہلو نہ تھا۔ ان کا مقصد غلط اور ظالمانہ نظام کو تہ و بالا کرنا تھا تاکہ لوگوں کو آزادانہ طور پر مذہب اور اجتماعی زندگی کے مطالعے کا موقع فراہم کیا جائے۔

تاریخ شاہد ہے کہ مسلمان جب کسی شہر کو فتح کرتے تو دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کو مسلمانوں کی طرح آزادی دیتے تھے اور جزیہ کے طور پر جو ٹیکس ان سے وصول کیا جاتا وہ دراصل امن و امان برقرار رکھنے اور امن و امان برقرار رکھنے والی قوتوں کے اخراجات کی تکمیل کے لیے ہوتا تھا کیونکہ اسلام میں غیر مسلموں کی جان و مال اور عزت و ناموس محفوظ تھی۔ یہاں تک کہ وہ اپنی مذہبی رسوم بھی آزادانہ بجالاتے تھے۔

وہ سب لوگ جو تاریخ اسلام سے واقف ہیں اس حقیقت کو جانتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ عیسائی جنہوں نے اسلام کے بارے میں کتابیں لکھی ہیں انہوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے۔ مثلاً کتاب تمدنِ اسلام و عرب میں ہے:

> مسلمانوں کا دوسرے لوگوں سے سلوک اس قدر محبت بھرا اور نرم تھا کہ ان کے سرداروں نے انہیں اپنی مذہبی تقریبات تک منعقد کرنے کی اجازت دے رکھی تھی۔



کئی ایک تواریخ میں ہے کہ عیسائیوں کا ایک گروہ جو بعض سوالات اور تحقیقات کے لیے پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں پہنچا تھا اُس نے اپنی مذہبی عبادت مدینہ کی مسجد نبوی میں آزادانہ انجام دی۔

اسلام میں فوجی طاقت کے استعمال کے مواقع

اصولی طور اسلام صرف تین مواقع پر فوجی طاقت کو ذریعہ قرار دیتا ہے:

۱۔ شرک اور بت پرستی کی بیخ کنی کے لیے: شرک اور بُت پرستی کے آثار محو کرنے کے لیے اسلام فوجی طاقت استعمال میں لاتا ہے کیونکہ بت پرستی اسلام کی نظر میں کوئی دین و آئین نہیں ہے بلکہ کجروی، بیماری اور بے ہودہ چیز ہے اور اس کی اجازت ہرگز نہیں دی جانا چاہیے کہ لوگ سو فیصد غلط اور بے ہودہ راستے پر چلتے رہیں بلکہ اس کی حوصلہ شکنی کی جانا چاہیے۔ لہٰذا اسلام نے بت پرستوں کو تبلیغ کے ذریعے راہ توحید کی طرف دعوت دی لیکن جہاں انہوں نے مقابلے کا راستہ اختیار کیا اسلام نے طاقت استعمال کی، ان کے بت خانے توڑے گئے اور بت اور بت پرستی کے تمام آثار مٹا دیے گئے تاکہ اس روحانی اور فکری بیماری کی مکمل ریشہ کنی کی جا سکے۔

مشرکین سے قتال کرنے کی آیات اسی مفہوم کی حامل ہیں۔ سورہ لبقرہ کی آیت ۱۹۳ میں ہے:

"وقاتلوھم حتّٰی لا تکون فتنۃ"

مشرکین سے جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ شرک کا فتنہ معاشرے سے ختم ہو جائے۔

اِس بناء پر محل بحث اور اس قسم کی آیات میں کوئی تضاد نہیں کہ جس کی بنیاد پر نسخ کا ذکر ضروری۔

۲۔ اسلام کے خلاف حملے کی تیاری کرنے والوں سے: جو لوگ مسلمانوں کی نابودی کے لیے اُن پر حملے کی سازش کر رہے ہوں وہاں دفاعی جہاد اور فوجی قوت استعمال کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ پیغمبر اکرمؐ کے زمانے کی اسلامی جنگیں شاید زیادہ اسی قسم کی تھیں۔ مثال کے طور پر احد، احزاب، حنین، موتہ اور تبوک کے غزوات کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

۳۔ تبلیغ کی آزادی حاصل کرنے کے لیے: ہر دین حق رکھتا ہے کہ منطقی طریقوں سے اس کا آزادانہ تعارف کروایا جا سکے۔ اگر کچھ لوگ اِس میں مانع ہوں اور رکاوٹ پیدا کریں تو یہ حق طاقت کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

"فمن یکفر بالطاغوت ویؤمن باللہ فقد استمسک بالعروۃ الوثقٰی"

"طاغوت" صیغہ مبالغہ ہے۔ اُس کا مادہ ہے "طغیان" اس کا معنی ہے حد سے تجاوز کرنا اور زیادتی کرنا۔ ہر وہ چیز جو حد سے تجاوز کا ذریعہ بنے اسے طاغوت کہا جاتا ہے۔ اسی بناء پر شیطان، بت، جارح اور ظالم و متکبر حاکم کو طاغوت کہا جاتا ہے۔ حتّٰی کہ پروردگار عالم کے علاوہ ہر معبود اور ہر راستہ جو غیر حق تک پہنچائے اس پر



طاغوت کا اطلاق ہوتا ہے یہ لفظ مفرد اور جمع دونوں معانی میں استعمال ہوتا ہے۔

آیت کے اس حصے میں قرآن کہتا ہے: جو شخص طاغوت سے کفر کرے اور اس سے منہ پھیر لے اور خدا پر ایمان لے آئے اس نے گویا مضبوط کڑے پر ہاتھ ڈالا ہے جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں۔

عروۃ الوثقیٰ اس آہ کو کہتے ہیں جو دروازے کی پشت پر نصب کرتے ہیں اور دروازہ بند کرتے یا کھولتے وقت اس پر ہاتھ ڈالتے ہیں۔

طاغوت سے یہاں کیا مراد ہے۔ اس بارے میں مفسرین نے مختلف باتیں کی ہیں بعض نے بت کہا ہے، بعض نے شیطان مراد لیا ہے، بعض نے کاہنوں کو طاغوت قرار دیا ہے اور بعض نے جادوگر مراد لیے ہیں۔ لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس سے وسیع تر مفہوم مراد ہے یعنی ہر سرکش، بٹ، بڑھے اور غلط مذہب اور راستے کو یہ لفظ اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

درحقیقت یہ حصۂ آیت کے سابقہ حصوں کے لیے ایک دلیل ہے۔ دین و مذہب جبر و اکراہ کا محتاج نہیں کیونکہ دین خدا کی طرف دعوت دیتا ہے جو ہر خیر و برکت اور سعادت کا منبع ہے جبکہ دوسرے لوگ تباہی، انحراف اور فساد کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ بہر حال خدا پر ایمان لانا ایسا ہی ہے جیسے کسی محکم کڑے پر ہاتھ ڈالنا کہ جس کے ٹوٹنے کا کوئی امکان نہ ہو۔

"وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ"

آیت کے آخر میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ کفر و ایمان کا مسئلہ ایسا نہیں جو دکھاوے سے حل ہو جائے کیونکہ خدا سب کی باتوں کو سنتا ہے چاہے وہ آشکار ہوں یا بند کمروں اور مخفی اجلاسوں میں اس طرح وہ لوگوں کے دلوں میں چھپی ہوئی چیزوں اور لوگوں کے ضمیروں کی حالت سے آگاہ ہے۔

یہ جملہ دراصل حقیقی ایمان لانے والوں کے لیے تشویق اور منافقین کے لیے تہدید اور دھمکی ہے۔

۲۵۷۔ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰۗــــُٔــھُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

ترجمہ

۲۵۷۔ خدا ان لوگوں کا سرپرست ہے جو ایمان لے آئے ہیں۔ انہیں وہ تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آتا ہے (لیکن) وہ لوگ جو کافر ہو گئے ہیں ان کے اولیاء اور سرپرست طاغوت (بت، شیطان اور ظالم و سرکش لوگ) ہیں جو انہیں نور سے نکال کر تاریکیوں



کی طرف لے جاتے ہیں وہ اہل آتش (جہنم) ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

تفسیر

"ولی" کا معنی جیسا کہ بعد میں "انما ولیکم الله و رسوله ...." والی آیت کے ذیل میں آئے گا اصل میں "نزدیکی اور عدم جدائی" ہے۔ اسی بناء پر سرپرست کو ولی کہتے ہیں اور جو شخص تربیت اور سرپرستی کا محتاج ہو اُس کے مربی کو ولی کہا جاتا ہے۔ مخلص دوستوں اور رفقاء کے لیے بھی ولی اور اولیاء کا اطلاق ہوتا ہے لیکن واضح ہے کہ اس آیت میں پہلے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

گذشتہ آیات میں کفر و ایمان، حق و باطل اور راہِ راست اور انحرافی راستے کی وضاحت کے بعد اب یہ آیت تکمیلِ مطلب کے لیے کہتی ہے: مومن و کافر ہر کسی کا رہبر و راہنما اور اپنا مخصوص راستہ ہے۔ مومنین کا رہبر و راہنما خدا ہے، ان کا راستہ تاریکیوں سے جدا ہو کر نور کی طرف جاتا ہے۔ لیکن کافروں کا رہبر طاغوت ہے اور ان کی راہ مومنین کے برعکس نور سے ظلمت کی طرف جاتی ہے اور ان کا انجام بھی واضح ہے کیونکہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آگ میں رہیں گے (اولئك اصحب النار ۚ هم فيها خلدون)۔

چند اہم نکات

۱۔ **نور و ظلمت کی تشبیہ:** ایمان اور کفر کو نور اور ظلمت سے تشبیہ دینا اس موقع کی مناسب ترین تشبیہ ہے۔ نور ـــــ زندگی اور تمام برکات و آثارِ حیات کا منبع ہے۔ نور ہی رشد، نمو، تکامل، تحرک اور جنبش کا سرچشمہ ہے اور نور ہی سکون بخش، مطمئن کرنے والا، آگاہ کرنے والا اور نشاندہی کرنے والا ہے جبکہ ظلمت و تاریکی سکوت، موت، خواب، نادانی، گمراہی اور وحشت کی رمز ہے۔

۲۔ **"نور" کے مقابل "ظلمات" کیوں:** اس آیت میں اور اس کے مشابہ آیات قرآن میں لفظ ظلمت کی جمع ظلمات استعمال کیا گیا ہے اور نور صیغہ مفرد کے طور پر آیا ہے۔ یہ دراصل اس طرف اشارہ ہے کہ راہِ حق میں کسی قسم کی کوئی پراگندگی اور انتشار نہیں بلکہ وہ الہام بخش وحدت و یگانگی ہے۔ راہِ حق خط مستقیم کی طرح ہے جو دو نقطوں کے درمیان کھینچا جائے تو ہمیشہ ایک ہی ہوگا اور اس میں ایک سے زیادہ کی تعداد ممکن نہیں لیکن اہل باطل اپنے باطل میں ہم آہنگ نہیں ہیں۔ ان میں ہدف اور مقصد کی وحدت نہیں ہے ان کی حالت بالکل دو نقطوں کے درمیان کھینچے جانے والے غیر منظم خطوط کی سی ہے جن کی تعداد خط مستقیم کے دونوں طرف بے شمار ہے۔

۲۵۸۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِىْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِىْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّىَ الَّذِىْ يُحْىٖ وَيُمِيْتُ ۙ



قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ ؕ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۟ۚ

ترجمہ

۲۵۸۔ کیا دیکھتے نہیں ہو (اور اُس سے آگاہ نہیں ہو) جس نے ابراہیم کے ساتھ اُس کے پروردگار کے بارے میں حجت بازی اور کلام کیا کیونکہ خدا نے اُسے حکومت دے رکھی تھی (اور وہ کم ظرفی کی وجہ سے بادۂ غرور سے سرمست ہوگیا تھا) جب ابراہیم نے کہا: میرا خدا وہ ہے جو زندہ کرتا اور مارتا ہے۔ اس نے کہا میں زندہ کرتا اور مارتا ہوں۔
(اس کے بعد اُس نے مغالطہ پیدا کرنے کا حکم دیا اور دو قیدی حاضر کیے گئے، اُس نے ایک کی آزادی اور دوسرے کے قتل کا فرمان جاری کر دیا) ابراہیم نے کہا خدا آفتاب کو افق مشرق سے نکالتا ہے (اگر تم اپنے اس قول میں سچے ہو کہ تمہی جہان ہستی پر حکمران ہو تو) تم خورشید کو مغرب سے نکال کر دکھاؤ (یہاں) وہ کافر مبہوت ہوگیا اور خدا ظالم قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔

تفسیر

گذشتہ آیت پروردگار کی ولایت اور راہنمائی کے ذریعے مومنین کی ہدایت اور طاغوت کی پیروی کے ذریعے کفار کی گمراہی کے بارے میں تھی۔ اس کے بعد زیرِ نظر آیت میں خدا ایک زندہ اور واضح شاہد کا ذکر کرتا ہے جو اس کے عظیم پیغمبر حضرت ابراہیمؑ کے متعلق رونما ہوا۔

ہوا یہ کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے زمانے کے ایک جابر سے بحث مباحثہ کیا اور اپنے موقف کے حق میں دلائل پیش کئے وہ اپنی حکومت کی وجہ سے بادہ غرور سے سرمست تھا لہٰذا حضرت ابراہیمؑ سے پوچھنے لگا تیرا خدا کون ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے کہا وہی جو زندہ کرتا اور مارتا ہے۔ حقیقت میں آپ نے عظیم ترین شاہکار قدرت کو دلیل کے طور پر پیش کیا۔ مبداءِ جہانِ ہستی کے علم و قدرت کی واضح نشانی یہی قانونِ موت و حیات ہے لیکن اُس نے مکر و تزویر کی راہ اختیار کی اور مغالطہ پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ لوگوں کو اور اپنے حمایتیوں کو غافل رکھنے کے لیے کہا وہ تو میں زندہ کرتا اور مارتا ہوں اور موت و حیات کا قانون میرے ہاتھ میں ہے (اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ)۔

قرآن میں اس کے جملے کے بعد واضح نہیں ہے کہ اُس نے اپنے پیدا کیے گئے مغالطے کی تائید کے لیے کس طرح عملی اقدام کیا لیکن احادیث و تواریخ میں آیا ہے کہ اُس نے فوراً دو قیدیوں کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ قیدی لائے گئے تو اس نے



فرمان جاری کیا کہ ایک کو آزاد کر دو اور دوسرے کو قتل کر دو۔ پھر کہنے لگا: تم نے دیکھا کہ موت و حیات کس طرح میرے قبضے میں ہے۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی موت و حیات سے متعلق دلیل ہر لحاظ سے قوی تھی لیکن دشمن سادہ لوح لوگوں کو جھل دے سکتا تھا لہٰذا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دوسرا استدلال پیش فرمایا کہ خدا آفتاب کو افقِ مشرق سے نکالتا ہے اگر جہانِ ہستی کی حکومت تیرے ہاتھ میں ہے تو تُو اسے مغرب سے نکال کر دکھا۔ یہاں دشمن خاموش، مبہوت اور عاجز ہو گیا۔ اس میں سکت نہ رہی کہ اس زندہ منطق کے بارے میں کوئی بات کر سکے۔ ایسے ہٹ دھرم دشمنوں کو لاجواب کرنے کا یہ بہترین طریقہ ہے۔ یہ مُسلّم ہے کہ موت و حیات کا مسئلہ کئی جہات سے آسمان اور گردشِ شمس و قمر کی نسبت پروردگارِ عالم کے علم و قدرت پر زیادہ گواہی دیتا ہے۔ اسی بناء پر حضرت ابراہیمؑ نے پہلے وہی مسئلہ پیش کیا اور یہ فطری امر ہے کہ اگر صاحبِ فکر اور روشن خیال افراد اس مجلس میں ہوں گے تو وہ اسی دلیل سے مُطمئن ہو گئے ہوں گے کیونکہ ہر شخص اچھی طرح جانتا ہے کہ ایک قیدی کو آزاد کرنا اور دوسرے کو قتل کر دینا یہ طبیعی اور حقیقی موت و حیات سے بالکل ربط نہیں رکھتا لیکن جو لوگ کم عقل تھے اور اس دور کے ظالم حکمران کے پیدا کردہ مغالطے سے متاثر ہو سکتے تھے ان کی فکر راہِ حق سے منحرف ہو سکتی تھی لہٰذا آپ نے دوسرا استدلال پیش کیا اور سورج کے طلوع و غروب کا مسئلہ پیش کیا تاکہ حق ہر دو طرح کے افراد کے سامنے واضح ہو جائے۔

چند اہم نکات

۱۔ حضرت ابراہیمؑ کے مدِمقابل کون تھا: سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے مدِمقابل اس اجتماع میں کون تھا اور کون آپ سے حجت بازی کر رہا تھا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن میں اس کے نام کی صراحت نہیں ہے لیکن فرمایا گیا ہے۔

"ان اٰتٰه الله الملك"

یعنی — اس غرور تکبر کے باعث جو اس میں نشۂ حکومت کی وجہ سے پیدا ہو چکا تھا وہ ابراہیم سے حجت بازی کرنے لگا۔

لیکن حضرت علی علیہ السلام سے منقول درمنثور کی ایک حدیث میں اور اسی طرح تواریخ میں اس کا نام "نمرود بن کنعان" بیان کیا گیا ہے۔

۲۔ یہ مباحثہ کب ہوا: زیرِ بحث آیت میں اس مباحثے کا وقت نہیں بتایا گیا۔ لیکن قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ واقعہ حضرت ابراہیمؑ کی بت شکنی اور آگ کی بھٹی سے نجات کے بعد کا ہے کیونکہ یہ مسلم ہے کہ آگ میں ڈالے جانے سے قبل اس گفتگو کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور اصولی طور پر بت پرست آپ کو ایسے مباحثے کا حق نہ دے سکتے تھے وہ حضرت ابراہیمؑ کو ایک ایسا مجرم اور گنہ گار سمجھتے تھے جسے ضروری تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے اپنے اعمال اور خدایانِ مقدس کے



خلاف قیام کی سزا ملے۔ وہ تو انہوں نے بت شکنی کے اقدام کا صرف سبب پوچھا تھا اور اس کے بعد انتہائی غصے اور سختی سے انہیں آگ میں جلانے کا حکم صادر ہوا تھا لیکن جب آپ حیرت انگیز طریقے سے آگ سے نجات پا گئے تو پھر اصطلاحی الفاظ میں "نمرود کے حضور رسائی ہوئی" اور پھر بحث و مباحثے کے لیے بیٹھ گئے۔

۳۔ **بحث سے نمرود کا مقصد:** آیت سے اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ اس بحث اور گفتگو کے ذریعے نمرود کسی حقیقت کی جستجو نہ کر رہا تھا بلکہ وہ اپنے باطل موقف کو برتر ثابت کرنا چاہتا تھا۔ شاید لفظ "حاج" اسی مقصد کے لیے استعمال ہوا ہے کیونکہ یہ لفظ عموماً ایسے ہی مواقع پر استعمال ہوتا ہے۔

۴۔ **نمرود کا دعوائے الوہیت:** آیت سے یہ بھی اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ وہ ظالم حکمران اپنے بارے میں الوہیت کا مدعی تھا۔ یہی نہیں کہ وہ اپنی پرستش کرواتا تھا بلکہ اپنے آپ کو عالم ہستی کا پیدا کرنے والا بھی بتاتا تھا یعنی اپنے آپ کو معبود بھی سمجھتا تھا اور خالق بھی۔

ایسا ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ جب لوگ پتھر اور لکڑی کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں اور ان کی پرستش کرنے کے علاوہ انہیں امورِ عالم میں موثر اور سہیم بھی مانتے ہیں تو ایسا موقع ایک مکار اور ظالم حکمران کے لیے بھی پیش آ سکتا ہے کہ وہ سادہ لوح لوگوں سے فائدہ اٹھائے، انہیں اپنی طرف دعوت دے اور اپنے آپ کو ایک بنا کر پیش کرے تاکہ اس کی بھی پرستش ہو اور لوگ اس کی خالقیت کے سامنے گردن جھکائیں۔

بُت پرستی کی مختصر تاریخ

ہم یہاں بُت پرستی کی مختصر تاریخ بیان کرتے ہیں۔

بُت پرستی کی ابتداء کا تعین بہت مشکل ہے۔ قدیم ترین زمانے سے جہاں تک ہمیں انسانوں کی تاریخ معلوم ہے یہ بت پرستی اُن لوگوں میں موجود رہی ہے جو پست فکر اور گھٹیا تھے۔ بت پرستی دراصل خدا پرستی کے عقیدے کی ایک تحریف ہے۔ خدا پرستی دراصل انسان کی فطرت اور سرشت کا جزء ہے اور شروع سے انسان اسی فطرت اور سرشت کا مالک رہا ہے لہٰذا اس کی تحریف بھی پست افراد میں ہمیشہ رہی ہے لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ بت پرستی کی تاریخ تقریباً تاریخ انسانی کے ساتھ ساتھ شروع ہوتی ہے۔

اِس کی وضاحت یہ ہے کہ انسان اپنی سرشت اور خلقت کے تقاضے کی بناء پر طبیعات سے ماوراء ایک قوت کی طرف متوجہ تھا۔ نظامِ ہستی کے واضح استدلالات اِس سرشت کی تائید کرتے تھے اور ایک ایسے مبداء کی نشاندہی کرتے تھے کہ جو عالم و قادر ہے اور انسان سرشت اور عقل کے ان دونوں طریقوں سے کم و بیش ہمیشہ ہی اس مبداء ہستی سے آشنا رہا ہے۔
لیکن ــــ بھوک کا وہ احساس جو بچے میں موجود ہے اگر برمحل اس کی رہبری نہ کی جائے اور اسے صحیح غذا نہ دی جائے تو پھر وہ کیچڑ اور اس جیسی چیزوں کی طرف ہاتھ بڑھانے لگتا ہے اور آہستہ آہستہ ایسی ہی چیزوں کا عادی ہو جاتا ہے اور اپنی صحت و سلامتی کھو بیٹھتا ہے اسی طرح انسان کی عقل و فطرت کو ملحوظ رکھتے ہوئے بروقت راہنمائی میسر نہ آئے



تو وہ مصنوعی خدا اور طرح طرح کے بتوں کا رخ کرلیتا ہے اور ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کر بیٹھتا ہے اور اُن کے لیے خدائی صفات کا قائل ہو جاتا ہے۔

یاد دہانی کی ضرورت نہیں کہ کوتاہ فکر اور بے وقوف لوگوں کی کوشش ہوتی ہے کہ ہر چیز کو حسی قالب میں دیکھیں۔ بنیادی طور پر ان کی فکر محسوسات کی دنیا سے آگے قدم نہیں رکھتی اس لیے اَن دیکھے خدا کی پرستش ان کے لیے مشکل ہے۔ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ اپنے خدا کو پیکرِ محسوس میں دیکھیں۔ یہ جہالت و نادانی جب خدا پرستی کی سرشت سے مل جاتی ہے تو بت پرستی اور خدائے حس کی شکل میں رونما ہوتی ہے۔

دوسری طرف کہا جاتا ہے کہ گذشتہ قومیں انبیاء اور بزرگانِ دین کے لیے جو خاص احترام رکھتی تھیں اس کے پیشِ نظر ان کی وفات کے بعد ان کے مجسمے یادگار کے طور پر بنا لیتی تھیں۔ کوتاہ نظر اور کم فکر لوگوں میں جو جعلی فضائل اور غلو کی روح ہوتی ہے وہ انہیں جوش دلاتی اور مجبور کرتی کہ ان مجسموں کے لیے بلند مرتبوں اور معجزوں کے قائل ہو جائیں اور یوں انہیں سرحدِ الوہیت تک پہنچا دیں۔ یہ انداز بت پرستی کا دوسرا سرچشمہ ہے۔

بت پرستی کا ایک سرچشمہ یہ بھی تھا کہ موجودات کا ایک سلسلہ جو انسانی زندگی کے لیے سودمند تھا مثلاً چاند، سورج، آگ اور پانی وغیرہ۔ لوگ اُن کے سامنے سرِ تعظیم خم کر دیتے اور اپنی فکر کے افق کو وسیع نہ کرتے کہ جس کے نتیجے میں وہ ان سے ماوراء سببِ اوّل اور خالقِ عالم کو دیکھ پاتے۔ احترام اور تعظیم کے اس انداز نے رفتہ رفتہ بت پرستی کی شکل اختیار کر لی۔

بت پرستی کی تمام اشکال کی جڑ اور بنیاد ایک ہی چیز ہے اور وہ ہے فکری پستی اور جہل و نادانی نیز خدا جوئی اور خداشناسی کے لیے صحیح رہبری کا نہ ہونا مگر جب انبیاء کی تعلیم و تربیت اور راہنمائی موجود تھی تو پھر یہ عذر قابلِ گرفت ضرور ہے۔

۲۵۹۔ اَوْ كَالَّذِىْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّهِىَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى يُحْىٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ۭ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ۭ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۭ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ



نُنۡشِزُهَا ثُمَّ نَكۡسُوۡهَا لَحۡمًا ؕ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعۡلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ○

ترجمہ

۲۵۹۔ یا اس شخص کی طرح جو ایک آبادی میں سے گزرا، حالت یہ تھی کہ اس کی دیواریں چھتوں پر گری پڑی تھیں (اور اس میں رہنے والوں کے جسم اور ہڈیاں ہر طرف بکھرے پڑے تھے۔ یہ دیکھا تو وہ شخص اپنے آپ سے) کہنے لگا: خدا انہیں موت کے بعد اب کیسے زندہ کرے گا (اسی وقت) خدا نے اسے ایک سو سال کیلئے مار دیا۔ پھر اُسے زندہ کیا اور اس سے کہا: کتنی دیر ٹھہرے رہے ہو۔ کہنے لگا: ایک دن۔ یا دن کا کچھ حصہ فرمایا: (نہیں) بلکہ ایک سو سال تک ٹھہرے رہے ہو، اپنی غذا اور پینے کی چیزوں کی طرف دیکھو (جو تمہارے پاس تھی اور سالہا سال گزرنے کے باوجود) اس میں کوئی تغیر نہیں آیا (وہ خدا جس نے جلد خراب ہو جانے والی ان چیزوں کی اتنی طویل مدت حفاظت کی ہے وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے) لیکن اپنے گدھے کی طرف دیکھو (کہ وہ کیسے ریزہ ریزہ ہو چکا ہے موت کے بعد زندگی تمہارے اطمینان کے لیے ہے نیز) اس لیے بھی کہ تمہیں ہم لوگوں کے لیے (معاد کے بارے میں) نشانی قرار دیں اب (اپنی سواری کی) ہڈیوں کی طرف دیکھو کہ ہم انہیں کیسے اٹھا کر ایک دوسرے سے جوڑ دیتے ہیں اور اس پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ (یہ حقائق) جب اُس پر آشکار ہوئے تو اُس نے کہا: میں جانتا ہوں کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

تفسیر

واقعے کی تفصیلات

یہ آیت ایک گذشتہ نبی کا دوسرا واقعہ بیان کرتی ہے یہ واقعہ معاد اور قیامت پر ایک زندہ گواہ ہے۔ درحقیقت گذشتہ آیات جن میں حضرت ابراہیمؑ کی نمرود سے ہونے والی گفتگو کو بیان کیا گیا تھا توحید اور خدا شناسی کے بارے میں تھیں اور یہ آیت معاد اور موت کے بعد کی زندگی کے بارے میں ہے۔ پہلے ہم اجمالی طور اس واقعے کو دیکھیں گے اور پھر آیت کی تفسیر کریں گے۔ آیت ایک ایسے شخص کی سرگذشت بیان کر رہی ہے جو اثنائے سفر میں تھا۔ ایک سواری پر سوار تھا، کھانے پینے کا کچھ سامان اُس کے ہمراہ تھا اور وہ ایک آبادی میں سے گزر رہا تھا جو وحشتناک حالت میں گری پڑی تھی اور ویران ہو چکی تھی اور اس کے باسیوں کے جسم اور بوسیدہ ہڈیاں نظر آ رہی تھیں۔ جب اس نے یہ وحشتناک منظر دیکھا تو کہنے لگا:



خدا ان مُردوں کو کس طرح زندہ کرے گا۔

ہاں البتہ اُس کی یہ بات شک اور انکار کے طور پر نہ تھی بلکہ از روئے تعجب تھی کیونکہ آیت میں موجود قرائن نشاندہی کرتے ہیں کہ وہ ایک نبی تھے۔ جیساکہ آیت کے مطابق خدا نے اُس سے گفتگو کی۔ روایات بھی اس حقیقت کی تائید کرتی ہیں جس کی طرف ہم بعد میں اشارہ کریں گے۔

خدا تعالیٰ نے اسی وقت اُس کی روح قبض کر لی اور پھر ایک سو سال کے بعد اسے زندہ کیا۔ اب اس سے سوال کیا کہ اِس بیابان میں کتنی دیر ٹھہرے رہے ہو۔ وہ تو یہ خیال کرتا تھا کہ یہاں تھوڑی دیر ہی توقف کیا ہے۔ فوراً جواب میں عرض کیا: ایک دن یا اس سے بھی کم۔ اسے خطاب ہوا: تم ایک سو سال یہاں رہے ہو لیکن اپنے کھانے پینے کی چیزوں کی طرف دیکھو کیسے طویل مدت میں حکمِ خدا کی وجہ سے ان میں تغیر نہیں آیا۔ اب اس دلیل کے لیے کہ تم جان لو کہ تمہیں سو سال موت کے عالم میں گزر گئے ذرا اپنی سواری کی طرف نگاہ کرو اور دیکھو کہ کھانے پینے کی چیزوں کے برعکس وہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر چکی ہے اور طبیعت کے عام قوانین اسے اپنی لپیٹ میں لے چکے ہیں اور موت نے اس کے جسم کو منتشر کر دیا ہے۔ اب دیکھو کہ ہم اِس کے پراگندہ اجزاء کو کیسے جمع کر کے اسے زندہ کرتے ہیں۔ اِس نے یہ منظر دیکھا تو کہنے لگا: میں جانتا ہوں کہ خدا ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے یعنی میں مطمئن ہو چکا ہوں اور مردوں کے دوبارہ اُٹھنے کا معاملہ متشکل ہو کے میرے سامنے آگیا ہے

اِس بارے میں کہ وہ پیغمبر کون تھے، مختلف احتمالات دیے گئے ہیں۔ بعض نے "ارمیاؑ" کہا ہے اور بعض "خضرؑ" سمجھتے ہیں لیکن مشہور یہ ہے کہ وہ "عزیرؑ" تھے۔ امام صادق علیہ السلام سے منقول ایک حدیث میں بھی حضرت عزیرؑ کے نام کی تائید ہوتی ہے۔

یہ بھی سوال اُٹھتا ہے کہ یہ آبادی کہاں تھی۔ بعض اسے بیت المقدس سمجھتے ہیں جو بخت النصر کے حملوں کی وجہ سے ویران اور برباد ہو چکا تھا۔ لیکن یہ احتمال بعید نظر آتا ہے۔

اب آیت کی تفسیر کی طرف لوٹتے ہیں۔

"اوکالذی مرّ علی قریة وھی خاویة علی عروشھا":

جیساکہ ہم کہہ چکے ہیں یہ آیت گذشتہ آیت کی تکمیل کر رہی ہے۔ گذشتہ آیت میں توحید کے بارے میں بحث تھی۔ یہ اور اس سے اگلی آیت معاد اور قیامت کے حسی نمونے پیش کر رہی ہیں۔ ابتدا یوں ہوتی ہے: کیا تو نے اُس شخص کو نہیں دیکھا جو ایک ایسی جگہ سے گذر رہا تھا جو بالکل ویران ہو چکی تھی۔

"عروش" جمع ہے "عرش" کی۔ یہاں "چھت" کے معنی میں ہے۔ "خاویہ" دراصل "خالی" کے معنی میں ہے اور یہاں ویران ہونے کے مفہوم کے لیے کنائے کے طور پر آیا ہے کیونکہ آباد گھر عموماً سکونتی ہوتے ہیں اور جو گھر خالی ہوتے ہیں، پہلے سے ویران ہوتے ہیں یا خالی رہنے کی وجہ سے ویران ہو جاتے ہیں۔ اس لیے "وھی خاویة علی عروشھا" کا مطلب ہے کہ اِس آبادی کے سب گھر ویران ہو چکے تھے لیکن اس شکل میں کہ پہلے ان کی چھتیں گری تھیں اور اس کے بعد ان کی دیواریں زمین بوس ہو گئی تھیں ایسی ویرانی ایک مکمل ویرانی ہوتی ہے کیونکہ کسی عمارت کی تباہی کے وقت عموماً پہلے چھت تباہ ہوتی



ہے اور ایک مدت تک دیواریں کھڑی رہتی ہیں اور پھر وہ بھی تباہ شدہ چھتوں پر آجاتی ہیں ۔

"قال انی یحی ھذہ اللہ بعد موتھا":

ظاہراً اس ماجرے میں پیغمبر کے ساتھ کوئی اور شخص نہیں تھا لہٰذا انہوں نے اپنے آپ سے کہا: خدا اس بستی کو موت کے بعد کیسے زندہ کرے گا۔ "قریہ" سے مراد یہاں بستی والے ہیں ۔ یہ جملہ نشاندہی کرتا ہے کہ وہ اس حادثے میں اہل بستی کی بکھری پڑی ہڈیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر ان کی طرف اشارہ کرکے یہ بات کر رہے تھے ۔

"فاماتہ اللہ مائۃ عام ثم بعثہ":

اکثر مفسرین اس جملے سے یہ سمجھے ہیں کہ خدا نے پیغمبر مذکور کو ایک سو سال کے لیے مار دیا تھا ۔ پھر انہیں زندہ کیا ۔ "اماتہ" کا لفظ بھی جو "موت" کے مادہ سے ہے اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتا ہے لیکن تفسیر المنار کا مولف کہتا ہے :

"ممکن ہے یہ ایک قسم کی نیند کی طرف اشارہ ہو ، جسے آج کے علماء "سبات" کہتے ہیں ، جس کے مطابق موجود زندہ ایک طویل مدت تک گہری نیند میں مستغرق رہتا ہے لیکن اس میں شعلہ حیات خاموش نہیں ہوتا جیسا کہ ہم نے اصحاب کہف کی نیند کے بارے میں پڑھ رکھا ہے ۔"

پھر وہ مزید لکھتا ہے

"اس طویل نیند کے بارے میں اب تک جو اتفاق ہوا ہے وہ چند سال سے زیادہ نہیں لہٰذا اس کا سو سال تک طویل ہو جانا خلاف معمول ہے لیکن یہ مسلم ہے کہ جب چند سال کے لیے ایسا ممکن ہے تو سو سال کے لیے بھی ممکن ہو سکتا ہے ۔ خارق عادت امور قبول کرنے کے لیے جو چیز ضروری ہے وہ یہ ہے کہ کام ممکن ہو محال عقلی نہ ہو ۔

اس تفسیر کے لیے ظاہراً آیت میں کوئی دلیل موجود نہیں بلکہ آیت کا ظہور یہ ہے کہ پیغمبر مذکور دنیا سے چل بسے اور سو سال کے بعد پھر سے زندہ ہوئے ۔ ایسی موت و حیات البتہ ایک خارق عادت اور غیر معمولی چیز ہے لیکن محال ہرگز نہیں اور پھر خارق عادت واقعات صرف اسی موقع کے لیے منحصر نہیں کہ ہمیں اس کی توجیہ و تاویل کرنا پڑے ۔

بہت سے حیوانات ایسے ہیں جو سردیوں کے موسم میں سوئے پڑے رہتے ہیں اور جب ہوا گرم ہوتی ہے تو بیدار ہو جاتے ہیں ۔ بعض حیوانات طبیعی طور پر منجمد ہو جاتے ہیں اور انسان بھی جانوروں کو مصنوعی طریقے سے منجمد کر سکتا ہے ۔

اگر یہاں چند سال تک کی طویل نیند کے امکان کے حوالے سے سو سال تک مردہ رہنے کے بعد زندہ ہونے کو بھی ایک امر ممکن شمار کیا جائے تو یہ ایک اچھی بات ہوگی ۔ اس کا معنی یہ ہوگا کہ وہ خدا جو جانوروں کو سالہا سال تک طویل نیند یا حالت انجماد میں رکھ کر انہیں پھر بیدار کر دیتا ہے اور وہ پہلی حالت پر لوٹ آتے ہیں وہ اس پر بھی قادر ہے کہ مردوں



کو موت کے بعد دوبارہ زندہ کرے۔

اصولی طور پر معاد، قیامت کے دن مردوں کی دوبارہ زندگی، خارق عادت واقعات اور انبیاء کے معجزات تسلیم کر لینے کا فائدہ یہ ہے کہ تمام آیات قرآن کی طبیعی قوانین کی روشنی میں تفسیر کرنے پر اصرار کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی اور نہ ظاہری مفہوم کے خلاف بیان کرنا پڑتا ہے کیونکہ ایسا کرنا نہ تو ضروری ہے اور نہ ہی صحیح

"قال کم لبثت قال لبثت یوما او بعض یوم":

اس جملے میں خدا تعالیٰ پیغمبر سے پوچھتا ہے: اس جگہ کتنی دیر ٹھہرے رہے ہو۔ وہ جواب میں تردد سے کہتے ہیں: ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔

جواب میں تردد سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مرنے کا وقت اور زندہ ہونے کا وقت دن کی کوئی ایک معین گھڑی نہ تھی مثلاً موت کا وقت ظہر سے پہلے تھا اور زندہ ہونے کا زوال کے بعد تھا۔ لہٰذا وہ شک میں پڑ گئے کہ کیا ایک شب و روز گزر گئے ہیں یا دن کے چند گھنٹے گزرے ہیں۔ اسی لیے ایک دن کہنے کے بعد پھر تردد کے عالم میں کہا: یا دن کا کچھ حصہ۔ لیکن فوراً خطاب ہوا کہ انہیں بلکہ تم تو یہاں ایک سو سال سے ٹھہرے ہوئے ہو "بل لبثت مائة عام"

"فانظر الی طعامک وشرابک لم یتسنه":

"تسنہ" کا مادہ ہے "سنة" یعنی ایک سال "لم یتسنه" کا معنی ہے "اُسے ایک سال نہیں گزرا"۔ یہ اس بات کے لیے کنایہ ہے کہ یہ متغیر اور خراب نہیں ہوا۔ اس طرح جملے کا مجموعی معنی یہ ہوگا کہ اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھو کہ سالہا سال گزر جانے کے باوجود یوں لگتا ہے کہ گویا ان پر ایک سال کا عرصہ بھی نہیں گزرا اور ان میں کوئی تغیر نہیں آیا۔ یعنی وہ خدا جو تیری کھانے پینے کی چیزوں کو ان کی اصل حالت میں محفوظ رکھ سکتا ہے جب کہ قاعدۃً انہیں بہت جلد خراب اور فاسد ہو جانا چاہیے اسی خدا کے لیے مردوں کو زندہ کرنا کیا مشکل ہے۔ کھانے پینے کی چیزوں کو اتنی مدت تک خراب ہونے سے بچانا دراصل حیات کو باقی رکھنا ہے کیونکہ ایسی چیزوں کی مدت عمر تو بالعموم بہت کم ہوتی ہے جو کہ بذات خود مردوں کو زندہ کرنے سے آسان تر نہیں ہے۔ [1]

رہا یہ سوال کہ پیغمبر کے پاس کھانے پینے کی کیا چیزیں تھیں تو آیت میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ کھانے کے لیے انجیر اور پینے کے لیے کسی پھل کا جوس تھا اور یہ معلوم ہے کہ یہ چیزیں جلدی خراب ہو جاتی ہیں اس لیے ایک طویل مدت تک ان کی بقا ایک اہم امر ہے۔

"وانظر الی حمارک":

یعنی ___ اپنے گدھے کو دیکھو۔ قرآن نے ان کی سواری کے متعلق اس سے زیادہ نہیں کہا لیکن بعد کے جملوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی سواری وقت گزرنے کے ساتھ بالکل گل سڑ چکی تھی کیونکہ اس کے علاوہ سو سال گزرنے پر کوئی دلیل نہ تھی۔

---

[1] توجہ رہے کہ لم تیسنہ کی ضمیر مفرد ہے جبکہ اس کا تعلق "طعام" سے بھی ہے اور "شراب" سے بھی اس لیے بظاہر ضمیر تثنیہ ہونا چاہیئے تھی لیکن چونکہ یہاں مراد جنس ہے اور سب ایک چیز شمار ہوتی ہے لہٰذا ضمیر بھی مفرد کی شکل میں ہے۔



یہ خود ایک عجیب وغریب چیز ہے کہ جانور جس کے لیے طویل عمر کا امکان ہے اس کے اجزا راس طرح بکھر جائیں لیکن پھل اور پھلوں کا جوس جسے بہت جلد خراب ہونا چاہیئے اس میں کوئی تبدیلی نہ آئے یہاں تک کہ اس کا ذائقہ اور بو تک نہ بدلے۔ یہ خدا تعالیٰ کی انتہائی قدرت نمائی ہے۔

" ولنجعلك اٰية للناس ":

یعنی یہ واقعہ نہ صرف تمہارے لیے قیامت میں اٹھائے جانے کی دلیل ہے بلکہ تمام لوگوں کے لیے نشانی ہے۔

" وانظر الی العظام کیف ننشزها ثمّ نکسوها لحمًا ":

" ننشزها " کا مادہ ہے " نشوز " اس کا معنی ہے " ارتفاع " اور " بلند ہونا "۔ یہاں مراد ہے بکھری ہوئی چیزوں کا جمع ہو کر باہم پیوست ہونا۔ اس بناء پر اس جملے کا معنی یوں ہوگا: بکھری ہوئی ہڈیوں کو دیکھو کہ ہم کیسے انہیں اٹھا کر ایک دوسرے سے پیوست کرتے ہیں اور ان پر گوشت (کا لباس) پہناتے ہیں اور اسے زیادہ کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ بوسیدہ ہڈیوں سے مراد ان کی سواری کے جانور کی ہڈیاں ہیں نہ کہ اہل بستی کی بوسیدہ ہڈیاں کیونکہ یہ امر گذشتہ جملوں سے مناسبت نہیں رکھتا۔

" فلمّا تبیّن له قال اعلم انّ الله علی کلّ شیءٍ قدیر "

یہ مسائل جب پیغمبر پر آشکار ہو گئے تو وہ کہنے لگے: میں جانتا ہوں کہ خدا ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ وہ یہ نہیں کہتے کہ میں نے اب جان لیا ہے۔ جب کہ زلیخا کی حضرت یوسف سے گفتگو میں اس طرح ہے:

" الاٰن حصحص الحق "

یعنی — اب حق واضح ہوا ہے۔

بلکہ پیغمبر کہتے ہیں: میں جانتا ہوں۔ یعنی اب اپنی آگاہی کا اعتراف کرتا ہوں۔

۲۶۰- وَاِذْ قَالَ اِبْرٰھٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی ؕ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰی وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْکَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی کُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَکَ سَعْیًا ؕ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ۝



ترجمہ

۲۶۰۔ اور اس وقت (کو یاد کرو) جب ابراہیم نے کہا: خدایا! مجھے دکھا کہ تو کیسے مردوں کو زندہ کرتا ہے۔ فرمایا: کیا تم ایمان نہیں لائے۔ کہنے لگے: کیوں نہیں میں چاہتا ہوں میرے دل کو اطمینان ہو جائے۔ فرمایا: یہ بات ہے تو چار پرندے انتخاب کر لو (ذبح کرنے کے بعد) انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر لو (پھر ان کے گوشت کو آپس میں ملا دو) پھر ہر پہاڑ پر ایک حصہ رکھ دو، پھر انہیں پکارو، وہ تیزی سے تمہارے پاس آئیں گے اور جان لو کہ خدا ب غالب اور حکیم ہے (وہ مردوں کے اجزائے بدن کو بھی جانتا ہے اور انہیں جمع کرنے کی طاقت بھی رکھتا ہے)۔

تفسیر

بہت سے مفسرین اور مورخین نے اس آیت کے ذیل میں یہ واقعہ لکھا ہے:

ایک دن حضرت ابراہیمؑ دریا کے کنارے سے گزر رہے تھے۔ آپ نے ایک مردار دریا کے کنارے پڑا ہوا دیکھا۔ اس کا کچھ حصہ دریا کے اندر اور کچھ باہر تھا۔ دریا اور خشکی کے جانور دونوں طرف سے اسے کھا رہے تھے بلکہ کھاتے کھاتے ایک دوسرے سے لڑنے لگتے تھے۔ اس منظر نے حضرت ابراہیمؑ کو ایک ایسے مسئلے کی فکر میں ڈال دیا جس کی کیفیت سب تفصیل سے جاننا چاہتے ہیں اور وہ ہے موت کے بعد مردوں کے زندہ ہونے کی کیفیت۔ ابراہیمؑ سوچنے لگے کہ اگر ایسا ہی انسانی جسم کے ساتھ ہو اور انسان کا بدن جانوروں کے بدن کا جزء بن جائے تو قیامت میں اٹھنے کا معاملہ کیسے عمل میں آئے گا جبکہ وہاں انسان کو اسی بدن کے ساتھ اٹھنا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ نے کہا: خدایا! مجھے دکھا کہ تو مردوں کو کیسے زندہ کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کیا تم اس بات پر ایمان نہیں رکھتے۔ انہوں نے کہا: ایمان تو رکھتا ہوں لیکن چاہتا ہوں دل کو تسلی ہو جائے۔

خدا تعالیٰ نے حکم دیا: چار پرندے لے لو اور ان کا گوشت ایک دوسرے سے ملا دو پھر اس سارے گوشت کے کئی حصے کر دو اور ہر حصہ ایک پہاڑ پر رکھ دو۔ اس کے بعد ان پرندوں کو پکارو تاکہ میدان حشر کا منظر دیکھ سکو۔ انہوں نے ایسا ہی کیا تو انتہائی حیرت کے ساتھ دیکھا کہ پرندوں کے اجزاء مختلف مقامات سے جمع ہو کر اُن کے پاس آگئے ہیں اور ان کی ایک نئی زندگی کا آغاز ہو گیا ہے۔

اس مشہور واقعے کے مقابلے میں ایک مفسر ابو مسلم نے ایک اور نظریہ پیش کیا ہے جسے مشہور مفسر فخر رازی نے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے۔ ابو مسلم کا نظریہ باقی مفسرین کے برخلاف ہے لیکن چونکہ ایک معاصر مفسر مؤلف المنار نے اس کی تائید کی ہے لہذا ہم اسے نقل کرتے ہیں۔

موصوف نے کہا ہے کہ آیت اس بات پر ہرگز دلالت نہیں کرتی کہ حضرت ابراہیمؑ نے پرندوں کو ذبح کیا اور پھر حکم خدا سے انہیں زندہ کیا۔ بلکہ آیت میں تو مسئلہ حشر و نشر واضح کرنے کے لیے ایک مثال پیش کی گئی ہے۔ یعنی اے ابراہیم! چار پرندے



لے لو اور انہیں اپنے ساتھ ایسے مانوس کر لو کہ جب انہیں پکارو تو وہ تمہارے پاس آجائیں اگرچہ اُن میں سے ہر ایک کو ایک پہاڑ کی چوٹی پر بٹھا دو تو یہ کام تمہارے لیے کتنا آسان ہے ۔ اسی طرح مردوں کو زندہ کرنا اور مختلف مقامات عالم سے ان کے پراگندہ اجزاء جمع کرنا بھی خدا کے لیے آسان ہے ۔

اس لیے خدا نے ابراہیمؑ کو پرندوں کے بارے میں جو حکم دیا تھا وہ یہ نہ تھا کہ وہ ایسا کوئی کام کریں بلکہ صرف ایک مثال اور تشبیہ کے طور پر بیان کیا گیا تھا ۔ یہ بعینہٖ ایسا ہے جیسے کوئی دوسرے سے کہے کہ میں فلاں کام نہایت آسانی سے اور تیزی سے کر سکتا ہوں ۔ بس تم پانی کا ایک گھونٹ پیو اور میں یہ کام کیے دیتا ہوں ۔ یعنی یہ میرے لیے اس قدر آسان ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسرے پر پانی کا گھونٹ پینا فرض ہو گیا ہے ۔

دوسرے نظریے کے حامی "صرھن الیک" سے استدلال کرتے ہیں ۔ وہ کہتے ہیں کہ جب یہ لفظ "الی" سے متعدی ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے "مائل کرنا" اور "مانوس بنانا" اس لیے جملے کا مفہوم ہو گا کہ مذکورہ پرندوں کو اپنے ساتھ مانوس کرو ۔ علاوہ ازیں "صرھن" "منھن" اور "ادعھن" کی ضمیریں پرندوں کی طرف لوٹتی ہیں اور یہ اسی صورت میں صحیح ہے کہ ہم دوسری تفسیر کو درست مان لیں کیونکہ پہلی تفسیر کے مطابق بعض ضمیریں پرندوں سے متعلق ہیں اور بعض ان کے اجزاء سے متعلق جب کہ یہ مناسب دکھائی نہیں دیتا ۔

ان استدلالات کا جواب ہم آیت کی تفسیر میں بیان کریں گے لیکن جس بات کی طرف یہاں اشارہ کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ آیت یہ حقیقت وضاحت سے پیش کرتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے حشر و نشر کے محسوس مشاہدے کا تقاضا کیا تھا تاکہ ان کا دل مطمئن ہو جائے اور واضح ہے کہ ایک مثال حشر و نشر کی منظر کشی نہیں کرتی اور نہ ہی دل کے لیے باعث اطمینان ہو سکتی ہے ۔ درحقیقت عقل و منطق کے ذریعے تو حضرت ابراہیمؑ پہلے ہی حشر و نشر پر ایمان رکھتے تھے لیکن وہ چاہتے تھے کہ اس کا حسی طور پر مشاہدہ کریں ۔

اب ہم آیت کی تفسیر کی طرف لوٹتے ہیں تاکہ واضح ہو جائے کہ کونسا نظریہ تفسیر سے میل کھاتا ہے ۔

"واذ قال ابراھم رب ارنی کیف تحی الموتیٰ" :

جیسا کہ پہلے بھی اشارہ ہو چکا ہے کہ حشر و نشر کے بارے میں یہ آیت گذشتہ آیت کے موضوع کی تکمیل کرتی ہے ۔ "ارنی کیف ....." سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ مشاہدہ ، رویت اور شہود کا تقاضا کر رہے تھے اور وہ بھی اصل معاد کا نہیں بلکہ اس کی کیفیت کا ۔

"قال اولم تؤمن قال بلٰی ولٰکن لیطمئن قلبی" :

ممکن تھا کہ مذکورہ مطالبے پر لوگ حضرت ابراہیمؑ کے ایمان کے بارے میں تزلزل کا گمان کرتے لہٰذا انہیں وحی ہوئی : تو کیا تم ایمان نہیں لائے ہو؟ یہ اس لیے تھا تاکہ وضاحت ہو جائے اور اس واقعے سے کسی کو غلط فہمی نہ ہو لہٰذا انہوں نے کہا : جی ہاں ، میرا ایمان تو ہے لیکن چاہتا ہوں دل مطمئن ہو جائے ۔

ضمناً اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بات کا امکان ہوتا ہے کہ مسئلے میں علمی اور منطقی دلائل سے یقین پیدا ہو جائے



لیکن اطمینان قلب نہ ہو کیونکہ استدلال عقل انسانی کو تو راضی کر لیتا ہے لیکن دل اور جذبات انسانی کو نہیں ۔ جو دونوں کو سیراب کرتا ہے وہ شہود عینی اور مشاہدات حسی ہی ہیں ۔ یہ ایک اہم بات ہے جس کے بارے میں اس کے مقام پر مزید وضاحت کریں گے۔

"قال فخذ اربعة من الطير فصرهن اليك ثم اجعل على كل جبل منهن جزءًا" :

"صرهن" کا مادہ ہے "صور" (بروزن "قول") اس کا معنی ہے "ٹکڑے کرنا"، "مائل کرنا" اور "بلند آواز سے پکارنا"۔ یہاں پہلا معنی ہی مناسب ہے ۔ یعنی چار پرندے انتخاب کر لو ، انہیں ذبح کرو اور انہیں ٹکڑے ٹکڑے کرکے ایک دوسرے سے ملا دو ۔

مقصد یہ تھا کہ حضرت ابراہیمؑ حشر و نشر اور مردوں کے اجزاء بدن کے بکھر جانے کے بعد زندہ ہونے کے نمونے کا مشاہدہ کریں اور یہ بات پکارنے اور مائل کرنے کے معانی سے حاصل نہیں ہوتی خصوصاً جبکہ آیت کا بعد کا حصہ کہتا ہے : پھر ہر پہاڑ پر ان میں سے ایک حصہ رکھ دو " آیت کا یہ حصہ واضح گواہی دے رہا ہے کہ پہلے پرندوں کو ٹکڑے ٹکڑے کیا گیا ہے اور ان کے اجزاء بنے ہیں ۔ جو لوگ "صرهن" کا ترجمہ "مانوس اور مائل کرنا" کرتے ہیں وہ دراصل لفظ "جزء" کے معنی سے غافل ہیں ۔

چند اہم نکات

۱ - **چار پرندے** : اس میں شک نہیں کہ مذکورہ چار پرندے مختلف انواع میں سے تھے کیونکہ اس کے بغیر حضرت ابراہیمؑ کا مقصد پورا نہیں ہوتا تھا ۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ ہر ایک کے اجزاء اس کے اصلی بدن میں واپس آئیں اور یہ مختلف انواع ہونے کی صورت میں ہی ظاہر ہو سکتا تھا ۔ مشہور روایات کے مطابق وہ چار پرندے مور ، مرغ ، کبوتر اور کوّا تھے جو کہ کئی پہلوؤں سے ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں ۔

بعض ان پرندوں کو انسانوں کی مختلف صفات اور جذبات کا مظہر سمجھتے ہیں ۔

مور : خودنمائی ، زیبائش اور تکبر کا مظہر ہے ،
مرغ : شدید جنسی میلانات کا مظہر ہے ،
کبوتر : لہو و لعب اور کھیل کود کا مظہر ہے اور
کوّا : لمبی چوڑی آرزوؤں اور تمناؤں کا مظہر ہے ۔

۲ - **پہاڑوں کی تعداد** : جن پہاڑوں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پرندوں کے اجزاء رکھے تھے ان کی تعداد کی صراحت قرآن حکیم میں نہیں ہے لیکن روایات اہل بیتؑ میں یہ تعداد دس بتائی گئی ہے ۔ اسی لیے بعض روایات میں آیا ہے کہ اگر کوئی شخص وصیت کر جائے کہ اس کے مال کا ایک جزء فلاں سلسلے میں صرف کرنا اور اس کی مقدار معین نہ کر جائے تو مال کا دسواں حصہ دینا کافی ہے ۔[1]

۳ - **واقعہ کب رونما ہوا** : یہ واقعہ کب پیش آیا ، جب حضرت ابراہیمؑ بابل میں تھے یا جب شام چلے آئے تھے ۔ یوں

[1] تفسیر "نور الثقلین" جلد اوّل ۔ صفحہ ۲۷۸



لگتا ہے کہ یہ شام میں آنے کے بعد کا واقعہ ہے کیونکہ سرزمین بابل میں پہاڑ نہیں ہیں۔

"ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا":

"پھر انہیں پکارو تو وہ تیزی سے تمہاری طرف آئیں گے" اس موقع پر ایک پرندے کے بکھرے ہوئے اجزاء جمع ہوئے اور آپس میں مل گئے اور پرندے نئے سرے سے زندہ ہو گئے۔ البتہ ایسا ہونا بالکل خارق عادت اور خلاف معمول ہے لیکن اگر ہم خدا کو طبیعی قوانین پر حاکم سمجھیں نہ کہ محکوم، تو پھر مسئلے میں کوئی پیچیدگی نہیں رہے گی۔

ضمناً یہ بھی ایک پہلو ہے کہ بعض نے لفظ "سعیا" سے یہ سمجھا ہے کہ پرندے زندہ ہونے کے بعد پرواز نہ کرکے بلکہ دوڑ کر ابراہیمؑ کے پاس آئے "سعیا" عموماً لغت عرب میں تیزی سے چلنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

خلیل بن احمد مشہور عربی ادیب سے منقول ہے کہ ابراہیمؑ چل رہے تھے کہ پرندے ان کے پاس آئے (یعنی "سعی" ابراہیمؑ سے متعلق ہے پرندوں سے نہیں)۔

بہر حال ان تمام باتوں کے باوجود کوئی مانع نہیں کہ "سعیا" سریع اور تیز پرواز کے لیے کنایہ ہو۔

"وَاعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ":

جب ابراہیمؑ یہ حیرت انگیز منظر دیکھ چکے تو انہیں وحی ہوئی کہ یہ واقعہ دیکھ کر جان لو کہ خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے اور اس کے تمام کام حکمت کے ماتحت ہیں اور لامتناہی علم و قدرت رکھنے کی وجہ سے اُس کے لیے مُردوں کے منتشر اجزاء کو جاننا اور انہیں جمع کرنا کوئی مشکل نہیں۔

معاد جسمانی

قیامت کے بارے میں قرآن مجید میں آنے والی بہت سی آیات معادِ جسمانی کی توضیح و تشریح کرتی ہیں۔ اصولی طور پر جن لوگوں کا قرآن میں آیاتِ معاد سے رابطہ ہے وہ جانتے ہیں کہ قرآن میں معاد سے مراد معادِ جسمانی کے علاوہ اور کچھ نہیں اور معادِ جسمانی کا یہ مطلب ہے کہ حشر و نشر کے وقت یہ جسم بھی پلٹ آئے گا اور روح بھی۔ اسی لیے تو قرآن میں اسے احیاء الموتیٰ" (مُردوں کو زندہ کرنا) کہا گیا ہے اور اگر قیامت صرف روحانی پہلو کی حامل ہوتی تو زندہ کرنے کا اصلاً کوئی مفہوم ہی نہ تھا۔

زیر بحث آیت بھی صراحت سے اسی بدن کے منتشر اجزاء کا لوٹنا بیان کر رہی ہے جس کا نمونہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

شبۂ آکل و ماکول

مُردوں کے زندہ ہونے کے منظر کا مشاہدہ کرنے کا تقاضا حضرت ابراہیمؑ نے جس وجہ سے کیا تھا اس کی تفصیل بیان ہو چکی ہے اور وہ تھا مردہ جانور کا دریا کے کنارے پڑا ہونے کا واقعہ جسے دریا اور خشکی کے جانور کھا رہے تھے۔ اس سے معلوم



ہوتا ہے کہ حضرت ابرا ہیمؑ کا تقاضا زیادہ تر یہ تھا کہ ایک جانور کا بدن دوسرے جانوروں کے بدن کا جزء بننے کے بعد اپنی اصلی صورت میں کیسے پلٹ سکتا ہے۔ علم عقائد میں اسی بحث کو "شبۂ آکل و ماکول" کہا جاتا ہے۔

اِس کی وضاحت یہ ہے کہ قیامت میں خدا انسان کو اسی مادی جسم کے ساتھ پلٹائے گا۔ اصطلاحی الفاظ میں کہا جاسکتا ہے کہ جسم اور روح دونوں پلٹ آئیں گے۔

اِس صورت میں یہ اشکال سامنے آتا ہے کہ اگر ایک انسان کا بدن خاک ہو جائے اور درختوں کی جڑوں کے ذریعے کسی سبزی یا پھل کا جزء بن جائے پھر کوئی دوسرا انسان اسے کھائے اور اب یہ اس کے بدن کا جزء بن جائے یا مثال کے طور پر قحط سالی میں ایک انسان دوسرے انسان کا گوشت کھالے تو میدانِ حشر میں کھائے ہوئے اجزاء ان دونوں میں سے کس کے بدن کا جزء بنیں گے اگر پہلے بدن کا جزء بنیں تو دوسرا بدن ناقص اور دوسرے کا بنیں تو پہلا ناقص رہ جائے گا۔

اِس کا جواب یہ ہے:

فلاسفہ اور علم عقائد کے علماء نے اس قدیم اعتراض کے مختلف جواب دیے ہیں۔ یہاں سب کے بارے میں گفتگو کرنا ضروری نہیں۔ بعض علماء ایسے بھی ہیں جو قابل اطمینان جواب نہیں دے سکے اس لیے انہیں معادِ جسمانی سے مربوط آیات کی توجیہ و تاویل کرنا پڑی اور انہوں نے انسان کی شخصیت کو روح اور روحانی صفات میں منحصر کر دیا۔ حالانکہ انسانی شخصیت صرف روح پر منحصر نہیں اور نہ ہی معادِ جسمانی سے مربوط آیات ایسی ہیں کہ انکی تاویل کی جاسکے بلکہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں وہ کاملاً صریح آیات ہیں۔

بعض لوگ ایک ایسی معاد کے بھی قائل ہیں جو ظاہراً جسمانی ہے لیکن معادِ روحانی سے اس کا کوئی خاص فرق بھی نہیں۔ لیکن ہم یہاں قرآنی آیات کے حوالے سے ایک ایسا واضح راستہ اختیار کریں گے جو دورِ حاضر کے علوم کی نظر میں بھی صحیح ہے البتہ اس کی وضاحت کے لیے چند پہلوؤں پر غور کی ضرورت ہے۔

۱۔ ہم جانتے ہیں کہ انسانی بدن کے اجزاء بچپن سے لے کر موت تک بارہا بدلتے رہتے ہیں یہاں تک کہ دماغ کے خلیے اگرچہ تعداد میں کم یا زیادہ نہیں ہوتے پھر بھی اجزاء کے لحاظ سے بدل جاتے ہیں کیونکہ ایک طرف سے وہ غذا حاصل کرتے ہیں اور دوسری طرف سے ان کی تحلیل ہوتی رہتی ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ ایک مکمل تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ دس سال سے کم عرصے میں انسانی بدن کے گذشتہ ذرات میں سے کچھ باقی نہیں رہ جاتا لیکن توجہ رہے کہ پہلے ذرات جب موت کی وادی کی طرف روانہ ہوتے ہیں اپنے تمام خواص اور آثار نئے اور تازہ خلیوں کے سپرد کر جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ انسانی جسم کی تمام خصوصیات رنگ، شکل اور قیافہ سے لے کر دیگر جسمانی کیفیات تک زمانہ گزرنے کے باوجود اپنی جگہ پر قائم رہتی ہیں اور اس کی وجہ یہی ہے کہ پرانی صفات نئے خلیوں میں منتقل ہو جاتی ہیں (غور کیجئے گا)۔

اِس بناء پر ہر انسان کے بدن کے آخری اجزاء جو موت کے بعد خاک میں تبدیل ہو جاتے ہیں وہ سب ان صفات کے حامل ہوتے ہیں جو اس نے پوری عمر میں کسب کئے ہیں اور یہ صفات انسانی جسم کی تمام عمر کی سرگذشت کی بولتی ہوئی تاریخ ہوتی ہیں۔



۲۔ یہ صحیح ہے کہ انسانی شخصیت کی بنیاد روح سے پڑتی ہے لیکن توجہ رہنا چاہیئے کہ روح کی پرورش جسم کے ساتھ ہوتی ہے اور جسم کے ساتھ ہی روح تکامل و ارتقاء کی منزل حاصل کرتی ہے اور دونوں ایک دوسرے کے متقابل تاثیر رکھتے ہیں۔ اسی لیے جیسے دو جسم تمام جہات سے ایک دوسرے سے شباہت نہیں رکھتے، دو روحیں بھی تمام پہلوؤں سے ایک دوسرے سے مشابہ نہیں ہوتیں۔

اسی بناء پر کوئی روح اس جسم کے بغیر مکمل اور وسیع مفاہمت اور کارکردگی باقی نہیں رکھ سکتی جس کے ساتھ اس نے پرورش پائی ہو اور تکامل و ارتقاء حاصل کیا ہو لہٰذا ضروری ہے کہ قیامت میں وہی سابق جسم لوٹ آئے تاکہ اس سے وابستہ ہو کر روح عالی تر مرحلے میں نئے سرے سے اپنی فعالیت کا آغاز کرے اور اپنے انجام دیے ہوئے اعمال کے نتائج سے بہرہ مند ہو۔

۳۔ انسانی بدن کا ہر ذرہ اس کے تمام مشخصات جسمی کا حامل ہوتا ہے۔ یعنی اگر واقعاً ہم بدن کے ہر خلیے (CELL) کی پرورش کر کے اسے ایک مکمل انسان بنالیں تو وہ انسان اس شخص کی تمام صفات کا حامل ہو گا جس کا جزء لیا گیا تھا (یہ امر بھی قابلِ غور ہے)۔

پہلے دن انسان ایک خلیے سے زیادہ نہ تھا۔ پہلے نطفے کا خلیہ تھا۔ اسی میں انسان کی تمام صفات موجود تھیں۔ تدریجاً وہ تقسیم ہوا اور دو خلیے بن گئے پھر دو سے چار ہوئے اور رفتہ رفتہ انسانی بدن کے تمام خلیے وجود میں آگئے۔ اسی بناء پر انسانی جسم کے تمام خلیے پہلے خلیے کی طرح ہیں اگر ان کی بھی پہلے خلیے کی طرح پرورش ہو تو ہر ایک ہر لحاظ سے ایک پورا انسان ہو گا جو بعینہٖ پہلے خلیے سے وجود میں آنے والے انسان کی سی صفات کا حامل ہو گا۔

اِن مندرجہ بالا تین مقدمات کو سامنے رکھتے ہوئے اب ہم اصل اعتراض کا جواب پیش کرتے ہیں۔

آیاتِ قرآنی صراحت سے کہتی ہیں کہ آخری ذرات جو موت کے وقت انسانی بدن میں ہوتے ہیں، قیامت کے دن انسان انہی کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔[1]

اِس بناء پر اگر کسی دوسرے انسان نے کسی کا گوشت کھایا ہو تو وہ اجزاء اُس کے بدن سے خارج ہو کر اصلی شخص کے بدن میں پلٹ آئیں گے۔ اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ پھر دوسرے کا بدن تو ضرور ناقص ہو جائے گا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ناقص نہیں ہو گا بلکہ چھوٹا ہو جائے گا کیونکہ اِس کے اجزاء بدن سارے جسم میں پھیلے ہوئے ہیں اب جب وہ اُس سے لے لیے جائیں گے تو اسی نسبت سے دوسرا بدن مجموعی طور پر لاغر اور چھوٹا ہو جائے گا مثلاً ایک انسان کا وزن ساٹھ کلو ہے۔ اس میں سے چالیس کلو دوسرے کے بدن کا حصہ تھا وہ لے لیا گیا تو باقی بیس کلو کا چھوٹا سا بدن رہ جائے گا۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اِس طرح کوئی مشکل تو پیدا نہیں ہو گی۔ جواب یہ ہے کہ یقیناً نہیں ہو گی کیونکہ یہ چھوٹا سا بدن بلا کم و کاست دوسرے شخص کی تمام صفات کا حامل ہے۔ روزِ قیامت ایک چھوٹے بچے کی طرح اس کی پرورش ہو گی اور وہ بڑا ہو کر مکمل انسان کی شکل میں محشور ہو گا حشر و نشر کے موقع پر ایسی پرورش و تکامل میں عقلی اور نقلی طور پر کوئی اشکال نہیں۔

یہ پرورش محشور ہوتے وقت فوری ہو گی یا تدریجی . . یہ ہمارے سامنے واضح نہیں ہے لیکن ہم اتنا جانتے ہیں کہ جو صورت بھی ہو اس سے کوئی اعتراض پیدا نہیں ہو سکتا اور دونوں صورتوں میں مسئلہ حل شدہ ہے۔

---

[1] ان آیات کا مطالعہ کیجئے جن میں فرمایا گیا ہے کہ لوگ اپنی قبروں سے زندہ ہوں گے۔



ایک سوال اب بیان باقی رہ جاتا ہے وہ یہ کہ اگر کسی شخص کا سارا جسم دوسرے کے اجزاء سے تشکیل پایا ہو تو اس صورت میں کیا بنے گا۔

اِس سوال کا جواب بھی واضح ہے کہ اصولی طور پر ایسا ہونا محال ہے کیونکہ مسئلہ آکل و مأکول کی بنیاد یہ ہے کہ ایک بدن پہلے موجود ہو اور وہ دوسرے بدن سے کھائے اور یوں پرورش پائے لہٰذا یہ ممکن ہی نہیں کہ کسی بدن کے تمام اجزا دوسرے بدن سے تشکیل پائیں۔ پہلے ایک بدن فرض کرنا ہوگا جو دوسرے بدن کو کھائے اس طرح دوسرے بدن کا جز رہے گا نہ کہ کل (غور کیجئے گا)۔

ہم نے جو کچھ کہا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ایسے بدن سے معادِ جسمانی کے مسئلے پر کوئی اعتراض پیدا نہیں ہوتا اور جن آیات میں اس مفہوم کی صراحت کی گئی ہے، ان کی کسی توجیہ کی کوئی ضرورت نہیں۔

۲۶۱۔ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِىْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ○

ترجمہ

۲۶۱۔ جو لوگ اپنا مال راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں وہ اس بیج کی مانند ہیں جس کے سات خوشے نکلیں اور ہر خوشے میں سو دانے ہوں اور خدا جس کے لیے چاہے ہے (اور جو لیاقت و اہلیت رکھتا ہو) دوگنا یا کئی گنا کر دیتا ہے اور خدا (قدرت و رحمت کے لحاظ سے) وسیع اور (تمام چیزوں سے) آگاہ و دانا ہے۔

تفسیر

انفاق ـــــ طبقاتی تفاوت کا ایک حل

معاشرے کی ایک مشکل جس سے انسان ہمیشہ دوچار رہتا ہے اور باوجود اتنی صنعتی اور مادی ترقی کے انسان اس میں مبتلا ہے وہ طبقاتی تفاوت ہے۔ ایک طرف فقر، بے چارگی اور تنگدستی ہے اور دوسری طرف مال و دولت کے ڈھیر ہیں۔

کچھ وہ لوگ ہیں کہ انہیں اپنی دولت کا اندازہ نہیں اور کچھ وہ ہیں کہ فقر و فاقہ کی ایسی تکلیف دہ حالت سے دوچار ہیں کہ ضروریاتِ زندگی مثلاً کھانا، رہائش اور سادہ لباس بھی مہیا کرنا ان کے لیے ممکن نہیں۔



واضح ہے کہ جس معاشرے کا ایک حصّہ دولت و ثروت کے پاٹ پر اور دوسرا اہم حصّہ فقر و فاقے کے پاٹ پر گرفتار ہو زندہ نہیں رہ سکتا اور ہرگز کسی حقیقی سعادت تک نہیں پہنچ سکتا۔ ایسا معاشرہ اضطراب، پریشانی، نفرت اور آخر کار دشمنی کا شکار ہو جاتا ہے اور اس میں جنگ ناگزیر ہوتی ہے۔ اگرچہ گذشتہ زمانوں میں بھی انسانی معاشروں میں یہ اختلاف رہا ہے لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے زمانے میں یہ طبقاتی فاصلہ زیادہ ہو گیا ہے اور خطرناک ترین صورت اختیار کر چکا ہے۔

حالت یہ ہے کہ ایک طرف سے حقیقی معنی میں انسانی ہمدردی، تعاون اور مدد کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔ سود جو طبقاتی اختلافات کا بہت بڑا سبب ہے اس کا دروازہ کئی مختلف شکلوں میں کھل چکا ہے۔ کمیونزم جیسے نظاموں کی پیدائش، خون ریزیاں، چھوٹی بڑی اور وحشت ناک جنگیں اس صدی کی پیداوار ہیں۔ یہ جنگیں ابھی تک دنیا کے مختلف حصوں میں جاری ہیں۔ ان سب حالات کی زیادہ تر بنیادیں اقتصادی ہیں اور یہ انسانی معاشروں میں سے اکثریت کی محرومیت کا نتیجہ ہیں۔

دنیا کے اقتصادی ماہرین اور مکاتب اس عظیم اجتماعی مشکل کی چارہ جوئی اور حل کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔ ہر ایک نے ایک راستہ انتخاب کر لیا ہے۔ کمیونزم نے انفرادی ملکیت کو لغو قرار دے دیا ہے اور سرمایہ داری نے بھاری مالیات وصول کر کے عام لوگ کے فائدے کے نام پر ادارے قائم کر دیے ہیں (جو طبقاتی تفاوت کے حل کی بجائے زیادہ تر دکھاوے پر مبنی ہیں)۔ یہ سب اپنے تئیں طبقاتی فاصلوں کو سمیٹنے کے درپے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان میں سے کوئی بھی اس راستے میں مؤثر قدم نہیں اٹھا سکا کیونکہ روحِ مادہ پرستی جو اس وقت دنیا پر حکمران ہے اس کی موجودگی میں اس مسئلے کا حل ممکن نہیں۔

قرآن مجید کی آیات میں غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام کا ایک ہدف اور مقصد یہ ہے کہ معاشرے میں سے غیر عادلانہ اختلافات ختم ہو جائیں جو اجتماعی بے انصافی کی وجہ سے غریب اور امیر طبقے میں پائے جاتے ہیں اور جو لوگ دوسروں کی مدد کے بغیر اپنی ضروریاتِ زندگی پوری نہیں کر سکتے ان کی سطحِ زندگی بلند ہو جائے اور کم از کم لوگوں کے پاس لوازماتِ زندگی تو ضرور ہونا چاہئیں۔

اس مقصد تک پہنچنے کے لیے اسلام کے پاس ایک وسیع پروگرام ہے۔ اسلام نے سودخواری مطلقاً حرام قرار دی ہے زکوٰۃ و خمس وغیرہ جو کہ اسلامی مالیات ہیں ان کی ادائیگی واجب قرار دی ہے۔ انفاق، خرچ کرنے، وقف کرنے، قرض حسنہ دینے اور مختلف قسم کی مالی امداد دینے کا شوق پیدا کرنا بھی اسی پروگرام کا ایک حصّہ ہے اور ان سب سے زیادہ روحِ ایمانی پیدا کرنا اور انسانی بھائی چارے کو زندہ کرنا اسلامی پروگرام کی عظمت ہے۔

" مثل الّذین ینفقون اموالھم فی سبیل اللہ کمثل حبّۃ ":

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس آیت میں انفاق اور خرچ کرنے سے مراد جہاد میں خرچ کرنا ہے۔ اس لیے کہ اس سے قبل آیات میں جہاد کی گفتگو آئی ہے۔ لیکن واضح ہے کہ یہ مناسبت تخصیص کا سبب نہیں بنتی کیونکہ " سبیل اللہ " مطلقاً آیا ہے۔ جس میں ہر نیک مصرف شامل ہے۔ علاوہ ازیں بعد کی آیات گواہی دیتی ہیں کہ ان تمام آیات میں جہاد کے علاوہ دوسری بحث ہو رہی ہے اور " انفاق " اور خرچ کرنے کی بحث کا مستقل طور پر پیچھا کیا گیا ہے۔ تفسیر مجمع البیان کے مطابق روایات میں بھی آیت کے عمومی مفہوم کی طرف اشارہ ہوا ہے۔



قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ اس آیت میں راہِ خدا میں خرچ کرنے والے اشخاص کو اس پُر برکت دانے سے تشبیہ دی گئی ہے جسے مستعد اور قابل زمین میں ڈالا جائے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ ان اشخاص کو دانے سے تشبیہ نہ دی جاتی بلکہ ان کے "انفاق" اور خرچ کرنے کو دانے سے تشبیہ دی جاتی یا خود انہیں بیج ڈالنے والے کسان سے تشبیہ دی جاتی۔ اسی لیے بعض مفسرین نے کہا ہے کہ آیت میں کوئی لفظ حذف ہو گیا ہے یا لفظ "صدقات" "الذین" سے پہلے یا لفظ "باذر" "حبة" سے قبل فرض کرنا چاہیئے لیکن آیت میں ایسی کوئی دلیل اور قرینہ نہیں کہ حذف یا فرض کرنے کا معاملہ درپیش ہو۔

انفاق اور خرچ کرنے والے افراد کو پُر برکت دانوں سے تشبیہ بڑی جاذب نظر ہے اور یہ ایک عمیق اور گہری بات ہے۔

قرآن یہ کہنا چاہتا ہے کہ ہر شخص کا عمل اس کے وجود کا پرتو ہے اور عمل میں جتنی وسعت پیدا ہوتی ہے دراصل اتنی ہی وسعت انسانی وجود میں پیدا ہوتی ہے۔ کیا ایسا نہیں کہ انسانی اعمال انسانی قوتوں کی تبدیل شدہ صورت ہیں۔

زیادہ واضح الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن انسان کے عمل کو اس کے وجود سے جُدا نہیں سمجھتا اور دونوں کو ایک ہی حقیقت کی مختلف شکلیں قرار دیتا ہے۔ اس بناء پر آیت بغیر کسی حذف اور مفروضے کے قابلِ تفسیر ہے اور یہ ایک عقلی حقیقت کی طرف اشارہ ہے یعنی ایسے نیک لوگ ایک پُر ثمر بیج کی طرح ہیں جو ہر طرف اپنی جڑیں اور شاخیں پھیلاتا ہے اور تمام جگہیں اس کے پَر و بال کے سائے میں آجاتی ہیں۔

"انبتت سبع سنابل فی کل سنبلة مائة حبة"

اس جملے میں قرآن اس پُر برکت دانے کی توصیف یوں کرتا ہے: اس سے سات سنبل اور خوشے اگتے ہیں، ان میں سے ہر خوشے میں سو دانے ہیں۔ یوں وہ اپنی اصل سے سات سو گنا ہو جاتے ہیں۔

کیا یہ ایک فرضی تشبیہ ہے

کیا ایسا کوئی دانا نہیں ہے جس سے سات سو دانے نکلیں یا پھر اس سے مراد "ارزن"[1] کے دانوں جیسے دانے ہیں جن میں ایسی تعداد دیکھی جا سکتی ہے چونکہ کہتے ہیں کہ گندم وغیرہ میں یہ تعداد نظر نہیں آتی۔

لیکن یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ چند سال پیشتر ایک مرتبہ کثرت سے بارشیں ہوئیں تو اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ بوشہر[2] کے گرد و نواح کے بعض کھیتوں میں گندم کے تنے بہت بلند اور پُر خوشہ تھے اور ان میں سے بعض اوقات ایک ہی تنے میں گندم کے چار ہزار تک دانے موجود تھے۔ یہ خود ایک دلیل ہے کہ قرآن کی تشبیہ واقعاً ایک مکمل تشبیہ ہے۔

"واللہ یضاعف لمن یشاء واللہ واسع علیم":

"یضاعف" کا مادہ ہے "ضعف" (بروزن "شعر")۔ یہ دوگنا یا چند گنا کے معنی میں ہے۔ اس لیے اس جملے کا مفہوم یہ ہو گا کہ خدا جس کے لیے چاہے اس برکت کو زیادہ کر دے اور دوگنا یا کئی گنا کر دے۔

مندرجہ بالا تحریر کو نظر میں رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ کچھ دانے ایسے بھی ہیں جو سات سو سے کئی گنا زیادہ ثمر دیتے ہیں۔

اس بناء پر یہ تشبیہ ایک حقیقت کی حیثیت رکھتی ہے۔

---

[1] باریک دانوں والا ایک غلہ (مترجم) [2] ایران کا ایک شہر (مترجم)



آیت کے آخری حصے میں پروردگار کی وسعتِ قدرت اور تمام چیزوں سے اس کی آگاہی کی نشاندہی کی گئی ہے تاکہ خرچ کرنے والے جان لیں کہ وہ ان کے عمل اور نیتوں سے بھی آگاہ ہے اور ہر قسم کی برکت عطا کرنے پر قدرت بھی رکھتا ہے۔

۲۶۲۔ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○

ترجمہ

۲۶۲۔ جو لوگ اپنا مال راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں اور جو کچھ انہوں نے خرچ کیا ہو اس پر کوئی منت اور احسان نہیں جتاتے اور اذیت نہیں پہنچاتے ان کی جزا اُن کے پروردگار کے ہاں محفوظ ہے اور انہیں کوئی خوف ہے نہ وہ غمگین ہوتے ہیں۔

تفسیر

کس انفاق کی قدر و قیمت ہے

اس آیت میں بھی انفاق فی سبیل اللہ کا ذکر بطورِ مطلق آیا ہے اور اس میں ہر وہ نیک کام شامل ہے جو خدا کے لیے انجام پذیر ہو۔

"ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى":

اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ بارگاہِ پروردگار میں خرچ کرنے کی قبولیت تبھی ہے جب اُس میں احسان جتلانے کا عمل نہ ہو اور کوئی ایسی چیز نہ ہو جو ضرورت مندوں کے لیے تکلیف و آزار کا باعث ہو۔ اس بنا پر جو لوگ راہِ خدا میں مال خرچ کرتے ہیں اور بعد میں احسان جتلاتے ہیں یا کوئی ایسا کام کرتے ہیں جو اذیت اور تکلیف کا باعث ہو تو وہ در حقیقت اس ناپسندیدہ عمل سے اپنا اجر اور صلہ بھی کھو بیٹھتے ہیں۔

اس آیت میں جو بات اپنی طرف زیادہ توجہ مبذول کرواتی ہے یہ ہے کہ قرآن واقع میں انسانی زندگی کے سرمائے کو مادی سرمائے میں منحصر نہیں سمجھتا بلکہ روحانی اور اجتماعی سرمائے کو بھی شمار کرتا ہے۔

جو شخص کوئی چیز کسی کو دیتا ہے اور پھر اسے احسان جتلاتا ہے یا تکلیف پہنچا کر دل شکستہ کرتا ہے حقیقت میں اس نے اسے کوئی چیز نہیں دی کیونکہ اگر کچھ سرمایہ اسے دیا ہے تو کچھ لے بھی لیا ہے۔ اکثر تو ایسا ہوتا ہے کہ وہ تحقیر و تذلیل اور



روحانی شکستگی اسے دیے جانے والے مال سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے۔ اس لیے اگر ایسے اشخاص کے لیے کوئی اجر اور ثواب نہ ہو تو یہ بالکل فطری اور عادلانہ معاملہ ہوگا بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایسے افراد بہت سے مواقع پر تو مقروض ہوتے ہیں نہ کہ قرض خواہ کیونکہ انسان کی عزت و آبرو مال و ثروت سے کئی درجے برتر و بالاتر ہے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ احسان جتانے اور اذیت پہنچانے کا ذکر آیت میں لفظ "ثم" کے ساتھ آیا ہے جو عام طور پر دو واقعات کے درمیان فاصلے اور اصطلاح میں "تراخی" کے لیے ہے۔ اس لیے آیت کا معنی یہ ہوگا کہ جو لوگ خرچ کرتے ہیں اور بعد میں منت و احسان جتلاتے ہیں نہ اذیت و تکلیف پہنچاتے ہیں ان کی جزا اور اجر پروردگار کے پاس محفوظ ہے۔

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا مقصد صرف یہ نہیں کہ انفاق ادب و احترام سے اور احسان جتلائے بغیر ہو بلکہ بعد ازاں بھی احسان نہیں جتلایا جانا چاہیے۔ یہ امر اسلام کی انتہائی عمیق نظری اور انسانی خدمات میں خلوص کا پتہ دیتا ہے۔

توجہ رکھنی چاہیئے کہ احسان جتلانا اور اذیت پہنچانا جو انفاق کی عدم قبولیت کا سبب ہیں فقراء اور مساکین سے مخصوص نہیں بلکہ عمومی اور اجتماعی کاموں مثلاً راہ خدا میں جہاد کرنا یا فلاح و بہبود کے کام جن میں مال خرچ کرنے کی ضرورت پڑتی ہے کے بجالانے میں بھی اِس امر کو ملحوظ نظر رکھنا چاہیے۔

"لھم اجرھم عند ربھم"

یہ جملہ خرچ کرنے والوں کو اطمینان دلاتا ہے کہ ان کی جزا اور اجر پروردگار کے پاس محفوظ ہے تاکہ وہ دلی اطمینان سے اس راہ میں بڑھ چڑھ کر قدم اٹھائیں کیونکہ جو چیز خدا کے پاس ہے نہ اُس کے نابود ہونے کا خطرہ ہے نہ اُس کے نقصان کا اندیشہ ہے بلکہ لفظ "رب" کے ساتھ "ھم" کی ضمیر (جس کا معنی ہے ان کا پروردگار) یہ گویا اس طرف اشارہ ہے کہ وہ ان کی پرورش کرتا ہے اور اس میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔

"ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون":

پہلے بھی بیان ہوچکا ہے کہ "خوف" آئندہ کے امور کے بارے میں ہوتا ہے اور حزن و اندوہ گذشتہ امور کے بارے میں۔ خرچ کرنے والے جانتے ہیں کہ ان کا اجر اور جزا بارگاہِ خدا میں محفوظ ہے اس لیے نہ وہ آئندہ اور روزِ قیامت کا خوف رکھتے ہیں اور نہ راہِ خدا میں بخش دیے جانے والے کے بارے میں کوئی ملال کرتے ہیں۔

۲۶۳۔ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ؕ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ○

ترجمہ

۲۶۳۔ (ضرورت مندوں کے سامنے) پسندیدہ گفتگو اور عفو (اور ان سے تلخ باتیں کہنے سے بچنا) اس بخشش و عطا سے بہتر ہے جس کے بعد اذیت اور تکلیف پہنچائی جائے اور خدا بے نیاز اور بردبار ہے۔



تفسیر

یہ آیت درحقیقت گذشتہ بحث کی تکمیل کرتی ہے ۔ جو لوگ حاجت مندوں سے اچھی بات اور خوش کن گفتگو کرتے ہیں اور سخت لب ولہجے میں ان کے اصرار کے باوجود عفو و درگزر سے کام لیتے ہیں وہ ان سے بہتر ہیں جو کچھ دینے کے بعد لوگوں کو اذیت اور تکلیف پہنچاتے ہیں ۔

یہ آیت اشخاص کی اجتماعی قدر و قیمت اور وقعت وحیثیت کے بارے میں اسلام کی منطق واضح کرتی ہے ۔ جو لوگ انسانیت کے سرمائے کی حفاظت کی کوشش کرتے ہیں ، حاجت مندوں سے اچھی گفتگو کرتے ہیں، کبھی ان کی ضروری راہنمائی بھی کرتے ہیں اور ان کے راز کبھی فاش نہیں کرتے وہ اُن کے مقابلے میں اسلام کی نظر میں برتر و بالاتر ہیں جو خود پرست ہیں، کوتاہ نظر ہیں، تھوڑی سی مدد کرکے عزت دار اور آبرومند لوگوں کو زبان کے ہزار چرکے لگاتے ہیں اور اُن کی شخصیت مجروح کرتے ہیں ۔ جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں ایسے افراد درحقیقت جتنا فائدہ پہنچاتے ہیں اس سے زیادہ نقصان دہ اور مُضر ہیں اور اگر کچھ سرمایہ دیتے ہیں تو بہت بڑا سرمایہ برباد کر دیتے ہیں ۔

جو کچھ اُوپر کہا جا چکا ہے اس سے واضح ہوتا ہے "قول معروف" ایک وسیع مفہوم کا حامل ہے ۔ ہر قسم کی اچھی بات، دلجوئی اور راہنمائی اِس کے مفہوم میں شامل ہے ۔

" مغفرة " کا مفہوم ہے ۔ حاجتمندوں کی تلخی کے جواب میں عفو و درگزر کرنا کیونکہ مصائب و آلام کے ہجوم کی وجہ سے کبھی ان کا پیمانۂ صبر لبریز بھی ہو جاتا ہے اور بعض اوقات وہ نہ چاہتے ہوئے بھی سخت باتیں کر جاتے ہیں ۔

یہ لوگ دراصل اپنا حق غصب کرنے والے ظالم معاشرے سے اس طرح انتقام لینا چاہتے ہیں اور معاشرے اور صاحبانِ استطاعت ان کی محرومیت کی جو کم از کم تلافی کر سکتے ہیں ۔ یہ ہے کہ ان کی باتیں تحمل سے سنیں کیونکہ یہ اُن کے اندر لگی ہوئی آگ کی چنگاریاں ہیں ۔ انہیں نرمی اور محبت سے خاموش کرنا چاہیے ۔ واضح ہے کہ ان کی تلخی کو برداشت کرنا ، اُن کی سخت نکتہ چینی پر درگزر کرنا اور ان کے دُکھ درد کی گرہوں کو ڈھیلا کرنا ایک اسلامی حکم ہے اور یہ ہدایت اسلامی حکم کی اہمیت کو مزید روشن کر دیتی ہے ۔

بعض نے یہاں " مغفرة " کو اس کے اصلی معنیٰ میں لیا ہے ۔ اس کا اصل معنی ہے "پردہ پوشی کرنا" اس مفہوم میں اِس لفظ کو حاجت مندوں کے اسرار کی پردہ پوشی کی طرف اشارہ سمجھا گیا ہے لیکن جو کچھ ہم نے کہا ہے یہ تفسیر اس سے کوئی تضاد یا اختلاف نہیں رکھتی کیونکہ "مغفرة" اپنے وسیع مفہوم میں عفو و درگزر بھی ہے اور حاجتمندوں کے راز دل کی پردہ پوشی بھی ہے ۔

تفسیر نور الثقلین میں پیغمبر اسلامؐ کی ایک حدیث یوں منقول ہے ۔

" اذا سئل السائل فلا تقطعوا علیه مسألته حتی یفرغ منها ثم ردوا علیه بوقار ولین اما یبذل یسیر او ردجمیل فانه قد یأتکم من لیس بانس



ولا جان ینظرونکم کیف صنیعکم فیما خولکم اللّٰہ تعالٰی"۔

اِس حدیث میں پیغمبر اکرمؐ نے خرچ کے آداب کے ایک پہلو کو واضح کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"جب کوئی حاجت مند تم سے کوئی چیز مانگے تو جب تک وہ اپنا تمام مقصد بیان نہ کرے اس کی بات قطع نہ کرو۔ اس کے بعد اُسے وقار و ادب اور نرمی سے جواب دو۔ جو چیز تمہارے بس میں ہے اسے دے دو یا پھر شائستہ اور خوبصورت طریقے سے اُسے واپس کر دو۔ کیونکہ ممکن ہے سوال کرنے والا کوئی فرشتہ ہو جو تمہاری آزمائش پر مامور ہو تاکہ وہ دیکھے کہ خدا نے جو نعمتیں تمہیں دی ہیں ان کے پیش نظر تم عمل کس طرح کرتے ہو۔"[1]

"واللّٰہ غنی حلیم"

چھوٹے چھوٹے جملے جو عموماً آیات کے آخر میں آتے ہیں اور جن میں خدا کی بعض صفات بیان کی گئی ہوتی ہیں آیت کے مضمون سے یقیناً مربوط ہوتے ہیں۔ اس نکتے کی طرف توجہ رکھتے ہوئے "واللّٰہ غنی حلیم" (یعنی خدا بے نیاز اور بردبار ہے) کے جملے سے مراد گویا یہ ہے کہ انسان چونکہ طبعی طور پر سرکش ہے اور کسی مقام و مرتبہ اور ثروت و دولت تک پہنچ جانے کے بعد اپنے آپ کو بے نیاز سمجھنے لگتا ہے اور یہ حالت بعض اوقات اس کی طرف سے فقراء اور مساکین سے گرمی اور بد زبانی کا باعث بن جاتی ہے۔ لہٰذا فرمایا گیا ہے کہ غنی بالذات صرف خدا ہے۔ حقیقت میں وہی ہے جو تمام چیزوں سے بے نیاز ہے اور انسان کی بے نیازی سراب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی لہٰذا مقام اور دولت کی وجہ سے اسے فقراء سے بے اعتنائی نہیں برتنا چاہیے۔ علاوہ ازیں خدا لوگوں کی ناشکری کے مقابلے میں بردبار ہے لہٰذا صاحب ایمان افراد کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ مذکورہ جملہ میں اس طرف اشارہ ہو کہ خدا تمہارے انفاق اور خرچ کرنے سے بے نیاز ہے اور جو کچھ تم انجام دیتے ہو تمہارے ہی فائدے میں ہے۔ اس لیے تمہارا کسی پر احسان نہیں ہے۔ علاوہ ازیں وہ تمہاری سخت روی اور درشتی کے مقابلے میں بردبار ہے اور سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا تاکہ تم بیدار ہو کر اپنی اصلاح کر لو۔

۲۶۴۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَیْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا یَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَیْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ

[1] نور الثقلین ج ۱ ص ۲۸۳۔



وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْکٰفِرِیْنَ ○

۲۶۵۔ وَمَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ
وَتَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِھِمْ کَمَثَلِ جَنَّۃٍ بِرَبْوَۃٍ اَصَابَھَا
وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُکُلَھَا ضِعْفَیْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ یُصِبْھَا وَابِلٌ
فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ○

ترجمہ

۲۶۴۔ اے ایمان والو! اپنی بخششوں کو احسان جتانے اور آزار پہنچانے سے اُس شخص کی طرح باطل نہ کرو جو دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے۔ خدا اور روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتا اور (اس کا کام) پتھر کے ٹکڑے کی طرح ہے جس پر مٹی (کی باریک تہ) ہو (اور اس میں بیج ڈالے جائیں) اور خوب بارش اس پر برسے (اور ساری مٹی اور بیج بہالے جائے) اور اُسے (مٹی اور بیج سے) خالی کر دے۔ ایسے لوگ جو کام بجالاتے ہیں اس سے کوئی چیز حاصل نہیں کر سکتے اور خدا کافر قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔

۲۶۵۔ اور ان لوگوں کا (کام) جو اپنا مال خدا کی خوشنودی اور اپنی روح (میں ملکات انسانی) باقی رکھنے کے لیے خرچ کرتے ہیں اس باغ کی طرح ہے جو بلند جگہ پر ہو، اس پر تیز بارش برسے (اور وہ کھلی ہوا اور نور آفتاب سے خوب بہرہ ور ہو) اور اپنا پھل دوگنا دے اور اگر اس پر سخت بارش نہ برسے اور اس پر پھوار اور شبنم پڑے (لہٰذا وہ ہمیشہ سرسبز، شاداب اور تروتازہ رہے) اور تم جو کچھ انجام دیتے ہو خدا اس سے بینا ہے۔

تفسیر

راہِ خدا میں خرچ کرنے کے اسباب و نتائج

اِن دو آیات میں پہلے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ اہل ایمان کو نہیں چاہیے کہ وہ راہ خدا میں خرچ کئے گئے سرمائے کو احسان جتلاکر اور آزار پہنچا کر ضائع کر دیں۔ اس کے لیے دو عمدہ مثالوں کے ذریعے دونوں طرح کے انفاق کی حیثیت کو واضح کیا گیا ہے۔ ایک وہ خرچ ہے جس میں احسان جتلانا، آزار پہنچانا، ریاکاری اور خودنمائی کی آمیزش ہے اور دوسرا وہ کہ جس کا سرچشمہ خلوص اور انسانی ہمدردی کے جذبات ہیں۔

پہلی مثال سخت پتھر کی ہے جس پر مٹی کی باریک سی تہ جمی ہو، اس میں بیج ڈال دیا جائے، اس پر کھلی ہوا چلے



اور سورج چمکے ، پھر اس پر موٹے موٹے قطرات کی بارش خوب برسے ۔ مسلم ہے کہ ایسی بارش مٹی کی پتلی سی تہ کو دھو ڈالے گی اور بیج کو بہالے جائے گی سخت پتھر جس میں پانی اور بیج نہیں ڈالا جا سکتا اس پر سبزہ کیسے اُگ سکتا ہے ۔ اس کی سختی ظاہر ہو جائے گی ۔ یہ سب اس لیے نہیں ہوا کہ سورج کی حدت ، کھلی ہوا اور مذکورہ بارش کوئی بُرا اثر رکھتی ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ بیج کے لیے جو جگہ منتخب کی گئی تھی وہ مناسب نہیں تھی ۔ ظاہری طور پر صحیح تھی اندرونی طور پر ناقابل نفوذ تھی اس پر صرف مٹی کی پتلی سی تہ جمی ہوئی تھی جبکہ سبزے اور درخت کی جڑوں کے لیے گہری مٹی درکار ہے تاکہ پودوں کو اس ذریعے سے غذا بھی پہنچتی رہے ۔

قرآن نے ریاکاری ، احسان جتلانے اور آزار پہنچانے کے لیے کیے گئے خرچ کو جس کا سرچشمہ سخت اور قساوت رکھنے والے دل ہیں ، مٹی کی اس نازک تہ سے تشبیہ دی ہے جس نے سخت پتھر کے بالائی حصے کو چھپا رکھا ہوا اور جس سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا جا سکتا ہو بلکہ وہ باغبان اور کسان کی محنت ضائع کر دے ۔ لہ

دوسری مثال : ایک سر سبز و شاداب باغ کی ہے جو بلند اور زرخیز زمین میں ہے اس پر آزاد ہوا چلے اور وافر دھوپ پڑتی ہے ۔ موسلا دھار اور نفع بخش بارش اس پر برسے اور جب کہ موسلا دھار بارش نہ برسے تب بھی شبنم اور پھوار کے ذریعے اس کی زمین ایسی زرخیز ہے کہ شبنم اور پھوار بھی اس کے درختوں کے ثمر آور ہونے کے لیے کافی ہے ۔ چونکہ وہ بلندی پر ہے اس لیے کھلی ہوا اور دھوپ سے خوب بہرہ مند ہوتا ہے ۔ اس کا خوبصورت منظر ہر دیکھنے والے کی آنکھ کے لیے پُر کشش ہے یہ سیلاب کے خطرے سے بھی محفوظ ہے ۔

جو لوگ اپنا مال خدا کی خوشنودی اور اپنے قلب و روح میں ایمان و یقین کو استوار کرنے کے لیے خرچ کرتے ہیں وہ اس باغ کی طرح ہیں جو پُر برکت ، مفید اور بیش بہا پھل دینے والا ہو ۔

چند اہم نکات

(۱) **بعض اعمال نیک اعمال کے نتائج کو ختم کر دیتے ہیں :** ۔ " لا تبطلوا صدقتکم بالمن والاذی " (یعنی اپنے صدقات کو احسان جتلا کر اور ایذا رسانی سے باطل نہ کرو ۔ اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ ممکن ہے کہ کچھ اعمال نیک اعمال کے نتائج کو ختم کر دیں ۔ یہ وہی مسئلہ احباط ہے جس کی تفصیل اسی سورہ کی آیت ۲۱۷ کے ذیل میں گزر چکی ہے ۔

(۲) **ریاکاری کی مشابہت :** ۔ وہ پتھر جس پر مٹی کی باریک سی تہ ہو اس کی ریاکارانہ عمل سے مشابہت واضح ہے ۔

لہ " صفوان " جمع ہے ۔ اس کا مفرد " صفوانہ " ہے اس کا معنی ہے صاف و شفاف پتھر ۔ " وابل " سخت اور موٹے قطرات والی بارش کو کہتے ہیں ۔ " صلد " کا معنی بھی صاف پتھر ہے ۔ ضعفین " ضعف " کا تثنیہ ہے اس کا معنی ہے دوگنا اور تثنیہ ہونے کی وجہ سے اس کا معنی چوگنا نہیں ہو جاتا مثلاً جیسے زوجین ہے جو کہ دو طرف کی نشاندہی کرتا ہے (غور کیجئے گا) ۔



ریاکار لوگ اپنے سخت اور بے ثمر باطن کو خیر خواہی اور نیکی کے چہرے سے چھپا لیتے ہیں اور ایسے اعمال بجالاتے ہیں جن کی جڑیں ان کے وجود میں استوار نہیں ہیں لیکن زندگی کے واقعات و حوادث بہت جلد اس پردے کو ہٹا دیتے ہیں اور ان کے باطن کو آشکار کر دیتے ہیں۔

(۳) انفاق کے اسباب: "ابتغاء مرضات الله و تثبیتا من انفسهم" (یعنی جو اپنا مال خوشنودیٔ خدا اور اپنے آپ میں انسانی فضائل باقی رکھنے کے لیے خرچ کرتے ہیں) سے ظاہر ہوتا ہے کہ صحیح اور خدا کیلیے خرچ کرنے کے دو اسباب ہیں۔

(۱) خوشنودیٔ خدا

(۲) روح ایمان کی تقویت اور اطمینان قلب

اس سے واضح ہوتا ہے کہ راہ خدا میں خرچ کرنے والے دراصل وہ لوگ ہیں جو صرف خوشنودیٔ خدا اور فضائل انسانی کی پرورش اور اپنی روح میں ان صفات کے ثبات و استحکام کے لیے خرچ کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ اس اضطراب اور دکھ کو دور کرنے کے لیے خرچ کرتے ہیں جو محروم لوگوں کو دیکھ کر احساس ذمہ داری اور مسئولیت کے پیش نظر ان کے وجدان میں پیدا ہو جاتا ہے (اس بناء پر آیت میں لفظ "من" "فی" کے معنی میں ہوگا)۔

(۴) خدا بصیر ہے: دوسری آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے "والله بما تعملون بصیر" (یعنی تم جو کچھ انجام دیتے ہو خدا اُسے دیکھنے والا ہے) یہ جملہ نیک اعمال انجام دینے والوں کے لیے ہے کہ جب بھی وہ کوئی عمل خیر انجام دیں تو توجہ رکھیں کہ نیت یا عمل میں معمولی سی آلودگی بھی پیدا نہ ہو کیونکہ خدا تعالیٰ ان کے اعمال کی نگرانی کرتا ہے

۲۶۶۔ اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۝

ترجمہ

۲۶۶۔ کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ اس کا کھجوروں اور انگور کا باغ ہو جس کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہوں، اس باغ میں اُس کے لیے ہر طرح کا پھل موجود ہو لیکن وہ بڑھاپے کو پہنچ چکا ہو اور اُس کی اولاد (چھوٹی اور) کمزور ہو (ایسے میں) آگ کا زبردست بگولہ اُٹھے اور جلا ڈالے (جو لوگ خرچ



کرکے ریاکاری، احسان جتلانے اور ایذا رسانی کے ذریعے اس عمل کو باطل کر دیتے ہیں ان کی حالت ایسی ہی ہے) خدا اس طرح اپنی آیات آشکار کرتا ہے کہ شاید تم غور و فکر کرو (اور سوچ سمجھ کر راہِ حق کو پالو)۔

تفسیر

ایک اور مثال

"ایود احدکم ان تکون لہٗ جنۃ ...."

انسان کو روزِ قیامت اعمالِ صالح کی سخت ضرورت ہوگی نیز ریاکاری، احسان جتلانا اور کسی کو تکلیف پہنچانا انفاق اور عملِ صالح کو ضائع کر دیتا ہے یہ مطالب واضح کرنے کے لیے زیرِ نظر آیت میں ایک اور عمدہ مثال بیان کی گئی ہے۔ یہ ایسے شخص کی مثال ہے جس کا ایک سرسبز و شاداب باغ ہو اس میں کھجوروں اور انگور جیسے طرح طرح کے پھل دار درخت ہوں، درختوں کے نیچے پانی بہتا ہو اور آبیاری کی احتیاج نہ ہو۔ وہ شخص بوڑھا ہو چکا ہو۔ اس کی اولاد ابھی کمزور و ناتواں ہو اور ان کی زندگی کا دار و مدار اسی باغ پر ہو۔ اب اگر یہ باغ اجڑ جائے تو وہ اور اس کی اولاد اسے آباد نہیں کر سکتے۔ اگر اچانک آتش بار آندھی کے گولے اس باغ پر برسنے لگیں اور اسے جلا کر خاکستر کر دیں تو اس وقت وہ بوڑھا شخص جو جوانی کی توانائیاں کھو چکا ہے اور کسی اور ذریعے سے اپنے اخراجات بھی پورے نہیں کر سکتا تو اس کی حالت کیا ہوگی اور کیسی حسرت و غم کی کیفیت سے دوچار ہوگا۔ جو لوگ نیک عمل بجا لاتے ہیں اور پھر ریاکاری، احسان دھرنے اور اذیت دینے سے اسے ضائع کر دیتے ہیں اسی شخص کی طرح ہیں جس نے محنت سے باغ تیار کیا ہو اور جب پھل حاصل کرنے کی ضرورت ہو تو اس کے کام کا نتیجہ بالکل برباد ہو جائے اور اس کے پاس حسرت و اندوہ کے علاوہ کوئی چیز باقی نہ رہے۔

"کذٰلک یبیّن اللہ لکم الاٰیٰت لعلّکم تتفکّرون"

تمام بدبختیوں کا سرچشمہ یہ ہے کہ غور و فکر سے کام نہ لیا جائے اس ضمن میں خصوصاً ایسے کام ہیں جو بے وقوف لوگ کرتے ہیں مثلاً احسان جتلانا، جن کا فائدہ بہت کم اور نقصان بڑی تیزی سے اور بہت زیادہ ہوتا ہے اس لیے آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ لوگوں کو غور و فکر کرنے کی دعوت دیتا ہے اور فرماتا ہے: اس طرح خدا تمہارے لیے اپنی آیات کی وضاحت کرتا ہے کہ شاید تم غور و فکر کرو۔

چند اہم نکات

"واصابہ الکبر ولہ ذریۃ ضعفاء" یعنی باغ کا مالک بوڑھا ہو چکا ہے اور اس کے بچے ابھی کمزور و ناتواں ہیں۔ اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ راہِ خدا میں بخشش کرنا اور ضرورت مندوں کی مدد کرنا ثمرے کے باغ کی طرح ہے جس کے پھلوں سے انسان خود بھی بہرہ مند ہوتا ہے اور اس کی اولاد بھی جب کہ ریاکاری، احسان دھرنا اور ایذا رسانی خود انسان کی اپنی محرومیت کا سبب بنتی ہیں اور اس کی آئندہ نسلیں بھی اس سے محرومیت کا شکار ہوتی ہیں حالانکہ انہیں تو اس کے نیک اعمال اور ثمرات کا فائدہ پہنچنا چاہیے تھا۔



یہ بات اس امر کی بھی دلیل ہے کہ آئندہ نسلیں گذشتہ نسلوں کے اعمال نیک کے نتائج میں حصہ دار ہوتی ہیں۔ عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے کیونکہ آباؤ اجداد اپنے نیک کاموں کی وجہ سے لوگوں کے افکار میں جو ایک محبوبیت اور اعتماد پیدا کر لیتے ہیں وہ ان کی اولاد کے لئے بھی ایک بہت بڑا سرمایہ ہوتا ہے۔

"اعصار فیه نار": یعنی ۔ ہوا کا بگولہ جس میں آگ بھی ہو۔ ممکن ہے یہ ان بگولوں کی طرف اشارہ ہو جو باد سموم جلانے والی اور خشک کر دینے والی ہوا ہوتی ہے۔ یا پھر اس سے وہ بگولہ مراد ہے جو آگ کے الاؤ سے گزرے اور عام طور پر بگولے کے راستے میں جو چیز آتی ہے وہ اسے اپنے ساتھ لے اڑتا ہے تو ہو سکتا ہے وہ آگ کو ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ جا پھینکے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ صاعقہ کے ساتھ پڑنے والے بگولے کی طرف اشارہ ہو جو تمام چیزوں کو خاکستر کر دے۔ بہر حال یہ فوری اور مکمل نابودی کی طرف اشارہ ہے۔[1]

۲۶۷۔ يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۪ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ حَمِيْدٌ ○

ترجمہ

۲۶۷۔ اے ایمان والو! پاکیزہ اموال (جو تجارت کے ذریعے) تمہارے ہاتھ آئے ہیں اور جو ہم نے تمہارے لیے زمین (کے خزانوں اور معادن) سے نکالے ہیں خرچ کرو حالانکہ یہ اموال (قبول کرتے وقت) تم چشم پوشی کرتے ہوئے اور ناپسندیدگی کے علاوہ قبول کرنے کو تیار نہیں ہو اور جان لو کہ خدا بڑا بے نیاز اور لائق تعریف ہے۔

شانِ نزول

امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ یہ ایک گروہ کے بارے میں نازل ہوئی جس نے زمانہ جاہلیت میں سُود کے طور پر دولت جمع کر رکھی تھی اور اس میں سے راہِ خدا میں خرچ کرتا تھا۔ خدا تعالیٰ نے انہیں اس کام سے روکا اور انہیں حکم دیا کہ وہ پاک اور حلال مال سے خرچ کریں۔

---

[1] لغت میں اعصار کا معنی وہ بگولہ ہے جو ہوا کے چلتے وقت دو مختلف سمتوں سے بنتا ہے اور عمودی شکل میں ہوتا ہے۔ اس کا ایک سرا زمین سے لپٹا ہوتا ہے اور دوسرا سرا فضا میں ہوتا ہے۔



تفسیر مجمع البیان میں یہ حدیث نقل کرنے کے بعد حضرت علی علیہ السّلام سے ایک روایت بیان کی گئی ہے کہ آپؑ نے فرمایا :

یہ آیت ایسے لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو خرچ کرتے وقت خشک، کم مادہ اور غیر مرغوب کھجوریں، اچھی کھجوروں میں ملا کر دیتے تھے۔ اس میں انہیں حکم ہوا کہ اس کام سے اجتناب کریں۔

دونوں شان نزول ایک دوسرے سے کوئی اختلاف نہیں رکھتیں۔ ممکن ہے یہ آیت دونوں گروہوں کے بارے میں نازل ہوئی ہو یعنی ایک معنوی پاکیزگی کی طرف اور دوسری ظاہری اور عام مرغوبیت کے بارے میں ہو۔

لیکن خیال رہے کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۷۵ کے مطابق جن لوگوں نے زمانہ جاہلیت میں سُودی ذرائع سے کچھ مال جمع کر لیا تھا اور اس آیت کے نزول کے بعد انہوں نے سُود خوری کو جاری رکھنے سے اجتناب کیا مگر گذشتہ مال ان پر حرام نہیں ہوا تھا یعنی یہ قانون گذشتہ اموال کے لیے نہ تھا اور حقیقت میں ان اموال سے مشابہ تھا جو ناپسندیدہ طریقے سے حاصل کئے گئے ہوں۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں انفاق کے ثمرات و فوائد اور خرچ کرنے والوں کی صفات بیان کی گئی ہیں نیز وہ اعمال بھی بتائے گئے ہیں جو انسانی اور خدا پسند کاموں کو آلودہ کر سکتے ہیں اور ان کی جزاء اور ثواب ختم کر سکتے ہیں۔ اب اس آیت میں یہ تشریح کی گئی ہے کہ کیسے مال کو خرچ کیا جانا چاہیے۔ آیت کے پہلے حصے میں خدا ایماندار لوگوں کو حکم دیتا ہے کہ اپنے اموال میں سے "طیبات" کو خرچ کرو۔

ہم جانتے ہیں کہ "طیب" کا لغوی معنی "پاکیزہ" اور "طیبات" اس کی جمع ہے۔ یہ لفظ جیسے ظاہری اور مادی پاکیزگی کے لیے بولا جاتا ہے اسی طرح معنوی اور باطنی پاکیزگی پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ یعنی وہ مال جو عمدہ، مفید اور قیمتی بھی ہے اور ساتھ ساتھ ہر قسم کے شبہ اور آلودگی سے بھی مُبّرا ہے

دو شانِ نزول جن کا ذکر کیا گیا ہے آیت کے معنی کی عمومیت کی بھی تائید کرتی ہیں۔

"لستم باٰخذیه الا ان تغمضوا فیه" (یعنی۔ تم تیار نہیں ہو کہ غیر طیب مال قبول کرو۔ مگر چشم پوشی اور کراہت کے ساتھ) یہ جملہ اس بات کی دلیل ہے کہ مراد صرف ظاہری پاکیزگی ہو کیونکہ اہل ایمان نہ اس کے لیے تیار ہوتے ہیں کہ جو مال ظاہری طور پر آلودہ اور بے قیمت ہو اسے قبول کر لیں اور نہ شبہ والے، ناپسندیدہ اور مکروہ مال کو قبول کرتے ہیں مگر چشم پوشی اور کراہت کے ساتھ۔

"و مما اخرجنا لکم من الارض"

"ما کسبتم" (جو کچھ تم نے کسب کیا ہے) ـــــ یہ لفظ تجارتی اموال کی طرف اشارہ ہے اور ("مما اخرجنا......") زراعتی، معدنی اور زیر زمین سرچشموں کی دولت کے بارے میں ہے۔ اس بناء پر تمام طرح کے اموال



کا ذکر آگیا ہے کیونکہ تمام انسانی اموال کی بنیاد زمین اور اس کے گوناگوں منابع ہیں۔ یہاں تک کہ صنعتیں، تجارتیں، جانوروں کا کاروبار اور ایسی دیگر چیزوں کی بنیاد یہی ہے۔

ضمناً اس جملے کے مطابق تمام منابع انسان کے اختیار میں دے دیے گئے ہیں۔ اس لیے راہ خدا میں کسی اچھے مال کو خرچ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھنا چاہیے۔

"ولا تیمموا الخبیث منه تنفقون ولستم بآخذیه الا ان تغمضوا فیه":

بعض لوگوں کی عادت ہے کہ ہمیشہ وہ مال جو بے قیمت ہو اور تقریباً ناقابل استعمال ہو اور خود ان کے لیے کام کا نہ ہو اسے خرچ کرتے ہیں۔ ایسے خرچ نہ انسان کی اپنی تربیت کا باعث بنتے ہیں اور نہ انسانی روح کی پرورش کا ذریعہ بنتے ہیں اور ضرورت مندوں کے لیے بھی یہ کوئی خاص فائدہ مند نہیں ہوتے بلکہ ایسے اُن کی ایک طرح سے تحقیر و توہین ہوتی ہے لہٰذا یہ جملہ لوگوں کو صراحت سے اِس کام سے منع کر رہا ہے۔ فرمایا گیا ہے: ایسے مال سے کس طرح خرچ کرتے ہو جب کہ تم خود اُسے کراہت و مجبوری کے سوا قبول کرنے کو تیار نہیں ہو۔ تو کیا تمہارے مسلمان بھائی بلکہ اس سے بڑھ کر وہ خدا جس کی راہ میں خرچ کر رہے ہو تمہاری نگاہ میں خود تم سے بھی کمتر ہیں۔

آیت درحقیقت ایک باریک نکتے کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور وہ یہ کہ جو اخراجات اللہ کی راہ میں ہوتے ہیں ان میں ایک طرف تو حاجتمند، فقراء اور مساکین ہیں اور دوسری طرف خدا ہے جس کے لیے اخراجات کیے جا رہے ہیں، اس حالت میں اگر پست اور بے قیمت مال کا انتخاب کیا گیا تو ایک طرف پروردگار کے مقام بلند کی توہین شمار ہوگی کہ اُسے طیب و پاکیزہ اجناس کے لائق نہ سمجھا گیا اور دوسری طرف حاجت مندوں کی تحقیر ہے کیونکہ ممکن ہے تہی دست ہونے کے باوجود وہ ایمان اور انسانیت میں بلند مقام رکھتے ہوں اور وہ ایسے انفاق سے روحانی طور پر آزردہ اور دکھی ہوں۔

ضمناً اس بات کی طرف بھی توجہ رہے کہ "ولا تیمموا" (یعنی قصد نہ کرو) ممکن ہے اِس طرف اشارہ ہو کہ اموال انفاق میں اگر نہ جانتے ہوئے کوئی ناپسندیدہ چیز شامل ہوگئی ہے تو اس گفتگو میں اسے شامل نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ یہ گفتگو تو ان لوگوں کے بارے میں ہے جو جان بوجھ کر ایسے کام کرتے ہیں۔

"واعلموا ان الله غنی حمید":

ارشاد فرمایا گیا ہے: جان لو کہ خداوند عالم بے نیاز اور لائق تعریف ہے یعنی اِس امر کی طرف متوجہ رہو کہ اِس خدا کی راہ میں خرچ کر رہے ہو جسے تمہارے خرچ کرنے کی ضرورت نہیں اور حمد و ستائش کے لائق وہی ہے جس نے یہ تمام نعمتیں تمہارے اختیار میں دی ہیں۔

ممکن ہے "حمید" کا معنی "حمد و تعریف کرنے والا" یعنی بے نیاز ہونے کے باوجود جب تم خرچ کرتے ہو تو وہ تمہاری تعریف کرتا ہے۔ اس لیے اپنے پاکیزہ اموال سے خرچ کرنے کی کوشش کرو۔



۲۶۸۔ اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ۖۙ

ترجمہ

۲۶۸۔ شیطان تمہیں (خرچ کرتے وقت) فقر وفاقہ اور تنگ دستی کے وعدے دیتا ہے اور معصیت (اور برائیوں) کی دعوت دیتا ہے لیکن خدا تم سے مغفرت وبخشش اور اضافے کا وعدہ کرتا ہے اور خدا کی قدرت وسیع ہے اور وہ (ہر چیز کو) جانتا ہے (اس لیے وہ اپنا وعدہ پورا کرے گا)۔

تفسیر

انفاق کی رکاوٹوں اور شیطانی افکار سے مقابلہ

آیت کا پہلا حصہ کہتا ہے کہ خرچ کرتے وقت اور زکوٰۃ دیتے وقت شیطان تمہیں فقر وتنگدستی سے ڈراتا ہے۔ خصوصاً جب اچھے اور قابل توجہ اموال خرچ کرنا چاہو جن کی طرف گذشتہ آیت میں اشارہ ہوا ہے (اکثر اوقات یہ شیطانی وسوسہ خرچ کرنے میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے بلکہ زکوٰۃ وخمس اور دیگر واجب اخراجات پر بھی اثر انداز ہو سکتا ہے۔ خدا تعالیٰ انسان کو آگاہ کر رہا ہے کہ تنگ دستی کے خوف سے انفاق اور راہِ خدا میں خرچ کرنے سے بچنا غلط فکر اور شیطانی وسوسہ ہے اور ممکن ہے انسان کی نظر میں ہو کہ یہ خوف اگرچہ شیطان کی طرف سے ہے پھر بھی ایک منطقی خوف تو ہے لہٰذا بلا فاصلہ فرماتا ہے "ویأمرکم بالفحشاء" شیطان تمہیں معصیت اور گناہ کا حکم دیتا ہے، اس لیے فقر وفاقہ اور تہی دستی سے ڈرنا ہر حالت میں غلط ہے کیونکہ شیطان باطل اور گمراہی کے سوا کسی چیز کی دعوت نہیں دیتا۔ اصولی طور پر ہر منفی، مانع اور کوتاہ فکری بنیاد فطرت سے انحراف اور شیطانی وسوسوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہے لیکن ہر مثبت، اصلاحی، محرک اور بلند فکر کا سرچشمہ خدائی الہامات اور خداداد پاک فطرت ہے۔

اگر اس بات کی طرف توجہ رہے کہ شیطانی وسوسے قوانینِ فطرت اور سنتِ الٰہی کے برخلاف ہیں تو یہ واضح ہو جائے گا کہ ان کا نتیجہ منفی اور نقصان وبدبختی پر مبنی ہوگا۔

اس کے مقابلے میں پروردگارِ عالم کے فرامین خلقت وفطرت سے ہم آہنگ اور اس کے ہم دوش ہیں اور ان کا نتیجہ سعادت بخش زندگی ہے۔

وضاحت یہ ہے کہ پہلی نظر میں انفاق اور مال خرچ کرنا، مال کم کرنے کے سوا کچھ نہیں اور یہی کوتاہ بینی کا شیطانی نظریہ



ہے لیکن دقتِ نظر اور وسعت نگاہ سے دیکھا جائے تو انفاق معاشرے کی بقا کا ضامن، عدالت اجتماعی کے قیام کا ذریعہ، طبقاتی فاصلوں کو کم کرنے کا سبب اور پورے معاشرے اور عام لوگوں کی پیش رفت کا ذریعہ ہے۔ یہ مسلم ہے کہ معاشرے کی اجتماعی پیش رفت سے افراد کو رفاہیت اور آسائش و آرام میسر آئے گا اور یہی حقیقت شناسی کا الٰہی نظریہ ہے۔

قرآن اس ذریعے سے مسلمانوں کو متوجہ کرتا ہے کہ انفاق اگرچہ ظاہری طور پر تم سے کسی چیز کو کم کر دیتا ہے لیکن درحقیقت تمہارے سرمائے میں معنوی اور مادی ہر دو لحاظ سے بہت سی چیزوں کا اضافہ کر دیتا ہے۔

آج کی دُنیا میں طبقاتی کشمکش کے نتیجے میں اور تقسیم دولت میں عدم اعتدال کی وجہ سے انسانی سرمائے کی پامالی کی جو صورت پیدا ہو چکی ہے اس کے پیش نظر مندرجہ بالا آیت کے معنی کو سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔

آیت سے ضمنی طور پر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ترکِ انفاق اور فحش و قبیح امور کے درمیان ایک خاص ربط ہے البتہ فحشاء سے بخل مراد لیا جائے تو پھر اس کا ترکِ انفاق سے ربط یوں ظاہر ہوگا کہ اس طرح آہستہ آہستہ انسان میں صفت بخل پیدا ہو جائے گی جو بدترین صفات میں سے ایک ہے اور اگر فحشاء کا معنی مطلق گناہ یا جنسی برائیاں لیا جائے تب بھی ترکِ انفاق سے اس کا ربط کسی سے پوشیدہ نہیں کیونکہ بہت سے گناہوں، آلودگیوں اور خود فروشیوں کا سرچشمہ فقر و فاقہ اور تنگ دستی ہے۔ علاوہ ازیں انفاق ایک معنوی آثار و برکات کے سلسلے کا بھی حامل ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

"واللّٰہ یعدکم مغفرۃً منہ و فضلاً":

تفسیر "مجمع البیان" میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

> انفاق کرتے وقت دو چیزیں خدا کی طرف سے ہیں اور دو چیزیں شیطان کی طرف سے ہیں۔ خدا کی طرف سے گناہوں کی بخشش اور وسعت مال ہے اور شیطان کی طرف سے فقر و تنگ دستی کا وعدہ اور فحشاء و منکر کا حکم دیتا ہے۔

اس بناء پر مغفرت سے مراد گناہوں کی بخشش ہے اور فضل سے مراد جیسا کہ ابن عباس سے منقول ہے انفاق کے ذریعے سرمائے میں اضافہ ہے۔

ایک بات کی طرف اور توجہ رہے اور وہ یہ کہ حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام سے منقول ہے۔ آپ نے فرمایا:

> جب سختی اور تنگ دستی میں مبتلا ہو جاؤ تو انفاق کے ذریعے خدا سے معاملہ کرو
> (یعنی انفاق کرو تاکہ تنگ دستی سے نجات پا جاؤ)۔[1]

"واللّٰہ واسعٌ علیم":

اس جملے میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ خدا تعالیٰ چونکہ وسیع قدرت اور لا متناہی علم رکھتا ہے اس لیے وہ اپنے وعدہ پر عمل کر سکتا ہے۔ لہٰذا اس کے وعدے پر یقین کرنا چاہیئے نہ کہ فریب کار اور ناتواں شیطان کے وعدے پر جو انسان کو گناہ کی طرف کھینچ

[1] نہج البلاغۃ



ے جاتا ہے۔ چونکہ وہ مستقبل سے آگاہ نہیں ہے اور قدرت بھی نہیں رکھتا۔ اس لیے اس کا وعدہ گمراہی اور نادانی کی تشویق کے علاوہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

۲۶۹- یُؤْتِی الْحِكْمَةَ مَنْ یَّشَآءُ ۚ وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا كَثِیْرًا ؕ وَمَا یَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ ○

ترجمہ

۲۶۹- حکمت و دانش جسے چاہتا ہے (اور اہل دیکھتا ہے) عطا کرتا ہے اور جسے حکمت و دانش دی گئی اسے بہت بھلائی عطا کی گئی اور عقلمندوں کے سوا (ان حقائق کو) کوئی نہیں پا سکتا (اور نہ کوئی سمجھ سکتا ہے)

تفسیر

لفظ "حکمت" کے بہت سے معانی بیان کیے گئے ہیں مثلاً "جہان ہستی کی معرفت و شناخت" "حقائق قرآن کا علم" "گفتار و کردار کے لحاظ سے حق تک پہنچنا" اور "خدا کی معرفت و آشنائی" وغیرہ۔ یہ سب معانی ایک وسیع مفہوم میں یکجا ہو جاتے ہیں۔

اس آیت کی گذشتہ آیات سے مناسبت یہ ہے کہ بعض افراد کو خدا تعالیٰ ان کی پاکیزگی اور کوشش کی وجہ سے ایک علم و آگاہی عطا کرتا ہے جس کی بنا پر وہ نہایت عمدہ طریقے سے معاشرے میں انفاق کے فوائد و آثار اور نقوش حیات کا ادراک کر لیتے ہیں اور خدائی الہامات اور شیطانی وساوس میں فرق کو جان لیتے ہیں دوسرے لفظوں میں گذشتہ آیت میں چونکہ اس بات پر گفتگو تھی کہ خدا تعالیٰ انفاق کے نتیجے میں بخشش و برکت کا وعدہ کرتا ہے اور شیطان انسان کے دل میں فقر و فاقہ کا وسوسہ پیدا کرتا ہے اس لیے زیر نظر آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ حکمت ہی ایسی چیز ہے جو خدائی اور شیطانی وعدوں میں فرق کر سکتی ہے اور گمراہ کرنے والے وسوسوں سے نجات بخشتی ہے۔

واضح ہے کہ "مَنْ یَّشَآءُ" (جسے وہ چاہتا ہے) سے یہ مراد نہیں کہ حکمت و دانش بغیر کسی وجہ سے اِسے یا اُسے دی جاتی ہے بلکہ خدا کی مشیت و ارادہ تمام امور میں حکمت سے منسلک ہے۔ یعنی جس شخص کو وہ اہل سمجھتا ہے اُسے دیتا ہے اور اس حیات بخش، صاف و شفاف اور شیریں سرچشمے سے سیراب کرتا ہے۔

"وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا كَثِیْرًا":

حکمت بخشنے والا اگرچہ خدا ہی ہے لیکن اس جملے میں اس کا نام نہیں لیا گیا، صرف یہ فرمایا گیا ہے: جس کسی کو حکمت دی جاتی ہے اسے بہت سی خیر دی گئی ہے۔ اور جس طرف سے بھی ملے اس کے خیر ہونے میں کوئی فرق نہیں۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ اس جملے میں فرمایا گیا ہے کہ جسے دانش و حکمت دی گئی ہے، اسے بہت سی خیر و برکت



ل گئی ہے۔ مطلق "خیر" نہیں کہا گیا کیونکہ خیر وسعادت صرف دانش وحکمت میں نہیں ہے بلکہ حکمت اس کا ایک اہم عامل ہے۔

"وما یذکر الا اولوا الالباب":

"تذکر" کا معنی ہے "یاد آوری" اور "روح میں علوم اور دانائیوں کی حفاظت" "الباب" "لب" کی جمع ہے۔ اس کا معنیٰ ہے "مغز" چونکہ ہر چیز کے بہترین اور بنیادی حصے کو مغز کہتے ہیں اس لیے عقل وخرد کو "لب" کہا جاتا ہے اس جملے میں کہا گیا ہے کہ صرف صاحبانِ عقل وخرد ہی ان حقائق کو یاد رکھتے ہیں، دوسروں کو یاد دلاتے ہیں اور ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اگرچہ (دیوانوں کے علاوہ) سب لوگ صاحب عقل ہیں لیکن سب کو "اولوا الالباب" نہیں کہا جاتا۔ بلکہ اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو عقل وخرد کو کام میں لاتے ہیں اور اس چراغِ پُر فروغ کے ذریعے راہِ حیات پالیتے ہیں۔

۲۷۰۔ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ○

ترجمہ

۲۷۰ — جو چیز خرچ کرتے ہو! (جن اموال کو راہ خدا میں خرچ کرنے کی) نذر کرتے ہو خدا انہیں جانتا ہے اور ستمگروں کا کوئی یاور و مددگار نہیں۔

تفسیر

آیت کہتی ہے: راہ خدا میں جو کچھ خرچ کرو وہ واجب ہو یا غیر واجب، کم ہو یا زیادہ .... حلال طریقے سے حاصل شدہ ہو یا حرام سے، خلوص سے ہو یا ریاکاری سے، احسان جتلا کر ہو یا ایذا پہنچا کر یا اس کے بغیر، ایسے اموال میں سے جنہیں خرچ کرنے کا خدا نے حکم دیا ہے یا انسان نے نذر کے ذریعے اپنے اوپر واجب کر لیا ہو — غرض جس طرح کا بھی ہو خدا اس کی تمام خصوصیات کو جانتا ہے اور اس کی جزا اچھی ہو یا بُری، ضرور دے گا۔

"وما للظلمین من انصار":

یہ جملہ کہتا ہے: ستمگروں اور ظالموں کا کوئی یار و یاور نہیں۔ یعنی جو لوگ راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں اور اس کے ذریعے محروموں اور تہی دستوں کو مصیبت سے نجات دلاتے ہیں یا ایسے کاموں میں مال صرف کرتے ہیں جو اجتماعی مفاد میں ہو اور عام لوگوں کی رفاہ و آسائش کے لیے ہو تو ان کے لیے یہ اخراجات پشت پناہ اور قوی مددگار ثابت ہوں گے جب کہ بخیل سرمایہ دار یا ریاکاری و مردم آزاری کے ساتھ خرچ کرنے والے اس یار و یاور سے محروم ہوں گے۔

ممکن ہے اس طرف اشارہ ہو کہ قیامت کے دن کے لیے جو سزائیں ریاکاروں، بخیلوں، احسان دھرنے



والوں اور لوگوں کو اذیت پہنچانے والو! کے انتظار میں ہیں ان سے بچانے کے لیے کوئی بھی ان کی حمایت اور شفاعت نہیں کرے گا۔ یہ ظالم وہ ہیں جنہوں نے عوام کے حقوق پامال کیے ہیں اس لیے کوئی اُس عظیم عدالت میں ان کا دفاع نہیں کرے گا۔

ہر ظلم اور ہر ستم کا یہی اثر ہے چاہے وہ جس چہرے اور جس شکل میں ہو۔

۲۷۱۔ اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ○

ترجمہ

۲۷۱۔ اگر انفاق اور صدقات کھلے بندوں کرو تو اچھا ہے اور اگر مخفی طور پر کرو تو حاجتمندوں کو دو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اور ایسا کرنا تمہارے کچھ گناہوں کو چھپا دیتا ہے (اور راہ خدا میں بخشش کرنے کے ذریعے تم بخشے جاؤ گے) اور جو کچھ تم انجام دیتے ہو خدا اس سے آگاہ ہے۔

تفسیر

خرچ کیسے کرنا چاہیے

اس میں شک نہیں کہ راہِ خدا میں اعلانیہ یا مخفی طور پر خرچ کرنے میں سے ہر ایک مُفید اثر رکھتا ہے کیونکہ انسان جب آشکار اور اعلانیہ اپنا مال راہِ خدا میں خرچ کرتا ہے تو اگر وہ واجب خرچ ہے تو قطع نظر اس کے کہ اس سے ایسے نیک کاموں کا لوگوں میں شوق پیدا ہوتا ہے انسان اِس تہمت سے بھی بچتا ہے کہ اس نے واجب ذمہ داری پوری نہیں کی اور اگر یہ انفاق مستحب ہے تو حقیقت میں ایک طرح کی عملی تبلیغ ہے جو اچھے کام کرنے، محروموں کا ساتھ دینے اور اجتماعی مفاد کے لیے نیک کام کرنے کی تشویق کا باعث ہے۔

دوسری طرف اگر انفاق مخفی طور پر ہو تو یقیناً اس میں ریاکاری اور خود نمائی کمتر ہوگی اور اس میں خلوص زیادہ ہوگا خصوصاً محروم انسانوں کی مدد کے بارے میں یہ طرزِ عمل بہتر ہے کیونکہ اِس طرح ان کی عزت و آبرو بہتر طور پر محفوظ رہ سکے گی۔

اِنہی پہلوؤں کے پیشِ نظر آیت میں ان ہر دو طریقوں کو اپنی جگہ پر اچھا اور شائستہ قرار دیا گیا ہے

مخفی طور پر خرچ کرنے کے بارے میں اِس حکم پر بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ صرف مستحب اخراجات کے لیے ہے۔ واجب انفاق مثلاً زکوٰۃ وغیرہ کی ادائگی تو ہمیشہ آشکار اور اعلانیہ ہی بہتر ہے لیکن مسلم ہے کہ دونوں احکام (اظہار اور اخفاء) میں سے کوئی بھی عمومی اور سب کے لیے ایک جیسا پہلو نہیں رکھتے بلکہ حالات مختلف ہوتے ہیں۔ بعض اوقات جب کہ تشویق زیادہ موثر



ہو اور خلوص پر زد بھی نہ پڑتی ہو تو اظہار کرنا بہتر ہے ۔ بعض اوقات آبرومند افراد سے ایسا معاملہ درپیش ہے کہ ان کی عزت و آبرو کا تقاضا ہے کہ انفاق مخفی طور پر انجام پائے اور ریاکاری اور عدم خلوص کا خوف بھی ہے تو وہاں اسے مخفی ہی رکھنا چاہیے ۔

امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے ، آپؑ نے فرمایا :

> واجب زکوٰۃ اپنے مال سے آشکار طور پر الگ کر لو اور کھلے بندوں خرچ کرو ۔ لیکن مستحب انفاق مخفی ہو تو بہتر ہے ۔[1]

جو کچھ ہم نے کہا ہے ایسی احادیث اِس سے متضاد نہیں کیونکہ واجبات کی ادائیگی میں ریا کی آمیزش بہت کم ہوتی ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ذمہ داری اور فریضہ ہوتی ہے اور اسلامی ماحول میں ہر شخص مجبور ہوتا ہے کہ اسے ادا کرے اور یہ یقینی اموال کی حیثیت سے ادا کرنا ہوتے ہیں ۔ اس بناء پر ان کا اظہار بہتر ہے اور مستحبی انفاق میں چونکہ لازمی ہونے کا پہلو نہیں تو ممکن ہے اس کا اظہار خلوص نیت کو نقصان پہنچائے لہٰذا اسے مخفی طور پر انجام دینا زیادہ مناسب ہے ۔

" ویکفر عنکم من سیاٰتکم " :

اِس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ راہ خدا میں خرچ کرنا گناہوں کی بخشش کے لیے بہت مؤثر ہے کیونکہ حکم انفاق کے بعد اِس جملے میں فرمایا گیا ہے : اور تمہارے گناہوں کو چھپاتا ہے ۔

البتہ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ تھوڑے سے انفاق کی وجہ سے سب گناہ بخش دیے جائیں گے بلکہ یہاں " من " استعمال ہوا ہے جو عام طور پر کچھ حصے کے لیے " تبعیض " کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے ۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ انفاق کچھ گناہوں کو چھپاتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ انفاق کی مقدار اور خلوص کے معیار سے وابستہ ہے ۔

اِس بارے میں کہ انفاق سبب بخشش ہے ، اہل بیتؑ کے ذرائع سے اور اہل سنت کے طرق سے بہت سی روایات وارد ہوئی ہیں ۔ ان میں سے ایک حدیث میں ہے :

> پوشیدہ طور پر خرچ کرنا غضب خدا کو ٹھنڈا کر دیتا ہے اور جس طرح پانی آگ کو بجھاتا ہے اس طرح یہ انسان کے گناہ ختم کر دیتا ہے ۔[2]

ایک اور روایت میں ہے ۔

> سات اشخاص ایسے ہیں جن پر قیامت کے دن خدا اپنے لطف کا سایہ کرے گا جب کہ اس دن اس کے سایۂ لطف کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہوگا اور وہ سات اشخاص یہ ہیں :

۱ ۔ عادل راہنما ۔

۲ ۔ وہ جوان جو اللہ تعالیٰ کی عبادت میں پروان چڑھتا ہے ۔

---

[1] الزکوٰۃ المفروضۃ تخرج علانیۃ و تدفع علانیۃ وغیر الزکوٰۃ ان دفعہ سرًّا فھو افضل ۔ (تفسیر مجمع البیان نقل از علی بن ابراھیم ۔)

[2] (صدقۃ السرّ تطفی غضب الرّب و تطفی الخطیئۃ کما یطفی الماء النّار ۔)



۳۔ وہ شخص جس کا دل مسجد سے پیوستہ ہے۔

۴۔ وہ اشخاص جو ایک دوسرے کو خدا کے لیے دوست رکھتے ہیں، محبت والفت سے ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور محبت ہی سے ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں۔

۵۔ وہ شخص جسے خوبصورت اور قدر و منزلت کی حامل عورت دعوتِ گناہ دے اور وہ کہے: میں تو خدا سے ڈرتا ہوں۔

۶۔ وہ شخص جو اس طرح مخفی طور پر انفاق کرتا ہے کہ اس کے دائیں ہاتھ کو خبر نہیں کہ بائیں نے انفاق کیا ہے۔

۷۔ وہ شخص جو اکیلا یاد خدا میں محو ہو اور اس کی آنکھوں کے کناروں سے آنسو گر رہے ہوں۔ [1]

"واللّٰہ بما تعملون خبیر"

اِس جملے کا معنی ہے کہ تم جو کچھ خرچ کرتے ہو ظاہراً ہو یا پوشیدہ، خدا جانتا ہے۔ اسی طرح وہ تمہاری نیتوں سے بھی آگاہ ہے کہ اظہار و اخفاء کس مقصد کے لیے انجام دیتے ہو۔

بہر حال انفاق میں جو چیز مؤثر ہے وہ عمل میں پاکیزہ نیت اور خلوص ہے۔ لوگوں کا جاننا یا نہ جاننا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اہم چیز خدا کا جاننا ہے کیونکہ انسان کے اعمال کی جزا دینے والا وہی ہے۔ وہ اعمال مخفی ہوں چاہے آشکار۔

۲۷۲۔ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۗ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ۗ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝

ترجمہ

۲۷۲۔ (جبر سے) اُن کی ہدایت کرنا تمہارے ذمّے نہیں ہے (اس بناء پر غیر مسلموں کو اسلام لانے پر

---

[1] "سبعة يظلهم الله في ظله يوم لا ظل الا ظله الامام العدل والشاب الذي نشأ في عبادة الله تعالى، ورجل قلبه يتعلق بالمساجد حتى يعود اليها، ورجلان تحابا في الله و اجتمعا عليه وتفرقا عليه، ورجل دعته امرأة ذات منصب وجمال فقال اني اخاف الله تعالى، ورجل تصدق فاخفاها حتى لم تعلم يمينه ما تنفق شماله ورجل ذكر الله خاليا ففاضت عيناه؛



مجبور کرنے کے لیے ان پر خرچ نہ کرنا صحیح نہیں ہے، لیکن خدا جسے چاہتا ہے (اور وہ اہلیت رکھتا ہے تو) ہدایت کرتا ہے اور جو کچھ تم اچھی چیزوں میں سے خرچ کرتے ہو وہ تمہارے ہی لیے ہے (لیکن اللہ کی رضا کے سوا خرچ نہ کرو اور اچھی چیزوں میں سے جو کچھ تم خرچ کرتے ہو وہ تمہیں دیا جائے گا اور تم پر ظلم نہیں ہوگا۔

شانِ نزول

تفسیر مجمع البیان میں ابن عباس سے منقول ہے کہ مسلمان غیر مسلموں پر خرچ کرنے کو تیار نہیں تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور انہیں اجازت دی گئی کہ ضروری مواقع پر یہ کام انجام دیں۔

اس آیت کے بارے میں ایک اور شان نزول بھی منقول ہے جو پہلی شان نزول سے غیر مشابہ نہیں ہے اور یہ کہ اسماء ایک مسلمان عورت تھی۔ عمرۃ القضاء کے سفر میں وہ پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں تھی۔ اس کی ماں اور دادی اسے ڈھونڈتے ہوئے پہنچیں انہوں نے اس سے مدد مانگی۔ چونکہ وہ دونوں مشرک اور بت پرست تھیں اس لیے اسماء نے ان کی مدد کرنے سے انکار کر دیا اور کہا: ضروری ہے کہ پہلے پیغمبر اکرمؐ سے اجازت حاصل کر لوں۔ کیونکہ تم میرے دین کی پیرو نہیں ہو۔ اس کے بعد وہ آنحضرتؐ کی خدمت میں آئی اور اجازت چاہی۔ اس پر محل بحث آیت نازل ہوئی۔

تفسیر

"لیس علیک ھدٰھم": یعنی تم ان کی ہدایت پر مجبور نہیں ہو۔

اس جملے میں پیغمبر اکرمؐ سے خطاب ہے اور گذشتہ آیات سے اس کا ربط واضح ہے کیونکہ گزشتہ آیت میں کلی طور پر انفاق کا ذکر ہے اور یہ آیت غیر مسلموں پر اس معنی میں خرچ کرنے کی تشریح کرتی ہے کہ غیر مسلم فقراء و مساکین پر اس مقصد کے لیے خرچ نہ کرنا کہ وہ فقر و فاقہ کی سختی سے اکتا کر اسلام قبول کر لیں اور ان کی ہدایت ہو جائے، یہ صحیح نہیں ہے۔ جیسے اس دُنیا میں خدائی بخششیں اور نعمتیں (بلا تفریق دین و آئین) سب انسانوں کے لیے ہیں مسلمانوں کو بھی چاہیے کہ جب مستحب انفاق کریں اور حاجت مندوں کی حاجت روائی کریں تو ضروری مواقع پر غیر مسلموں کی حالت کا بھی خیال رکھیں۔

البتہ یہ اس صورت میں ہے جب غیر مسلموں پر خرچ کرنا انسانی مدد کے طور پر ہو۔ کفر کی تقویت اور اسلام دشمنوں کی منحوس سازشوں کی پیش رفت کا سبب نہ بنے بلکہ انہیں اسلام کی روحِ انسان دوستی سے آگاہی کا ذریعہ بنے۔

یہ جو پیغمبر اکرمؐ سے کہا گیا ہے کہ تم ان کی ہدایت پر مجبور نہیں ہو، واضح ہے کہ اس کا یہ مقصد نہیں کہ ارشاد و تبلیغ آپؐ کا فریضہ اور ذمہ داری نہیں۔ کیونکہ ارشاد و تبلیغ تو پیغمبر کے واضح ترین اور بنیادی ترین پروگرام کا حصہ ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ آپؐ کا فریضہ نہیں کہ ان پر سختی کریں اور انہیں ہدایت پر مجبور کریں۔ دوسرے لفظوں میں مراد جبری ہدایت کی نفی ہے اختیاری ہدایت کی نہیں یا مراد ہدایت تکوینی کی نفی ہے، ہدایت تشریعی کی نہیں۔ اس کی وضاحت ذیل میں پیش کی جائے گی۔

ہدایت کی اقسام

ہدایت کی بہت سی قسمیں ہیں۔



۱۔ **ہدایت تکوینی:** ۔ ہدایت تکوینی سے مراد یہ ہے کہ خدا نے مختلف موجودات عالم مثلاً انسان اور دیگر جاندار بلکہ بے جان موجودات کے ارتقاء اور تکامل کے لیے عوامل کا ایک سلسلہ پیدا کیا ہے۔ شکم مادر میں بچے کا رشد و تکامل مختلف اجناس اور نباتات کے دانوں کی زمین کے اندر پیش رفت اور نشوو نما، نظام شمسی کے مختلف کرات کی اپنے مدار میں حرکت اور اس قسم کی دیگر چیزیں ہدایت تکوینی کے مختلف نمونے ہیں۔ ایسی ہدایت خدا سے مخصوص ہے اور اس کے طبیعی و ماوراء طبیعی عوامل و اسباب ہیں۔ قرآن مجید کہتا ہے:

"الذی اعطی کل شیء خلقه ثم هدی"۔

وہ خدا جس نے ہر موجود و مخلوق کو اس کی مخصوص خلقت عطا کی
اور اس کے بعد اسے ہدایت کی۔ (طٰہٰ - ۵۰)

۲۔ **ہدایت تشریعی:** ۔ اس ہدایت سے مراد ہے تعلیم و تربیت، مفید قوانین، عادلانہ حکومت اور پند و نصیحت کے ذریعے لوگوں کی راہنمائی کرنا۔ یہ ہدایت انبیاء، مرسلین، آئمہ معصومین، صالحین اور ہمدرد مربین کے ذریعے انجام پاتی ہے۔ قرآن میں بارہا اس کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے

"ذالک الکتب لاریب فیه هدی للمتقین"۔

اس عظیم کتاب میں کوئی شک و شبہ نہیں اور یہ پرہیز گاروں کی ہدایت
کا ذریعہ ہے۔ سورة بقرة : آية ۲

۳۔ **وسیلے کی فراہمی:** ۔ ہدایت کا ایک معنی وسیلہ اور ذریعہ فراہم کرنا بھی ہے۔ ایسی ہدایت کو کبھی توفیق بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانوں کو ضروری وسائل فراہم کر دیے جائیں تاکہ وہ اپنی رضا و رغبت سے اپنی پیش رفت کے لیے ان سے استفادہ کر سکیں۔ مثلاً مدرسہ، مسجد اور دیگر تربیتی مراکز قائم کرنا، ضروری پروگرام اور کتب مہیا کرنا اور لائق و اہل مبلغین اور معلمین کی تربیت کرنا۔ یہ سب امور ہدایت کی اس قسم میں شامل ہیں۔ دراصل ہدایت کی یہ قسم ہدایت تکوینی اور ہدایت تشریعی کے درمیان حدِ فاصل ہے۔ قرآن کہتا ہے:

"والذین جاهدوا فینا لنهدینهم سبلنا"

اور جو لوگ ہماری راہ میں جہاد اور کوشش کرتے ہم انہیں اپنے
راستوں کی ہدایت کرتے ہیں۔ (عنکبوت - ۶۹)

۴۔ **نعمتوں اور جزا و ثواب کی طرف کی ہدایت:** اس ہدایت سے مراد ہے دوسرے جہاں میں اہل ایمان کو ان کے نیک اعمال کے نتائج سے بہرہ مند کرنا۔ ایسی ہدایت اہل ایمان اور اعمال صالح بجالانے والے افراد سے مخصوص ہے۔ قرآن کہتا ہے:

"سیهدیهم ویصلح بالهم"۔

خدا انہیں ہدایت کرتا ہے اور ان کی حالت کی اصلاح کرتا ہے (محمد : ۵)



آیت میں یہ جملہ راہِ خدا میں شہید ہونے والوں کی فداکاری کے ذکر کے بعد آیا ہے ۔ ظاہر ہے کہ یہ ہدایت صرف دوسرے جہان میں اُن کے اپنے عمل کے اچھے نتائج سے بہرہ مند ہونے سے مرابط ہے ۔

واقع میں یہ چار قسم کی ہدایت ایک ہی حقیقت کے مختلف مراحل ہیں ۔ ان میں سے ہر ایک پہلے کے بعد اگلا مرحلہ ہے ۔
سب سے پہلے ہدایت تکوینی ہے جو انسان کی تلاش میں آتی ہے اور عقل و فکر اور دوسرے قویٰ اس کے اختیار میں دے دیتی ہے ۔
پھر انبیاء کی ہدایت اور راہنمائی شروع ہو جاتی ہے اور وہ لوگوں کو راہِ حق کی ہدایت کرتے ہیں اس کے بعد جب لوگ اگلے مرحلہ میں داخل ہوتے ہیں تو توفیق الٰہی اُن کے شامل حال ہوتی ہے ۔ اُن کے لیے راستے ہموار ہوتے چلے جاتے ہیں اس طرح وہ تیسرے مرحلے کو طے کرتے ہیں ۔
آخر میں دارِ آخرت ہے جہاں لوگ اپنے اعمال کے نتائج سے بہرہ مند ہوں گے ۔
اِن چار اقسام میں سے ارشاد و تبلیغ انبیاء اور آئمہ ھدیٰ کے حتمی فرائض میں سے ہے اور تیسری قسم میں یہ جو راستہ ہموار کرنا کہا گیا ہے یہ انبیاء اور آئمہ کی حکومت الٰہی کے پروگراموں کا جزء ہے ۔ آخری اور پہلی قسم ذات خدا سے مخصوص ہے ۔
اِس بناء پر قرآن میں جہاں کہیں پیغمبر اکرمؐ سے ہدایت کی نفی کی گئی ہے اِس سے مراد دوسری اور تیسری قسم کی ہدایت نہیں ہے ۔

" ولٰکنّ اللّٰه یهدی من یشآء "

یعنی خدا جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے لیکن یہ مسلم ہے کہ پروردگار عالم کی طرف سے ہدایت حساب و کتاب اور حکمت و دانش کے بغیر نہیں یعنی ایسا نہیں کہ وہ کسی کو بلاوجہ ہدایت دے دے اور دوسرے کو محروم رکھے ۔
زیرِ نظر آیت سے ایک اور حقیقت بھی معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں کو یہ جور یا کاری ، احسان جتلانے اور آزار پہنچانے سے منع رہنے کی بار بار تاکید کی گئی ہے ۔ اِس کے باوجود اگر کچھ لوگ اپنے آپ کو ان امور سے آلودہ کریں تو تم پریشان نہ ہونا ۔ تمہاری ذمہ داری فقط احکام بیان کرنا اور ایک صحیح اجتماعی ماحول پیدا کرنا ہے ۔ اس لیے کہ تم ہرگز ذمہ دار نہیں ہو کہ انہیں مجبور کرو ۔ واضح ہے کہ یہ تفسیر گذشتہ تفسیر سے اختلاف نہیں رکھتی اور یہ بھی ممکن ہے کہ آیت سے دونوں مفاہیم حاصل کئے جائیں

انفاق کرنے والوں پر اس کے اثرات

" وما تنفقوا من خیرٍ فلأنفسکم " :

آیت کے اِس حصے میں فرمایا گیا ہے کہ انفاق کے فوائد کی بازگشت خود تمہاری طرف ہے ۔ اس میں انفاق کرنیوالوں کو اس انسانی عمل کی تشویق دلائی گئی ہے ۔ مسلم ہے کہ جب انسان یہ جان لیتا ہے کہ اس کے کام کا نتیجہ اور فائدہ خود اسی کو حاصل ہوگا تو اس کا دل زیادہ اس کام میں لگے گا ۔
ممکن ہے بادی النظر میں یہ معلوم ہو کہ انفاق کے منافع کی بازگشت سے مراد اس کی اُخروی جزا اور اس کے اُخروی نتائج ہیں ۔ یہ مفہوم اگرچہ صحیح ہے لیکن ایسا نہیں کہ انفاق کا فائدہ فقط آخرت میں حاصل ہوتا ہے بلکہ اس دُنیا میں



بھی اس کے مادی اور معنوی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

معنوی لحاظ سے انفاق کرنے والے میں عفو و بخشش، ایثار، دوستی اور اخوت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور حقیقت میں یہ انسان کے تکامل اور اس کی روح کے ارتقاء کے لیے ایک موثر تربیتی ذریعہ ہے۔

مادی لحاظ سے دیکھا جائے تو معاشرے میں محروم اور بے نوا لوگوں کی موجودگی خطرناک دھماکوں کا سبب ہوتی ہے اور یہ دھماکے بعض اوقات اصل ملکیت کو ختم کر دیتے ہیں، تمام دولت اور سرمائے کو نگل جاتے ہیں اور نابود کر دیتے ہیں۔

انفاق اور خرچ کرنے سے مختلف طبقات میں تفاوت میں کمی آتی ہے اور طبقاتی کش مکش کی وجہ سے معاشرے کو جو خطرات لاحق ہوتے ہیں انفاق کے ذریعے ٹل جاتے ہیں۔ انفاق غیظ و غضب کی آگ کو ٹھنڈا کرتا ہے اور محروم طبقوں کے جلا دینے والے شعلوں کو بجھا دیتا ہے اور ان میں سے انتقام کے جذبات ختم کر دیتا ہے۔

اس بناء پر انفاق اجتماعی اہمیت، اقتصادی سالمیت اور مختلف دیگر مادی و معنوی پہلوؤں کے پیشِ نظر خود خرچ کرنے والوں کے فائدے میں ہے۔

"وما تنفقون الا ابتغاء وجه الله":

یعنی مسلمان اپنے اموال خوشنودیٔ خدا کی طلب کے علاوہ خرچ نہیں کرتے۔

جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے، ممکن ہے کہ جملہ خبریہ یہاں نہی کے معنی میں ہو یعنی لوگوں کو انفاق نہیں کرنا چاہیئے مگر یہ کہ خدا کی رضا کے لیے ہو اور انفاق صرف اس صورت میں سود مند اور مفید ہے جب خدا کی خاطر انجام پذیر ہو۔

وجہ اللہ کا مفہوم

"وجہ" کا لغوی معنی ہے "چہرہ"۔ بعض اوقات یہ "ذات" کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس بناء پر "وجہ اللہ" کا معنیٰ ہوا "ذاتِ خدا"

انفاق کرنے والوں کی نظر میں پروردگار کی ذات پاک ہونا چاہیے اس سے معلوم ہوا کہ لفظ "وجہ" اس آیت میں اور ایسی دیگر آیات میں ایک طرح کی تاکید کا حامل ہے کیونکہ "ذاتِ خدا کے لیے" میں "خدا کے لیے" کی نسبت زیادہ تاکید ہے یعنی حتمی طور پر خدا کے لیے ہو کسی اور کے لیے نہ ہو۔

علاوہ ازیں انسان کا چہرہ اس کے ظاہری بدن کا بہترین حصہ ہوتا ہے۔ قوتِ بصارت، قوت سماعت اور قوت گویائی اسی حصے میں موجود ہیں۔ اس لیے جب لفظ "وجہ" استعمال ہو تو وہ اہمیت کی طرف اشارہ کر رہا ہوتا ہے۔ یہاں بھی خدا کے بارے میں یہ لفظ بطور کنایہ استعمال ہوا ہے اور واقع میں اس سے ایک طرح کا احترام اور اہمیت ظاہر ہو رہی ہے۔

یہ بدیہی ہے کہ خدا تعالیٰ جسم رکھتا ہے نہ کوئی اس کا چہرہ ہے۔

"وما تنفقوا من خیر یوف الیکم وانتم لا تظلمون":

آیت کے اس حصے میں سابق مفہوم کو زیادہ واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے یہ گمان نہ کرو کہ انفاق سے



تمہیں صرف تھوڑا سا فائدہ پہنچے گا بلکہ جو کچھ تم خرچ کرو گے سب تمہاری طرف پلٹ آئے گا اور تم پر تھوڑا سا ظلم بھی نہیں ہوگا اس لیے انفاق کرتے وقت ہاتھ اور دل کھلا رکھو۔

ضمنی طور پر یہ جملہ تجسّم اعمال کے مسئلہ پر بھی دلیل ہے۔ کیونکہ اس کے مطابق: جو تم خرچ کرو گے وہی چیز تمہیں واپس کر دی جائے گی۔

۲۷۳۔ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِیْمٰهُمْ لَا یَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ ○

ترجمہ

۲۷۳۔ (تمہارا انفاق خاص طور پر ایسے لوگوں کے لیے ہونا چاہیے) جو حاجت مند ہوں اور راہِ خدا میں محصور ہو چکے ہوں (دین خدا کی طرف ان کی رغبت کی وجہ سے وہ بے وطن ہو گئے ہوں اور جہاد میں شرکت کی وجہ سے ان کے لیے ممکن نہ رہا ہو کہ وہ کسب و تجارت کے ذریعہ اپنے اسباب زندگی فراہم کر سکیں) سفر نہ کر سکتے ہوں (کہ سفر کے ذریعے روزگار مہیا کر سکیں) اور ان کی خودداری کی وجہ سے بے خبر لوگ انہیں دولت مند اور تونگر سمجھتے ہیں لیکن تم انہیں ان کے چہروں سے پہچان لو گے اور وہ اصرار کر کے ہرگز لوگوں سے کوئی چیز طلب نہیں کرتے (یہ ان کی نشانیاں ہیں) اور جو اچھی چیز جو تم راہِ خدا میں خرچ کرو خدا اس سے آگاہ ہے۔

شانِ نزول

امام باقرؑ سے منقول ہے کہ یہ آیت اصحاب صُفّہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے [1]۔ مسجد میں ان کی رہائش چونکہ مسجد کے احترامات کے منافی تھی لہٰذا انہیں حکم دیا گیا کہ مسجد سے باہر صُفّہ [2] میں منتقل ہو جائیں۔ اس صورت حال پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی جس میں مسلمانوں کو اپنے ان بھائیوں کو ہر ممکنہ امداد کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور انہوں نے ایسا ہی کیا۔

---

[1] اصحاب صفہ: یہ تقریباً چار سو افراد تھے۔ ان کا تعلق مکہ اور اطراف مدینہ سے تھا۔ مدینہ میں ان کا کوئی گھر اور کوئی رشتے دار نہ تھا اس لئے انہوں نے مسجد نبوی میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ انہوں نے ہر اسلامی جہاد میں شرکت کے لیے اپنی آمادگی کا اعلان کر رکھا تھا۔

[2] صُفّہ۔ بڑے اور وسیع برآمدے کو کہتے ہیں۔



تفسیر

انفاق کا بہترین موقع

اِس آیت میں خدا تعالیٰ نے انفاق کے لیے بہترین موقع بیان کیا ہے۔ جن پر خرچ کیا جانا چاہیے ان لوگوں کی یہ صفات بیان کی گئی ہیں:

۱۔ الّذین احصروا فی سبیل اللّٰہ: یعنی وہ لوگ جو اہم کاموں مثلاً جہاد، دشمن سے مقابلہ، فنونِ جنگ کی تعلیم اور ضروری علوم کی تحصیل میں مصروف ہیں اور اس وجہ سے اپنی زندگی کے اسباب مہیا نہیں کر سکتے۔ جیسے اصحابِ صُفّہ، جو اس کے واضح مصداق تھے۔

۲۔ لا یستطیعون ضربًا فی الارض: وہ اسبابِ زندگی کی تلاش میں سفر اختیار نہیں کر سکتے۔ ان کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ شہروں، بستیوں اور ایسے علاقوں میں جائیں جہاں اللہ کی نعمتیں فراواں ہیں۔ اس لیے جو لوگ اسبابِ زندگی مہیا کر سکتے ہیں وہ سفر کی مشقت اور تکلیف برداشت کریں اور دوسروں کے دست و بازو کی کمائی پر ہرگز نہ بیٹھے رہیں۔ ہاں البتہ کسی زیادہ اہم کام کی وجہ سے وہ لوگ رک جائیں مثلاً جہاد جو رضائے الٰہی کا محل و مقام ہے۔

۳۔ یحسبھم الجاھل اغنیاء من التعفف: یعنی جو لوگ ان کے حالات سے آگاہ نہیں ہیں وہ ان کی خودداری، عزتِ نفس اور پاکدامنی کی وجہ سے گمان کرتے ہیں کہ یہ غنی اور کسی کی امداد سے بے نیاز ہیں۔

۴۔ تعرفھم بسیمٰھم: "سیما" لغت میں "علامت" اور "نشانی" کے معنی میں ہے۔ یعنی اگرچہ وہ اپنے بارے میں کوئی بات نہیں کہتے لیکن ان کے چہرے پر داخلی دکھ درد کی نشانیاں موجود ہوتی ہیں جو باشعور افراد کے لیے واضح ہوتی ہیں۔ ان کے رخساروں کا رنگ ان کے اندرونی راز کی خبر دیتا ہے۔

۵۔ لا یسئلون الناس الحافًا: مراد یہ ہے کہ وہ پیشہ ور فقیروں کی طرح کسی سے سوال نہیں کرتے یعنی وہ تو اصولی طور پر سوال کرتے ہی نہیں چہ جائیکہ وہ سوال میں اصرار یا تکرار کریں۔ دوسرے لفظوں میں پیشہ ور فقیروں کا معمول ہے کہ وہ سوال پر اصرار کرتے ہیں لیکن وہ بالعموم ضرورت مند اور حاجتمند نہیں ہوتے۔

یہ جو قرآن نے کہا ہے کہ وہ اصرار کے ساتھ سوال نہیں کرتے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ سوال تو کرتے ہیں مگر اصرار نہیں کرتے بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ وہ پیشہ ور فقیر نہیں ہوتے کہ سوال کرتے پھریں۔ اس بناء پر اس جملے کا آیت کے ابتدائی جملے سے کوئی اختلاف نہیں جس میں فرمایا گیا ہے کہ وہ اپنی علامت سے پہچانے جاتے ہیں نہ کہ سوال کے ذریعے۔

آیت میں ایک احتمال اور بھی ہے اور وہ یہ کہ اگر شدید حالتِ اضطرار کے باعث وہ سوال پر مجبور بھی ہو جائیں تو بھی سوال پر اصرار نہیں کرتے بلکہ اپنی حاجت کو نہایت احسن طریقے سے اپنے مسلمان بھائیوں کے گوش گزار کرتے ہیں۔

و ما تنفقوا من خیرٍ فان اللّٰہ بہ علیمٌ: یہ جملہ خرچ کرنے والوں کو شوق دلانے



کے لئے ہے۔ خصوصاً ایسے افراد پر خرچ کرنا جو صاحب عزت نفس اور عالی مزاج ہیں کیونکہ جب خرچ کرتے وقت کسی کو یہ خیال ہو کہ جو کچھ وہ راہ خدا میں خرچ کر رہا ہے چاہے مخفی طور پر ہے لیکن خدا تعالیٰ اس سے آگاہ ہے اور اُسے اس کے عمل کے ثمرات سے بہرہ مند کرے گا تو وہ زیادہ لگاؤ اور انہماک سے یہ عظیم خدمت سرانجام دے گا۔

۲۷۴۔ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

ترجمہ

۲۷۴۔ وہ لوگ جو شب و روز اپنے اموال پنہاں و آشکار خرچ کرتے ہیں، اُن کا اجر ان کے پروردگار کے پاس ہے۔ ان پر کوئی خوف ہے نہ وہ غمگین ہوتے ہیں۔

تفسیر

ہر صورت میں خرچ کرنا

بہت سی احادیث میں آیا ہے کہ یہ آیت حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے کیونکہ آپؑ نے ایک درہم رات کو، ایک دن کو، ایک چھپا کر اور ایک ظاہر بظاہر خرچ کیا تھا۔[1]

لیکن قرآن کا حکم حسب معمول ایک عمومی حیثیت رکھتا ہے۔ اس آیت میں انفاق کے طور طریقوں اور مختلف کیفیات کی تشریح کی گئی ہے اور انفاق کرنے والوں کی ذمہ داری کی وضاحت کی گئی ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ ظاہر یا پوشیدہ طور پر خرچ کرتے وقت اخلاقی و اجتماعی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ جس پر خرچ کیا جا رہا ہے اس کی شخصی حیثیت کو بھی مدنظر رکھا جانا چاہیے۔

جس مقام پر حاجتمندوں کی حفاظت آبرو اور زیادہ خلوص مقتضی ہو کہ انفاق کو پوشیدہ رکھا جائے وہاں پوشیدہ ہی رہنا چاہیے اور جہاں دیگر مصالح مثلاً شعائر مذہبی کی تعظیم اور دوسروں کو تشویق و ترغیب دلانا مقصود ہو اور کسی مسلمان کی ہتک حرمت بھی نہ ہوتی ہو وہاں ظاہری طور پر خرچ کرو۔ ایسے افراد کو اجر اور اچھے بدلے کی خوشخبری دیتے ہوئے فرماتا ہے: ان کا اجر و ثواب خدا کے پاس ہے اور ان کے لیے کوئی وحشت و خوف اور غم و اندوہ نہیں ہے

---

[1] "نور الثقلین" ج ۱ ص ۲۹۰-۲۹۱ اس حدیث کا مضمون اہل سنت کی کتب تفاسیر میں بھی نقل ہوا ہے۔ درمنثور میں یہی حدیث ابن عساکر، طبرانی، ابوحاتم، ابن جریر اور دیگر بہت سے مؤلفین کے حوالے سے نقل کی گئی ہے۔



"فلھم اجرھم عند ربھم ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون"؛

ہم جانتے ہیں کہ انسان اپنی زندگی کو جاری و ساری رکھنے اور اس کا انتظام کرنے کے لیے اپنے آپ کو مال و دولت سے بے نیاز نہیں سمجھتا۔ اس لیے جب اسے ہاتھ سے دے بیٹھتا ہے تو حزن و ملال کا شکار ہو جاتا ہے اور اپنی آئندہ زندگی کے لیے بھی پریشان ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ اس کے حالات آئندہ کیسے رہیں گے۔ یہی خیال بہت سے مواقع پر اسے خرچ کرنے سے روک لیتا ہے۔ مگر جو لوگ خدا کے وعدوں پر ایمان رکھتے ہیں اور خرچ کرنے کے اجتماعی آثار کو بھی سمجھتے ہیں وہ راہ خدا میں خرچ کرنے سے مستقبل کے لیے کسی خوف و وحشت میں مبتلا نہیں ہوتے اور اپنی کچھ دولت خرچ کر دینے پر غمزدہ نہیں ہوتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ وہ اس کے بدلے میں پروردگار کے ہاں کئی مراتب حاصل کریں گے اور اس کے بہت فضل سے بہرہ مند ہوں گے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ انہیں اس دنیا میں اور آخرت میں اس عمل کے ذریعے انفرادی، اجتماعی اور اخلاقی برکات حاصل ہوں گی۔

۲۷۵۔ اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○

۲۷۶۔ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ○

۲۷۷۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○



ترجمہ

۲۷۵۔ جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ تو بس اُس شخص کی طرح کھڑے ہوتے ہیں جسے شیطان نے چھو کر باؤلا کر دیا ہو اور وہ اپنے اعتدال کو برقرار نہ رکھ سکتا ہو (کبھی زمین پر گر پڑتا ہو اور کبھی کھڑا ہو جاتا ہو) یہ سب اِس لیے ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ بیع بھی سود کی طرح ہے (اور ان دونوں میں کوئی فرق نہیں جب کہ اللہ نے بیع کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے (کیونکہ دونوں میں بہت فرق ہے) اور اگر کسی تک خدا تعالیٰ کی طرف سے نصیحت پہنچ جائے اور وہ (سود خوری سے) بچ جائے تو وہ سود جو (اس کی حرمت کے حکم کے نازل ہونے سے) پہلے اسے مل چکا ہے وہ اس کا مال ہے (اور اس حکم میں گذشتہ مال شامل نہ ہوگا) اور اس کا معاملہ خدا کے سپرد ہو جائے گا (اور وہ اس گذشتہ معاملے کو بخش دے گا۔ لیکن جو لوگ لوٹ جائیں (اور اس گناہ کا نئے سرے سے ارتکاب کریں وہ اہل آتشِ جہنم میں ہوں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

۲۷۶ــــ اللہ سود کو نابود کر دے گا اور صدقات کو بڑھائے گا اور خدا کسی ناشکر گزار گنہ کار کو دوست نہیں رکھتا۔

۲۷۷ــــ جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے اچھے اعمال انجام دیے اور نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کی ان کی اجرت و ثواب ان کے پروردگار کے پاس ہے ان کے لیے کوئی خوف ہے نہ وہ کسی حزن و ملال میں مبتلا ہوں گے۔

تفسیر

سُود خوری قرآن کی نظر میں

گذشتہ آیات میں حاجت مندوں کے لیے مال خرچ کرنے اور رفاہ عامہ کے کام سر انجام دینے کے بارے میں گفتگو تھی۔ اِن آیات میں سود خوری کا مسئلہ زیرِ بحث آیا ہے۔ سود خوری کا اثر اور نتیجہ انفاق کے اثر اور نتیجے کی ضد ہے۔ ان آیات کا مقصد دراصل گذشتہ آیات کے سلسلے کی تکمیل کرنا ہے کیونکہ سود طبقاتی تفاوت میں اضافے، چند لوگوں کے پاس سرمائے کی ریل پیل اور معاشرے کے بیشتر لوگوں کی محرومیت کا سبب بنتا ہے۔

اِن آیات میں سختی سے سود کے بارے میں حکم اور اس کی حُرمت بیان کی گئی ہے آیات کے لب و لہجے سے معلوم ہوتا ہے کہ قبل ازیں بھی سود کے بارے میں گفتگو ہو چکی ہے۔ قرآنی سورتوں کی تاریخِ نزول کی طرف توجہ کرنے سے یہ معاملہ اسی طرح معلوم ہوتا ہے۔



قرآن کے نزول کی ترتیب کے مطابق سب سے پہلے جس سورۃ میں سود کے متعلق گفتگو ہوئی ہے وہ سورہ روم ہے کیونکہ سورۃ روم تیسویں سورت ہے جو مکہ میں نازل ہوئی اِس سُورت کے علاوہ کسی اور مکی سورت میں سود کے بارے میں کوئی حکم نظر نہیں آتا لیکن اس میں بھی سود کے بارے میں اخلاقی نصیحت کے طور پر گفتگو کی گئی ہے اور فرمایا گیا ہے کہ سود خوری بارگاہِ پروردگار میں کوئی پسندیدہ کام نہیں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"وما اٰتیتم من ربا لیربوا فی اموال الناس فلا یربوا عند اللہ"

یعنی ہوسکتا ہے کوتاہ بین افراد کی نظر میں سود خوری سرمائے میں اضافے کا ذریعہ ہو لیکن بارگاہِ خدا میں اس سے کوئی زیادتی نہیں ہوتی۔ (روم - ۳۹)

پھر ہجرت کے بعد تین مدنی سورتوں میں سود کی بحث آئی ہے۔ ان سورتوں کی ترتیب یہ ہے، سورہ بقرہ، سورہ آل عمران اور سورہ نساء، سورہ بقرہ اگرچہ سورہ آل عمران سے قبل نازل ہوئی ہے لیکن بعید نہیں سورہ آل عمران کی آیت ۱۳۰ جس میں سود کی حرمت کا حکم ہے سورہ بقرہ اور زیر نظر آیات سے پہلے نازل ہوئی ہو۔

بہر حال یہ آیت اور سود کے بارے میں دیگر آیات اِس وقت نازل ہوئی ہیں جب سود خوری مکہ، مدینہ اور پورے جزیرۃ العرب میں کمال شدت سے رائج تھی اور طبقاتی زندگی، محنت کش طبقے کی لیسماندگی اور 'اشراف' کی سرکشی کا اہم عامل تھی لہٰذا سود کے خلاف اسلام کی جنگ اجتماعی امور کے بارے میں اس کے اہم معرکوں میں شمار ہوتی ہے۔

"الذین یأکلون الربوا لا یقومون الا کما یقوم الذی یتخبطہ الشیطٰن من المس"

"خبط" کا لغوی معنی ہے: "راہ چلتے یا اٹھتے وقت بدن کو اعتدال پر نہ رکھ سکنا"۔ آیت میں سود خور کو آسیب زدہ اور دیوانہ سے تشبیہ دی گئی ہے جو چلتے وقت اپنے بدن کو اعتدال میں نہ رکھ سکے اور صحیح طریقے سے قدم نہ اٹھا سکے۔

اِس سے مراد دُنیا میں سود خوروں کا اجتماعی چال چلن ہے کیونکہ ان کا یہ عمل دیوانوں کا سا ہے۔ وہ صحیح اجتماعی فکر نہیں رکھتے یہاں تک کہ وہ اپنے فوائد کو بھی نہیں پہچان پاتے کیونکہ تعاون، ہمدردی، انسانی جذبے اور دوستی جیسے مسائل ان کے نزدیک کوئی مفہوم نہیں رکھتے۔ دولت کی پرستش نے ان کی آنکھوں کو ایسا اندھا کر رکھا ہے کہ وہ نہیں سمجھتے کہ پسے ہوئے طبقوں کا استحصال اور اُن کی محنت و زحمت سے حاصل ہونے والے مال کی غارت گری ان کے دلوں میں دشمنی کا بیج بوئے گی اور معاملہ ایسے انقلابات اور تغیرات تک جا پہنچے گا کہ مالکیت کی بنیاد ہی خطرے سے دوچار ہو جائے گی اور ایسی صورت میں معاشرے میں سے امن و امان اور راحت و سکون رخصت ہو جائے گا۔ اِس طرح سود خور بھی راحت و آسائش کی زندگی نہیں گزار سکیں گے لہٰذا ان کا چال چلن دیوانوں کا سا ہے۔

اِس سے مراد حشر و نشر کے وقت کھڑا ہونا اور میدانِ قیامت میں آنا بھی ہوسکتا ہے۔ یعنی سود خوار اُس جہاں میں زندہ ہونے کے وقت دیوانوں اور آسیب زدہ افراد کی طرح محشور ہوگا۔



اکثر مفسرین نے دوسرے احتمال کو قبول کیا ہے لیکن بعض نئے مفسرین نے پہلے احتمال کو ترجیح دی ہے لیکن انسان کے اعمال چونکہ اس جہان میں مجسم ہوکر پیش ہوں گے لہٰذا ممکن ہے آیت کا اشارہ دونوں معانی کی طرف ہو یعنی دنیا میں جن لوگوں کا قیام غیر عاقلانہ اور دیوانہ وار سرمایہ اندوزی ہے دوسرے جہان میں بھی وہ دیوانوں کی طرح محشور ہوں گے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ روایات میں دونوں مفاہیم کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ آیت کی تفسیر میں ایک روایت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے۔ آپ نے فرمایا:

"اٰکل الرّبٰوا لا یخرج من الدنیا حتٰی یتخبطه الشیطٰن"

سود خور جب تک پاگل پن کی ایک قسم میں مبتلا نہ ہو جائے دُنیا سے نہیں جاتا۔[1]

سُود خور جو صرف اپنے منافع کی فکر میں رہتے ہیں اور ان کی دولت ان کے لیے وبالِ جان بن جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کی حالت ایک روایت میں بیان کی گئی ہے۔ پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے:

"میں معراج پر گیا تو وہاں ایک گروہ کو اس حال میں دیکھا کہ ان کے پیٹ اتنے بڑے ہیں کہ وہ اٹھ کر چلنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ناکام رہتے ہیں اور اٹھنے کی کوشش میں بار بار زمین پر گر پڑتے ہیں۔ میں نے جبریل سے پُوچھا: یہ کون لوگ ہیں اور ان کا جرم کیا ہے۔ انہوں نے جواب دیا: یہ سُود خور ہیں"[2]

پہلی حدیث اس دُنیا میں سود خوروں کی پریشان حالی کو منعکس کرتی ہے اور دوسری میدانِ قیامت میں ان کے حالات بیان کرتی ہے۔ دونوں ایک ہی حقیقت سے مربوط ہیں۔ جیسے پیٹو لوگ بہت زیادہ موٹے ہوتے جاتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان میں بے عقلی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ سرمایہ دار بھی سود خوری کی وجہ سے موٹے ہوجاتے ہیں ان کی غیر صحیح اقتصادی زندگی ان کے لیے وبال جان بن جاتی ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا جنون اور آسیب کا سرچشمہ شیطان ہے جس کی طرف زیر مطالعہ آیت میں اشارہ ہوا ہے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ آسیب اور جنون نفسیاتی بیماریوں میں سے ہیں اور ان کے زیادہ تر عوامل کی شناخت ہو چکی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ کچھ لوگوں کا اعتقاد ہے کہ "مس الشیطان" کی تعبیر نفسیاتی بیماری اور جنون کے لیے کنایہ ہے اور عربوں کے درمیان یہ تعبیر عام تھی۔ یہ نہیں کہ واقعاً شیطان روح انسانی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ لیکن بعید نہیں کہ بعض شیطانی کام اور بے سوچے سمجھے غلط اعمال ایک طرح کے شیطانی جنون کا سبب بنتے ہوں یعنی ان اعمال کے بعد شیطان کسی شخص پر اثر انداز ہوکر اس کے نفسیاتی اعتدال کو درہم برہم کر دیتا ہو۔ علاوہ ازیں جب غلط اور شیطانی کام پے درپے ہوتے رہیں تو ان کا یہ فطری اثر ہوتا ہے کہ انسان سے صحیح چیز کی تشخیص کا احساس اور منطقی طرز فکر چھن جاتی ہے۔

۱؎ تفسیر نور الثقلین ج ۱، ص۲۹۱　۲؎ تفسیر نور الثقلین ج ۱، ص۲۹۱



سودخوروں کی منطق

"ذٰلک بانھم قالوآ انما البیع مثل الربٰوا" :

آیت کے اس حصے میں سودخوروں کی یہ منطق بیان کی گئی ہے کہ تجارت اور سودخوری میں کوئی فرق نہیں یعنی دونوں ایک ہی طرح کا لین دین ہیں جنہیں طرفین اپنے ارادہ و اختیار سے انجام دیتے ہیں۔

قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے: خدا نے بیع اور تجارت کو حلال قرار دیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے۔ یعنی ان دونوں کے درمیان واضح فرق ہے۔ انہیں ایک دوسرے سے مشتبہ نہیں کرنا چاہیے (و احل اللہ البیع وحرم الربٰوا)

قرآن نے اس کی مزید تفصیل اس لیے بیان نہیں کی کہ یہ بالکل واضح ہے۔ اس سلسلے میں بعض پہلو یہاں ذکر کئے جاتے ہیں:

۱۔ عام خرید و فروخت میں طرفین نفع و نقصان میں برابر کے شریک ہوتے ہیں بعض اوقات دونوں کو نفع ہوتا ہے اور بعض اوقات دونوں کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے اور کبھی ایک کو نفع اور دوسرے کو نقصان ہوتا ہے جبکہ سودی معاملات میں سود خور کو کبھی نقصان نہیں ہوتا اور نقصان کے احتمال کا سارا بوجھ دوسرے کے کندھے پر جا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سودی ادارے دن بدن بڑے سرمایہ دار بنتے چلے جاتے ہیں ضعیف نحیف تر ہوتے چلے جاتے ہیں اور دولتمندوں کی ثروت کا حجم ہمیشہ بڑھتا رہتا ہے۔

۲۔ عام تجارت اور خرید و فروخت میں طرفین تولید اور مصرف کی راہ میں قدم اٹھاتے ہیں جبکہ سود خور اس سلسلے میں کوئی مثبت عمل سرانجام نہیں دیتا۔

۳۔ سودخوری کے عام ہو جانے سے سرمایہ غلط اور غیر صحیح راستے پر استعمال ہونے لگتا ہے اور اقتصاد کے ستون جو معاشرے کی بنیاد ہیں متزلزل ہو جاتے ہیں۔ جبکہ تجارت سرمائے کی درست اور صحیح گردش کا سبب ہے۔

۴۔ سودخوری طبقاتی کشمکشوں اور جنگوں کا ذریعہ ہے جب کہ صحیح تجارت اس طرح نہیں ہے وہ معاشرے کو کبھی طبقاتی تقسیم اور اس سے پیدا ہونے والی جنگوں کی طرف نہیں کھینچتی۔

"فمن جآءہ موعظۃ من ربہ فانتھٰی فلہ ما سلف وامرہ الی اللہ":

اس جملے میں کہا گیا ہے کہ جن لوگوں کے پاس سود کی حرمت کے بارے میں خدائی نصیحت پہنچ جائے اور وہ یہ کام چھوڑ دیں، جو سود وہ اس حکم کے نزول سے قبل لے چکے ہیں وہ انہی کی ملکیت ہے یعنی یہ قانون ہر دوسرے قانون کی طرح ماقبل پر لاگو نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ اگر قوانین گذشتہ امور پر بھی نافذ ہو جائیں تو بہت سی مشکلات پیدا ہو جائیں اور زندگی شدید اتار چڑھاؤ کا شکار ہو جائے۔ اس لیے قوانین جب بنتے ہیں اس وقت سے نافذ ہوتے ہیں۔

البتہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ سودخوروں کے حساب میں اگر کچھ سود لوگوں کے ذمے ابھی باقی تھا تو اس آیت کے نزول کے بعد بھی وہ لے سکتے تھے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ جو سود وہ اس وقت تک لے چکے تھے وہ حلال کر دیا گیا ہے۔

مزید فرمایا گیا ہے۔ "وامرہ الی اللہ" یعنی ان کا معاملہ قیامت میں خدا کے سپرد ہوگا۔ اس جملے کا



ظاہری مفہوم تو یہ ہے کہ سزا یا معافی کے بارے میں ان لوگوں کا مستقبل واضح ہے لیکن گذشتہ حصے کی طرف توجہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مراد عفو ہی ہے گویا سود اتنا بڑا گناہ ہے کہ جو لوگ پہلے یہ کام کرتے تھے۔ ان کی معافی کا ذکر بھی صراحت سے کرنا پڑا ہے تاکہ بات مخفی نہ رہے۔

"ومن عاد فاولئک اصحب النار ھم فیھا خلدون":

یعنی جو شخص خدا تعالیٰ کی طرف سے اس نصیحت اور بار بار کی تاکید کے باوجود اس عمل سے دستکش نہ ہو اسے چاہیے کہ پروردگار کے دردناک اور دائمی عذاب کا منتظر رہے۔

دائمی عذاب اگرچہ اہل ایمان کے لیے نہیں ہے لیکن آیت میں ایسے سود خوار مراد ہیں جو خدا سے جنگ اور دشمنی کرتے ہوئے نہایت ڈھٹائی سے اس گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ مسلم ہے کہ ایسے لوگوں کا ایمان صحیح نہیں ہے۔ اسی لیے آیت میں ان کے لیے دائمی عذاب کی خبر دی گئی ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہاں دوام سے مراد طولانی عذاب ہے نہ کہ دائمی اور اس کی مثال سورہ نساء کی آیت ۹۳ ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہمیشہ سود خوری میں مبتلا رہنے کی وجہ سے انسان بغیر ایمان کے دنیا سے آنکھیں موند لے۔

"یمحق اللہ الربوا ویربی الصدقت":

"محق" کا معنی ہے "نقصان" اور "تدریجاً نابود ہونا" اور "ربا" "تدریجی رشد و نمو" کو کہتے ہیں۔

سود خور چونکہ اپنی دولت کے ذریعے محنت کش طبقے کے پسینے کی کمائی سمیٹتا ہے اور بعض اوقات اس طرح سے ان کے وجود ہی کو ختم کر دیتا ہے یا کم از کم ان کے دل میں دشمنی پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے اور حالت یہاں تک جا پہنچتی ہے کہ وہ آہستہ آہستہ سود خور کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں اور یوں خود سود خور کی جان اور مال خطرے سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے: اللہ سودی طریقے کو نابودی کی طرف لے جاتا ہے۔ تدریجاً واقع ہونے والی یہ نابودی جیسے سود خوروں کیلئے ہے اسی طرح سود خور معاشرے کے لیے بھی ہے ان کے مقابلے میں جو لوگ انسانی جذبوں کا احترام کرتے ہیں اور ہمدردی اور غمخواری کا راستہ اختیار کرتے ہیں، اپنے سرمائے اور مال میں سے خرچ کرتے ہیں اور لوگوں کی احتیاج پوری کرنے کی کوشش کرتے ہیں انہیں عوام کی طرف سے محبت اور احترام حاصل ہوتا ہے۔ ان کا سرمایہ نہ فقط یہ کہ خطرے سے دوچار نہیں ہوتا ہے بلکہ عوام کے تعاون سے طبیعی رشد حاصل کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کہتا ہے: انفاق کرنے میں اللہ تعالیٰ اضافہ عطا کرتا ہے۔ یہ حکم فرد اور معاشرہ دونوں کے لیے ایک سا ہے۔ جس معاشرے میں عام لوگوں کی ضروریات پوری کی جاتی ہیں اس کے محنت کش اور کاریگر طبقے کی فکری اور جسمانی صلاحیتیں بہتر طور پر کام کرتی ہیں اور یہی طبقہ معاشرے کی اکثریت ہوتا ہے۔ اس طرح سے ایک صحیح اقتصادی نظام وجود میں آتا ہے جس کی بنیاد عوام کا تعاون اور عوام کی ضرورت کی کفالت پر استوار ہوتی ہے۔

"واللہ لا یحب کل کفار اثیم":

"کفار" مادہ "کفور" (بروزن "فجور") سے ہے۔ کفور اس شخص کو کہتے ہیں جو بہت ہی ناشکرا اور کفران نعمت کرنے والا ہو اور "اثیم" "زیادہ گناہ کرنے والے" کو کہتے ہیں۔



اس جملے میں کہا گیا ہے کہ سود خور نہ صرف یہ کہ راہ خدا میں خرچ نہ کرکے، قرض حسنہ نہ دے کر اور عام مزدور تمندوں کے کام نہ آکر خدا کی عطا کردہ نعمتوں کا شکریہ ادا نہیں کرتے بلکہ اس کے ذریعے ہر قسم کا ظلم و ستم اور گناہ و فساد کرتے ہیں اور یہ فطری بات ہے کہ خدا ایسے لوگوں کو دوست نہیں رکھتا۔

" انّ الّذین اٰمنوا و عملوا الصّٰلحٰت و اقاموا الصّلٰوۃ و اٰتوا الزّکٰوۃ لھم اجرھم عند ربّھم":

ناشکر گزار گنہ گار سود خوروں کے مقابلے میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ایمان کے زیر سایہ خود پرستی کو ترک کیے ہوئے اپنے فطری جذبوں کو زندہ کیے ہوئے ہیں ۔ یہ لوگ اپنے پروردگار سے رابطہ قائم رکھے ہوئے ہیں ۔ نماز قائم کرتے ہیں ۔ حاجتمندوں کے کام آتے ہیں اور ان کی حمایت میں پیش پیش ہوتے ہیں ۔ اس طرح وہ سرمائے کے ارتکاز، طبقاتی کشمکش اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ہزاروں جرائم کی راہ روکے ہوئے ہیں ۔ ان کی جزا اُن کے پروردگار کے پاس ہے اور وہ دونوں جہانوں میں اپنے نیک عمل کے نتیجے سے بہرہ مند ہوں گے۔

فطری امر ہے کہ ایسے لوگوں کے لیے اضطراب اور پریشانی کے عوامل پیدا نہیں ہوتے اور جو خطرات مفت خور سرمایہ داروں کو لاحق تھے اور ان پر جو لعن طعن اور نفرین ہوتی تھی ایسے لوگوں پر نہیں ہوتی۔

مختصر یہ کہ وہ مکمل راحت، آرام اور اطمینان سے بہرہ یاب ہوں گے اور ان کے لیے کسی قسم کا اضطراب اور غم و اندوہ نہیں ہے۔ " ولا خوفٌ علیھم ولا ھم یحزنون"

۲۷۸۔ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ○

۲۷۹۔ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَکُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِکُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ ○

۲۸۰۔ وَاِنْ کَانَ ذُوْ عُسْرَۃٍ فَنَظِرَۃٌ اِلٰی مَیْسَرَۃٍ ؕ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○



ترجمہ

۲۷۸۔ اے ایمان والو! خدا سے ڈرو اور جو ربا (کا تقاضا ابھی) باقی ہے اُسے چھوڑ دو اگر تم ایمان رکھتے ہو۔

۲۷۹۔ اگر ایسا نہیں کرتے ہو تو پھر خدا اور رسول سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ توبہ کر لو تو (سود کے بغیر اصل) سرمایہ تمہاری ہی ملکیت رہے گا۔ تم ظلم کرو نہ تم پر ظلم کیا جائے گا۔

۲۸۰۔ اور اگر (مقروض قرض) ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تو اُسے اتنی مہلت دو کہ وہ ایسا کر سکے اور (اگر وہ بالکل ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تو) بخش دو تو بہتر ہے۔ اگر (تم اِس کام کے فائدے سے) آگاہ ہو۔

شان نزول

علی بن ابراہیم کی تفسیر میں ہے کہ سود کی آیات کے نزول کے بعد خالد بن ولید نامی ایک شخص پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کہنے لگا: میرے باپ نے ثقیف قبیلے سے سُودی معاملات تھے اور اس نے مطالبات وصول نہیں کیے تھے اور مجھے وصیت کر گیا تھا کہ اس کا سودی مال جو ابھی تک اُس نے وصول نہیں کیا حاصل کر لوں اور اپنی تحویل میں لے لوں۔ کیا یہ عمل میرے لیے جائز ہے؟

اِس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور لوگوں کو ایسے کام سے سختی سے روک دیا گیا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے یہ آیت نازل ہونے کے بعد فرمایا۔

"الا کل ربا من ربا الجاهلیة موضوع و اول ربا اضعه ربا العباس ابن عبد المطلب":

آگاہ رہو کہ زمانہ جاہلیت کے لوگوں کے تمام سودی مطالبات چھوڑ دیے جائیں اور سب سے پہلے میں عباس بن عبدالمطلب کے سودی مطالبات ترک کرنے کا اعلان کرتا ہوں۔

اِس روایت سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ جب پیغمبر اکرمؐ زمانۂ جاہلیت کے سودی مطالبات پر سُرخ قلم پھیر رہے تھے تو آپؐ نے یہ کام اپنے رشتے داروں سے شروع کیا اور اگر اُن میں عباس بن عبدالمطلب جیسے دولت مند افراد تھے کہ جو زمانہ جاہلیت میں دیگر سرمایہ داروں کی طرح اِس گناہ میں آلودہ تھے تو آپؐ نے سب سے پہلے انہی کے سُودی تقاضوں کو ممنوع قرار دیا۔

تفسیر

پہلی آیت میں خدا تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو مخاطب فرمایا ہے، انہیں پرہیزگاری کی وصیت کے بعد فرمایا گیا ہے کہ



اگر وہ ایمان رکھتے ہیں تو اپنے باقی ماندہ سودی مطالبات بھول جائیں۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ آیت ایمان باللہ سے شروع ہوتی ہے اور ایمان ہی کے تقاضے پر ختم ہوتی ہے۔ یہ امر اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ سود روحِ ایمان کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔

"فان لم تفعلوا فأذنوا بحرب من الله ورسوله":

اس آیت میں قرآن نے اپنے لب ولہجہ کو بدل دیا ہے۔ پہلی آیت کی نصیحتوں کے بعد اس آیت میں سود خوروں پر شدید حملہ کیا ہے اور انہیں خطرے کا الارم دیا ہے۔ حکم ہوتا ہے کہ اگر انہوں نے اپنا کام جاری رکھا اور حق وحقیقت کے سامنے سر تسلیم خم نہ کیا اور اسی طرح محروم لوگوں کا خون چوستے رہے تو پیغمبرؐ مجبور ہیں کہ فوجی طاقت سے انہیں روکیں اور حق کے سامنے جھکا دیں۔ حقیقت میں پیغمبرؐ کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔ یہ وہی جنگ ہے جو اس قانون کے تحت انجام پاتی ہے:

فقاتلوا التی تبغی حتی تفیء الی امر الله" (حجرات: آیۃ ۹)

تجاوز اور بغاوت کرنے والے گروہ سے جنگ کرو تاکہ وہ فرمانِ خدا کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔ (حجرات - ۹)

یہی وجہ ہے کہ جب امام صادق علیہ السلام نے ایک شخص کے بارے میں سنا کہ وہ بڑی جرأت سے سود کھاتا ہے اور اس نے اس کا نام لبا (دودھ) رکھا ہے تو فرمایا:

"اگر مجھے اس پر دسترس حاصل ہو جائے تو اسے قتل کر دوں"۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم ان لوگوں کے لیے ہے جو اسلام میں حرمت سود کے منکر ہوں۔

بہر صورت اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ اسلامی حکومت طاقت کے ذریعے سود خوری کو روک سکنے کی مجاز ہے۔

"وان تبتم فلکم رءوس اموالکم لا تظلمون ولا تظلمون":

ارشاد ہوتا ہے: اگر توبہ کر لو اور سود خوری کی دوکان بڑھا دو تو تمہیں حق پہنچتا ہے کہ لوگوں کے پاس جو تمہارا اصلی سرمایہ ہے (سود چھوڑ کر) وہ لے لو اور یہ قانون ہر طرح سے عادلانہ ہے۔ کیونکہ یہ قانون ایک طرف تو تمہیں دوسروں پر ظلم کرنے سے روکتا ہے اور دوسری طرف تمہیں ظلم کے وار سے بچاتا ہے۔ اس طرح نہ ظالم بنو گے اور نہ مظلوم۔

"لا تظلمون ولا تظلمون" اگرچہ یہ سود خوروں کے بارے میں آرہا ہے لیکن درحقیقت یہ وسیع مفہوم کا حامل نہایت قیمتی اسلامی شعار ہے جو کہتا ہے کہ جس طرح مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ظلم کرنے سے پرہیز کریں اس طرح اپنے آپ کو ظلم و ستم کے سپرد کرنے سے بھی اجتناب کریں۔ اصولی طور پر اگر ستم کش نہ ہوں تو ستمگر بھی کم پیدا ہوں گے۔ اگر مسلمان اپنے حقوق کے دفاع کا پورا حوصلہ اور آمادگی رکھتے ہوں تو کوئی ان پر ظلم نہیں کر سکتا۔ لہٰذا ظالم کو ظلم سے منع کرنے سے پہلے مظلوم سے کہو کہ ظلم نہ سہے۔

"وان کان ذو عسرة فنظرة الی میسرة":

قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے کہ (سود کے بغیر) اصل سرمایہ طلبگار کا حق ہے۔ اس آیت میں مقروض کا ایک حق بیان کیا گیا ہے کہ اگر وہ اپنا قرض ادا کرنے سے عاجز ہو تو نہ صرف یہ کہ زمانہ جاہلیت کی رسم کے مطابق ان پر نیا سود نہ لگایا جائے



اور انہیں ستایا نہ جائے بلکہ اصل قرض کی ادائیگی پر بھی انہیں مہلت دی جانا چاہیے تاکہ جب وہ واپس کر سکنے کے قابل ہوں اُس وقت لوٹا سکیں۔ قوانین اسلامی میں جو دراصل اس آیت کے مفہوم کو واضح کرتے ہیں یہ تصریح ہو چکی ہے۔ کبھی بھی مقروض افراد کے گھر اور دیگر ضروری وسائل کو قرق کر کے اس سے قرضہ وصول نہیں کیا جا سکتا بلکہ ضروریاتِ زندگی سے زائد مال پر طلبگار اسی سے اپنا حق لے سکتے ہیں اور یہ انسانی معاشرے کے ضعیف اور پسماندہ طبقے کی بہت واضح حمایت ہے۔

"وان تصدقوا خیر لکم ان کنتم تعلمون":

اس سے بھی آگے بڑھ کر فرمایا گیا ہے: اگر مقروض اپنا قرضہ ادا کرنے سے واقعاً بالکل عاجز ہو تو بہتر ہے کہ طلب گار ایک عظیم تر انسانی قدم اٹھائے اور اپنے مال سے صرف نظر کر لے اور یہ اس کے لیے ہر لحاظ سے بہتر اور انسانی ہمدردی کا اچھا مظہر ہے اور جو شخص اس عمل خیر کے فوائد سے آگاہ ہو جائے گا وہ واقعیت کی تصدیق کرے گا۔

۲۸۱۔ وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝

ترجمہ

۲۸۱۔ اور اس دن سے ڈرو جب خدا کی طرف پلٹ جاؤ گے اور پھر ہر شخص نے جو کچھ انجام دیا ہوگا اسے لوٹا دیا جائے گا اور ان پر ظلم و ستم نہیں ہوگا (بلکہ وہ جو کچھ بھی دیکھیں گے وہ ان کے اپنے اعمال کے نتائج ہوں گے۔

تفسیر

قرآن مجید کا طریقہ ہے کہ جزوی احکام اور اسلامی پروگرام بیان کرنے کے بعد بہت سے مواقع پر آخر کار ایک کلی، عمومی اور جامع اصول بیان کرتا ہے تاکہ احکام کی مزید تاکید ہو جائے اور وہ پوری طرح فکر اور روح کی گہرائیوں میں اتر جائیں لہٰذا اس آیت میں لوگوں کو قیامت اور بدکاروں کے اعمال کے عذاب کی طرف توجہ دلاتے ہوئے بیدار کیا گیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ وہ متوجہ رہیں کہ ایک ایسا دن آنے والا ہے کہ انسان کے تمام اعمال بغیر کسی کمی بیشی کے اسے لوٹا دیے جائیں گے اور وہ تمام چیزیں جو عالمِ ہستی کے دفتر ضبط و ثبت میں محفوظ ہیں، ایک ہی مقام پر اسے دے دی جائیں گی یہ وہ مقام ہوگا جہاں وہ ان اعمال کے بُرے نتائج سے خوف زدہ ہوگا لیکن یہ تو جو کچھ بویا تھا اُس کا حاصل ہوگا اور کسی کی طرف اس پر کوئی ظلم نہ ہوگا بلکہ یہ تو خود انسان ہے جو اپنے اوپر ظلم و ستم روا رکھتا ہے۔ وهم لا يظلمون۔

ضمناً یہ آیت دوسرے جہان میں انسانی اعمال مجسم ہونے پر ایک اور شاہد ہے۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ تفسیر در منثور میں کئی طریقوں سے منقول ہے کہ یہ پیغمبر اسلامؐ پر نازل ہونے والی آخری آیت ہے اس مضمون کی طرف توجہ کی جائے تو یہ بات بعید بھی نظر نہیں آتی۔ سورہ بقرہ اگرچہ پیغمبر اکرمؐ پر نازل ہونے والی آخری سورت نہیں



ہے تاہم یہ بات پہلی بات سے کوئی اختلاف نہیں رکھتی کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ بعض اوقات بعد میں نازل ہونے والی آیات حکم رسولؐ سے پہلی سورتوں میں شامل کرلی گئی ہیں ۔

سود خوری کے نقصانات

سُود خوری معاشرے کے اقتصادی اعتدال کو تباہ کردیتی ہے اور دولت وثروت کے ارتکاز کا سبب بنتی ہے کیونکہ اس کے ذریعے فقط ایک طبقہ فائدہ اٹھاتا ہے اور تمام تر اقتصادی نقصان دوسرے طبقے کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ یہ جو ہم سنتے ہیں کہ امیر اور غریب ملکوں میں دن بدن فاصلہ بڑھ کر رہا ہے تو اس کی ایک اہم وجہ سود ہے اس کے بعد خون آشام جنگیں برپا ہوں گی ۔

سُود خوری ایک قسم کا غیر صحیح اقتصادی مبادلہ ہے جو انسانی جذبوں اور رشتوں کو کمزور کردیتا ہے اور دلوں میں کینے اور دشمنی کا بیج بوتا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ سود خوری نظام اِس بنیاد پر استوار ہے کہ سود خور صرف اپنا مالی مفاد پیشِ نظر رکھتا ہے اور مقروض کے نقصان پر اس کی قطعاً کوئی نظر نہیں ہوتی ۔

یہی مقام ہے جہاں مقروض سمجھتا ہے کہ سود خور پیسے کو اسے اور دوسروں کو بے بس کرنے کا ذریعہ بنائے ہوئے ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سود دینے والا اپنی ضرورت کے ماتحت سُود دینے پر تیار ہوتا ہے لیکن وہ اس بے انصافی کو کبھی فراموش نہیں کرسکتا ۔ معاملہ کبھی یہاں تک جا پہنچتا ہے کہ مقروض سُود خور کے پنجوں کی سخت گرفت شدت سے محسوس کرتا ہے ایسے موقع پر اس بے چارے کا سارا وجود سود خور کو لعنت اور نفرین کرتا ہے اور وہ اس کے خون کا پیاسا ہوجاتا ہے ۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ جو کمائی وہ جان کی بازی لگاکر کرتا ہے وہ سود خور کی جیب میں جارہی ہے ۔ ان حالات میں ایسا بحران پیدا ہوتا ہے کہ بہت سے وحشت ناک جرائم سامنے آتے ہیں ۔ کبھی مقروض خودکشی کرلیتا ہے کبھی شدید کرب سے دوچار ہوکر سود خور کو المناک طریقے سے قتل کردیتا ہے اور کبھی نتیجۃً اجتماعی بحران ، عمومی افراتفری اور عوامی انقلاب کی صورت میں رونما ہوتا ہے ۔

تعاون کے رشتوں کی یہی کمزوری سود دینے والے اور سود لینے والے ممالک میں بھی واضح طور پر نظر آتی ہے ۔ وہ قومیں جو دیکھتی ہیں کہ ان کا سرمایہ سود کے نام پر دوسری قوم کی جیب میں جارہا ہے ۔ ایک خاص بغض کینے اور نفرت سے اُس قوم کو دیکھیں گی ۔ اُنہیں قرض کی ضرورت تو ہے لیکن وہ منتظر رہتی ہیں کسی مناسب موقع پر اپنے ردِّ عمل کا مظاہرہ کریں ۔

یہی وجہ ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ سود خوری اخلاقی نقطۂ نظر سے قرض لینے والے کے دل و دماغ پر بہت بُرا اثر مرتب کرتی ہے اور اس کے دل میں اِس بات کا کینہ ضرور رہ جاتا ہے ۔ اس سے افراد اور قوموں کے درمیان اجتماعی تعاون کا رشتہ ڈھیلا پڑ جاتا ہے [1]

اسلامی روایات میں ایک مختصر سے پُر معنی جملے کے ذریعے سود کے بُرے اخلاقی اثر کی طرف اشارہ ہوا ہے ۔

کتاب وسائل الشیعہ میں سود کی حرمت کی وجہ کے بارے میں ہے کہ ہشام بن سالم کہتا ہے امام صادق علیہ السلام

[1] کتاب "ربا خواری یا استثمار اقتصادی" کا مطالعہ فرمائیں۔



نے فرمایا :۔

"انما حرم اللہ عز وجل الربٰوا لکیلا یمتنع الناس من اصطناع المعروف"۔ ؎۱

خدا تعالیٰ نے سود کو حرام قرار دیا ہے تاکہ لوگ نیک کام کرنے سے رک نہ جائیں۔ ؎۲

۲۸۲- يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ
مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ۭ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ
وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ
وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا
يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْــــًٔـا ۭ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ
سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ ھُوَ فَلْيُمْلِلْ
وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ۭ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ
فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ
تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاۗءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ
اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ۭ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَاۗءُ اِذَا مَا دُعُوْا ۭ
وَلَا تَسْــَٔـمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ۭ
ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا
تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا
بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْھَا ۭ وَاَشْهِدُوْٓا
اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۠ وَلَا يُضَاۗرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ڛ وَاِنْ تَفْعَلُوْا

؎۱ "وسائل" ج ۱۲ ۔ ابواب ربوا ۔ باب ۱ ۔ ص ۴۲۲ ۔



فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ○

ترجمہ

۲۸۲۔ اے ایمان والو! جب ایک معین مدت کے لیے (قرض یا کسی اور معاملے کے لیے) ایک دوسرے سے لین دین کرو تو اسے لکھ لیا کرو اور لکھنے والے کو چاہیے کہ وہ عدل سے دستاویز لکھے اور جس شخص کو اللہ نے لکھنے پڑھنے کی قابلیت عطا کی ہے اسے چاہیے کہ وہ لکھنے سے گریز نہ کرے اور جس کے ذمے حق ہے اِملا وہ شخص کروائے اور خدا سے ڈرے اور طے شدہ معاملے میں کوئی چیز فروگزاشت نہ کرے اور اگر قرض لینے والا نادان یا ضعیف ہو (یا دیوانہ ہو) اور یا (گونگا ہونے کی وجہ) اِملا نہ کروا سکتا ہو تو اُس کے ولی کو چاہیے کہ (اس کی بجائے) عدل کو ملحوظ رکھتے ہوئے اِملا کروائے اور اپنے مردوں میں سے دو افراد کو (اِس حق پر) گواہ بنائے اور اگر دو مرد نہ ہوں تو اپنے حسب اطمینان ایک مرد اور دو عورتیں منتخب کر لو (یہ دونوں عورتیں مل کر ایک گواہ ہوں گی اور یہ دو عورتیں اِس لیے ہیں) تاکہ ایک بھول جائے تو دوسری اُسے یاد دلا دے اور جب گواہوں کو شہادت کے لیے بلایا جائے تو انہیں انکار نہیں کرنا چاہیے اور وہ معاملہ جس کی مدت معین ہے چاہے تھوڑا ہو یا زیادہ اُسے لکھنے پر دل تنگ نہیں ہونا چاہیے (جو کچھ بھی ہو لکھ لینا چاہیے) یہ خدا کے نزدیک عدل کے قریب تر ہے۔ شہادت کے لیے زیادہ سہولت اسی میں ہے اور شک و تردد اور بحث و نزاع کو روکنے کے لیے بھی بہتر ہے۔ ہاں البتہ جو لین دین تم دست بدست آپس میں کرتے ہو اگر اس میں نہ بھی لکھا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں اور نقد خرید و فروخت کے وقت بھی گواہ بنا لیا کرو۔ کاتب اور گواہ کو (حق گوئی کی وجہ سے) کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔ (اور نہ ان سے سختی کی جانا چاہیے) اور اگر ایسا کرو گے تو پروردگار کے فرمان سے نکل جاؤ گے۔ خدا سے ڈرتے رہو اور خدا تمہیں تعلیم دیتا ہے اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

تفسیر

تجارتی دستاویزات

جیسے قرآن نے سود خوری، ذخیرہ اندوزی اور بخل کے خلاف سخت جنگ کی ہے۔ اسی طرح تجارتی اور اقتصادی امور کے لیے تفصیلی قواعد بیان کیے ہیں۔ تاکہ جتنا زیادہ ہو سکے سرمایہ طبیعی رُشد حاصل کرے اور کسی قسم کا جھگڑا، اختلاف اور نزاع پیدا نہ ہو۔

محل بحث آیت قرآن حکیم کی طویل ترین آیت ہے۔ اس میں مالی لین دین کے قواعد کے سلسلے میں اٹھارہ احکام



بیان کیے گئے ہیں ۔ ذیل میں ہم ان قواعد کو ترتیب وار ذکر کرتے ہیں :

۱۔ جب کوئی شخص کسی کو قرض دے یا کوئی معاملہ انجام پائے اور طرفین میں سے ایک مقروض ہو جائے تو بعد میں ممکنہ کسی اشتباہ یا نزاع سے بچنے کے لیے معاملے کی ساری شرائط ضبط تحریر میں آجانا چاہئیں ۔

"یاایھا الذین اٰمنوآ اذا تداینتم بدینٍ الیٰ اجلٍ مسمّی فاکتبوہ ۔" :

یہ بات قابل توجہ ہے کہ آیت میں لفظ "قرض" نہیں بلکہ "دین" استعمال ہوا ۔ قرض صرف وہاں استعمال ہوتا ہے جہاں دو ایسی چیزوں کا تبادلہ ہو جو ایک دوسرے کی مثل ہوں ۔ مثلاً نقدی یا جنس قرض کے طور پر لی جائے اور اس سے فائدہ اٹھا کر اس کی مثل واپس کر دی جائے لیکن دین کا دامن وسیع تر ہے کیونکہ جیسا معاملہ انجام پائے ۔ مثلاً صلح ، اجارہ ، خرید و فروخت وغیرہ پھر اگر ایک طرف سے کچھ دینا ہو تو اسے دین کہتے ہیں ۔ اس بناء پر زیر بحث آیت ان تمام معاملات پر محیط ہے جو سلف یا نسیہ کے طور پر انجام پاتے ہیں یہاں تک کہ قرض بھی اس کے مفہوم میں داخل ہے ۔

۲۔ اطمینان کے حصول کے لیے اور طرفین میں سے کسی کی ممکنہ بے جا مداخلت سے بچنے کے لیے حکم دیا گیا ہے کہ دستاویز کوئی تیسرا شخص لکھے ۔

"ولیکتب بینکم کاتبٌ" :

اس جملے کے ظاہری مفہوم سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ دستاویز لکھنا واجب ہے ۔ لیکن بعد کی آیت میں فرمایا گیا ہے فان امن بعضکم بعضًا فلیؤدّ الذی اؤتمن امانتہ :

اگر تمہیں آپس میں اطمینان ہے کہ جس کے ذمے حق ہے وہ ادا کر دے گا تو تحریر موجود نہ ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تحریر اس صورت میں ضروری ہے جب آپس میں مکمل اطمینان نہ ہو اور احتمال ہو کہ معاملہ نزاع اور کشمکش تک جا پہنچے گا ۔

۳۔ کاتب کو چاہیے کہ دستاویز لکھتے وقت حق کو پیش نظر رکھے اور عین واقع کے مطابق لکھے (بالعدل) ۔

۴۔ جس شخص کو خدا تعالیٰ نے لکھنے پڑھنے کی قابلیت عطا فرمائی ہے اور وہ معاملے کے بارے میں احکام و شرائط سے آگاہ ہے اسے چاہیے کہ دستاویز لکھنے میں گریز نہ کرے بلکہ اس اجتماعی امر میں طرفین کی مدد کرے ۔

"ولا یاب کاتبٌ ان یکتب کما علمہ اللہ فلیکتب" :

"کما علمہ اللہ" مندرجہ بالا تفسیر کی روشنی میں دیکھا جائے تو آیۃ کا یہ حصہ مزید تاکید اور تشویق کے لیے معلوم ہوتا ہے ۔ نیز یہ ایک اور نکتے کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ جیسے خدا نے اسے تعلیم دی ہے تا انتہائی حد تک عدل اور ایمان داری کو ملحوظ رکھے اور اصطلاح کے مطابق بَیِّنَۃً و بَیْنَ اللہ دستاویز کو انتہائی سوچ بچار سے ترتیب دے ۔

البتہ دستاویز لکھنے کی دعوت قبول کرنا واجب عینی نہیں جیسا کہ اس جملے سے ظاہر ہوتا ہے :



" ولا تسئموآ ان تکتبوہ صغیرًا اوکبیرًا " :

یعنی کسی چھوٹی بڑی دستاویز کے لکھنے سے دل تنگ نہ ہونا۔

۵۔ چاہیے کہ معاملے کے دونوں فریق میں سے ایک دستاویز کی املا کروائے یعنی وہ کہتا جائے تاکہ کاتب لکھتا جائے ۔ لیکن طرفین میں سے ایسا کون کرے؟ اِس بارے میں آیت کہتی ہے کہ مقروض یعنی جسے حق ادا کرنا ہے وہ ایسا کرے (" ولیملل الّذی علیه الحق ")

ایسی دستاویزات میں ہمیشہ بنیادی اقرار تو مقروض ہی کا ہوتا ہے اور اُسی کے دستخط بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اس لیے جو متن اُس کے اعتراف اور املاء کروانے سے تیار ہوگا وہ ایک ایسی بنیاد بن جائے گا جس کا انکار نہیں ہو سکتا۔

۶۔ جس کے ذمہ حق واجب الادا ہے اُسے چاہیے کہ املاء کرواتے وقت خدا تعالیٰ کو پیش نظر رکھے اور کسی چیز کو فراموش نہ کرے اور تمام چیزیں کہے تاکہ کاتب لکھ لے " ولیتق الله ربّهٗ ولا یبخس منه شیئًا "

۷۔ اگر مقروض سفیہ و نادان ہو اپنے مالی امور کی دیکھ بھال نہ کر سکتا ہو اور اپنے نفع و نقصان کو نہ سمجھ سکتا ہو ضعیف و کمزور ، کوتاہ فکر ، کم عقل اور گونگا ہو بات کرنے کی قدرت نہ رکھتا ہو تو ان صورتوں میں اس کی جگہ اس کا ولی املاء کروائے گا اور دستاویز کو ترتیب دینے والا اسے لکھے گا "فان کان الّذی علیه الحق سفیهًا او ضعیفًا اولا یستطیع ان یمل هو فلیملل ولیّه " :

۸۔ " ولی " کو بھی چاہیے کہ املاء میں عدالت کو ملحوظ رکھے اور حق سے انحراف سے بچے ولیملل ولیّه بالعدل)

۹۔ طرفین کو دستاویز پر دو گواہ بھی بنانا چاہئیں (واستشهدوا شهیدین.) ۔

۱۰ - ۱۱ ۔ یہ دونوں گواہ بالغ اور مسلمان ہوں (من رجالکم.) "(کم.)" مسلمان ہونے کا معنی دیتا ہے کیونکہ " من رجالکم " کا لفظی معنی ہے " ایسے مرد جو تمہاری جماعت میں سے ہوں."

۱۲۔ ایک مرد اور دو عورتیں بھی گواہ ہو سکتے ہیں "فان لم یکونا رجلین فرجلٌ و امراتٰن ."

۱۳۔ گواہ قابل اعتماد ہونا چاہئیں (" ممّن ترضون من الشهدآء .") اس جملے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ گواہ ہر لحاظ سے پسندیدہ ہوں اور اس سے مراد اُن کی عدالت ہی ہے ۔ جیسا کہ روایات میں بھی آیا ہے ۔

۱۴ جب گواہ دو مرد ہوں تو ان میں سے ہر ایک مستقل گواہی دے سکتا ہے لیکن جب ایک مرد اور دو عورتیں ہوں تو پھر ان دو عورتوں کو چاہیے کہ ایک دوسرے سے مل کر متفق ہو کر گواہی دیں تاکہ ان میں سے ایک اشتباہ کرے تو دوسری اُسے یاد دلا دے ۔

رہا یہ سوال کہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر کیوں شمار کی گئی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ عورت نرم دل ہوتی ہے



اور ممکن ہے بعض اوقات کسی کے زیرِ اثر آجائے اس لیے اس کے ساتھ ایک اور عورت کو شامل کیا گیا ہے تاکہ وہ اسے کسی کے زیرِ اثر ہونے سے روک سکے "ان تضل احدٰھما فتذکر احدٰھما الاخرٰی"

۱۵۔ قرض تھوڑا ہو یا زیادہ اسے تحریر میں آجانا چاہیے کیونکہ اسلام چاہتا ہے کہ اقتصادی روابط میں کسی قسم کا جھگڑا اور نزاع نہ ہو۔ وہ کہتا ہے قرض کی کمی کی وجہ سے دستاویز لکھنے میں کوتاہی نہیں ہونا چاہیے ("ولا تسئموا ان تکتبوہ صغیرًا اوکبیرًا الیٰ اجلہ")

مستی اور خستگی کو "سامہ" کہتے ہیں "لا تسئموا" یعنی خستہ و دل تنگ نہ ہو جاؤ۔

یہاں قرآن مندرجہ بالا احکام کے فلسفہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ دستاویزات کی تیاری ایک طرف تو عدل و انصاف کی ضامن ہے اور دوسری طرف گواہوں کے لیے شہادت کے وقت تقویت و اطمینان کا باعث ہے اور تیسرا پہلو یہ ہے کہ افرادِ معاشرہ کے مابین نزاع پیدا ہونے میں رکاوٹ کا کام دیتی ہے "ذٰلکم اقسط عند اللہ واقوم للشھادۃ وادنیٰ الّا ترتابوا"

۱۶۔ جب معاملہ نقد بنقد ہو تو کسی سند یا دستاویز کی ضرورت نہیں ہے "الّا ان تکون تجارۃً حاضرۃً تدیرونھا بینکم فلیس علیکم جناحٌ الّا تکتبوھا"

"تجارۃً حاضرۃً" کا معنی ہے "نقد معاملہ" اور "تدیرونھا" کا مطلب ہے دست بدست پھیرنا جو کہ نقد معاملے ہی کی تاکید ہے۔

"فلا جناح" یعنی کوئی حرج نہیں۔ یہ لفظ ظاہر کرتا ہے کہ جب نقد معاملہ انجام پا رہا ہو اس وقت بھی کوئی دستاویز تیار کر لینا بہتر ہے کیونکہ اس طرح ہر طرح کا ممکنہ اشتباہ اور اعتراض ختم ہو جاتا ہے۔

۱۷۔ نقد معاملے میں اگرچہ تحریر ضروری نہیں البتہ گواہ بنا لینا چاہئیں ("واشھدوا اذا تبایعتم")

۱۸۔ آیت کے آخر میں حکم دیا گیا ہے کہ گواہوں اور کاتب پر کسی قسم کا تشدد اور سختی نہیں کی جانا چاہیے تاکہ وہ حق اور عدالت سے اپنا کام سرانجام دیں ("ولا یضآر کاتبٌ ولا شھیدٌ")۔

جو کچھ ہم نے مندرجہ بالا جملے میں کہا ہے اس سے معلوم ہوا کہ "یضآر" اصطلاح کے مطابق فعل مجہول ہے یعنی اسے اذیت نہ پہنچائی جائے۔

باقی رہا عدالت کے بارے میں کاتبوں اور گواہوں کے لیے حکم — تو وہ آیت کی ابتداء میں آچکا ہے اس لیے ضرورت نہیں کہ "لا یضآر" کو فعل معلوم سمجھیں اور اس کا معنی یہ لیں کہ "وہ اذیت نہ پہنچائیں"۔ مندرجہ بالا حکم کے بعد تاکید ہے کہ اگر کوئی شخص حق گوئی کی بناء پر گواہوں اور کاتبوں کو اذیت پہنچائے تو وہ فسق و گناہ کا مرتکب قرار پائے گا اور ایسا کرنا بندگیٔ خدا کے تقاضوں کے منافی ہے ("وان تفعلوا فانّہٗ فسوقٌ بکم")۔

یہ تمام احکام بیان کرنے کے بعد آخر میں لوگوں کو تقویٰ و پرہیزگاری اور اوامرِ الٰہی کی اطاعت کی دعوت دی گئی ہے ("واتقوا اللہ")۔ اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ جو چیزیں تمہاری مادی اور معنوی زندگی کے لیے ضروری ہیں وہ



خدا تعالیٰ تمہیں ان کی تعلیم دیتا ہے۔ ("ویعلمکم اللہ") وہ لوگوں کے فائدے اور نقصان سے آگاہ ہے اور جن چیزوں میں ان کی بہتری اور صلاح ہے وہی ان کے لیے مقرر کرتا ہے ("واللہ بکل شیء علیم")۔
ضمنی طور پر ("واتقوا اللہ و یعلمکم اللہ") سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا پرستی، آگاہی، روشن فکری اور علم و دانش میں اضافے پر تقویٰ اور پرہیزگاری گہرا اثر مرتب کرتی ہے اور جب انسان کا دل پاک ہو جاتا ہے تو وہ آئینے کی طرح حقائق کو اپنے اندر منعکس کر لیتا ہے۔

۲۸۳۔ وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۝ ع

ترجمہ

۲۸۳۔ اور اگر تم سفر میں ہو اور دستاویز لکھنے کے لیے کوئی کاتب میسر نہ آئے تو کچھ رہن رکھ لو (اور رہن کے طور پر دی گئی چیز قرض دینے والے کے قبضے میں ہونی چاہیے) اور اگر تم ایک دوسرے پر (کامل) اطمینان رکھتے ہو (تو پھر رہن کی بھی ضرورت نہیں) اور جسے امین سمجھا گیا ہے (اور بغیر کسی رہن کے اس نے دوسرے سے کوئی چیز لے لی ہے) اُسے چاہیے کہ امانت (اور اپنا قرض موقع پر) ادا کرے اور اُس اللہ سے ڈرے جو اُس کا پروردگار ہے اور شہادت کو نہ چھپاؤ کہ جو شخص اُسے چھپائے گا اس کا دل گنہ گار ہے اور جو کچھ تم انجام دیتے اللہ اس سے آگاہ اور اس کا عالم ہے۔

تفسیر

یہ آیت دراصل گذشتہ آیت کے مفاہیم کی تکمیل کرتی ہے۔ اس میں چند ایک احکام مزید بیان فرمائے گئے ہیں
۱۔ اگر لین دین کرتے وقت دستاویز لکھنے والا میسر نہ ہو، جیسا کہ سفر میں پیش آ سکتا ہے تو قرض لینے والا دوسرے کی تسلی کے لیے کوئی چیز گروی کے طور پر دے دے ("وان کنتم علی سفر ولم تجدوا کاتبا فرھٰن مقبوضۃ")۔



بادی النظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ رہن کا قانون سفر سے مخصوص ہے لیکن اگلے جملے ولم تجدوا کاتبًا (کاتب میسر نہ آئے تو) سے ظاہر ہوتا ہے کہ سفر کا ذکر مثال کے طور پر ایسے موقع کے لیے آیا ہے جب دستاویز لکھنے والا میسر نہ ہو۔ اس بناء پر وطن میں بھی طرفین صرف رہن پر اکتفا کر سکتے ہیں۔ تفاسیر اہل بیتؑ میں بھی اس حقیقت کیطرف اشارہ ہوا ہے۔ شیعہ و سُنی کتب احادیث میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ پیغمبر اسلامؐ نے اپنی زرہ ایک غیر مسلم کے پاس قرض لینے کے لیے رہن کے طور پر رکھی تھی۔

۲۔ رہن حتمی طور پر قرض دینے والے کے پاس رہنا چاہیے تاکہ اسے اطمینان رہے "فرھٰنٌ مقبوضۃٌ" تفسیر عیاشی میں ہے کہ امام صادقؑ فرماتے ہیں۔

لا رھن الّا مقبوضۃ ؟:

رہن رہن نہیں مگر وہ کہ جو طلب گار کی تحویل میں ہو۔

۳۔ دستاویز لکھنا، گواہ بنانا اور رہن رکھنا سب احکام ایسے مواقع کے لیے مخصوص ہیں جہاں طرفین ایک دوسرے کے بارے میں مکمل طور پر اطمینان نہ رکھتے ہوں ورنہ قرض دینے والے کو کسی دستاویز کی کوئی ضرورت نہیں اور مقروض کو بھی چاہیے کہ وہ اس کے اعتماد کا احترام کرے اور برمحل اس کا حق ادا کر دے اور تقویٰ کو فراموش نہ کرے۔

"فان امن بعضکم بعضًا فلیؤد الّذی اؤتمن امانتہٗ ولیتق اللہ ربہٗ" [۱]

۴۔ لین دین کا موقع ہو یا کوئی اور، اصولی طور پر جو لوگ جانتے ہیں کہ کس کا کیا حق ہے ان کی ذمہ داری ہے کہ جب انہیں گواہی کے لیے بلایا جائے تو وہ گواہی کو نہ چھپائیں کیونکہ گواہی کو چھپانا عظیم گناہوں میں شمار ہوتا ہے "ولا تکتموا الشھادۃ ومن یکتمھا فانّہٗ اٰثمٌ قلبہٗ"۔

یہ واضح ہے کہ گواہی دینا اُس صورت میں ہم پر واجب ہے جب دوسرے اپنی شہادت سے حق کو ثابت نہ کریں اگر کچھ لوگ اپنی گواہی سے حق ثابت کر دیں تو باقی لوگوں پر سے یہ ذمہ داری ساقط ہو جاتی ہے۔ اصطلاح میں گواہی دینا واجب کفائی ہے۔

شہادت کا مخفی رکھنا اور موقع کے مطابق اس کا اظہار نہ کرنا۔ یہ عمل چونکہ دل ہی کی مرضی سے انجام پاتا ہے اس لئے مزید تاکید کے طور پر گناہ کی نسبت دل کی طرف دی گئی ہے اور فرمایا گیا ہے: اس کا دل گناہگار ہے۔ [۲]

آیت کے آخر میں امانت اور دیگر حقوق کے بارے میں زیادہ سے زیادہ توجہ اور بیداری کے لیے فرمایا گیا ہے کہ پروردگار تمہارے کردار سے باخبر ہے ("واللہ بما تعملون علیمٌ")

---

[۱] "اؤتمن" امن کے مادہ سے ہے۔ اس کا معنی ہے اطمینان خاطر۔ اس سے مراد وہ مقروض ہے جسے امین سمجھا گیا ہے۔ دوسرے جملے میں امانت سے مراد قرض ہے یعنی اس صورت میں قرض امانت والا حکم رکھتا ہے۔ [۲] دل سے کیا مراد ہے اسکی وضاحت تفسیر نمونہ جلد اول ص (اردو ترجمہ) میں کی جا چکی ہے۔



۲۸۴ - لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۗ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا
فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۗ فَيَغْفِرُ لِمَنْ
يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○

ترجمہ

۲۸۴ - جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اللہ کا مال ہے (لہٰذا) جو کچھ تمہارے دل میں ہے اُسے ظاہر کردو یا پوشیدہ رکھو خدا تمہارا حساب اس کے مطابق ہی کرے گا۔ پھر جسے چاہے گا (اور جو اہل ہوگا) اُسے بخش دے گا اور جسے چاہے گا (اور وہ مستحق ہوگا) اسے عذاب دے گا اور خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

تفسیر

انسان سے جو گناہ سرزد ہوتے ہیں ان میں سے بعض اعمال خارجی پہلو رکھتے ہیں اور بعض داخلی اور قلبی پہلو رکھتے ہیں۔ مثلاً شہادت کو چھپانا اور شرک کرنا وغیرہ۔ مندرجہ بالا آیت اِس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ خدا تعالیٰ صرف ظاہری گناہوں کا محاسبہ نہیں کرے گا بلکہ باطنی اور قلبی پہلو رکھنے والے گناہ بھی احتساب کے عمل سے گذریں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ زمین و آسمان پر حاکم ہے اور کوئی چیز اس سے مخفی نہیں ہے۔ اندرونی اور قلبی گناہوں کا محاسبہ نہ کرسکنے والے وہ ہیں جو آسمان و زمین اور دُنیا کے ظاہر و باطن سے بے خبر ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ تمام چیزوں کا عالم ہے۔

اِس تفسیر سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ آیت ان بہت سی احادیث سے کوئی اختلاف نہیں رکھتی جن میں فرمایا گیا ہے کہ گناہ کی نیت گناہ نہیں ہے کیونکہ یہ احادیث ان نافرمانیوں کے بارے میں ہیں جو خارجی عمل کا پہلو رکھتی ہیں اور نیت ان کا مقدمہ اور تمہید ہے اور یہ احادیث اُن گناہوں کے بارے میں نہیں ہیں جو ذاتی طور پر اندرونی اور باطنی پہلو رکھتے ہیں اور قلبی عمل ہیں۔ آیت کا ایک اور معنی بھی ہے اور وہ یہ کہ ایک عمل کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں مثلاً انفاق ممکن ہے خدا کے لیے ہو یا شہرت طلبی کے لیے ہو۔ آیت کہتی ہے۔ تم اپنی نیت ظاہر کرو یا چھپائے رکھو، خدا اس سے آگاہ ہے اور اس کا محاسبہ کرے گا۔ درحقیقت اس آیت میں " لا عمل الا بالنیۃ " (نیت کے بغیر کوئی عمل نہیں) والی روایت کی وضاحت کی گئی ہے۔

اِس کے بعد فرمایا گیا ہے: جہاں وہ چاہتا ہے لغزشوں سے درگزر فرماتا ہے اور جہاں اس کا ارادہ ہو سزا دیتا ہے (فیغفر لمن یشآء و یعذب من یشآء۔) البتہ واضح ہے کہ بخشش و عذاب اور ہدایت و ضلالت کے بارے میں خدا کا ارادہ اور مشیت کسی حساب کے بغیر نہیں ہوتے بلکہ وہ اہلیت اور قابلیت کی بنا پر ہی ہیں جنھیں انسان



خود حاصل کرتا ہے اور پروردگار ہر چیز پر طاقت وقدرت رکھنے والا ہے۔

۲۸۵۔ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۗ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝

ترجمہ

۲۸۵۔ رسول اُس چیز پر ایمان لایا ہے جو اُس کے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہے (اور وہ ایسا رہبر ہے کہ اپنی تمام باتوں کی صداقت پر مکمل ایمان رکھتا ہے) اور مومنین بھی خدا کے فرشتوں، اس کی کتابوں اور اُس کے بھیجے ہوئے افراد پر ایمان رکھتے ہیں ہم اپنے رسولوں میں کسی میں کوئی فرق نہیں کرتے اور کہتے ہیں ہم نے سُنا ہے اور ہم اطاعت کرتے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار مغفرت تیری طرف سے ہے اور تیری ہی طرف (ہماری) بازگشت ہے۔

تفسیر

دیگر انسانی راہنماؤں کے مقابلے میں انبیاء کا ایک امتیاز یہ ہے کہ تمام انبیاء اپنے ہدف و مقصد اور دین و مکتب پر قطعی و یقینی ایمان رکھتے تھے اور ان کے عقیدے میں کسی قسم کا کوئی تزلزل نہ تھا۔ قرآن حکیم لوگوں کو ایسے پیغمبر کی طرف دعوت دیتا ہے جو اپنے پورے وجود سے اپنے مطلب و مدعا کا ادراک رکھتا ہے ارشادِ الٰہی ہے:۔

فَاٰمِنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ.

اللہ اور اس کے اُس رسول نبی اُمّی پر ایمان لے آؤ جو اللہ اور اس کے کلمات پر ایمان رکھتا ہے۔

زیر بحث آیت میں یہ نکتہ بیان کیا گیا ہے کہ خالق کائنات اور اس کے تمام پروگرام جو پیغمبر پر نازل (اعراف ۱۵۸) ہوئے ہیں پیغمبر کا ان پر مستحکم اور غیر متزلزل عقیدہ ہے بلکہ مومنین اور جو مکتب پیغمبر کے تربیت یافتہ ہیں وہ بھی



ایسے ہی ہیں۔ ان کے برعکس یہ لوگ ہیں:

یریدون ان یفرقوا بین اللہ و رسلہ ویقولون نؤمن ببعض ونکفر ببعض

خدا اور اُس کے پیغمبروں کے درمیان تفریق اور اختلاف کے قائل ہیں اور چاہتے ہیں کہ بعض پر ایمان لے آئیں اور بعض کا انکار کر دیں۔ (النساء - ۱۵۰)

زیر بحث آیت آگے کہتی ہے: وہ ایمان رکھتے ہیں کہ تمام انبیاء ایک ہی ہدف اور مقصد کے حامل ہیں اور ایک ہی مقصود کے لیے بھیجے گئے ہیں لہٰذا سب زبان حال سے کہتے ہیں: (لا نفرق بین احد من رسلہ۔) یعنی ہم خدا کے بھیجے ہوئے افراد میں کوئی فرق نہیں کرتے۔

البتہ یہ بات اِس امر سے تضاد نہیں رکھتی کہ گذشتہ تمام ادیان منسوخ ہو چکے ہیں کیونکہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ انبیاء کی تعلیمات مختلف کلاسوں کی تعلیم کی طرح ہیں۔ جب اعلیٰ کلاسوں میں ترقی کی جاتی ہے تو پہلی کلاسیں چھوٹ جاتی ہیں حالانکہ ان کا احترام برقرار رہتا ہے۔

بندگی کا اعتراف

اہل ایمان ہمیشہ بندگی اور عبودیت کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں: پروردگار! تیرے پیغمبر ہمیں تیری طرف بلانے کے لیے جو دعوت اور ندا دیتے ہیں ہم اسے دل و جان سے قبول کرتے ہیں اور تیری پیروی و اطاعت کی منزل میں داخل ہوتے ہیں۔ "وقالوا سمعنا و اطعنا"[لہ]

لیکن خدایا! آخر ہم انسان ہیں۔ کبھی ہمارے نفوس ہمیں لغزشوں سے بھی دوچار کر دیتے ہیں لہٰذا ہم تجھ سے بخشش کی اُمید رکھتے ہیں کیونکہ ہم نے بہرحال تیری ہی طرف پلٹنا ہے۔ غفرانک ربنا و الیک المصیر"[٣]

۲۸۶۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ

لہ "سمع" بعض اوقات کہنے اور تصدیق کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جس کی ایک مثال یہی آیت ہے۔ ٣ ادبی لحاظ سے یہاں (غفرانک) ... ہم تیری بخشش چاہتے ہیں کا مفہوم بھی مضمر ہے۔



عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا أَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝

ترجمہ

۲۸۶۔ خدا کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ ذمہ داری نہیں سونپتا (اسی بناء پر انسان) جو بھی (نیک) کام انجام دے اُس نے اپنے لیے انجام دیا ہے اور جو (بُرا) کام کرے خود اُس کے لیے نقصان دہ ہے (مومنین کہتے ہیں) پروردگار! اگر ہم بھول جائیں یا خطا کر گزریں تو ہمارا مؤاخذہ نہ کرنا۔ اے ہمارے رب! کسی سنگین ذمہ داری کا بوجھ ہم پر نہ ڈالنا جیسا کہ (گناہ و سرکشی کی وجہ سے) ان لوگوں پر ڈالا گیا جو ہم سے پہلے تھے۔ اے ہمارے پروردگار! ایسی سزائیں نہ دے جنہیں ہم برداشت نہیں کر سکتے اور ہمارے گناہوں کے آثار ہم سے دھو ڈال ہمیں بخش دے اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل کر دے تو ہمارا مولا اور سرپرست ہے پس ہمیں کُفّار کی جماعت پر کامیابی اور کامرانی عطا فرما۔

تفسیر

طاقت کے مطابق ذمہ داری

"وُسْع" کا لغوی معنی قدرت اور طاقت ہے۔ اس بناء پر آیت اِس عقلی حقیقت کی تائید کرتی ہے کہ خُدا کی طرف سے عائد ذمہ داریاں کبھی بشری طاقت سے ماوراء نہیں ہو سکتیں لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ یہ آیت تمام احکام کی تفسیر اور حد بندی کرتی ہے۔ تمام احکام یہ خصوصیت رکھتے ہیں کہ وہ انسانی قدرت و طاقت کے مطابق ہیں۔ ایک حکیم و عادل فقط ایسا ہی قانون بنا سکتا ہے۔

ضمنی طور پر اس بات سے اِس حقیقت کی پھر تائید ہو جاتی ہے کہ احکامِ شرعی کبھی حکم عقل کے منافی نہیں ہو سکتے۔ حکم شرع اور حکم عقل ہمیشہ دوش بدوش رہتے ہیں۔



"لھا ما کسبت وعلیھا ما اکتسبت":

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ انہی قوانین واحکام پر عمل سے انسانی سرنوشت مربوط ہے اس جملے کے مطابق ہر شخص اپنے نیک و بد عمل کا نتیجہ حاصل کرے گا۔ اس جہان میں اور آئندہ جہان میں اپنے کئے کا پھل پائے گا۔ اس طرح لوگوں کو ان کی ذمہ داری اور ان کے اعمال کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ اس طرح سے قرآن نے ان افسانوں پر خط بطلان کھینچ دیا ہے جن میں لوگوں کو ان کے اعمال سے بری قرار دیا گیا ہے یا بلاوجہ کسی کے اعمال کی جوابدہی کا ذمہ دار دوسروں کو قرار دیا گیا ہے۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ آیۂ شریفہ میں نیک اعمال کے لیے لفظ "کسب" اور برے اعمال کے لیے لفظ "اکتساب" استعمال کیا ہے۔ تعبیر کا یہ اختلاف شاید اس لیے ہے کہ "کسب" ان اعمال کے لیے بولا جاتا ہے جو بلا تکلف اور فطرت کے مطابق انجام دیے جاتے ہیں جب کہ "اکتساب" ان اعمال کے لیے استعمال ہوتا ہے جو انسانی فطرت کے خلاف ہوں اور یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ نیک اعمال انسانی فطرت کے مطابق ہیں اور برے اعمال ذاتی طور پر خلاف فطرت ہیں۔

ان دونوں تعبیروں کے اختلاف کے بارے میں راغب اصفہانی نے ایک اور بات کہی ہے اور وہ بھی قابل غور ہے۔ وہ یہ کہ "کسب" ان کاموں کے لیے مخصوص ہے جن کا فائدہ فقط انسان کی اپنی ذات تک محدود نہیں ہوتا بلکہ دوسروں کو بھی پہنچتا ہے، ان اعمال خیر کی طرح جن کا نتیجہ صرف انجام دینے والے شخص کو نہیں پہنچتا بلکہ ممکن ہے کہ اس کے عزیز و اقارب اور دوست احباب بھی اس میں شریک ہوں جب کہ "اکتساب" ان مواقع پر بولا جاتا ہے جہاں کام کا اثر صرف کرنے والے تک محدود ہو اور گناہ میں ایسا ہوتا ہے (البتہ توجہ رہے کہ یہ مفہوم اس وقت لیا جاتا ہے جب "کسب" اور "اکتساب" کو ایک دوسرے کے مد مقابل استعمال کیا جائے)۔

"ربنا لا تؤاخذنا ان نسینا او اخطانا":

مؤمنین چونکہ لھا ما کسبت و علیھا ما اکتسبت کے قانون کی روشنی میں سمجھتے ہیں کہ ان کے مستقبل کا انحصار انہی کے اپنے اچھے یا برے کردار پر منحصر ہے لہٰذا بارگاہ الٰہی میں خاص تضرع وزاری کے ساتھ اپنے رب کو پکارتے ہیں، اس ذات کو پکارتے ہیں جو ان کی پرورش میں خاص لطف و کرم فرماتا ہے اور کہتے ہیں: اے ہمارے پروردگار اگر ہم بھول اور خطا و اشتباہ سے دوچار ہو جائیں تو اپنی وسیع رحمت سے تو ہماری لغزش سے درگزر اور ہمیں اس کے عذاب سے رہائی بخش۔

خطا کے بدلے سزا

یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ کیا ممکن ہے کہ پروردگار کسی کو بھول چوک پر سزا دے کہ اس پر بھی درخواست کی گنجائش پیدا ہو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بعض اوقات بھول چوک انسان کی اپنی سہل انگاری کی وجہ سے ہوتی ہے اور مسلم ہے کہ بھول



چوک کی وجہ سے انسان سے جوابدہی اور مسئولیت ختم نہیں ہو جاتی. جیسا کہ قرآن میں آیا ہے :

"فذوقوا بما نسیتم لقاء یومکم ھذا"

عذابِ خدا کا ذائقہ چکھو کیونکہ تم اس دن کو بھول گئے تھے ۔ (سجدہ - ۱۴)

اس سے معلوم ہوا کہ وہ خطائیں جو اپنی سہل انگاری کی وجہ سے سرزد ہوتی ہیں، قابلِ سزا ہیں ۔

ایک اور بات جس کی طرف توجہ کرنا چاہیے یہ ہے کہ نسیان اور خطا ایک دوسرے سے واضح طور پر مختلف ہیں لفظ "خطا" عام طور پر ایسے کاموں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو غفلت یا انسان کی عدم توجہ کے باعث سرزد ہوتے ہیں ۔ مثلاً کوئی شخص شکار کے لیے تیر مارتا ہے اور اس کے ارادے کے بغیر کسی انسان کو جا لگتا ہے اور وہ زخمی ہو جاتا ہے ۔ لفظ "نسیان" ایسے کام کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو انسان توجہ سے انجام دے لیکن حقائق سے ناآشنا ہو ۔ مثلاً کوئی شخص کسی بے گناہ کو گناہگار سمجھتے ہوئے سزا دے دے ۔

"ربنا ولا تحمل علینا اصرا کما حملتہ علی الذین من قبلنا ."

"اِصر" کا معنی ہے کسی کو روک رکھنا، کسی کو حبس و قید میں رکھنا ۔ یہ لفظ ہر اس سنگین اور بھاری کام کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جو انسان کی فعالیت کو روک دے ۔ نیز ایسے عہد و پیمان کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جو انسان کو محدود کر دے ۔ اسی لیے عذاب اور سزا کو بھی کبھی "اصر" کہتے ہیں ۔

اس جملے میں مومنین خدا سے دو تقاضے اور کرتے ہیں :

پہلا یہ کہ اُن پر دشوار ذمہ داریاں عائد نہ ہوں کیونکہ ایسی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں بعض اوقات اطاعت پروردگار کے خلاف کام ہو جاتا ہے ۔ احکامِ اسلام کے بارے میں ایسی ہی بات پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے ۔

"بعثت الی الشریعۃ السھلۃ السمحۃ."

میں ایسے دین کے ساتھ مبعوث ہوا ہوں جس پر عمل کرنا سب کے لیے سہل ہے ۔

ممکن ہے اس موقع پر سوال کیا جائے کہ اگر شریعت کا سہل ہونا اچھی چیز ہے تو پھر یہ گذشتہ اقوام میں کیوں نہیں تھا ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جیسے آیاتِ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ اُمتوں کے لیے شدید تکالیف اصل شریعت میں نہیں تھیں بلکہ ان کی نافرمانیوں کے بعد سزا کے طور پر انہیں شدائد کا سامنا کرنا پڑا ہے ۔ جیسا کہ بنی اسرائیل پے در پے نافرمانیوں کی وجہ سے کچھ حلال گوشتوں سے محروم ہو گئے تھے (انعام ۱۴۶، نساء - ۱۶۰)

دوسرا یہ کہ وہ طاقت فرسا آزمائشوں اور ناقابلِ برداشت سزاؤں سے محفوظ رہیں ۔ "ربنا ولا تحملنا ما لا طاقۃ لنا بہ" "لا تحمل" گذشتہ جملے میں اور "ولا تحمل" اس جملے میں شاید اسی بنا پر ہے کیونکہ پہلی تعبیر مشکلات کے مواقع کے لیے اور دوسری طاقت فرسا مواقع کے لیے استعمال ہوتی ہے ۔

"واعف عنا واغفرلنا وارحمنا ."



لغت میں عفو "کا معنی ہے "کسی چیز کے اثر کو محو کرنا" اور زیادہ تر یہ لفظ گناہ کے اثرات کو محو کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اِن میں طبیعی آثار بھی شامل ہیں اور سزا کے محو ہونے کا مفہوم بھی اس میں شامل ہے۔ "مغفرت" گناہ کے بدلے میں ملنے والی سزا سے صرف نظر کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس بنا پر دونوں لفظوں کے استعمال سے یہ سمجھ آتا ہے کہ مومنین اپنے پروردگار سے چاہتے ہیں کہ وہ لغزشوں کے طبیعی اور تکوینی آثار ان کی روح سے محو کر دے تاکہ وُہ ان کے بُرے نتائج میں گرفتار نہ ہوں اور یہ بھی تقاضا کرتے ہیں کہ ان کی معینہ سزاؤں سے بھی بچ جائیں اور پھر اُس کی وسیع رحمت کی خواہش کرتے ہیں جو تمام چیزوں پر محیط ہے۔

"انت مولٰنا فانصرنا على القوم الكٰفرين"

پھر اپنی دُعا کے آخری حصّے میں خدا کو مولا کہہ کر پکارتے ہیں۔ یعنی ایسی ذات جو ان کی سرپرستی اور پرورش کرتی ہے ــــ اور چاہتے ہیں کہ وہ انہیں ہر طرح کے دشمنوں کے مقابلے میں کامیاب کرے۔

اِن دو آیات میں چونکہ سورہ بقرہ کا خلاصہ بیان ہوا ہے اور خدا تعالٰی کے حضور تسلیم و رضا کے آداب ہمیں سکھائے گئے، یعنی اگر اہل ایمان چاہتے ہیں کہ خدا تعالٰی ان کی لغزشوں سے درگزر کرے اور مختلف قسم کے دشمنوں کے مقابلے میں انہیں کامیاب کرے تو انہیں چاہیے کہ "سمعنا و اطعنا" کے طریقۂ کار پر عمل کریں اور کہیں کہ ہم پکارنے والے کی دعوت دل و جان سے قبول کرتے ہیں اور ان کی پیروی کے درپے ہیں اور اس راہ میں کسی جستجو اور کوشش میں کوتاہی نہ کریں گے۔ اس کے بعد اللہ سے رکاوٹوں اور دشمنوں پر کامیابی کی خواہش کریں "رب" کے عنوان سے خدا کے نام کا تکرار اس حقیقت کی تکمیل کرتا ہے۔ چونکہ اس نام کا استعمال اِس حقیقت کا اعتراف بھی ہے کہ وہ وہ ذات ہے جو ان کی پرورش کرنے میں خاص لطف و کرم رکھتی ہے۔

اِسی لیے رہبرانِ اسلام نے کئی ایک احادیث میں ہم مسلمانوں کو ان دو آیات کو خاص طور پر پڑھنے کی ترغیب دی ہے اور اس کی تلاوت کا بہت طرح کا ثواب بیان کیا ہے۔ ان احادیث کے مطابق اگر زبان اور دل ان آیات کی تلاوت میں ہم آہنگ ہوں اور ان کے مفاہیم کو زندگی کا پروگرام بنا لیا جائے صرف یہی آیات مرکزِ دل کو خالقِ کائنات سے منسلک کرنے کا عامل بن جائیں، روح میں پاکیزگی آجائے اور تحرک و فعالیت پیدا ہو جائے۔



سُورَةُ

آلِ عِمرَان

○ مدینہ میں نازل ہوئی

○ ۲۰۰ آیات ہیں



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۱۔ الٓمّٓ ۝

۲۔ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۝

۳۔ نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ
وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝

۴۔ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۝ ؎

ترجمہ

اُس خُدا کے نام سے جو مہربان اور بخشنے والا ہے۔

۱۔ الم۔

۲۔ خدائے یکتا کے علاوہ کوئی معبود نہیں، وہ زندہ و پائیدار اور نگہبانی کرنے والا ہے۔

۳۔ (وہی ذات ہے) جس نے تم پر حق کے ساتھ کتاب نازل کی۔ یہ کتاب گذشتہ کُتب کی نشانیوں پر منطبق ہوتی ہے اور اس سے قبل تورات اور انجیل کو لوگوں کی ہدایت کے لیے اتارا گیا۔ نیز حق و باطل میں تمیز کرنے والی کتاب (قرآن مجید) کو نازل کیا۔

شانِ نزول

بعض مُفسرین کہتے ہیں کہ اَسّی سے کچھ زیادہ آیات نجران کے عیسائی نمائندوں کے بارے میں ہیں جنھیں اسلام کے بارے میں تحقیق کے لیے مدینہ بھیجا گیا تھا۔

؎ یہاں کچھ حصہ آیت ۴ کا بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ (مترجم)



وہ ساٹھ افراد تھے ۔ ان میں سے چودہ نجران کے اشراف اور معززین شمار ہوتے تھے ۔ ان چودہ میں سے تین سردار تھے وہاں کے عیسائی اپنے کاموں اور مشکلات میں انہی تین سے رجوع کرتے تھے ۔ ان میں سے ایک عاقب تھا جسے عبدالمسیح بھی کہتے تھے ۔ وہ اپنی قوم کا امیر اور رئیس بھی شمار ہوتا تھا ۔ اس کی قوم کبھی اس کے نظریے اور رائے کی مخالفت نہیں کرتی تھی ۔ دوسرے کا نام سید تھا اُسے ایہم بھی کہتے تھے ۔ خاطر تواضع اور سفر کے انتظامی امور کی سرپرستی بھی کرتا تھا اور عیسائیوں کے لیے بہت قابل اعتماد تھا ۔ تیسرا شخص ابو حارثہ تھا جو عالم تھا اور نہایت با اثر تھا ۔ عیسائیوں نے کئی ایک گرجے اس کے نام کے بنا رکھے تھے ۔ اُسے تمام مذہبی مسیحی کُتب یاد تھیں ۔ ساٹھ افراد کا یہ گروہ قبیلہ بنی کعب کے لباس میں مدینہ آیا اور مسجد نبوی میں پہنچا ۔ اس وقت نبی اکرمؐ مسلمانوں کے ہمراہ نماز عصر ادا فرما چکے تھے ۔ ان ساٹھ افراد نے خوبصورت زرق برق اور پُرکشش لباس پہن رکھے تھے ۔ ایک صحابی کے بقول : ہم نے کبھی کوئی نمائندے ایسے بنے ٹھنے نہیں دیکھے تھے ۔[1]

وہ مسجد میں پہنچے تو یہ ان کی نماز کا وقت تھا ۔ انہوں نے اپنے مراسم کے مطابق ناقوس بجایا اور مشرق کی طرف رُخ کرکے نماز میں مشغول ہو گئے ۔ کچھ اصحاب نے انہیں روکنا چاہا لیکن آپؐ نے فرمایا : تم ان سے سروکار نہ رکھو ۔

نماز کے بعد عاقب اور سید نبی کریمؐ کی خدمت میں آئے اور آپؐ سے گفتگو کرنے لگے ۔ آپؐ نے انہیں دینِ اسلام قبول کرنے اور بارگاہ خداوندی میں سر تسلیم خم کرنے کی دعوت دی ۔

عاقب اور سید کہنے لگے : ہم آپ سے پہلے اسلام لا چکے ہیں اور بارگاہ الٰہی میں سر تسلیم خم کر چکے ہیں ۔

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا : تم کس طرح دینِ حق پر ہو جب کہ تمہارے اعمال بتاتے ہیں کہ تم خدا کے سامنے سر تسلیم جھکائے ہوئے نہیں ہو کیونکہ تم خدا کے لیے بیٹے کے قائل ہو اور حضرت عیسٰیؑ کو خدا کا بیٹا قرار دیتے ہو ، صلیب کی پوجا اور پرستش کرتے ہو اور خنزیر کا گوشت کھاتے ہو جب کہ یہ سب امور دینِ حق کے خلاف ہیں ۔

عاقب اور سید نے کہا : اگر حضرت عیسٰیؑ خدا کے بیٹے نہیں تو پھر ان کا باپ کون تھا ؟

نبی کریمؐ نے فرمایا : کیا تم یہ بات مانتے ہو کہ ہر بیٹا باپ سے شباہت رکھتا ہے ؟

اُنہوں نے کہا : ہاں ۔

آپؐ نے فرمایا : کیا ایسا نہیں کہ ہمارا خدا ہر چیز پر محیط ہے ، قیوم ہے اور موجودات کو روزی دینا اُس کے ذمہ ہے ؟

وہ کہنے لگے : ہاں ایسا ہی ہے ۔

آپؐ نے فرمایا : کیا حضرت عیسٰیؑ میں یہ اوصاف تھے ؟

اُنہوں نے کہا : نہیں ۔

آپؐ نے فرمایا : کیا تم جانتے ہو کہ زمین و آسمان کی کوئی چیز خدا سے مخفی نہیں اور وہ ہر چیز کو جانتا ہے ؟

---

[1] یمن کے شمالی کوہستان میں ایک مقام صنعاء ہے ۔ صنعاء سے دس منزل دور قبیلہ ہمدان کی زمینیں تھیں ۔ جاہلیت کے زمانے میں اس قبیلے کا ایک بت تھا ۔ اس کا نام اہل قبیلہ نے "یعوق" رکھا تھا ۔ اس قبیلے کی بستی کو نجران کہتے تھے ۔ معجم البلدان یاقوت حموی کے بقول نجران چند مقامات کا نام ہے ۔



کہنے لگے: ہاں، ہم جانتے ہیں۔

آپ نے فرمایا: جو کچھ حضرت عیسٰی کو خدا نے بتایا کیا وہ اُس کے علاوہ اپنی طرف سے کسی چیز کو جانتے تھے؟

وہ بولے: نہیں۔

آپ نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ ہمارا خدا وہی ہے جس نے شکم مادر میں حضرت عیسٰی کو جیسے چاہا بنایا؟

کہنے لگے: ہاں، ایسا ہی ہے۔

آپ نے فرمایا: کیا ایسا نہیں کہ حضرت عیسٰی کو ان کی والدہ باقی بچوں کی طرح جسم میں اٹھائے رہیں اور پھر اُنہیں باقی ماؤں کی طرح جنم دیا اور حضرت عیسٰی ولادت کے بعد دیگر بچوں کی طرح غذا کھاتے تھے؟

وُہ کہنے لگے: ہاں ایسے ہی تھا۔

اِس پر آپ نے فرمایا: تو پھر حضرت عیسٰی خدا کے بیٹے کیسے ہو گئے جب کہ اُس سے کوئی شباہت نہیں رکھتے؟

گفتگو یہاں تک پہنچی تو سب کے سب خاموش ہو گئے۔ اس وقت اس سورۃ کی اسّی ۸۰ سے کچھ اوپر آیات نازل ہوئیں ان آیات میں بعض معارف اور کچھ اسلامی پروگراموں کی وضاحت کی گئی ہے۔[1]

تفسیر

یہ سورہ باتفاق مفسرین دوسو آیات پر مشتمل ہے۔ اس کی تمام آیات مدینہ میں نازل ہوئیں۔ آل عمران کے واقعے کی مناسبت سے اس کا نام سورہ آل عمران رکھا گیا ہے۔ یہ واقعہ آیت ۳۳ کے بعد اس سورہ میں موجود ہے۔

اِس سورہ کے اہم موضوعات ہیں۔

- ایمان۔
- اسلام۔
- اسلام کی حمایت اور وسعت میں استقامت و پامردی،
- یہود و نصاریٰ سے منطقی مقابلہ۔
- مسلمانوں کے لیے متعدد تربیتی درس،
- اسلام کی پیش رفت اور
- باطل عقائد کی نفی۔

اِس سورہ کے مطالب ایک دوسرے سے اس طرح مربوط اور متناسب ہیں گویا سب آیات ایک وقت میں نازل ہوئی ہیں اب اس سورہ کی ایک ایک آیت کی تفسیر بیان کی جاتی ہے۔

الم — کمپیوٹر کے ذریعے حروف مقطعات کی تفسیر

---

[1] المیزان، ج ۳، ص ۱۳۵۔



قرآن کے حروفِ مقطعات کے بارے میں سورہ بقرہ کی ابتداء میں ضروری توضیحات پیش کی جا چکی ہیں، اب ان کے تکرار کی ضرورت نہیں۔ یہاں پر ہم ان کے بارے میں ایک قابلِ توجہ نظریہ پیش کریں گے۔ یہ نظریہ حال ہی میں ایک مصری عالم نے پیش کیا ہے۔ موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر ہم اُسے یہاں مکمل طور پر بیان کرتے ہیں۔ البتہ اس کی صحت یا کسی سقم کے بارے میں فیصلہ کرنا بہت زیادہ تحقیق کا محتاج ہے جو شاید آئندہ آنے والے لوگوں کے ذمے ہے۔ ہم اسے یہاں فقط ایک نظریے کے طور پر ذکر کرتے ہیں۔

مشہور مصری مجلہ "آخر ساعۃ" جو ایشیا کا ایک بڑا مجلہ شمار ہوتا ہے نے مصر ہی کے ایک مسلمان عالم کی کچھ آیات قرآن مجید کے بارے میں کمپیوٹر کی مدد سے تیار کی گئی عجیب و غریب تحقیق پیش کی ہے۔ اس نے دُنیا کے مختلف خطوں میں بسنے والوں کو حیران کر دیا ہے۔ یہ تحقیقات کیمسٹری کے مصری اُستاد ڈاکٹر رشاد خلیفہ کی تین سالہ مسلسل کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ ان تحقیقات نے ایک دفعہ پھر اس حقیقت کو ثابت کر دیا ہے کہ یہ عظیم آسمانی کتاب ذہنِ انسانی کی پیداوار نہیں ہے اور انسان کے بس کی بات نہیں کہ اس کی مثل پیش کر سکے۔

ڈاکٹر رشاد خلیفہ نے یہ تحقیقات امریکی ریاست میسوری کے شہر سانٹ لوئیس میں کی ہیں۔ وہ اب بھی غذا سازی کی ایک امریکی کمپنی میں بطور مشیر کام کرتے ہیں۔

اُنہوں نے اپنی حیرت انگیز تحقیقات کی تکمیل کے لیے مدتوں کمپیوٹر سے استفادہ کیا ہے۔ ان کمپیوٹرز پر کام کرنے کا ایک سیکنڈ کا کرایہ ۱۰ ڈالر تھا جو وہاں کے بعض مسلمانوں کی مدد سے ادا کیا گیا۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ فارسی جرائد میں مذکورہ سائنسدان سے مصری خبر نگار کی گفتگو ناقص اور غیر مکمل صورت میں شائع ہوئی ہے فارسی دان طبقہ اس سے پوری طرح بات نہیں سمجھ پایا۔ لہٰذا ہم نے ضروری سمجھا کہ خبر کے اصلی منبع سے رجوع کیا جائے تاکہ اِس بحث کا مکمل تجزیہ و تحلیل کیا جا سکے۔ البتہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں اس وقت ہمارا مقصد اس نظریے کی تائید نہیں بلکہ اسے ہم آئندہ تحقیق کرنے والوں کے لیے ریکارڈ پر لانا چاہتے ہیں۔ مذکورہ پروفیسر نے اپنی تمام تر مساعی قرآن کے حروفِ مقطعات جو ق. الم لیس وغیرہ کی شکل میں ہیں کے سمجھنے پر صرف کی ہیں۔ اُس نے پیچیدہ حسابات (CALCULATIONS) کی مدد سے ثابت کیا ہے کہ جس سورہ کے شروع میں یہ حروف آتے ہیں اُس سورۃ کے دیگر حروف سے ان کا نزدیکی تعلق ہے (غور کیجئے گا)۔

کمپیوٹر سے صرف سورتوں کے حروف کی تعداد اور ان کی نسبت معلوم کرنے کے لیے (اصطلاحاً) ایک فیصد حروف سے مدد لی گئی ہے نہ یہ کہ اس سے قرآنی آیات کی تفسیر چاہی گئی ہے لیکن یہ مسلم ہے کہ کمپیوٹر کے بغیر یہ بات کسی انسان کے بس کی نہ تھی کہ وہ سالہا سال تک اِن حسابات کو کرتا رہتا۔

اب ہم مذکورہ سائنسدان کے انکشافات پیش کرتے ہیں:۔

ڈاکٹر رشاد کہتا ہے: ہم جانتے ہیں کہ قرآن مجید کی ۱۱۴ سورتیں ہیں۔ ان میں سے ۸۶ مکہ میں اور ۲۸ مدینہ میں نازل ہوئیں۔ ان میں ۲۹ سورتوں کے آغاز میں حروفِ مقطعات ہیں۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ مجموعی طور پر یہ تمام حروف ۱۴ ہیں جب کہ



عربی حروف ابجد کی تعداد ۲۸ ہے۔ گویا یہ ان کا نصف ہوئے۔ حروف مقطعات میں آنے والے حروف یہ ہیں
ا، ح، ر، س، ص، ط، ع، ق، ک، ل، م، ن، ھ، ی۔ انہیں بعض اوقات حروفِ نورانی بھی کہتے ہیں

ڈاکٹر رشاد مزید کہتا ہے: میں سالہا سال سے جاننا چاہ رہا تھا کہ یہ حروف جو ظاہراً ایک دوسرے سے الگ ہیں اور سورتوں کی ابتداء میں آتے ہیں۔ ان کے معانی کیا ہیں۔ عظیم مفسرین کی تفاسیر و آراء دیکھیں لیکن تسلی نہ ہوئی لہٰذا خدا سے مدد مانگی اور مطالعے میں محو ہوگیا۔

اچانک یہ سوچ پیدا ہوئی کہ شاید ان حروف اور جس سورہ کے شروع میں یہ موجود ہیں اس کے حروف کے درمیان کوئی ربط پایا جاتا ہو لیکن ۱۴ نورانی حروف اور ۱۱۴ سورتوں کے بارے میں تحقیق ہر ایک نسبت کا تعین اور دیگر بہت سے حسابات کمپیوٹر کے بغیر ممکن نہ تھے لہٰذا پہلے مذکورہ حروف کو قرآن کی ۱۱۴ سورتوں میں علیحدہ علیحدہ کیا گیا اور پھر سورت کے تمام حروف کو ترتیب دے کے کمپیوٹر کے سپرد کیا گیا تاکہ ان کی مدد سے آئندہ حسابات کئے جاسکیں۔ یہ کام اور دیگر ابتدائی ضروری امور دو سال کے عرصے میں انجام پائے۔

اس کے بعد کمپیوٹر پر مذکورہ حسابات کے لیے پورا ایک سال کام کرتا رہا تو بہت ہی درخشاں نتیجہ برآمد ہوا۔ تاریخ اسلام میں پہلی مرتبہ تعجب انگیز حقائق سے پردہ اٹھا جنہوں نے دیگر پہلوؤں کے علاوہ علم ریاضی کے اعتبار سے حروف قرآن کی نسبت کے بارے میں قرآنی اعجاز کو مکمل طور پر واضح کردیا۔ کمپیوٹر نے ہمیں بتایا کہ ان ۱۴ حروف کی ۱۱۴ قرآنی سورتوں میں ہر ایک سے کیا نسبت ہے مثلاً حساب کے بعد ہم نے دیکھا کہ "ق" جو قرآن کے نورانی حروف میں سے ہے۔ سورہ فلق میں اس کا سب سے زیادہ حصہ ہے، یہ حصہ ۰۰۔۶۷ فیصد ہے اور یہ نسبت قرآن کی سورتوں میں اول نمبر پر ہے (البتہ سورہ ق اس میں شامل نہیں ہے) اس کے بعد سورہ قیامۃ ہے جس میں ق کی نسبت ۷۹۰۔ ۳ فیصد ہے پھر سورہ والشمس ہے جس میں یہ تناسب ۶۔ ۲۹ فیصد ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ سورہ قیامۃ اور والشمس میں یہ فرق سو میں سے ایک ہزار کا ہے اسی ترتیب سے قرآن کی تمام ۱۱۴ سورتوں میں سے ہم نسبت معلوم کرسکیں گے۔ اور یہ نسبت اسی ایک حرف کے بارے میں نہیں بلکہ تمام نورانی حروف کے بارے میں ہر ایک سورت کے تمام حروف کی نسبت ایک ایک کرکے معلوم کی جاسکتی ہے۔

اب ہم ان جاذب نظر نتائج کا ذکر کرتے ہیں جو ان حسابات (CALCULATIONS) سے سامنے آئے ہیں۔

ا — حرف ق کی نسبت سورہ ق میں قرآن کی دوسری سورتوں کے مقابلے میں بلا استثناء سب سے زیادہ ہے یعنی ۲۳ سالوں کے دوران میں جو دیگر ۱۱۳ سورتیں نازل ہوئی ہیں ان میں حرف ق سورہ ق کی نسبت کم استعمال ہوا۔ واقعاً یہ امر بہت حیران کن ہے کہ ایک انسان ۲۳ سال کے طویل عرصے میں اپنی گفتگو کے حروف کی تعداد کا اس قدر خیال رکھے اور اس کے باوجود آزادانہ اور بلا تکلف گفتگو کرتا رہے۔ مسلّم ہے کہ یہ کام ایک انسان کے بس سے باہر ہے یہاں تک کہ ایک عظیم ترین ریاضی دان بھی کمپیوٹر کی مدد کے بغیر اس کا حساب نہیں رکھ سکتا۔

یہ تمام چیزیں نشاندہی کرتی ہیں کہ نہ صرف قرآن کی سورتیں اور آیات بلکہ حروفِ قرآن بھی ایک خاص نظام اور حساب کے



تحت ہیں اور اس پر صرف خدا ہی قادر ہے۔

اسی طرح حسابات سے معلوم ہوتا ہے کہ حرف ص کی سورہ ص میں یہی پوزیشن ہے یعنی اس میں اس کی مقدار سورہ کے باقی حروف کی نسبت قرآن کی دیگر سُورتوں میں اس کی نسبت سے زیادہ ہے۔

اس طرح سورہ حجر کے علاوہ حرف ن کی سورہ "ن والقلم" میں نسبت دیگر سورتوں میں اس کی نسبت سے زیادہ ہے لیکن سُورہ حجر میں اس کی نسبت سورہ ن والقلم میں اس کی نسبت سے زیادہ ہے۔ اس سلسلے میں یہ امر جاذب نظر ہے کہ سورہ حجر ان سُورتوں میں سے ہے جن کی ابتداء "ال ر" سے ہوتی ہے۔ بعد میں ہم دیکھیں گے کہ وہ سُورتیں جن کی ابتدا "ال ر" سے ہوتی ہے وُہ سب کی سب ایک سورت شمار ہوں گی اور اگر ہم نے ایسا کیا تو ہمیں مطلوبہ نتیجہ دستیاب ہوگا یعنی ان تمام سورتوں میں حرف ن کی نسبت۔ اس کی سورہ ن والقلم میں نسبت سے کم ہو جائے گی۔

۲ — ال م ص — یہ چار حروف سورہ اعراف کی ابتدا میں آتے ہیں اب اگر اس سورہ میں آنے والے تمام ال م ص جمع کیے جائیں تو ہم دیکھیں گے کہ ان کی نسبت اس سورہ کے دیگر حروف کے ساتھ ان کی نسبت دوسری سورتوں میں دیگر حروف سے زیادہ ہے
اسی طرح ال م ر — یہ چار حروف سورہ رعد کی ابتداء میں ہیں ان کی بھی یہی حالت ہے۔ یونہی ک ھ ی ع ص — یہ پانچ حروف سورہ مریم کے آغاز میں ہیں ان کا بھی یہی حساب ہے۔

یہاں مسئلے کے ایک نئے رُخ سے ہمارا سامنا ہوتا ہے کہ ایک جدا حرف ہی اس آسمانی کتاب میں ایک خاص نظم کے تحت نہیں بلکہ ایک سے زیادہ حروف بھی اسی حیرت انگیز وضع میں اس میں موجود ہیں۔

۳ — اب تک تو صرف ایک سورہ کے شروع میں آنے والے حروف کا ذکر تھا لیکن وہ حروف مقطعات جو ایک سے زیادہ قرآنی سورتوں کے آغاز میں آتے ہیں مثلاً ال م ر یا ال م تو وہ اپنے اندر ایک اور مشکل حساب سموئے ہوئے ہیں۔ اور وہ یہ کہ جن سورتوں میں یہ حروف آتے ہیں، مثلاً ال م چھ سورتوں کے آغاز میں ہے تو ان چھ سورتوں میں ان حروف کے مجموعے کا تناسب دیگر حروف سے دیکھنا ہوگا۔ ہم دیکھیں گے کہ یہ نسبت ان حروف کی دیگر ہر سورہ میں ان کی نسبت سے زیادہ ہے
یہاں مسئلے نے پھر ایک توجہ طلب صورت اختیار کرلی ہے اور وہ یہ کہ نہ صرف قرآن کی ہر سُورت کے حروف ایک معین ضابطے اور حساب کے تحت ہیں بلکہ مشابہ سورتوں کے مجموعی حروف بھی ایک ہی ضابطے اور نظام کے مطابق ہیں۔

ضمنی طور پر یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن مجید کی متعدد سُورتیں کیوں ال م یا ال م ر سے شروع ہوتی ہیں گویا ایسا اتفاقاً اور بلاوجہ نہیں ہے۔

ڈاکٹر رشاد نے پیچیدہ ترین حسابات "ح م" پر مشتمل سورتوں کے بارے میں پیش کئے ہیں ہم اختصار کے پیش نظر ان سے صرف نظر کرتے ہیں۔

ڈاکٹر رشاد نے اس ضمن میں کچھ اور قابل توجہ نکات بھی پیش کیے ہیں جنہیں بعض نئے نتیجہ بخش نکات کے اضافے کے ساتھ ہم قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں:۔



(۱) قرآن مجید کے اصلی رسم الخط کی حفاظت کریں

وہ کہتے ہیں کہ یہ تمام حسابات اسی صورت میں صحیح ہیں جب ہم قرآن کے اصلی اور قدیمی رسم الخط پر ہاتھ نہ ڈالیں ورنہ حساب خراب ہوجائے گا ۔ مثلاً اسحٰق ، زکوٰۃ اور صلوٰۃ کی صورت میں لکھیں نہ کہ اسحاق ، زکات اور صلات کی شکل میں ۔

(۲) قرآن مجید میں عدمِ تحریف کی ایک اور دلیل

یہ تحقیقات نشاندہی کرتی ہیں کہ قرآن مجید میں ایک لفظ بلکہ ایک حرف کی بھی کمی یا زیادتی نہیں ہوئی ورنہ یقینی طور پر ہمارے حسابات موجودہ قرآن میں ایسے نتائج پیش نہ کر سکتے ۔

(۳) پر معنی اشارات

قرآن حکیم کی بہت سی سورتیں جن کی ابتداء حروف مقطعات سے ہوئی ہے ان میں ان حروف کے بعد قرآن کی حقانیت اور عظمت کا ذکر آیا ہے مثلاً "الٓمّٓ ذٰلک الکتٰب لا ریب فیہ"

یہ بذات خود مذکورہ حروف کے اعجاز قرآن ہونے کی طرف ایک اشارہ ہے ۔

حاصل کلام

اس ساری بحث سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ۲۳ سال میں پیغمبر اکرمؐ پر نازل ہونیوالے حروف قرآن بہت دقیق اور منظم حسابات کے حامل ہیں اور الف ، با اور دیگر تمام حروف کا ہر سورۃ کے مجموعی حروف سے علم ریاضی کے حوالے سے گہرا تعلق ہے ایسے حسابات انسان کمپیوٹر کی مدد کے بغیر نہیں کرسکتا ۔ اس میں شک نہیں کہ دانشمند مذکور کی تحقیقات ابھی ابتدائی مرحلے میں ہیں لہٰذا نقائص سے خالی نہیں ہیں ۔ ابھی انہیں اپنی کے ذریعے یا دیگر دانشمندوں کے ذریعہ پایۂ تکمیل تک پہنچنا چاہیے ۔

" اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ "

اللہ یگانہ و یکتا ہے ، جاوداں اور قائم رہنے والا معبود ہے اور تمام چیزیں اسی کے وجود سے وابستہ ہیں ۔ اس آیہ کی شرح و تفسیر سورہ بقرہ کی آیہ ۲۵۵ میں گزر چکی ہے ۔

" نَزَّلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰۃَ وَالْاِنْجِیْلَ مِنْ قَبْلُ ھُدًی لِّلنَّاسِ "

اس آیت میں پیغمبر اسلامؐ مخاطب ہیں ۔ فرمایا گیا ہے : وہ خدا جو پائندہ اور قیوم ہے اس نے تم پر ایسا قرآن نازل کیا ہے جس میں حق و حقیقت کی نشانیاں ہیں اور یہ نشانیاں ان کے علاوہ بھی ہیں جن کی بشارت گذشتہ انبیاء اور آسمانی کتب (تورات ، انجیل) نے دی ہے اور گذشتہ انبیاء اور آسمانی کتب نے قرآن اور قرآن لانے کے بارے میں جو گفتگو کی ہے اس نے اس کی بھی تصدیق کی



ہے۔ وُہ وُہی خدا ہے جس نے تورات اور انجیل کو نوعِ بشر کی راہنمائی اور ہدایت کے لیے نازل کیا ہے۔

چند اہم نکات

(۱) **حق کا مفہوم:** "حق" کا معنی اصل میں "مطابقت" اور "ہم آہنگی" ہے۔ اسی لیے جو چیز واقعیت سے مطابقت رکھتی ہے اسے حق کہتے ہیں۔ یہ جو خدا تعالیٰ کو حق کہتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی ذاتِ مقدس عظیم ترین واقعیت ہے کہ جو قابلِ انکار نہیں۔ واضح تر الفاظ میں ــــ حق یعنی وہ ثابت اور مضبوط امر جس میں باطل کے لیے کوئی راستہ نہ ہو۔ محلِ بحث آیت میں "با" اصطلاح میں مصاحبت کے لیے ہے۔ یعنی اے پیغمبر! خدا نے تم پر ایسا قرآن نازل کیا ہے جو واقعیت کی نشانیوں سے توام اور ہم آہنگ ہے۔

(۲) **تورات کیا ہے:** "تورٰۃ" عبرانی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا معنی ہے "شریعت" اور "قانون"۔ یہ لفظ خدا کی طرف سے حضرت موسیٰؑ بن عمران پر نازل ہونے والی کتاب کے لیے بولا جاتا ہے۔ نیز بعض اوقات عہد عتیق کی کتب کے مجموعے کے لیے اور کبھی کبھی تورات کے پانچوں اسفار کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ یہودیوں کی کتب کے مجموعے کو عہد عتیق کہتے ہیں۔ اس میں تورات اور چند دیگر کتب شامل ہیں۔ تورات کے پانچ حصے ہیں جنہیں سفرِ پیدائش، سفرِ خروج، سفرِ لاویان، سفرِ اعداد اور سفرِ تثنیہ کہتے ہیں۔ اس کے موضوعات یہ ہیں:

(i) کائنات، انسان اور دیگر مخلوقات کی خلقت،

(ii) حضرت موسیٰؑ بن عمران، گذشتہ انبیاء اور بنی اسرائیل کے حالات اور

(iii) اس دین کے احکام کی تشریح۔

عہد عتیق کی دیگر کتابیں دراصل حضرت موسیٰؑ کے بعد کے مؤرخین کی تحریر کردہ ہیں۔ ان میں حضرت موسیٰ بن عمران کے بعد کے نبیوں، حکمرانوں اور قوموں کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔

یہ بغیر کہے واضح ہے کہ تورات کے پانچوں اسفار سے اگر صرف نظر کر لیا جائے تو دیگر کتب میں سے کوئی کتاب بھی آسمانی کتاب نہیں ہے۔ خود یہودی بھی اس کا دعویٰ نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ حضرت داؤد سے منسوب زبور جسے وہ مزامیر کہتے ہیں، حضرت داؤد کے مناجات اور پند و نصائح کی تشریح ہے۔ رہی بات تورات کے پانچوں سفروں کی تو ان میں ایسے واضح قرائن موجود ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ وہ بھی آسمانی کتابیں نہیں ہیں بلکہ وہ تاریخی کتب ہیں جو حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام کے بعد لکھی گئی ہیں کیونکہ ان میں حضرت موسیٰؑ کی وفات، ان کے دفن کی کیفیت اور ان کی وفات کے بعد کے کچھ حالات مذکور ہیں خصوصاً سفرِ تثنیہ کے آخری حصے میں یہ بات وضاحت سے ثابت ہوتی ہے کہ یہ کتاب حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام کی وفات سے کافی مدت بعد لکھی گئی ہے۔

علاوہ ازیں ان کتب میں بہت سی خرافات اور ناروا باتیں انبیاء و مرسلین سے منسوب کر دی گئی ہیں۔ بعض بچگانہ باتیں بھی ہیں جو ان کے خود ساختہ اور جعلی ہونے پر گواہ ہیں نیز بعض تاریخی شواہد بھی نشاندہی کرتے ہیں کہ اصلی تورات غائب ہو گئی اور پھر حضرت

مُوسٰی بن عمران علیہ السلام کے پیروکاروں نے یہ کتابیں تحریر کیں ۔ ؎

(۳) انجیل کیا ہے؟ "انجیل" اصل میں یونانی لفظ ہے۔ اس کا معنی ہے "بشارت" یا "جدید تعلیم"۔ یہ اس کتاب کا نام ہے جو حضرت عیسٰی علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ قرآن نے محلِ بحث آیت اور دیگر آیات جن میں حضرت عیسٰیؑ کی کتاب کا نام لیا ہے، یہ لفظ مفرد ہی استعمال ہوا ہے اور اسے خدا کی طرف سے نازل شدہ قرار دیا ہے۔ اب وُہ بہت سی اناجیل جو عیسائیوں میں مروّج ہیں، وحیِ الٰہی نہیں ہیں۔ ان اناجیل میں یہ چار زیادہ مشہور ہیں:

(۱) لوقا ، (۲) مرقس ، (۳) متی اور (۴) یوحنا ؎

ان کے وحیِ الٰہی نہ ہونے کا خود عیسائی بھی انکار نہیں کرتے۔ موجودہ انجیلیں سب حضرت عیسٰی علیہ السلام کے شاگردوں یا اُن کے شاگردوں کی ہیں اور آپ سے کافی مدت بعد لکھی گئی ہیں۔ عیسائیوں کا دعوٰی زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ حضرت مسیح کے شاگردوں نے یہ اناجیل الہامِ الٰہی سے لکھی ہیں۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ جدید اور اناجیل کے بارے میں تحقیق کرتے ہوئے ان کے مُصَنِّفین سے واقفیت حاصل کریں۔

عیسائیوں کی اہم ترین مذہبی کتاب عہدِ جدید کا مجموعہ ہے جس پر تمام عیسائی فرقے ایک آسمانی کتاب کی حیثیت سے ایمان رکھتے ہیں۔

عہدِ جدید کا مجموعہ عہدِ قدیم کے تیسرے حصّے سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ ۲۷ متفرق کُتب و رسائل پر مشتمل ہے۔ یہ بالکل مختلف موضوعات کی حامل ہیں۔ ان کی ترتیب یہ ہے:

(۱) انجیل متّی: متّی حضرت مسیح کے بارہ شاگردوں میں سے ایک تھا۔ یہ انجیل اس نے ۳۸ء میلادی میں یا بعض کے نظریے کے مطابق ۵۰ء میلادی سے لے کر ۶۰ء میلادی کے درمیان لکھی

(۲) انجیل مرقس: کتاب قاموس مقدس کے صفحہ ۷۹۲ پر ہے کہ مرقس حواریوں میں سے نہ تھا۔ اس نے اپنی انجیل پطرس کی زیرِ نگرانی تصنیف کی۔ مرقس ۶۸ء میلادی میں قتل ہوگیا۔

(۳) انجیل لوقا: لوقا پولس رسول کا رفیق اور ہمسفر تھا۔ پولس نے حضرت عیسٰی کی وفات کے ایک عرصہ بعد عیسائیت قبول کی۔ یہ آپ کے زمانے میں متعصب یہودی تھا۔ لوقا کی وفات ۷۰ء میلادی کے قریب ہوئی۔ قاموس مقدس کے مولّف نے اپنی تالیف کے صفحہ ۷۷۲ پر لکھا ہے کہ انجیل لوقا کی تالیف عام خیال کے مطابق تقریباً ۶۳ء میلادی میں ہوئی۔

(۴) انجیل یُوحنا: یُوحنا مسیح کے شاگردوں میں سے تھا اور پولس کا دوست اور ہمسفر تھا۔ مؤلف مذکور کے بقول اس کی تالیف زیادہ تر ناقدین کے نزدیک پہلی صدی کے آخری حصّے میں لکھی گئی ؎

یہ اناجیل عموماً حضرت مسیح کو سولی دیے جانے اور اس کے بعد کے حوادث کے ذکر سے معمور ہیں۔ اس سے اچھی

؎ مزید وضاحت کے لیے: "الھدٰی الٰی دین المصطفٰی" (عربی) "الرحلۃ المدرسیۃ" (عربی)، رہبر سعادت (فارسی) اور قرآن و آخرین پیغمبر (فارسی) اور ان جیسی دیگر کتب کا مطالعہ کریں۔ ؎ [illegible]



طرح ثابت ہوتا ہے کہ یہ سب اناجیل حضرت مسیحؑ کے سالہا سال بعد لکھی گئی ہیں اور اُن میں کوئی بھی کتاب آسمانی نہیں جو حضرت مسیحؑ پر نازل ہوئی ہو۔

(۵) **اعمال رسولانہ** : صدر اوّل میں حضرت عیسٰیؑ کے حواری اور مبلغین کے اعمال۔

(۶) **۱۴ رسالے** : مختلف افراد اور اقوام کے نام پولس کے خطوط۔

(۷) **رسالۂ یعقوب** : عہدِ جدید کے ستائیس کُتب و رسائل میں سے یہ بیسواں رسالہ ہے۔

(۸) **پطرس کے خطوط** : یہ عہد جدید کے اکیسویں اور بائیسویں رسالے پر مشتمل ہیں۔

(۹) **یُوحنا کے خطوط** : یہ تین رسالوں پر مشتمل ہیں ۲۳، ۲۴ اور ۲۵ رسالوں میں یہی خطوط ہیں۔

(۱۰) **نامہ یہودا** : یہ عہد جدید کا چھبیسواں رسالہ۔

(۱۱) **مکاشفہ یوحنا** : یہ عہد جدید کا آخری حصہ ہے۔

لہٰذا عیسائی مورخین کی تصریح نیز اناجیل اور عہد جدید کی دیگر کتب و رسائل کے مطابق ان میں سے کوئی بھی آسمانی کتاب نہیں ہے۔ مزید یہ کہ یہ تمام کُتب حضرت عیسٰیؑ کے بعد لکھی گئی ہیں۔ اِس گفتگو سے ہم اِس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ حضرت مسیحؑ پر نازل ہونے والی آسمانی کتاب درمیان میں سے الگ گئی ہے اور آج دستیاب نہیں ہے۔ اس کے کچھ حصّے جو حضرت مسیحؑ کے شاگردوں نے اپنی اناجیل میں بیان کیے ہیں باعث تاسف ہے کہ ان میں بھی خرافات شامل ہو چکی ہیں۔

رہی بعض کی یہ بات کہ مسلمانوں کو موجودہ اناجیل اور توراۃ کی صحت میں شک نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ قرآن نے ان کی تصدیق کی ہے اور ان کی صحت کی گواہی دی ہے تو اس کا جواب جلد اوّل میں اِس آیت کے ذیل میں آچکا ہے۔

"وَ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ" (بقرۃ : ۴۱)

"وانزل الفرقان"

تورات و انجیل کے ذکر کے بعد آیت کے اس حصّے میں نزول قرآن کا تذکرہ ہے۔ قرآن کو فرقان کہنے کی وجہ یہ ہے کہ "فرقان" لغت میں "حق کی باطل سے تمیز کا ذریعہ" کے معنی میں ہے اور ہر وہ چیز جو حق کو باطل سے ممتاز کر دے اسے فرقان کہتے ہیں اسی لیے جنگ بدر کے روز کو قرآن نے "یوم الفرقان"[1] قرار دیا ہے۔ کیونکہ اس دن ایک بے سرو سامان چھوٹا سا لشکر اپنے سے کئی گنا بڑے کیل کانٹے سے لیس اور طاقتور دشمن پر کامیاب و کامران ہوا۔ اِس طرح حضرت مُوسٰیؑ کے دس معجزات کو بھی فرقان[2] کہا گیا ہے۔ یونہی عقل و خرد اور روشن فکری کو بھی فرقان کہا جاتا ہے[3]۔ محل بحث آیت میں بھی قرآن کو اسی جہت سے فرقان کہا گیا ہے کہ قرآن حق کو باطل سے ممتاز کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔

بعض اسلامی روایات سے معلوم ہوتا ہے قرآن پوری آسمانی کتاب کا نام ہے جب کہ فرقان اس کی اُن آیات کے مجموعے کو کہتے ہیں جن میں عملی احکام، حلال و حرام اور انفرادی و اجتماعی منصوبوں کا ذکر ہے۔[4]

---

[1] انفال ۴۱ [2] بقرہ ۵۰ [3] اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا (انفال ۲۹) [4] تفسیر نور الثقلین ج ۱، صفحہ ۳۱۱ بحوالہ اصول کافی۔



۴۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ○ ؎

ترجمہ

۴۔ جو لوگ آیاتِ الٰہی کے منکر ہو گئے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے اور خدا بدکاروں اور سرکش کافروں کو عذاب دینے کی قدرت رکھتا ہے اور وہ انتقام لینے والا ہے۔

تفسیر

اتمامِ حجت، خدا کی طرف سے آیات کے نزول اور انبیاء کے دعویٰ کی صداقت پر عقل و فطرت کی گواہی کے بعد بلاشبہ انہیں قبول کر لینا چاہیے۔ لہٰذا جو لوگ ان تمام امور کے باوجود مخالفت کرتے ہیں تو اس کا سبب ہٹ دھرمی اور سرکشی کے علاوہ کچھ نہیں اور عقل و وجدان انہیں مستحق عذاب قرار دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس آیت میں منکرین آیات کو شدید اور دردناک عذاب کی تہدید کرتا ہے۔

"وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ"

لغت میں "عزیز" ہر مشکل چیز کے معنی میں ہے۔ وہ زمین جسے عبور کرنا سخت مشکل ہو اُسے "عزاز" کہتے ہیں۔ جو چیز کمیابی کی وجہ سے مشکل سے ملتی ہو اُسے بھی "عزیز" کہتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ کوئی شخص اس پر غلبہ کی قدرت نہیں رکھتا اور ہر کوئی اس کا ارادہ کر کے رہ جاتا ہے۔

کافروں کو آگاہ کرنے کے لیے کہ یہ تہدید اور دھمکی بالکل حقیقی اور حتمی ہے اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ خدا قادر ہے اس لیے کوئی شخص اس کی دھمکیوں پر عمل درآمد کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا کیونکہ جیسے وہ رحیم اور مہربان ہے جو لوگ رحمت کے قابل نہیں اُن کے لیے اس کے پاس عذاب شدید ہے اور ان کے لیے وہ صاحبِ انتقام ہے۔

آج کی اصطلاح میں "انتقام" زیادہ تر ایسے مواقع پر استعمال ہوتا ہے جہاں لوگ خلاف ورزیوں کے مقابلے میں معاف نہیں کرتے یا دوسرے اشتباہات کی بناء پر ویسا ہی بدلہ لیتے ہیں اور درگزر کرنے کو درست نہیں سمجھتے۔ یہ صفت مسلماً پسندیدہ نہیں ہے کیونکہ بہت سے مقامات پر ویسا ہی بدلہ لینے کی بجائے انسان کو عفو و درگزر کا راستہ اختیار کرنا چاہیے لیکن حقیقت میں انتقام لغوی طور پر اس معنی میں نہیں ہے بلکہ گناہگار کو سزا دینے کے معنی میں ہے اور مسلّم ہے کہ مغرور ستمگروں اور گناہگاروں کو سزا دینا نہ صرف پسندیدہ کام ہے بلکہ ان سے صرف نظر کرنا عدالت و حکمت کے

؎ آیت نمبر ۴ کا ابتدائی حصہ پہلی آیات کے ضمن میں ذکر ہو چکا ہے۔



خلاف ہے۔

٥۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَخْفٰی عَلَیْہِ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ ؕ۝

ترجمہ

٥۔ زمین و آسمان میں کوئی چیز بھی خدا پر مخفی نہیں رہتی (اس لیے اُن کی تدبیر کرنا بھی اُس کے لیے مشکل نہیں ہے)۔

تفسیر

یہ آیت درحقیقت گذشتہ آیات کے مفاہیم کی تکمیل کرتی ہے کیونکہ ہم گذشتہ آیات میں پڑھ چکے ہیں کہ خدا جاوداں اور قیوم ہے۔ جہانِ ہستی کی تدبیر اور انتظام اُس کے ہاتھ میں ہے۔ مسلم ہے کہ یہ کام قدرت و علم کا محتاج ہے لہٰذا گذشتہ آیت کے آخر میں اُس کی قدرتِ مطلقہ کی طرف اشارہ ہوا ہے اور یہ آیت اُس کے بے پایاں علم کی طرف اشارہ کرتی ہے اور کہتی ہے: زمین و آسمان کی کوئی چیز اللہ کے لیے مخفی اور مستور نہیں۔ یہی مضمون قرآن کی دیگر بہت سی آیات میں بھی آیا ہے۔

پروردگار کے وسعتِ علم کی دلیل واضح ہے کیونکہ وہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے اس لیے کہ اس کا وجود بے پایاں و غیر محدود ہے کوئی جگہ اس سے خالی نہیں ہے لہٰذا اگرچہ وہ محل و مقام نہیں رکھتا ہے تمام چیزوں پر محیط ہے۔ خدا کا یہ احاطۂ وجودی اور ہر جگہ پرا کے حاضر ہونے کا حتمی نتیجہ یہ ہے کہ تمام چیزوں اور جگہوں کے متعلق اس کا علم کامل ہے اور وہ بھی علمِ حضوری نہ کہ علمِ حصولی [1]

٦۔ ھُوَالَّذِیْ یُصَوِّرُکُمْ فِی الْاَرْحَامِ کَیْفَ یَشَآءُ ؕ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَالْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ۝

ترجمہ

٦۔ وہ وہ ذات ہے جو ماؤں کے رحم میں جیسی چاہتا ہے تمہاری صورت بناتا ہے (اسلیے

---

[1] علم حضوری کا مطلب یہ ہے کہ جس کا علم ہے یا جو معلوم ہے اس کی ذات عالم کے سامنے حاضر ہو لیکن علم حصولی میں معلوم کی شکل و صورت اور نقش و نگار عالم کے پاس حاضر ہوتے ہیں۔ مثلاً اپنی ذات کے متعلق ہمارا علم علم حضوری ہے کیونکہ ہماری ذات خود ہمارے سامنے حاضر ہے لیکن باقی موجودات کے بارے میں ہمارا علم علم حصولی ہے کیونکہ ہمارے سامنے تو ان کے فقط نقش و نگار اور شکل و صورت ہی حاضر ہے۔



اُس توانا اور حکیم خدا کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے۔

تفسیر

اس آیت میں خدا کی قدرت، دانائی اور حکمت کا شاہکار بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ شکم مادر میں انسان کی صورت بناتا ہے۔ واقعاً یہ امر تعجب خیز اور حیرت انگیز ہے کہ رحم کے اندر خدا انسان کے مختلف خط و خال بناتا ہے طرح طرح کی استعداد پیدا کرتا ہے، کئی قسم کی صفات عطا کرتا ہے اور جبلت و سرشت کی تشکیل کرتا ہے۔

جنین کے مراحل ـ تخلیق کا شاہکار

علم جنین شناسی کی ارتقاء نے آج کی دُنیا میں اس آیت کے مفہوم کی عظمت کو بہت اجاگر کر دیا ہے۔

ابتدا میں جنین ایک خلیے (CELL) پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس وقت اس کی کوئی شکل و صورت ہوتی ہے نہ اعضا وجوارح۔ اُس میں کوئی طاقت و توانائی بھی نہیں ہوتی۔ پھر وہ عجیب سُرعت سے رحم کے مخفی خانے میں ہر روز نئی شکل اور نیا نقش و نگار اپناتا ہے۔ جیسے نقش و نگار کے ماہرین اس کے پاس بیٹھے ہیں اور شب و روز اس پر کام کر رہے ہیں اور اس ناچیز ذرّے سے تھوڑے ہی عرصے میں ایک انسان بنا ڈالتے ہیں۔ وہ انسان جس کا ظاہر بہت ہی آراستہ و پیراستہ ہوتا ہے اور اس کے وجود کے اندر صاف ستھرے، پیچیدہ دقیق اور حیرت انگیز کارخانے نظر آنے لگتے ہیں۔ اب اگر مراحل جنین کی فلم لی جائے (جیسا کہ لی بھی گئی ہے) اور انسان کی آنکھوں کے سامنے یہ مناظر یکے بعد دیگرے گزرتے رہیں تو انسان کو عظمت خلقت اور قدرت خالق سے ایک نئی آشنائی ہوگی اور وہ بے اختیار کہہ اٹھے گا۔

ے زیبندۂ ستائش، آن آفریدگاری است

کارد چنین دل آویز، نقشی زماء وطینی

وہ خالق لائق تعریف ہے کہ جو ایسا دلآویز نقش پانی اور مٹی سے بنا لایا ہے۔

اور تعجب کی بات ہے کہ یہ تمام نقش و نگار پانی پر ہیں جس کے متعلق مشہور ہے کہ اس پر نقش و نگار نہیں ہو سکتے!

ع کہ کردہ است در آب صورت گری؟

یہ کون ہے کہ جس نے پانی پر صورتیں بنائی ہیں؟

یہ امر قابل توجہ ہے کہ انعقادِ نطفہ کے بعد جب جنین اپنی پہلی شکل اختیار کر لیتا ہے تو تیزی سے تقسیم و افزائش کے عمل سے گزرتا ہے اور پھر شہ توت کے ایک پھل کی طرح ہو جاتا ہے جس کے چھوٹے چھوٹے دانے ایک دوسرے سے ملے ہوتے ہیں۔ اُسے مرولا کہتے ہیں۔ عین اس پیش رفت کے موقع پر خون کا ایک لوتھڑا جسے جفت کہتے ہیں اس کے قریب ارتقائی حالت میں ہوتا ہے۔ ایک طرف سے جفت دو شریانوں اور ایک ورید کے ذریعے ماں کے دل سے ملا ہوتا ہے اور دوسری طرف بند ناف کے ذریعے جنین سے مربوط ہوتا ہے اور جنین خون جفت سے غذا حاصل کرتا ہے کیونکہ غذائی مواد خونِ جفت



میں موجود ہوتا ہے، غذا ملنے، ارتقائی سفر طے کرنے اور خلیوں کا باہر کی طرف رُخ کرنے سے مرولا کا اندرونی حصہ آہستہ آہستہ خالی ہو جاتا ہے جسے بلاسٹولا کہتے ہیں۔ زیادہ وقت نہیں گزرتا کہ بلاسٹولا کے خلیوں کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے اب بلاسٹولا دو تہوں والے تھیلے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ پھر وہ اپنے اندر کی طرف سکڑنا شروع کر دیتا ہے جس کے نتیجے میں بچہ دو حصوں یعنی سینہ اور شکم میں تقسیم ہو جاتا ہے۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ اس مرحلے تک تمام خلیے ایک دوسرے کے مشابہ ہوتے ہیں اور ظاہراً ان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اس مرحلے کے بعد جنین کی صورت بننے لگتی ہے اور اس کے اجزاء میں آئندہ انجام پانے والے کاموں کی مناسبت سے تغیر آنے لگتا ہے۔ نئے تانے بانے بننے لگتے ہیں اور نئی مشینیں حرکت میں آجاتی ہیں اور خلیوں کا ایک ایک گروپ بن کر کسی ایک مشین کو اپنے ذمے لے لیتا ہے مثلاً اعصاب کی مشین، گردش خون اور معدے کا عمل وغیرہ اس کے نتیجے میں جنین رحم کے مخفی خانے میں ایک موزوں انسان کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

"تکامل جنین اور اس کے مختلف مراحل کی تفصیل انشاءاللہ سورہ مومنون کی آیت ۱۲ کے ذیل میں پیش کی جائے گی۔

ابتدائے سورہ میں جو شان نزول بیان کی گئی ہے اُسے نگاہ میں رکھیں تو اس آیت کا مقصد واضح ہو جاتا ہے اس میں حضرت عیسٰی کی پیدائش اور عیسائیوں کے عقائد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب خود عیسائی قبول کرتے ہیں کہ حضرت مسیح شکم مادر میں پروان چڑھے اور اُنھوں نے خود اپنے تئیں پیدا نہیں کیا لہٰذا وہ کسی پیدا کرنے والے کی مخلوق ہیں کہ جس نے عالم رحم میں اس طرح سے ان کی ہیئت و صورت بنائی ہے۔ اس لیے کیسے ممکن ہے کہ حضرت مسیح خدا ہوں۔

"لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ"

اس جملے میں تاکید کی گئی ہے کہ حقیقی معبود صرف خدائے قادر و حکیم ہے جو نہ صرف رحم مادر میں پانی کے قطرے پر خوبصورت اور نئی نئی شکلیں بناتا ہے بلکہ اس کی قدرت و حکمت پوری کائنات پر محیط ہے اس لیے حضرت مسیح جیسی مخلوق کو کس طرح معبود قرار دیا جا سکتا ہے وہ مخلوق کہ جو اپنے سارے وجود اور ہستی میں اور تمام مراحل میں اس کی قدرت و حکمت کی محتاج ہے۔

۷۔ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاۗءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاۗءَ تَاْوِيْلِهٖ ڄ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ



وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِہٖ کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ○

ترجمہ

۷۔ وہ ذات وہ ہے کہ جس نے تم پر کتاب نازل کی جس کی بعض آیات محکم (صریح اور واضح) ہیں جو اس کتاب کی بنیاد ہیں (اور جو پیچیدگی دیگر آیات میں نظر آئے وہ ان کی طرف رجوع کرنے سے برطرف ہوجاتی ہے) اور کچھ آیات متشابہ ہیں (یہ وہ آیات ہیں جن میں بلند سطح کے مطالب بیان کئے گئے ہیں اور کچھ دیگر پہلو بھی ہیں جن کے باعث پہلی نظر میں ان میں مختلف احتمالی معانی دکھائی دیتے ہیں لیکن محکم آیات کی تفسیر کی طرف توجہ کرنے سے یہ آیات بھی اہل نظر پر واضح ہوجاتی ہیں) لیکن جن کے دلوں میں کجی ہے وہ متشابہات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں تاکہ فتنہ انگیزی کرتے رہیں (اور لوگوں کو گمراہ کریں) اور اس کی (غلط) تفسیر کرنا چاہتے ہیں حالانکہ ان کی تفسیر اللہ اور علم میں راسخ لوگوں کے علاوہ کوئی نہیں جانتا اور یہ (راسخون فی العلم) وہی ہیں جو (فہم و ادراک رکھتے ہیں، تمام آیات قرآنی کے اسرار و رموز سے آگاہ ہیں اور الٰہی علم و دانش کے سبب) کہتے ہیں کہ ہم ان سب پر ایمان رکھتے ہیں، سب کچھ ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے اور دانشمند لوگوں کے سوا کوئی تذکر نہیں کرتا (اور ان کے علاوہ کوئی ادراک حقیقت نہیں کر سکتا)

شانِ نزول

تفسیر نور الثقلین[1] میں معانی الاخبار کے حوالے سے امام باقر علیہ السلام سے ایک حدیث منقول ہے کہ یہودیوں کے چند افراد حی بن اخطب اور اس کے بھائی کے ہمراہ پیغمبر اسلامؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حروفِ مقطعہ ال م کی بنیاد پر کہنے لگے کہ ابجد کے حساب سے الف مساوی ہے ایک کے ۔ لام برابر ہے ۳۰ کے

[1] نور الثقلین، ج ۱، ص ۳۱۳



اور میم مساوی ہے ۴۰ کے۔ اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ آپ کی اُمت کی بقاء کا زمانہ اکہتر برس سے زیادہ نہیں ہے
پیغمبر اسلامؐ نے ان کی غلط فہمی کے ازالے کے لیے فرمایا:
نہ صرف "الٓمٓ" الف لام میم کا حساب کیوں کرتے ہو۔ کیا قرآن میں "الٓمٓصٓ" "الٓر" اور دیگر حروف مقطعہ نہیں ہیں۔ اگر یہ حرف میری اُمت کی بقاء کی مدت کی طرف اشارہ ہیں تو پھر سب کا حساب کیوں نہیں کرتے ہو ، جب کہ ان حروف سے تو کچھ اور مراد ہے۔

بہرحال اس واقعے پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی۔

تفسیر "فی ظلال القرآن" میں اس آیت کی ایک اور شان نزول بھی منقول ہے جو نتیجے کے اعتبار سے پہلی شان نزول ہی سے ہم آہنگ ہے اور وہ یہ ہے کہ نجران کے کچھ عیسائی پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے حضرت مسیح کے بارے میں قرآنی تعبیر "کلمۃ اللّٰہ و روحہ" کو اپنے حق میں دلیل قرار دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنے عقیدۂ تثلیث اور حضرت عیسیٰؑ کے خدا ہونے کے اپنے نظریے کے لیے اس سے غلط فائدہ اٹھائیں اور ان آیات کو نظر انداز کر دیں جو پوری صراحت سے خدا کے لیے ہر قسم کے شریک اور شبیہ کی نفی کرتی ہیں۔ اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی۔

تفسیر

اس آیت میں مُحکم و مُتشابہ آیات کا ذکر ہے اور اسی میں اہل ایمان اور بے ایمان لوگوں کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ ان آیات سے کس طرح وابستگی اختیار کرتے ہیں۔ آیت کے عمیق اور گہرے مطالب سے آگاہی کے لیے مندرجہ ذیل نکات کا واضح ہونا ضروری ہے:

(۱) محکم اور متشابہ آیات سے کیا مراد ہے

لفظ "مُحکم" دراصل "احکام" سے لیا گیا ہے جس کا معنیٰ ہے ممنوع قرار دینا۔ اسی لیے پائیدار اور استوار چیزوں کو "محکم" کہتے ہیں۔ چونکہ نابودی اور تباہی کے عوامل ان سے دور ہوتے ہیں۔ واضح اور قطعی باتیں جو ہر مخالف احتمال کو اپنے سے دُور کر دیں بھی "مُحکم" کہلاتی ہیں۔ اس لیے آیات محکمات سے مراد وہ آیات ہیں جن کا مفہوم اس قدر واضح ہے کہ اُن کے معنیٰ میں گفتگو اور بحث و تمحیص کی گنجائش نہ ہو۔ مثلاً

- "قل ھو اللّٰہ احد"



- "لیس کمثلہ شیء"
- "اللہ خالق کل شیء"
- "للذکر مثل حظ الانثیین".

اور ایسی ہی دیگر ہزاروں آیات ہیں جو عقائد، احکام، مواعظ اور تاریخ کے بارے میں ہیں اور سب کی سب "محکمٰت" ہیں۔

یہ "محکمٰت" قرآن میں "ام الکتٰب" کے نام سے موسوم ہیں یعنی یہی وہ آیات ہیں جنہیں اصل مرجع، مفسر اور دیگر آیات کی وضاحت کرنے والی کہا جا سکتا ہے۔

لفظ "متشابہ" سے دراصل ایسی چیز مراد ہے جس کے مختلف حصے ایک دوسرے سے شباہت رکھتے ہوں۔ اسی لیے وہ جملے اور کلمات جس کے معانی پیچیدہ ہوں اور بعض اوقات ان کے بارے میں مختلف احتمالات پیدا ہو جائیں "متشابہ" کہلاتے ہیں متشابہات قرآن سے ایسی ہی آیات مراد ہیں۔ یعنی وہ آیات جن کے معانی پہلی نظر میں پیچیدہ ہیں اور ابتداء میں ان میں کئی احتمالات دکھائی دیتے ہیں۔ اگرچہ آیاتِ محکمات کی طرف توجہ کرنے سے ان کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

مفسرین نے "محکم" اور متشابہ کے بارے میں اگرچہ بہت سے احتمالات پیش کیے ہیں لیکن ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ ان دونوں الفاظ کے اصل معانی سے بھی مطابقت رکھتا ہے اور شان نزول اور اس آیت کے ذیل میں وارد ہونے والی روایات جن میں اُن کی تفسیر بیان کی گئی ہے کے بھی مطابق ہے۔ نیز خود محل بحث آیت سے بھی مطابقت رکھتا ہے۔ کیونکہ مذکورہ آیت میں ہے کہ خود غرض لوگ متشابہ آیات کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں واضح ہے کہ ایسے لوگ انہی آیات سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں جن کی پہلی نظر میں متعدد تفاسیر ہو سکتی ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ متشابہ کا وہی مفہوم ہے جو ہم اُوپر بیان کر چکے ہیں۔

متشابہ آیات کے لیے ہم اُن آیات کے نمونے پیش کرتے ہیں جو صفاتِ خدا اور معاد و قیامت کی کیفیت سے مربوط ہیں مثلاً:

- "ید اللہ فوق ایدیھم"

(خدا کا ہاتھ اُن کے ہاتھوں کے اوپر ہے)

یہ قدرتِ خدا کے بارے میں ہے۔

- "واللہ سمیع علیم"

(خدا سننے والا اور جاننے والا ہے)

یہ علم الٰہی کی طرف اشارہ ہے۔

- "ونضع الموازین القسط لیوم القیامۃ" (الانبیاء: ۴۷)



(قیامت کے دن ہم عدالت کے ترازو مقرر کریں گے)

یہ اعمال کے ناپ تول کے ذریعے کے متعلق ہے۔

واضح ہے کہ خدا کا ہاتھ کسی خاص عضو کے مفہوم میں نہیں ہے یونہی اس کا سننا بھی کسی کان کے وسیلے سے نہیں ہے اور نہ ہی اعمال کو تولنے کے لیے اُس کے پاس کوئی ایسا ترازو ہے جس کے ہم عادی ہیں بلکہ یہ سب قدرت و علم اور اعمال کی قدر و قیمت کے مفاہیم کی طرف اشارہ ہے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ محکم اور متشابہ قرآن میں ایک اور مفہوم کے لیے بھی استعمال ہوئے ہیں۔ سورہ ہود کے شروع میں ہے:

"کتٰب احکمت اٰیٰتہ"

اس آیت میں تمام آیات قرآن کو محکم کہا گیا ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ آیات قرآن ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور باہم پیوستہ ہیں۔

سورہ الزمر آیہ ۲۳ میں ہے:

"کتٰبًا متشابھًا"

یعنی ـــــ وہ کتاب کہ جس کی تمام آیات متشابہ ہیں

یہاں متشابہ سے مراد یہ ہے کہ اس کتاب کی آیات درستی اور حقیقت کے لحاظ سے ایک دوسرے کی مانند ہیں۔

محکم اور متشابہ کے بارے میں جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی جویائے حقیقت کے لیے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں کہ وہ اپنے پروردگار کے ارشادات کو سمجھنے کے لیے تمام آیات کو ایک جگہ پر رکھے اور اگر کچھ آیات کے ظواہر میں پہلی نظر میں کوئی ابہام یا پیچیدگی دکھائی دے تو دوسری آیات کو سامنے رکھتے ہوئے اسے دور کرے اور اس طرح ان آیات کی حقیقت تک پہنچے۔ آیات محکمات درحقیقت بڑی شاہراہوں کی مثل ہیں اور متشابہات ذیلی اور چھوٹے راستوں کی مانند ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر انسان کبھی چھوٹے اور ذیلی راستوں کے بارے میں حیران و سرگرداں ہو تو وہ کوشش کرتا ہے کہ وہ پہلے شاہراہ تک پہنچ جائے اور وہاں سے اپنے راستے کا پھر سے صحیح طریقے سے تعین کرے۔ محکمات کو ام الکتاب قرار دینا بھی اس حقیقت کی تائید کرتا ہے کیونکہ لفظ "ام" لغت میں ہر چیز کی اصل اور اساس کے معنی میں ہے ماں کو ام کہنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ خاندان کی جڑ ہوتی ہے اور حوادث و مشکلات میں وہی اولاد کی پناہ گاہ بھی ہوتی ہے۔ اس لیے محکمات دیگر آیات کے لیے اساس، جڑ اور ماں کی حیثیت رکھتی ہیں۔

۲۔ قرآن کی کچھ آیات متشابہ کیوں ہیں

اس کے باوجود کہ قرآن نور، روشنی اور حق ہے، ایک واضح کلام ہے اور تمام لوگوں کی ہدایت کے لیے آیا ہے



اس میں متشابہ آیات کیوں ہیں اور بعض آیات کے مفاہیم ایسے پیچیدہ کیوں ہیں کہ فتنہ انگیز لوگوں کے لیے غلط مقاصد کے حصول کا سبب بنتے ہیں۔

یہ موضوع بہت اہمیّت کا حامل ہے اور گہرے غور و فکر کا متقتضی ہے۔ ہو سکتا ہے مجموعی طور پر مندرجہ ذیل وجوہات قرآن میں آیات متشابہات کا سبب اور راز ہوں۔

(۱) انسانوں کی گفتگو میں استعمال ہونے والے الفاظ اور جملے روزمرّہ کی ضروریات کے ماتحت ہوتے ہیں اس لیے جب ہم انسان کی محدود مادی زندگی کے دائرے سے باہر نکلیں اور مثلاً خالق کائنات کے بارے میں گفتگو کریں جو ہر جہت سے لامحدود ہے تو ہمیں نظر آئے گا کہ ہمارے الفاظ اِن معانی کے لیے سانچے اور قالب کا کام نہیں دیتے تاہم ہم وہی الفاظ استعمال کرنے پر مجبور ہیں اگرچہ یہ الفاظ مختلف پہلوؤں سے ناقابل اور نارسا ہیں۔ الفاظ کی یہی نارسائی متشابہاتِ قرآن کے اہم حصّے کا سرچشمہ ہے۔ یہ آیات اسی مفہوم کے ادراک کے لیے نمونہ ہیں

"ید اللہ فوق ایدیھم"

"الرحمٰن علی العرش استوٰی"

"الٰی ربھا ناظرۃ"

ان آیات کی تفسیر اپنے مقام پر آئے گی۔ سمیع و بصیر جیسی تعبیرات بھی اسی قبیل سے ہیں۔ ان کی تفسیر آیات محکمات کی طرف رجوع کرنے سے اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔

(۲) بہت سے حقائق دوسرے جہاں یا عالم ماورائے طبیعت سے مربوط ہیں۔ یہ حقائق ہماری فکر و نظر کے افق سے دُور ہیں۔ زمان و مکان کی قید میں محدود ہونے کی وجہ سے ہم ان کی گہرائی کا ادراک نہیں کر سکتے۔ اس لیے ہمارے افکار کی نارسائی اور ان معانی کے افق کی بلندی بعض آیات کے متشابہ ہونے کا دوسرا سبب ہے۔ جس کی مثال بعض وہ آیات ہیں جن کا تعلق قیامت وغیرہ سے ہے۔

یہ بالکل اس طرح ہے جیسے کوئی شخص کسی بچے کو عالم جنین میں اس دنیا کے حالات بتانا چاہے۔ اگر بات نہ کرے تو بڑی کوتاہی ہے اور اگر کچھ کہے تو مجبوراً مطالب کو سربستہ اور اجمالی صورت میں ادا کرے گا۔ کیونکہ سننے والا اس حالت میں زیادہ استعداد نہیں رکھتا۔

(۳) قرآن میں متشابہات کا ایک مقصد یہ ہے کہ لوگوں کی فکر و نظر کو زیادہ سے زیادہ کام میں لایا جائے اور فکری تحرک پیدا ہو۔ ہمیشہ پیچیدہ فکری مسائل مفکرین کے افکار کی تقویت کے لیے پیش کیے جاتے ہیں تاکہ وہ مسائل کے حل کے لیے زیادہ سے زیادہ تفکر و تدبّر اور تحقیق و جستجو سے کام لے سکیں۔

(۴) ایک اور نکتہ جو قرآن میں متشابہات کی موجودگی کے لیے ہے اور اہل بیت علیہم السلام کی روایات بھی جس کی تائید کرتی ہیں یہ ہے کہ قرآن میں ایسی آیات خدائی پیشواؤں، پیغمبر اکرمؐ اور ان کے اوصیاء کی شدید احتیاج کو واضح کرتی ہیں اور یہ اس طرح کہ احتیاج علمی لوگوں کو مجبور کرے گی کہ وہ ان کی جستجو اور تلاش کریں اور عملی طور پر ان کی رہبری تسلیم کریں۔ اس



طرح دیگر علوم اور دیگر مشکلات میں بھی انہی سے راہنمائی حاصل کریں ۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے درسی کتب میں کچھ مسائل کی تشریح معلم اور اُستاد کے ذمے کی جاتی ہے تاکہ طالب علم اُستاد سے اپنا رابطہ منقطع نہ کرے اور یوں اس ضرورت کے ماتحت تمام چیزوں میں اس کے افکار سے راہنمائی حاصل کرے۔ درحقیقت ایسی روایات قرآن کے بارے میں پیغمبر اسلام کی مشہور وصیت کا مصداق ہیں :

" انی تارك فیکم الثقلین کتاب الله و اهل بیتی و انهما لن یفترقا حتی یردا علی الحوض "

• یعنی ـــ میں تمہارے درمیان دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں : خدا کی کتاب اور اپنے اہل بیت اور یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ قیامت کے دن کوثر کے کنارے مجھ تک پہنچیں گے ۔ لہ

۳ ۔ تاویل کسے کہتے ہیں

" تاویل " کے معنی کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے لیکن حقیقت کے نزدیک یہ ہے کہ " تاویل " کا اصلی لغوی معنی ہے " کسی چیز کو پلٹانا " اس لیے ہر کام یا بات کو اس کے آخری مقصد اور ہدف تک پہنچا دینے کو " تاویل " کہتے ہیں ۔ مثلاً اگر کوئی شخص کچھ اقدام کرتا ہے جس کا اصلی ہدف واضح نہیں ہے لیکن آخر میں اسے معین کر دے تو اس چیز کو " تاویل " کہیں گے جیسے حضرت موسیٰ اور ایک عالم کے واقعے میں ہے کہ عالم نے سفر کے دوران میں ایسے کام انجام دیے جن کا مقصد واضح نہیں تھا (مثلاً کشتی میں سوراخ کرنا) اس پر حضرت موسیٰ پریشان ہوئے لیکن جب اس عالم نے اختتام سفر پر اپنا مقصد بیان کیا اور کہا میرا مقصد تو کشتی کو غاصب وظالم بادشاہ سے نجات دلانا تھا اور مزید کہا ۔

" ذلك تأويل ما لم تسطع عليه صبرًا ۔"

یہی وہ مقصد تھا جس پر تم صبر نہ کر سکے (الکہف ۸۲)

یونہی اگر کوئی شخص کوئی خواب دیکھے جس کا نتیجہ واضح نہ ہو ۔ پھر کسی سے پوچھنے پر یا کوئی منظر دیکھنے سے اسے اس خواب کی تعبیر معلوم ہو جائے تو اسے تاویل کہا جائے گا ۔ جیسے حضرت یوسف علیہ السلام نے جو مشہور خواب دیکھا جب وہ خارجی دُنیا میں عمل میں آیا اور اصطلاح کے مطابق انتہا کی طرف پلٹ آیا تو آپؑ نے فرمایا ۔

" هٰذا تأويل رؤياى من قبل "

یہ اُس خواب کی انتہا اور نتیجہ ہے جو میں نے دیکھا تھا (یوسف ۱۰۰)

اس طرح جب کوئی انسان ایسی بات کہے کہ جس میں مخصوص مفاہیم و اسرار مخفی ہوں تو اس کے حقیقی مقاصد کو تاویل کہیں گے ۔

محل بحث آیت میں بھی " تاویل " سے یہی مراد ہے یعنی قرآن میں کچھ ایسی آیات ہیں جن کے معانی و اسرار

لہ " مستدرك حاكم " جلد سوم ، صفحہ ۴۸



گبھرے ہیں البتہ منحرف افکار اور فاسد اغراض رکھنے والے لوگ اس کی غلط تفسیر اور معنی گھڑ لیتے ہیں اور اپنے آپ کو یا دوسروں کو غافل رکھنے کے لیے اس سے کام لیتے ہیں۔

اس بناء پر " ابتغاء تأویله " سے مراد یہ ہے کہ وہ آیت کی " تأویل " اس کی اصل صورت کے علاوہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں ابتغاء تأویله علی خلاف الحق!

جیسا کہ ہم آیت کی شانِ نزول میں پڑھ چکے ہیں کہ کچھ یہودیوں نے قرآن کے حروفِ مقطعات سے غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کا معنی یہ کر دیا کہ دینِ اسلام کی مدت کم ہے۔

اس طرح عیسائیوں نے " رُوحٌ مِّنۡهُ " سے حضرت عیسٰی کی الوہیت پر استدلال شروع کر دیا۔

یہ تمام چیزیں "تأویل بغیر حق" اور آیت کو غیر واقعی اور غلط ہدف و مقصد کی طرف پھیرنے کے مفہوم میں داخل ہیں۔

۴۔ "راسخون فی العلم" کون ہیں

یہ تعبیر قرآن مجید میں دو مقامات پر استعمال ہوئی ہے۔ ایک تو اسی مقام پر اور دوسرا سورہ نساء آیہ ۱۶۲ میں جہاں فرمایا گیا ہے۔

" لکن الراسخون فی العلم منهم والمؤمنون
یؤمنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک "

" علم میں راسخ اہل کتاب میں سے اور اہل ایمان (بھی) اس پر ایمان رکھتے ہیں جو کچھ تم پر نازل ہوا اور جو کچھ تم سے پہلے نازل ہوا ہے۔"

اس لفظ کے لغوی معنی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو علم و دانش میں ثابت قدم اور صاحبِ نظر ہیں۔

البتہ اس لفظ کا ایک وسیع مفہوم ہے جس میں تمام علماء اور مفکرین شامل ہیں تاہم ان میں کچھ ایسے ممتاز افراد ہیں جن میں ایک مخصوص درخشندگی اور روشنی ہوتی ہے جو طبعاً اس لفظ کے درجہ اول کے مصادیق قرار پاتے ہیں اور جب کبھی یہ لفظ ادا ہو، سب سے پہلے نگاہیں انہی کی طرف اٹھتی ہیں۔

یہ جو کئی ایک روایات میں " راسخون فی العلم " سے پیغمبر اسلامؐ اور آئمہ ہدیٰ علیہم السلام مراد لیے گئے ہیں تو اس کی یہی وجہ ہے۔ ہم کئی مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ قرآن کی آیات اور الفاظ وسیع مفاہیم رکھتے ہیں۔ بہرحال اس کے مصادیق میں سب سے پہلے اس مفہوم کے غیر معمولی اور فوق العادہ قابلیت رکھنے والے افراد ہی آتے ہیں یہاں تک کہ بعض اوقات اس کی تفسیر میں فقط انہی کا نام آتا ہے۔ اصول کافی میں امام باقرؑ یا امام صادقؑ سے روایت ہے۔ فرمایا:

رسولِ خدا راسخون فی العلم میں سب سے بلند تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی آپؐ پر نازل فرمایا آپ اس کی تاویل و تنزیل سے واقف تھے۔ خدا نے آپ پر کوئی ایسی چیز نازل نہیں کی جس کی تاویل آپ کو نہ سکھائی ہو اور آپ کے اوصیاء بھی قرآن کی سب تاویل و تنزیل کو جانتے ہیں۔ اس سلسلے میں بہت سی اور روایات بھی اصول کافی اور دیگر کتب احادیث میں موجود ہیں جنہیں



نور الثقلین اور البرہان کے مولفین نے اس آیہ کے ذیل میں جمع کیا ہے اور جیسا کہا جا چکا ہے کہ راسخون فی العلم سے جہاں جہاں پیغمبر اسلامؐ اور ائمہ ہدیٰ مراد لیے گئے ہیں وہاں اس کے وسیع مفہوم کی نفی نہیں ہوجاتی ۔ اسی لیے ابن عباس سے منقول ہے وہ کہتے ہیں :

میں بھی راسخون فی العلم میں سے ہوں ۔

البتہ ہر شخص قرآنی اسرار و تاویل سے اپنے علم کے مطابق ہی آگاہ ہوگا اور جن کے علم کا سرچشمہ پروردگار کا علم بے کنار ہے یقیناً وہ تمام اسرارِ قرآن اور تمام تر تاویلات قرآن سے آشنا ہیں جب کہ اُن کے علاوہ دوسرے لوگ تو کچھ اسرار سے واقف ہیں ۔

یہاں مفسرین اور علماء ایک اہم بحث کرتے ہیں وہ یہ کہ کیا " راسخون فی العلم " ایک مستقل جملے کی ابتداء ہے یا عطف سے " الا اللہ " سے منسلک ہے ۔

دوسرے لفظوں میں : کیا آیت کا معنی یہ ہے کہ :

قرآن کی تاویل خدا اور راسخون فی العلم کے علاوہ کوئی نہیں جانتا ۔ ۔ ۔

یا اس کا مفہوم یہ ہے کہ

قرآن کی تاویل صرف اللہ ہی جانتا ہے ، باقی رہے راسخون فی العلم تو وہ کہتے ہیں اگرچہ آیات متشابہ کی تاویل ہمیں معلوم نہیں تاہم ہم ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں اور وہ سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہیں ۔

ان دونوں نظریات کے طرفداروں نے اپنے موقف کی تائید کے لیے شواہد پیش کئے ہیں لیکن جو چیز آیت میں موجود قرائن اور مشہور روایات سے ہم آہنگ ہے یہ ہے کہ " الراسخون فی العلم " کا عطف " اللہ " پر ہے اور یہ آپس میں منسلک ایک ہی جملہ ہے کیونکہ :

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ بہت بعید ہے کہ قرآن میں کچھ ایسی آیات بھی ہوں کہ جن کے اسرار خدا تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہ جانتا ہو ۔ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ کیا یہ آیات لوگوں کی تربیت اور ہدایت کے لیے نازل نہیں ہوئیں ۔ اگر اسی لیے نازل ہوئی ہیں تو پھر کیسے ممکن ہے کہ خود پیغمبر اکرمؐ کہ جن پر قرآن نازل ہوا ہے وہ ان کے معانی اور تاویل سے بے خبر ہوں کیونکہ یہ تو بالکل اسی طرح ہوگا کہ ایک شخص کوئی ایسی کتاب لکھے کہ جس کے بعض جملوں کا مفہوم خود اس کے علاوہ کوئی نہ سمجھ سکے ۔

دوسری بات یہ ہے کہ مرحوم طبرسی مجمع البیان میں کہتے ہیں :

کبھی نہیں دیکھا کہ مفسرین اور علماء اسلام کسی آیت کی تفسیر پر بحث کرنے میں احتراز کریں اور یہ کہیں کہ یہ آیت ان آیات میں سے ہے کہ جس کے حقیقی معنی خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا بلکہ سبھی ہمیشہ قرآن کے اسرار و معانی معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔

تیسری بات یہ ہے کہ اگر مقصد یہ ہے کہ راسخون فی العلم جس چیز کو نہیں جانتے اُس کے سامنے سرِتسلیم خم



کرتے ہیں تو پھر زیادہ مناسب یہ تھا کہ کہا جاتا کہ ایمان میں راسخ وہ لوگ ہیں، کیونکہ علم میں راسخ ہونا تو تاویل قرآن سے آگاہی سے مناسبت رکھتا ہے نہ کہ عدم آگاہی اور سرتسلیم خم سے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ بہت سی روایات جو اس آیت کی تفسیر میں منقول ہیں سب کی سب تائید کرتی ہیں کہ "راسخون فی العلم" وہ لوگ ہیں جو آیات قرآنی کی تاویل کو جانتے ہیں۔

ان دلائل کے پیش نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ عطف لفظ "اللہ" پر ہے اور والراسخون فی العلم نئے جملے کا آغاز نہیں ہے۔

جو چیز باقی رہ جاتی ہے وہ نہج البلاغہ کے خطبہ "اشباح" کا ایک جملہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ راسخون فی العلم آیات کی تاویل سے ناواقف ہیں اور وہ اپنے عجز و ناتوانی کا اعتراف کرتے ہیں:

"واعلم ان الراسخين في العلم هم الذين اغناهم عن اقتحام السدد المضروبة دون الغيوب الاقرار بجملة ما جهلوا تفسيره من الغيب المحجوب؟

اور جان لو کہ راسخین فی العلم وہ ہیں جو اسرار غیبی کے مقابلے میں اعتراف عجز کرتے ہیں اور وہ ان اسرار کی تفسیر سے عاجز ہیں اسی عجز نے انہیں اس سلسلے میں کوشش و کوشش سے بے نیاز کر دیا ہے۔[1]

یہ جملہ بعض ان روایات سے متفق معلوم نہیں ہوتا جو خود حضرت امیرالمومنینؑ سے ہی منقول ہیں اور جن میں آپؑ نے "راسخون فی العلم" کا عطف "اللہ" پر قرار دیا ہے اور انہیں قرآنی تاویل سے آگاہ بتایا ہے اور پھر مندرجہ بالا دلائل پر بھی یہ منطبق نہیں[2] لہٰذا ضروری ہے کہ خطبہ اشباح کے اس جملے کی ایسی توجیہ کی جائے جو ہمارے پاس موجود دیگر مدارک سے اختلاف نہ رکھتی ہو۔[3]

آیت کی تفسیر کے سلسلے میں نتیجۂ کلام

زیر بحث آیت کی تفسیر کے ضمن میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی آیات دو قسم کی ہیں:

۱۔ ایک وہ کہ جن کا مفہوم اس طرح واضح اور روشن ہے کہ ان سے کسی قسم کے انکار، ان کی توجیہ اور ان سے غلط فائدہ اٹھانے کی بالکل گنجائش نہیں ہے۔ انہیں **محکمات** کہتے ہیں۔

دوسری قسم کی آیات وہ ہیں جن کے مطالب کی سطح بلند ہے یا ان میں ایسے عوالم کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۹۰

[2] تفسیر نور الثقلین ج ۱، ... کی طرف رجوع فرمائیں۔ [3] نہج البلاغہ کا یہ جملہ دراصل خود راسخون فی العلم کے علم کی عظمت پر دلالت کرتا ہے کہ وہ اپنے علم کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ کے وسعت علم کا اندازہ کرتے ہیں اور اس کے سامنے اپنے عجز کا اظہار کرتے ہیں۔ اس لیے یہ بات صحیح ہے کہ یہ جملہ قرآن میں راسخون فی العلم کے تاویل قرآن سے ناواقف ہونے کے کسی مفروضہ مفہوم کی تائید نہیں کرتا۔ (مترجم)



کہ جو ہماری دسترس سے باہر ہیں مثلاً عالمِ غیب ، جہانِ حشر و نشر اور صفاتِ خدا وغیرہ ۔ ان آیات کا حقیقی معنی ، اسرار اور ان کی کنہ حقیقت کا ادراک مخصوص علمی سرمائے کا محتاج ہے ۔ انہیں **متشابہات** کہتے ہیں ۔

منحرف اور کج رو افراد عموماً کوشش کرتے ہیں کہ آیات متشابہات سے غلط مقصد حاصل کریں ان کی خلافِ حق تفسیر کریں تاکہ لوگوں میں فتنہ انگیزی کریں اور انہیں راہِ حق سے گمراہ کریں ۔ لیکن اللہ تعالیٰ اور راسخین فی العلم ان آیات کے اسرار کو جانتے ہیں اور لوگوں کے سامنے اُن کی تشریح کرتے ہیں ۔ وہ اپنے وسیع علم کی روشنی میں آیات متشابہات کا آیات محکمات کی طرح ادراک کرتے ہیں اور اس بناپر سب کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تمام آیات ہمارے پروردگار کی طرف سے ہیں کیونکہ سب آیات چاہے محکم ہوں یا متشابہ ان کے علم و دانش کے سامنے واضح اور روشن ہیں ۔

"یقولون اٰمنا بہ کل من عند ربنا ."

علم میں راسخ ہونا سبب بنتا ہے کہ انسان اسرارِ قرآن سے زیادہ سے زیادہ آگاہ ہوتا ہے البتہ جو علم و دانش کے لحاظ سے پہلے درجے پر فائز ہیں یعنی پیغمبر اکرمؐ اور آئمہ ہدیٰ علیہم السلام تو وہ تمام اسرار سے آگاہ ہیں جبکہ باقی لوگ اپنے علم و فضل کی مقدار کے برابر ان میں سے کچھ چیزیں جانتے ہیں یہی وجہ ہے کہ علماء بھی خدا کے بھیجے ہوئے معلمین سے اسرارِ قرآن حاصل کرنے کے درپے رہتے ہیں ۔

"وما یذکر الا اولوا الالباب ."

یہ جملہ اس طرف اشارہ ہے کہ ان حقائق کو صرف صاحبانِ عقل و خرد اور اہلِ فکر و نظر ہی جانتے ہیں ۔ یہی لوگ سمجھتے ہیں کہ قرآن میں محکم و متشابہ آیات کیوں موجود ہیں اور یہی لوگ سمجھتے ہیں کہ آیات متشابہ کو محکم آیات کے سامنے رکھ کر معانی معلوم کئے جاتے ہیں ۔ اسی لیے امام علی بن موسیٰ علیہما السلام سے منقول ہے ، آپؑ نے فرمایا:

"من رد متشابہ القراٰن الیٰ محکمہ ھدی الیٰ صراطٍ مستقیم."

جو شخص آیاتِ متشابہ کو آیاتِ محکم کی طرف پلٹاتا ہے اُس نے سیدھے راستے کی طرف ہدایت حاصل کی ہے [1]

۸۔ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ○

۹۔ رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ○

---

[1] تفسیر صافی ، آیہ محل بحث کے ذیل میں



ترجمہ

۸۔ (راسخین فی العلم کہتے ہیں) پالنے والے ہمارے دلوں کو سیدھے رہنے کی ہدایت کے بعد منحرف نہ کر دے اور اپنی طرف سے ہم پر رحمت فرما کیونکہ تو ہی بخشنے والا ہے۔

۹۔ اے ہمارے پروردگار! تو لوگوں کو اس دن جمع کرے گا جس میں کوئی شک و تردّد نہیں ہے کیونکہ اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا (ہم تجھ پر، تیری رحمت بے پایاں پر اور حشر و نشر اور قیامت کے وعدے پر ایمان رکھتے ہیں)۔

تفسیر

ممکن ہے کہ آیات متشابہ اور اُن کے حقیقی اسرار و رموز لوگوں کے لیے مقام لغزش ہو جائیں لہٰذا اہل ایمان، راسخین فی العلم اور صاحبان فکر و نظر آیات کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے اپنے علمی سرمائے سے کام لینے کے علاوہ اپنے خدا کی پناہ اور سہارا بھی حاصل کرتے ہیں اور یہ دونوں آیات جو راسخون فی العلم کی زبان سے نقل ہوئی ہیں اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ علم میں راسخ، آگاہ اور فکر و نظر کے حامل لوگ ہمیشہ اپنے قلب و روح کی حفاظت کرتے رہتے ہیں تاکہ وہ ٹیڑھے راستوں کی طرف مائل نہ ہوں اور وہ اس راہ میں خدا سے مدد طلب کرتے ہیں کیونکہ بہت سے لوگ علمی غرور و تکبر کے باعث شکست سے ہمکنار ہو گئے ہیں اور کج راستوں میں سرگرداں ہیں کیونکہ وہ خالق کی عظمت، اپنی خلقت اور اپنی کم علمی کو فراموش کر بیٹھے ہیں اور اپنے پروردگار کی ہدایت سے محروم ہو گئے ہیں۔ لیکن اہل ایمان اور صاحبان فکر و نظر کہتے ہیں " ربنا لا تزغ قلوبنا ......"

علاوہ ازیں افکار و نظریات کو کنٹرول کرنے کے لیے معاد اور قیامت کے اعتقاد سے بڑھ کر کوئی چیز مؤثر نہیں۔ راسخین فی العلم مبداء و معاد کے عقیدے کے ذریعے اپنے افکار کو اعتدال پر رکھتے ہیں۔ وہ حد سے گزرے ہوئے رجحانات اور جذبات سے اجتناب کرتے ہیں کیونکہ یہ لغزش کا سبب بنتے ہیں۔ اس طرح وہ ایک درست اور بے مزاحم فکر و نظر کے ذریعے صحیح راستے کو دیکھتے ہیں اور اس پر چلتے ہیں۔

ہاں ایسے ہی افراد آیات الٰہی سے مکمل طور پر استفادہ کر سکتے ہیں۔

درحقیقت پہلی آیت مبداء کے بارے میں ان کے کامل ایمان کی طرف اشارہ ہے اور دوسری آیت معاد کے بارے میں اُن کے راسخ عقیدے کا اظہار ہے۔



۱۰۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ
اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْــًٔا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمْ وَقُوْدُ
النَّارِ ۝

۱۱۔ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَذَّبُوْا
بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاَخَذَھُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ
الْعِقَابِ ۝

ترجمہ

۱۰ — جو لوگ کافر ہو گئے ہیں انہیں مال و دولت اور اولاد خدا سے بے نیاز نہیں کر سکتے (اور وہ انہیں اس کے عذاب سے نہیں چھڑا سکتے) اور وہ (جہنم کی) آگ کا ایندھن ہیں۔

۱۱ — (انکارِ حقائق اور تحریف میں) ان کی عادت آل فرعون اور ان سے پہلے لوگوں کی طرح ہے، انہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی اور خدا نے ان کے گناہوں کے باعث ان کی گرفت کی اور خدا شدید العقاب ہے۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں محکم اور متشابہ آیات کے ساتھ کفار، منافقین اور مومنین کے رویّے کی تشریح کی گئی ہے۔
اس کے بعد اب فرمایا گیا ہے: اگر ہٹ دھرم کافر یہ سمجھتے ہیں کہ اُن کا مال و دولت اور آل اولاد دوسرے جہاں میں انہیں بچا سکتے ہیں تو وہ سخت اشتباہ میں ہیں۔ ممکن ہے یہ اس جہاں میں وقتی طور پر کچھ حوادث کے مقابلے میں انسان کے کام آجائیں لیکن پروردگار کے مقابلے میں اس دُنیا میں اور دوسرے جہاں میں ان کی کوئی حیثیت نہیں لہٰذا یہ چیزیں کسی غرور اور جرأت گناہ کا باعث نہیں بننا چاہئیں۔ آیت کے آخر میں کہا گیا ہے وہ جلا ڈالنے والی آگ



میں گرفتار ہوں گے جس کا وہ خود ایندھن بنیں گے۔ "و اولٰئک ھم وقود النار"۔[1]

مندرجہ بالا تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ جہنم کی آگ کے شعلے خود گنا ہگاروں کے وجود کے اندر سے اٹھیں گے اور انہی کا وجود اُن میں آگ لگا دیگا نہ کہ کوئی اور چیز۔ البتہ کچھ آیات ایسی ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ دوزخ کا ایندھن گنا ہگاروں کے علاوہ پتھر بھی ہوں گے لیکن جیسے جلد اوّل سورہ بقرہ آیہ ۲۴ کے ذیل میں کہا جا چکا ہے کہ ممکن ہے ان سے وہ بُت مراد ہوں جو وہ پتھر سے بناتے تھے۔ اِس طرح جہنم میں آگ اُن کے وجود سے۔ باطل اعمال سے اور جھوٹے معبودوں سے شعلے بن کر نکلے گی۔

کدأب اٰل فرعون

"دأب" اصل میں سیر و حرکت کے دائم و قائم رکھنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور "ہر مسلسل کام اور عادت" کے مفہوم میں بھی مستعمل ہے۔

مندرجہ بالا دوسری آیت میں پیغمبر اکرمؐ کے دور کے کفار کی حالت کو آل فرعون اور اُن سے پہلی قوموں کی غلط اور مستقل عادت و سیرت سے تشبیہ دی گئی ہے۔ وہ لوگ آیاتِ خدا کی تکذیب کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے اُن کی اُن کے گناہوں کی وجہ سے گرفت کی اور وہ اِسی جہاں میں سخت سزا اور عذاب میں مبتلا ہوئے۔

درحقیقت یہ پیغمبر اکرمؐ کے زمانے کے ہٹ دھرم کافروں کو تنبیہ ہے کہ وہ آل فرعون اور ان سے پہلی قوموں کی حالت کو نظر میں رکھیں اور اپنے اعمال کا جائزہ لیں۔

یہ صحیح ہے کہ خدا ارحم الراحمین ہے لیکن اپنے مقام پر اور بندوں کی تربیت کے لیے وہ شدید العقاب بھی ہے لہٰذا پروردگار کی وسیع رحمت کہیں کسی کے لیے غرور و تکبر کا باعث نہ بن جائے۔

لفظ "داب" سے ضمناً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت کے مقابلے میں ان کی ہٹ دھرمی کا یہ غلط انداز اور تکذیبِ آیاتِ الٰہی اُن کی عادت بن چکی تھی۔ اسی لیے اُنہیں سخت سزا اور عذاب سے ڈرایا گیا ہے کیونکہ جب تک گناہ اور تجاوز کسی کی عادت اور راہ و رسم نہ بن جائے اس کا لوٹ آنا آسان ہے اور اس کی سزا نسبتاً کم ہے لیکن جب وہ وجودِ انسانی میں نفوذ کرے تو پھر لوٹ آنا مشکل ہے اور اس کی سزا بھی سخت ہے لہٰذا کیا ہی اچھا ہے کہ کافر اور گنا ہگار جب کہ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا غلط راستے سے لوٹ آئیں۔

۱۲۔ قُلْ لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰی جَھَنَّمَ ؕ وَبِئْسَ الْمِھَادُ ۝

---

[1] پہلے کہا جا چکا ہے کہ "وقود" کا معنی ایندھن ہے یعنی وہ چیز جس سے آگ جلائی جاتی ہے (لکڑیوں کی طرح کی) نہ وہ کہ جس سے آگ جلائی جاتی ہے (جیسے ماچس)



ترجمہ

۱۲ — جو کافر ہو گئے ہیں ان سے کہہ دیجئے (جنگ احد کی وقتی فتح پر خوش نہ ہو جاؤ) عنقریب تم مغلوب ہو جاؤ گے (اور پھر آخرت میں) جہنم کی طرف محشور ہو گے اور وہ کس قدر بری جگہ ہے۔

شانِ نزول

جنگ بدر اور اس میں مسلمانوں کی کامیابی کے بعد بعض یہودی کہنے لگے: جس رسول اُمّی کی تعریف و توصیف ہم نے اپنی مذہبی کتاب تورات میں پڑھی ہے کہ وہ کسی جنگ میں مغلوب نہیں ہوگا وہ یہی پیغمبر ہے۔

اس پر بعض دوسرے کہنے لگے جلدی نہ کرو، دوسری جنگ اور کوئی اور واقعہ پیش آلینے دو، پھر فیصلہ کرنا۔

جب جنگ احد میں مسلمانوں کو شکست ہوئی تو وہ کہنے لگے: بخدا یہ وہ پیغمبر نہیں جس کی بشارت ہماری کتاب میں دی گئی ہے۔

اس واقعے کے بعد صرف یہی نہیں کہ مسلمان نہ ہوئے بلکہ ان کے رویے میں مزید سختی آگئی اور وہ مسلمانوں سے اور دور ہو گئے یہاں تک کہ انہوں نے رسول خدا سے جو لڑائی جھگڑا نہ کرنے کا معاہدہ کر رکھا تھا اُسے بھی معینہ مدت سے پہلے توڑ دیا۔ کعب بن اشرف کی ہمراہی میں ان کے ساٹھ سوار مکہ پہنچے اور اسلام کے خلاف جنگ کیلئے مشرکین سے معاہدہ کرکے مدینہ واپس آگئے۔

اس دوران میں مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی جس میں انہیں دندان شکن جواب دیا گیا اور کہا گیا کہ نتیجہ تم کام کے انجام پر اخذ کرنا اور یہ جان لو کہ تم سب مغلوب ہو جاؤ گے۔

تفسیر

ایک صریح پیشن گوئی

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو صراحت سے بشارت دی ہے کہ وہ تمام دشمنوں پر فتح یاب ہوں گے نیز کفار سے کہا گیا ہے کہ تم اس دنیا میں بھی شکست کھاؤ گے اور مغلوب ہو گے اور دوسرے جہاں میں بھی تمہارا انجام بہت برا ہوگا۔

آیت کی شان نزول کو دیکھیں تو یہ آیت جنگ احد کے بعد نازل ہوئی ہے۔ جب مسلمان ظاہری طور پر



اپنی طاقت اور اثر کھو چکے تھے جب کہ دشمنان اسلام اپنے باہمی اتحاد اور معاہدوں کی وجہ سے دیدنی قدرت و طاقت حاصل کر چکے تھے ایسے میں مستقبل قریب کے بارے میں " ستغلبون " (تم عنقریب مغلوب ہو جاؤ گے) کہہ کر ایک صریح پیشین گوئی کی گئی ہے۔ اس لیے اس آیت کو اعجاز قرآن والی آیات میں شمار کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس میں آئندہ امور کے بارے میں ایک واضح خبر دی گئی ہے اور وہ ان حالات میں جب کہ کافروں اور یہودیوں پر مسلمانوں کی کامیابی بالکل واضح نہ تھی۔

زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ آیت کی صداقت ثابت ہو گئی۔ مدینہ کے یہودی بنی قریظہ اور بنی نضیر تباہ و برباد ہو گئے اور جنگ خیبر میں ان کی طاقت کا اہم ترین مرکز ختم ہو گیا۔ اور مشرکین مکہ بھی فتح مکہ کے بعد ہمیشہ کے لیے مغلوب ہو گئے۔

۱۳۔ قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِىْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْىَ الْعَيْنِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِى الْاَبْصَارِ ○

ترجمہ

۱۳۔ جب دو گروہ (جنگ بدر میں) آمنے سامنے آئے تو اس میں تمہارے لیے نشانی اور درس عبرت تھا۔ ایک گروہ راہ خدا میں جنگ کر رہا تھا اور دوسرا کافروں کا گروہ تھا (جو شیطان اور بتوں کی راہ میں مشغولِ جنگ تھے)، ان (کافروں) کو (مومنین) اپنی تعداد سے دوگنا نظر آ رہے تھے (اور یہ بھی ان کی وحشت و شکست کا ایک عامل بن گیا) اور خدا جسے چاہتا ہے (اور اہل سمجھتا ہے) اپنی مدد سے اس کی تائید کرتا ہے اور اس میں صاحبانِ نظر کے لیے عبرت ہے۔

شانِ نزول

یہ آیت جنگ بدر کی صورت حال کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ جیسا کہ مفسرین نے بیان کیا ہے کہ جنگ بدر



میں مسلمانوں کی تعداد تین سو تیرہ تھی۔ ان میں ستتر [۷۷] مہاجر تھے اور دو سو چھتیس [۲۳۶] انصار۔ مہاجرین کا پرچم حضرت علیؑ کے ہاتھ میں تھا اور انصار کے پرچم بردار سعد بن عبادہ تھے۔ اس عظیم معرکے کے لیے ان کے پاس صرف ستر [۷۰] اونٹ، دو گھوڑے، چھ زرہیں اور آٹھ تلواریں تھیں۔ دوسری طرف دشمن کی فوج ہزار افراد سے متجاوز تھی۔ اس کے پاس کافی وافی اسلحہ تھا اور ایک سو [۱۰۰] گھوڑے تھے۔ اس جنگ میں بائیس [۲۲] مسلمان شہید ہوئے۔ ان میں چودہ [۱۴] مہاجر اور آٹھ انصار تھے دشمن کے ستر [۷۰] افراد مارے گئے اور ستر ہی قیدی ہوئے۔ اس طرح مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی اور یوں مکمل کامرانی کے ساتھ وہ مدینہ کی طرف پلٹ آئے۔ زیرِ نظر آیت واقعہ بدر ہی کا ایک پہلو بیان کرتی ہے۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں کفار کو تنبیہ کی گئی تھی کہ وہ مال و ثروت اور کثرتِ تعداد پر مغرور نہ ہوں۔ اس آیت میں اس سلسلے کا ایک زندہ شاہد بیان کیا گیا ہے اور انہیں دعوت دی گئی ہے کہ وہ جنگ بدر کے تاریخ ساز واقعے سے درسِ عبرت حاصل کریں۔

"قد کان لکم اٰیۃ فی فئتین التقتا ...."

وہ اس بات سے کیوں عبرت حاصل نہیں کرتے کہ جنگی ساز و سامان سے عاری ایک چھوٹا سا لشکر لیکن پختہ ایمان والوں پر مشتمل اپنے سے کئی گنا بڑے جنگی وسائل سے آراستہ لشکر پر فتحیاب ہوگیا۔ اگر مال و دولت اور کثرتِ تعداد بغیر ایمان کے اثر انداز ہو سکتی تو جنگ بدر میں اپنا اثر دکھاتی جبکہ وہاں تو نتیجہ برعکس رہا۔

"یرونھم مثلیھم رای العین"

آیت کے اس حصے میں فرمایا گیا ہے: میدانِ جنگ میں کافروں کو مومنین اپنی تعداد سے دوگناہ دکھائی دیتے تھے یعنی اگر ان کی تعداد ۳۱۳ تھی تو وہ چھ سو سے زیادہ دکھائی دیتے تھے۔ [۱]

یہ مسلمانوں کی کامیابی کے لیے خدائی امداد تھی کیونکہ خدا اپنے مجاہد اور مومن بندوں کی کئی طرح سے مدد کرتا ہے۔ ایسا ظاہری پہلو سے بھی فطری اور طبیعی نظر آتا ہے کیونکہ جب جنگ شروع ہوئی تو مسلمانوں نے دشمنوں پر کمر توڑ ضربیں لگائیں اس لیے کہ وہ قوتِ ایمان اور تربیتِ اسلامی سے آراستہ تھے۔ دشمنوں نے یہ دیکھا تو وہ اتنے مرعوب اور دہشت زدہ ہوئے کہ سمجھنے لگے کہ مسلمانوں کے ساتھ اتنی ہی طاقت اور آملی ہے اور پہلی قوت سے دوگنا طاقت سے وہ میدانِ جنگ پر قابض ہو گئے ہیں جب کہ دشمنانِ اسلام جنگ شروع ہونے سے پہلے اس نتیجے کا خیال تک بھی نہ کر سکتے تھے اور مسلمان ان کو اصل تعداد سے بھی کم لگتے تھے۔

سورہ انفال کی آیت ۴۴ میں بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ ہوا ہے اور وہ آیت مندرجہ بالا تفسیر کی تائید کرتی ہے

---

[۱] یہ تفسیر اس نظریے کی بنیاد پر ہے کہ "یرون" کفار کے بارے میں ہے اور "ھم" کی ضمیر کا اشارہ مسلمانوں کی طرف ہے اور یہی آیت کا واضح مفہوم بنتا ہے۔ گرچہ بعض مفسرین نے ضمیروں کے مرجع کے بارے میں اور احتمالات بھی بیان کئے ہیں۔



"و اذ یریکموھم اذ التقیتم فی اعینکم قلیلاً و یقللکم فی اعینھم لیقضی اللہ امراً کان مفعولاً"

وہ وقت یاد کرو جب میدان جنگ میں اللہ تعالیٰ نے دشمنوں کو تمہاری تعداد کم کر کے دکھائی (تاکہ وہ اس جنگ سے منہ نہ پھیریں جس کا انجام ان کی شکست ہے) اور انہیں بھی تمہاری نظروں میں کم کر کے دکھایا (تاکہ اس تاریخی اور فیصلہ کن جنگ میں تمہارے دل بھی کمزور نہ ہوں) لیکن جنگ شروع ہوتے ہی معاملہ دگرگوں ہو گیا اور مسلمان جتنے تھے دشمن کو اس سے زیادہ نظر آنے لگے اور یہ ان دشمنوں کی شکست کا ایک عامل تھا۔

بدر کی تاریخی جنگ کے بارے میں سورہ انفال کی آیہ ۴۱ سے لے کر ۴۵ تک کی تفسیر میں انشاء اللہ تفصیل سے بحث کریں گے۔

واللہ یوید بنصرہ من یشاء۔

اس جملے میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ خدا جسے چاہتا ہے غلبہ اور کامیابی عطا کرتا ہے البتہ جیسا کہ ہم متعدد مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ مشیت الٰہی بغیر کسی وجہ اور بنیاد کے عمل میں نہیں آتی بلکہ ہمیشہ اس کی کوئی حکمت و مصلحت ہوتی ہے اور یہ لوگوں کی اہلیت کی حدود میں محدود ہوتی ہے یعنی جو تائید کی لیاقت رکھتے ہیں انہی کی تائید کی جاتی ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ بدر کے تاریخی واقعے میں تائید الٰہی اور مسلمانوں کی کامیابی کے دو پہلو تھے۔ ایک یہ فوجی لحاظ سے کامیابی تھی اور دوسری منطقی پہلو سے۔ فوجی کامیابی اس لحاظ سے تھی کہ ایک چھوٹا سا لشکر جس کے پاس جنگی ساز و سامان نہیں تھا ایسے لشکر پر غالب آگیا جو تعداد میں کئی گنا زیادہ تھا اور بے پناہ ساز و سامان سے لیس تھا اور منطقی کامیابی اس حوالے سے تھی کہ خدا تعالیٰ نے جنگ ہونے سے پہلے ہی صراحت سے مسلمانوں کو اس میں کامیابی کی خبر دے دی تھی۔

"ان فی ذالک لعبرۃ لاولی الابصار"

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ چشم بصیرت رکھتے ہیں اور حقائق کو صحیح طور پر دیکھتے ہیں وہ اہل ایمان کی اس کامیابی کو اس حوالے سے دیکھتے اور پہچانتے ہیں کہ کامیابیوں اور کامرانیوں کا اصل سرمایہ ایمان اور صرف ایمان ہے اور پھر وہ اس سے درس عبرت حاصل کرتے ہیں۔

۱۴۔ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۗ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ○



ترجمہ

۱۴ــ مادی چیزوں میں سے عورتیں ، اولاد اور مال جو سونے چاندی کے ڈھیروں پر مشتمل ہو منتخب گھوڑے ، جانور اور زراعت لوگوں کی نظر میں پسندیدہ بنا دیے گئے ہیں (تاکہ اُن کے ذریعے اُن کی آزمائش اور تربیت ہو لیکن) یہ چیزیں (اگر انسان کے اصلی مقاصد کے لیے ذریعہ بنیں پھر بھی) پست (مادی زندگی کا سرمایہ ہیں اور انجام نیک (اور عالی زندگی) خدا کے پاس ہے ۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں بتایا گیا ہے کہ انسان کا حقیقی سرمایہ ایمان ہے نہ کہ مال و دولت اور کثرت اولاد و افراد ۔ اب یہ آیت اِس حقیقت کی نشاندہی کرتی ہے کہ بیوی بچے اور مال و ثروت اِس جہان کی مادی زندگی کے لیے سرمایہ ہیں ۔ یہ انسان کا اصلی مقصد اور ہدف نہیں ہیں ۔

یہ صحیح ہے کہ ان وسائل کے بغیر روحانی و معنوی سعادت کی راہ بھی طے نہیں کی جاسکتی لیکن اس راہ میں ان سے کام لینا اور چیز ہے اور (وسیلہ نہ سمجھتے ہوئے) ان سے وابستگی اور ان کی پرستش دوسری چیز ہے ۔اس آیت میں چند قابل توجہ نکات ہیں جن کا ہم ذیل میں ذکر کرتے ہیں ۔

۱ ۔ امورِ مادی کو کس نے زینت دی ہے

"زین للناس حب الشھوٰت ...." [1] یہ جملہ فعل مجہول کی شکل میں ہے اس میں کہا گیا ہے : بیوی بچوں اور مال و دولت سے لگاؤ اور ان سے محبت کو لوگوں کی نگاہ میں پسندیدہ بنا دیا گیا ہے ۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ پسندیدہ بنانے والا اور انہیں لوگوں کی نظروں میں زینت دینے والا کون ہے بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ یہ شیطانی ہوا و ہوس ہے جو انہیں لوگوں کی نگاہوں میں پسندیدہ بناتی ہے وہ سورہ نمل کی آیت ۲۴ سے استدلال کرتے ہیں جس میں فرمایا گیا ہے :

---

[1] "شہوات" "شہوت" کی جمع ہے جس کا معنی ہے کسی چیز سے شدید لگاؤ اور تعلق رکھنا" لیکن مندرجہ بالا آیت میں "شہوات" "مشتھیات" کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور "مشتھیات" ان چیزوں کو کہتے ہیں جن سے تعلق اور لگاؤ ہو ۔



"وزین لھم الشیطٰن اعمالھم"
اور شیطان نے ان کے اعمال کو ان کی نگاہ میں زینت دی ہے۔

ایسی اور بھی آیات موجود ہیں۔

لیکن یہ استدلال صحیح معلوم نہیں ہوتا کیونکہ محل بحث آیت میں اعمال کے بارے میں گفتگو نہیں ہے۔ بلکہ اس میں مال، عورتوں اور اولاد کے بارے میں گفتگو ہے۔

آیت کی صحیح تفسیر یہی معلوم ہوتی ہے کہ زینت دینے والا خدا ہی ہے اور یہ قوت اُس نے انسان کی فطرت وطینت میں ودیعت کی ہے۔ کیونکہ خدا ہی انسان میں اولاد اور مال و دولت کی محبت پیدا کرتا ہے تاکہ اُسے آزمائے اُسے کمال وارتقاء عطا کرے اور تربیت کے راستے میں آگے لے جائے۔ جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے۔

"انا جعلنا ما علی الارض زینۃ لھا لنبلوھم ایھم احسن عملا۔":

ہم نے زمین کی تمام چیزوں کو ان کے لیے زینت بنایا ہے تاکہ انکی اخلاقی تربیت ہو کے یعنی اس محبت و وابستگی سے صرف سعادت، اصلاح اور تعمیر کے لیے فائدہ اٹھائیں نہ یہ کہ فتنہ و فساد اور تباہی و بربادی کے لیے انہیں کام میں لائیں۔ (کہف - ۷)

یہ امر قابل ذکر ہے کہ زیر نظر آیت میں پہلے ازواج اور اولاد کا ذکر ہے۔ آج کے ماہرین نفسیات بھی کہتے ہیں کہ جنسی پہلو انسان کے قوی ترین غرائز اور اندرونی تقاضوں میں سے ہے۔ انسان کی تاریخ اور دور حاضر بھی اس بات کی تائید کرتا ہے کہ بہت سے معاشرتی حوادث کا سرچشمہ اسی انسانی خواہش سے اٹھنے والے طوفان تھے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ زیر بحث آیت اور ایسی دوسری آیات بیوی، بچوں اور مال و دولت سے معتدل محبت اور لگاؤ کی مذمت نہیں کرتیں کیونکہ معنوی اور روحانی مقاصد و اہداف کی پیش رفت مادی وسائل کے بغیر ممکن نہیں۔ علاوہ ازیں قانون شریعت کبھی قانون فطرت سے متضاد نہیں ہو سکتا اور قانون فطرت قابل مذمت نہیں ہوتا ہاں البتہ ایسا عشق و محبت جو افراط کی حد کو پہنچ جائے۔ بہ الفاظ دیگر پرستش و عبادت بن جائے وہ قابل مذمت ہے۔

۲۔ "القناطیر المقنطرۃ" اور "الخیل المسومۃ" سے کیا مراد ہے

"قناطیر" "قنطار" کی جمع ہے۔ "قنطار" کا معنی ہے "محکم چیز"۔ بعد ازاں یہ لفظ "زیادہ مال" کے لیے استعمال ہونے لگا۔ پل کو "قنطرۃ" اس کی مضبوطی کے پیش نظر اور باہوش افراد کو "قنطر" اُن کی فکر و نظر کے استحکام کی وجہ سے کہتے ہیں۔ "مقنطرۃ" اسم مفعول ہے اس کا معنی ہے "کئی گنا" اور "مکرر"۔ یہ دونوں الفاظ کا اکٹھا ذکر تاکید کے لیے ہے۔ جیسے آج کل فارسی میں کہتے



ہیں : فلانکس صاحب آلاف والوف می باشد ا فلاں شخص ہزاروں اور ہزاروں کا مالک ہے ا یعنی اس کے پاس بہت مال و دولت ہے
بعض نے "قنطار" کے لیے ایک معین حد بیان کی ہے اور کہا ہے کہ "قنطار" ستر ہزار سونے کے دینار کو کہتے ہیں۔ کچھ نے ایک لاکھ دینار بتایا ہے اور بعض بارہ ہزار درہم کہتے ہیں اور کچھ کے نزدیک "قنطار" سونے چاندی کے سکوں سے بھری ہوئی تھیلی کو کہتے ہیں۔

ایک روایت جو امام باقر اور امام صادق علیہما السلام سے منقول ہے کے مطابق قنطار سونے کی وہ مقدار ہے جو ایک گائے کی کھال کو بھر دے۔

حقیقت میں اس کا ایک وسیع مفہوم ہے اور وہ ہے زیادہ اور کثیر مال۔

"خیل" اسم جمع ہے اور اس کا معنی "گھوڑے" اور "گھڑسوار" دونوں بیان کئے گئے ہیں البتہ زیرِ نظر آیت میں اس سے مراد "گھوڑے" ہی ہے۔

"مسومۃ" دراصل "ممتاز" کے معنی میں ہے۔ ممتاز ہونا یہاں جسم اور چہرے کے متناسب ہونے کے لحاظ سے ہے یا تربیت یافتہ ہونے اور میدان جنگ میں سواری کے لیے آمادہ ہونے کے حوالے سے ہے۔

اس مطالعے سے یہ نتیجہ نکلا کہ محل بحث آیت میں چھ چیزوں کی نشاندہی کی گئی ہے جو زندگی کا اہم سرمایہ ہیں اور وہ یہ ہیں :

۱) بیوی
۲) اولاد
۳) مال و دولت
۴) بہترین سواریاں اور گھریلو ضرورت کے جانور ("انعام")
۵) زراعت اور فصلیں

یہ سب مادی زندگی کے بنیادی ارکین ہیں۔

۳۔ دنیا کی متاع حیات سے کیا مراد ہے

متاع ایسی چیز کو کہتے ہیں جس سے انسان لُطف اندوز ہوتا ہو اور حیاتِ دُنیا سے مراد پست زندگی ہے اس بناء پر "متاع الحیٰوۃ الدّنیا" کا معنی یہ ہوگا کہ اگر کوئی شخص ان چھ امور سے بنیادی ہدف کے طور پر عشق کرے اور انہیں راہ حیات میں وسیلہ نہ سمجھے تو اُس نے اپنے آپ کو پست زندگی کے سپرد کر دیا۔

حیاتِ دُنیا (پست زندگی) دراصل اس زندگی کے ارتقاء اور تکامل کی طرف اشارہ ہے اس طرح اِس جہاں کی زندگی تو پہلا مرحلہ بن جاتی ہے اِسی لیے آیت کے آخر میں اعلیٰ ترین زندگی جو انسان کے انتظار میں ہے، کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے :



"واللہ عندہ حسن المآب"

یعنی ۔ نیک انجام تو خدا کے پاس ہے۔

۱۵۔ قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ۚ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا
عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ
فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ
بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝
۱۶۔ اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا
وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝
۱۷۔ اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ
وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ۝

ترجمہ

۱۵۔ کہہ دیجئے: کیا تمہیں ایسی چیز سے آگاہ کروں جو اس (مادی سرمائے) سے بہتر ہے جنہوں نے پرہیزگاری اختیار کی ہے (اور مادی سرمائے سے شرعی طریقے سے اور حق وعدالت کو ملحوظ رکھتے ہوئے استفادہ کیا ہے) ان کے پروردگار کے پاس (دوسرے جہان میں ایسے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے اور پاکیزہ بیویاں (جو ہر نا پاکی سے منزہ ہیں) اور خوشنودیٔ خدا انہیں نصیب ہوگی اور خدا (بندوں کے امور کو) دیکھنے والا ہے۔

۱۶۔ وہی لوگ جو کہتے ہیں: اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لے آئے ہیں، پس ہمیں بخش دے اور آگ کے عذاب سے بچا لے۔



۱۷۔ وہی جو (مشکلات کے مقابلے میں، اطاعت کی راہ میں اور ترکِ گناہ کے راستے میں) پامردی اور استقامت دکھاتے ہیں، سچ بولتے ہیں۔ (خدا کے حضور) خضوع کرتے ہیں (اس کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں اور اوقاتِ سحر میں (اور عبادت آخرِ شب میں) استغفار کرتے ہیں۔

تفسیر

اِن میں پہلی آیت انسانی تکامل وارتقا کے لیے بلندی کی راہوں کو واضح کرتی ہے۔ اسی طرف گذشتہ آیت کے آخر میں اشارہ ہوا تھا اس آیت میں فرمایا گیا ہے : کیا تمہیں اس چیز کی خبر دوں جو محدود، مادی اور پست زندگی سے بالاتر اور بہتر ہے وہ جہانِ ابدی کی زندگی ہے جو پرہیزگار اور خوددار افراد کے انتظار میں ہے جس میں تمام اِس جہان کی نعمتیں موجود ہیں لیکن وہ زیادہ کامل صورت میں ہیں اور عیب ونقص سے پاک ہیں۔

وہاں ایسے باغات ہیں جن کے درختوں کے نیچے اس جہان کے برعکس پانی بہتا رہتا ہے اور منقطع نہیں ہوتا۔

" جنّات تجری من تحتها الانھٰر "

اِس جہان کی نعمتیں تو بہت جلد گزر جاتی ہیں اور ناپائیدار ہیں لیکن وہاں کی نعمتیں ابدی ہیں خٰلدین فیھا

اُس جہاں کی بیویاں یہاں کی حسین عورتوں کے برعکس جسمانی وروحانی اعتبار سے بہت پاکیزہ ہوں گی اور ان میں کوئی ناپاکی وتیرگی نہیں ہوگی " وَاَزۡوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ "۔

یہ سب چیزیں پرہیزگاروں کے انتظار میں ہیں اور ان تمام سے بالاتر معنوی نعمتیں ہیں جو تصور سے ماوراء ہیں جنہیں آیت میں " رِضۡوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ " (یعنی — خوشنودیٔ خدا) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ آیت " اَؤُنَبِّئُكُمۡ " سے شروع ہوتی ہے جس کا معنی ہے " کیا تمہیں آگاہ کروں " ایک طرف یہ جملہ استفہامیہ ہے جو انسان کی بیدار فطرت سے جواب طلب کرتا ہے تاکہ سننے والے پر اس کا اثر زیادہ گہرا ہو اور دوسری طرف سے یہ لفظ " انباء " کے مادہ سے ہے اور خبر دینے کے معنی میں لیا گیا ہے جو عموماً اہم ترین اور قابلِ توجہ خبروں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

درحقیقت قرآن اِس آیت میں صاحبِ ایمان افراد کو خبر دیتا ہے کہ اگر وہ غیر شرعی لذتوں، سرکشی اور گناہ آلود ہوس سے صرف نظر کرلیں تو اس کا معنی لذت سے محرومی نہیں ہوگا کیونکہ وہ راہِ سعادت میں جائز لذات حاصل کرسکنے کے علاوہ دوسرے جہان کی لذتوں سے بھی بہرہ مند ہوں گے جو اس جہان کی لذتوں کی طرح ہیں لیکن بلند تر بھی ہیں اور ہر نقص وعیب سے مبرا بھی۔



کیا جنّت میں مادی لذّتیں بھی ہیں

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مادی لذتیں اسی دُنیا میں منحصر ہیں اور اُخروی دُنیا میں ان کا نام ونشان نہیں ہوگا اور یہ جو آیاتِ قرآنی میں باغات بہشت طرح طرح کے پھل اور میووں، جاری پانی اور بہترین بیویوں کا تذکرہ ہے۔ یہ معنوی مقامات وانعامات کے ایک سلسلے سے کنایہ ہیں اور یہ تعبیریں "کلّم النّاس علٰی قدر عقولھم" یعنی ـــ لوگوں سے ان کے فکری معیار کے مطابق بات کرو، کے مصداق بیان فرمائی گئی ہیں۔

اس خیال کا جواب یہ ہے کہ جب بہت سی صریح آیات قرآنی کے پیش نظر معادِ جسمانی ثابت ہوچکا ہے تو ضروری ہے کہ جسمانی اور روحانی تقاضوں کے مطابق نعمتیں بھی ہوں البتہ ان کی سطح ضرور بلند ہونی چاہیے اور اتفاق کی بات ہے کہ اس آیت میں دونوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ معادِ جسمانی کی طرف بھی اشارہ ہے اور روح اور معادِ ارواح کی مناسبت سے بھی اشارہ موجود ہے۔

جو لوگ اس جہان کی تمام نعمتوں کو معنوی نعمتوں کے لیے کنایہ سمجھتے ہیں وہ دراصل آیاتِ قرآنی کے ظاہری مفاہیم میں تاویل بھی کرتے ہیں اور وہ معادِ جسمانی اور اس کے لوازمات کو بھی بالکل فراموش کیے ہوئے ہیں۔

"واللّٰہ بصیرٌ بالعباد" یعنی ـــ خدا اپنے بندوں کی کیفیت کو دیکھتا ہے۔ ہوسکتا ہے یہ جملہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہو کہ خدا تعالیٰ دوسرے جہاں میں انسانی جسم وروح کے تقاضوں سے آگاہ ہے اور وہ ان تقاضوں کو بطریق احسن پورا کرے گا۔

"الّذین یقولون ربّنا انّنا ...."

گزشتہ آیت میں بتایا گیا تھا کہ پرہیزگار آخرت کی نعمتوں سے مالامال ہیں۔ اس آیت میں اور بعد والی آیت میں پرہیزگاروں کا تعارف کرواتے ہوئے اُن کی چھ نمایاں صفات کا ذکر کیا گیا ہے۔

۱۔ وہ دل وجان سے اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہیں اور ایمان نے ان کا دل روشن کردیا ہے۔ اسی لیے وہ سختی سے اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہیں اور وہ اپنے گناہوں کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ وہ خدا سے گناہوں کی بخشش طلب کرتے ہیں اور دوزخ سے نجات کی خواہش کرتے ہیں "فاغفرلنا ذنوبنا وقنا عذاب النّار"۔

۲۔ اپنے معاملات میں صبر واستقامت سے کام لیتے ہیں اور انہیں انجام تک پہنچاتے ہیں۔ گناہ کو ترک کرتے ہیں اور انفرادی واجتماعی مشکلات کا سینہ تان کے مقابلہ کرتے ہیں ("الصّٰبرین")۔

۳۔ سچ بولتے ہیں، صحیح کردار کے مالک ہیں، جن چیزوں کا دل سے اعتقاد رکھتے ہیں انہی پر عمل کرتے ہیں اور وہ نفاق، جھوٹ، مکروفریب اور خیانت سے دور رہتے ہیں ("وَالصّٰدِقِیْن")۔

۴۔ خدا کی بندگی اور عبودیت کی راہ میں ہمیشہ خضوع اور فروتنی سے کام لیتے ہیں ("وَالْقٰنِتِیْن")۔[1]

[1] قنوت کا معنی خدا کے سامنے خضوع بھی ہے اور اطاعت وبندگی میں دوام واستمرار بھی۔



۵۔ مال ہی نہیں بلکہ جو بھی مادی و روحانی نعمتیں اُنہیں میسر ہیں وہ اُنہیں راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں اور اس طرح سے اجتماعی و معاشرتی مشکلات اور بیماریوں کا مداوا کرتے ہیں۔

۶۔ وقتِ سحر اور آخرِ شب یعنی جب سکون اور مخصوص صفا و خلوص کا ماحول تمام جگہوں پر محیط ہو، جب بے خبر لوگ خوابِ غفلت میں ہوں اور میٹھی نیند سو رہے ہوں، جب ساری دُنیا کا شور و شین خاموش ہو چکا ہو اور مردانِ خدا کے افکار اور زندہ دلوں میں عالمِ ہستی کی اصلی قدریں نمایاں ہو رہی ہوں وہ یادِ خدا کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں اُس کی باعظمت بارگاہ میں استغفار اور طلبِ بخشش کرتے ہیں، پروردگار کے نور و جلال کے پرتو میں محو ہوتے ہیں اور ان کے وجود کے سب ذرّے باہم زمزمۂ توحید گنگنا رہے ہوتے ہیں۔ (" وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ")

امام صادق علیہ السلام سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

جو شخص نمازِ وتر میں ۷۰ مرتبہ " اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّيْ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ " پڑھے اور ایک سال تک اس عمل کی پابندی کرے خدا تعالیٰ اسے وقتِ سحر استغفار کرنے والوں، یعنی (" اَلْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ") میں سے قرار دے گا اور یقیناً اسے اپنی عفو بخشش سے نوازے گا۔

سحر کیا ہے

سَحَر " (بر وزن "بشر") دراصل پوشیدہ اور پنہاں ہونے کے معنی میں ہے۔ رات کے آخری حصے میں چونکہ تمام چیزوں پر ایک خاص قسم کی پوشیدگی غالب آجاتی ہے لہٰذا اس کا نام سحر رکھ دیا گیا ہے۔

لفظ " سِحر " (بروزن " شِعر ") بھی ایسے مادہ سے ہے: " سَاحِر " اور جادوگر چونکہ ایسے کام کرتا ہے جن کے اسرار دوسروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں اس لیے اُن کے اس عمل کو " سِحر " کہتے ہیں۔

اہلِ عرب انسان اور حیوان کی سانس کی نالی کو بھی بعض اوقات " سَحَر " کہتے ہیں اور یہ بھی اندر والے حصے کے پوشیدہ ہونے کی وجہ سے ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ شب و روز کے اوقات میں سے صرف وقت " سحر " کا تذکرہ کیوں ہے جب کہ بارگاہِ الٰہی میں ہر حالت میں توبہ و استغفار مطلوب ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ سحر وہ وقت ہے کہ جب سکون، آرام اور خاموشی ہوتی ہے، مادی کام معطل ہوتے ہیں اور استراحت کے بعد نشاط اور خوشی کا ایک عالم ہوتا ہے یہ صورتِ حال اور ماحول انسان کو زیادہ سے زیادہ بارگاہِ الٰہی میں توبہ و انابت کے لیے آمادگی بخشتا ہے۔

تجربے سے اس کیفیت کو آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے یہاں تک کہ بہت سے علماء اور دانشور علمی مسائل کے حل کے لیے اسی وقت سے استفادہ کرتے ہیں کیونکہ وقتِ " سَحَر " انسانی فکر و روح کا چراغ دیگر اوقات کی



نسبت زیادہ روشن اور درخشندہ ہوتا ہے ۔ عبادت و استغفار کی روح توجہ اور حضورِ قلب ہے لہٰذا لمحاتِ سحر میں عبادت و استغفار زیادہ گرانبہا اور عزیز تر ہے ۔

۱۸۔ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

ترجمہ

۱۸۔ خدا (جہانِ ہستی کے اکیلے نظام کو ایجاد کر کے) گواہی دیتا ہے کہ اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے اور فرشتے اور اہلِ علم و دانش (سب ایک طرح) گواہی دیتے ہیں، اس عالم میں کہ (خدا تعالیٰ عالمِ ہستی میں) عدالت قائم کیے ہوئے ہے (اور یہ عدالت بھی اُس کی ذات کی یکتائی کے لیے نشانی ہے)، اس لیے تم بھی ان سب کے ساتھ ہم آواز ہو کر کہو کہ اُس کے علاوہ کوئی معبود نہیں جو کہ غالب و توانا بھی ہے اور حکیم و دانا بھی ۔

تفسیر

اس آیت میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی ذات کی یکتائی خود پروردگار کی شہادت ہے، پھر ملائکہ کی گواہی اور پھر علماء، دانشوروں اور ان لوگوں کی شہادت ہے ۔ جو نورِ علم و فکر سے عالمِ دنیا کے حقائق پر نظر رکھتے ہیں ۔

(شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ)

یہاں چند امور کی طرف توجہ ضروری ہے ۔

۱۔ خدا کی اپنی یکتائی پر شہادت سے کیا مراد ہے

خدا تعالیٰ کی شہادت سے مراد عملی اور فعلی شہادت ہے نہ کہ قولی یعنی خدا تعالیٰ نے جہانِ آفرینش کو پیدا کیا۔ اس میں ایک ہی نظام قائم ہے، ہر جگہ اس کے قوانین ایک سے ہیں اور اس کا ایک ہی پروگرام ہے ۔ حقیقت میں ایک اکیلا اپنے سے وابستہ یگانہ نظام بذاتِ خود نشاندہی کرتا ہے کہ پیدا کرنے والا اور معبود اس جہاں میں ایک سے زیادہ نہیں اور سب مخلوقات کا ایک ہی منبع اور سرچشمہ ہے ۔ اس بناء پر ایک ہی نظام کی ایجاد ۔ ذاتِ الٰہی کی یگانگت اور یکتائی پر ایک شہادت ہے ۔



دوسری طرف فرشتوں اور علماء کی شہادت قولی پہلو رکھتی ہے کیونکہ ان میں سے ہر کوئی حسب حال کلام کے ذریعے اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے۔ ایک لفظ کے مختلف مفاہیم کی اور بھی بہت سی مثالیں آیات قرآنی میں موجود ہیں مثلاً

"اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ"

یعنی — اللہ اور اُس کے فرشتے پیغمبر پر درود بھیجتے ہیں۔ (احزاب - ۵۶)

اس میں خدا کی طرف سے درود بھیجنے اور ملائکہ کی طرف سے درود بھیجنے کے اور معنی ہیں۔ خدا کی طرف سے رحمت بھیجنا ہے اور فرشتوں کی طرف سے رحمت بھیجنے کا تقاضا ہے۔ البتہ فرشتوں اور علماء کی گواہی عملی پہلو میں بھی فرق رکھتی ہے کیونکہ وہ صرف اسی کی پرستش کرتے ہیں اور کسی اور معبود کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتے۔

۲۔ قیام بالقسط کیا چیز ہے۔

ادبی اصطلاح کے مطابق "شَهِدَ" فعل ہے، اس کا فاعل "اللّٰه" ہے اور قَآئِمًا بِالْقِسْطِ اس سے حال ہے۔ یعنی خدا تعالیٰ اپنی یکتائی کی گواہی اس عالم میں دیتا ہے کہ عالم ہستی میں عدالت قائم کیے ہوئے ہے اور واقعاً یہ جملہ اس کی شہادت کی دلیل ہے کیونکہ عدالت کی حقیقت یہ ہے کہ درمیانہ اور مستقیم راستہ انتخاب کیا جائے جو ہر قسم کے افراط، تفریط اور انحراف سے دور ہو اور ہم جانتے ہیں کہ درمیانہ اور مستقیم راستہ ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے اور ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتا، جیسا کہ سورہ انعام کی آیت ۱۵۳ میں ہے:

"وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ".

اور یہ میرا سیدھا راستہ ہے، پس اسی کی اتباع کرو اور دوسرے راستوں کے پیچھے نہ لگو کہ وہ تمہیں اس کے راستے سے بھٹکا دیں گے۔

اس آیت میں خدا کے ایک راستے کا ذکر ہے اور منحرف اور بھٹکے ہوئے متعدد راستے بتائے گئے ہیں کیونکہ "صراط مستقیم" مفرد ہے اور کج راستوں کا ذکر جمع کے صیغے سے کیا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عدالت ہمیشہ ایک ہی نظام سے ہوتی ہے اور ایک ہی نظام کا ہونا مبداء واحد کا پتہ دیتا ہے۔ اس لیے عالم آفرینش میں حقیقی عدالت اپنے اصلی مفہوم میں پیدا کرنے والے کی یکتائی پر دلیل ہے (غور کیجئے گا)۔

۳ ـ علماء کی حیثیت و وقعت

اس آیت میں حقیقی علماء کو فرشتوں کا ہم پلہ قرار دیا گیا ہے اور یہ بات دوسروں کی نسبت علماء کے امتیاز کو ظاہر کرتی ہے آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ علماء کا امتیاز یہ ہے کہ وہ اپنے علم کے ذریعے حقائق پر مطلع ہوتے ہیں اور اس طرح سے خدا کی یگانگت کا اعتراف کرتے ہیں جو سب سے بڑی حقیقت ہے۔



واضح ہے کہ آیت تمام علماء کے بارے میں ہے اور وہ روایات جو اس آیت کے ذیل میں وارد ہوئی ہیں ان میں جو " اولوا العلم " سے آئمہ اطہار مراد لیا گیا ہے تو وہ اس لحاظ سے ہے کہ وہ حضرات اولوا العلم کے واضح ترین مصداق ہیں۔

مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں جابر بن عبد اللہ انصاری کی وساطت سے پیغمبر اسلامؐ کا ایک فرمان نقل کیا ہے، آپؐ نے فرمایا:

"ساعة من عالم یتکیء علیٰ فراشه ینظر فی علمه خیر من عبادة العابد سبعین عاماً"

عالم کی وہ ایک ساعت جس میں وہ اپنے علم میں فکر و نظر کرنے کے لیے بستر پر تکیہ لگائے ایک عابد کی ستر سال کی عبادت سے بہتر ہے۔

آیت میں " لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ " کے جملے کا تکرار ہے۔ یہ تکرار گویا اس طرف اشارہ ہے کہ جیسے ابتداء میں خدا فرشتوں اور علماء کی شہادت آئی ہے اس طرح جو شخص بھی سنے اسے چاہیئے کہ وہ بھی انکی شہادت کے ساتھ ہم آواز ہو جائے اور معبود کی وحدت کی گواہی دے۔

لا الٰہ الا اللہ خدا کے حق کی ادائیگی ہے اور اس کی توحید کا اظہار ہے لہذا " عَزِیْزٌ " و " حَکِیْمٌ " دو اسماء الٰہی پر ختم ہوا ہے کیونکہ عدالت کا قیام قدرت و حکمت کا محتاج ہے اور وہ خدا ہی ہے جو ہر چیز پر قادر ہے اور تمام چیزوں سے آگاہ ہے اس لیے وہی جہان ہستی میں عدالت قائم کر سکتا ہے۔

یہ آیت اُن آیات میں سے ہے جن پر رسول اکرمؐ نے ہمیشہ خصوصی نظر رکھی اور آپؐ بار بار مختلف مواقع پر اس کی تلاوت فرماتے رہے۔ زبیر بن عوام کا کہنا ہے:

" عرفہ کی رات میں آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر تھا۔ میں نے سنا کہ آپؐ بار بار اس آیت کی تلاوت کرتے تھے۔ [1]

۱۹۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۗ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْیًۢا بَیْنَهُمْ ۗ وَمَنْ یَّكْفُرْ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ○

ترجمہ

۱۹ — اللہ کے نزدیک دین اسلام (اور حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنا) ہے۔ جن کے پاس

[1] تفسیر مجمع البیان، ج ۲، ص ۴۲۰



آسمانی کتاب تھی اُنہوں نے علم وآگاہی کے بعد بھی اختلاف پیدا کیا اور وہ بھی اپنے درمیان ظلم وستم کی بناء پر اور جو آیاتِ خدا سے کفر اختیار کرے تو خدا اس کا محاسبہ کرے گا کیونکہ خدا سریع الحساب ہے۔

تفسیر

حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہی روحِ دین ہے

"دِین" کا معنی ہے "جزاء"، "پاداش"، "حکم کی اطاعت" اور "پیروی"۔ مذہبی اصطلاح میں دین عبارت ہے ان عقائد، قوانین اور آداب سے جن کے ذریعے انسان دُنیا و آخرت کی سعادت و خوش بختی تک رسائی حاصل کرسکتا ہے۔ نیز انفرادی و اجتماعی اور اخلاقی و تربیتی لحاظ سے صحیح راہ پر گامزن ہوسکتا ہے۔

"اِسلام" "تسلیم" کے معنی میں ہے اور یہاں مراد خدا کے سامنے تسلیم ہونا ہے۔

اِس لیے "انّ الدّین عند اللہ الاسلام" کا معنی یہ ہوگا کہ بارگاہ الٰہی میں حقیقی دین اُس کے فرمان اور حقیقت کے سامنے سرِتسلیم خم کرنا ہے اور دراصل روحِ دین تمام ادوار میں حقیقت کے سامنے سرِتسلیم خم کرنے کے علاوہ کسی دوسری چیز کا نام نہیں البتہ چونکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دین و آئین اس کا اعلیٰ ترین نمونہ تھا اِس لیے اس کے لیے "اسلام" کے نام کا انتخاب ہوا۔

نہج البلاغہ کے کلماتِ قصار میں حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام کا اس حقیقت کے بارے میں عمیق اور گہرے مفہوم پر مبنی یہ جملہ مقصد کو واضح کرتا ہے:

"لا نسبن الاسلام نسبۃ لم ینسبھا احد قبلی :
الاسلام ھو التّسلیم ، والتّسلیم ھو الیقین ،
والیقین ھو التّصدیق ، والتّصدیق ھو الاقرار ،
والاقرار ھو الاداء ، والاداء ھو العمل ."

اِس عبارت میں امام علیہ السلام نے پہلے فرمایا ہے:

"میں چاہتا ہوں اسلام کی ایسی تفسیر بیان کروں جو کسی نے نہ کی ہو۔"

اِس کے بعد آپ نے اسلام کے چھ مرحلے بیان فرمائے ہیں جو یہ ہیں:

۱۔ اسلام حق کے سامنے سرِتسلیم خم کرنا ہے۔



۲- تسلیم یقین کے بغیر ممکن نہیں (کیونکہ یقین کے بغیر تسلیم اندھا دھند تسلیم ہے عالمانہ نہیں)
۳- یقین تصدیق کا دوسرا نام ہے (یعنی علم و دانائی کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ اعتقاد اور تصدیق قلب ضروری ہے)۔
۴- تصدیق ہی اقرار ہے (یعنی قلب و روح سے تصدیق کافی نہیں بلکہ جرأت و ہمت سے اس کا اظہار بھی کرنا چاہیئے)۔
۵- اقرار ذمہ داری کو پورا کرنا ہے (اقرار تو زبان تک محدود ہوتا ہے۔ اصل تو مسؤلیت اور ذمہ داری کو قبول کرنا ہے)۔
۶- مسؤلیت کو قبول کرنا ادائیگی اور عمل ہی کو کہتے ہیں۔

اور وہ لوگ جو اپنی قوت و توانائی کو فقط گفتگو، بیانات، جلسوں اور کانفرنسوں ہی میں صرف کرکے رہ جاتے ہیں اور باتوں سے آگے نہیں بڑھتے وہ نہ اپنی ذمہ داری کو قبول کیے ہوئے ہیں اور نہ رُوح اسلام سے واقف ہیں۔

اسلام کے تمام پہلوؤں کو مدّنظر رکھنے والی یہ واضح ترین تفسیر ہے۔

"وما اختلف الذین اوتوا الکتٰب الا من بعد ما جاءھم العلم بغیًا بینھم"۔

اس جملے میں قرآن نے مذہبی اختلافات کے سرچشمے کا تذکرہ کیا ہے اور فرمایا ہے: وہ لوگ جو حقیقت سے آگاہ تھے اس کے باوجود انہوں نے دین خدا میں اختلاف پیدا کیا اُن کے اس عمل کا سبب طغیان، سرکشی، ظلم و ستم اور حسد کے علاوہ کچھ نہیں تھا کیونکہ ہر آسمانی دین ہمیشہ واضح مدارک سے منسلک ہوتا ہے جن کی وجہ سے متلاشیان حقیقت کے لیے کوئی ابہام باقی نہیں رہتا۔ مثلاً پیغمبر اسلامؐ کے بہت واضح معجزات، کھلی نشانیوں اور روشن دلائل کے علاوہ جو آپ کے دین میں موجود تھے اور آپ کی حقانیت کے گواہ تھے، گذشتہ کتب آسمانی میں مذکور آپ کے اوصاف اور نشانیاں بھی موجود تھیں اور ان کتب کے کچھ حصے ان کے پاس تھے بھی اور اُنہی کے پیش نظر ان کے علماء آپ کے ظہور سے قبل آپ کے ظہور کی بشارت دیا کرتے تھے لیکن آپ کی بعثت کے بعد انہیں اپنے فوائد معرض خطر میں نظر آنے لگے اس لیے ظلم و ستم اور طغیان و سرکشی کی راہ اختیار کرتے ہوئے انہوں نے وہ سب کچھ پس پشت ڈال دیا۔

"فمن یکفر بایٰت اللہ فان اللہ سریع الحساب"۔

آیات کے آخر میں ایسے لوگوں کا مآل کار بیان کیا گیا: وہ لوگ جو آیات الٰہی کو جھٹلاتے ہیں، اپنے اعمال کا مکمل نتیجہ حاصل کریں گے، خدا تعالیٰ ان کے اعمال کا بہت جلد حساب کرے گا۔

سریع الحساب کے مفہوم کے بارے میں اسی جلد میں سورہ بقرہ کی آیت ۲۰۲ کے ذیل میں بحث کی جا چکی ہے، اُس سے رجوع فرمائیں۔

مذہبی اختلافات کا سرچشمہ

ضمنی طور پر اس آیت سے ایک جالب نظر بات معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ کہ زیادہ تر مذہبی اختلافات کا سرچشمہ



جہالت، نادانی اور بے خبری نہیں ہے بلکہ، سرکشی، ظلم، انحراف حق اور ذاتی مفادات ہی اس کی بیشتر وجوہات ہوتی ہیں۔ اگر سب لوگ عموماً اور علماء خصوصاً تعصب، کینہ پروری، تنگ نظری، ذاتی مفادات اور اپنے حقوق سے تجاوز سے باز رہیں اور حقیقت شناسی اور عدالت سے کام لیتے ہوئے احکام الٰہی کا مطالعہ کریں تو انہیں شاہراہ حق بہت ہی واضح دکھائی دے گی اور اختلاف بہت تیزی سے حل ہو جائیں گے۔

یہ آیت درحقیقت ان لوگوں کا دندان شکن جواب ہے جو کہتے ہیں کہ مذہب لوگوں میں اختلاف پیدا کرتا ہے اور اس کی وجہ سے تاریخ میں بہت سی خون ریزیاں ہوئی ہیں۔ یہ لوگ دراصل "مذہب" اور "مذہبی تعصبات اور انحرافی افکار" میں فرق نہیں کر پاتے کیونکہ اگر مذاہب کے احکام و قوانین کا مطالعہ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ سب ایک ہی ہدف اور مقصد کے درپے ہیں اور سب سعادت بشر کے لیے آئے ہیں اگرچہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ سلسلہ تکمیل تک پہنچا ہے۔

آسمانی ادیان اصل میں آسمان سے برسنے والے بارش کے قطروں کی طرح ہیں۔ بارش کے سب قطرے حیات بخش ہیں لیکن وہ شور دار اور تلخ زمینوں پر پڑتے ہیں تو مختلف رنگوں اور ذائقوں میں بدل جاتے ہیں اور ان اختلاف کا بارش سے تعلق نہیں بلکہ ان کا تعلق تو زمین کی فتنوں اور آلودگیوں سے ہے۔

ادیان کے سلسلۂ تکامل پر آخری بات یہ ہے کہ ان میں سے آخری دین کامل تر ہے۔

۲۰۔ فَإِنْ حَاجُّوكَ فَقُلْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلَّهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ۗ وَقُلْ لِلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْأُمِّيِّينَ أَأَسْلَمْتُمْ ۚ فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۖ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ ۗ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ ۝

ترجمہ

۲۰ — اگر وہ تم سے گفتگو اور جھگڑے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں (تو ان سے مجادلہ نہ کرو) اور کہہ دو! میں اور میرے پیروکار خدا کے (اور اس کے فرمان کے) سامنے تسلیم ہیں اور جو اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) ہیں اور جو ان پڑھ (مشرکین) ہیں ان سے کہہ دو کیا تم بھی تسلیم ہوئے ہو؟ اگر وہ (فرمانِ خدا اور منطق حق کے سامنے) سر تسلیم خم کر دیں تو ہدایت پا لیں اور اگر



روگردانی کریں (تو تم پریشان نہ ہو کیونکہ تم پر تو ابلاغ رسالت کی ذمہ داری) ہے اور خدا بندوں کے (عقائد و اعمال) دیکھتا ہے۔

تفسیر

لغت میں "محاجہ" بحث، مباحثہ، گفتگو، استدلال اور کسی عقیدے کے دفاع کو کہتے ہیں۔ یہ فطری امر ہے کہ ہر دین کے طرفدار اپنے مقصد اور عقیدے کا دفاع کرتے ہیں اور اس سلسلے میں اپنے آپ کو حقدار قرار دیتے ہیں اس لحاظ سے قرآن رسول اللہؐ سے کہتا ہے: ہو سکتا ہے اہل کتاب (یہود و نصاریٰ وغیرہ) تم سے بحث کریں اور کہیں کہ ہم حق کے سامنے تسلیم ہیں اور حق کی طرفداری کے معنی میں اسلام کے پیروکار ہیں، یہاں تک کہ وہ اس بارے میں اپنی استقامت و پائداری کا مظاہرہ کریں جیسا کہ نجران کے عیسائیوں نے بھی پیغمبر اسلامؐ سے ایسی ہی گفتگو کی تھی۔

مندرجہ بالا آیت میں اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اسلامؐ کو یہ حکم نہیں دیا کہ اہل کتاب سے بحث مباحثہ اور گفتگو ہی نہ کی جائے بلکہ یہاں ایک اور حکم دیا گیا ہے جس کے مطابق جب بحث آخری مرحلے تک پہنچ جائے تو اس وقت نہ ان کی راہنمائی کی ضرورت ہے نہ مخاصمت و مجادلہ کی بہترین راستہ یہ ہے کہ انہیں کہیں کہ میں اور میرے پیروکار خدا کے سامنے تسلیم کئے ہوئے ہیں اور حق کے پیروکار ہیں اور پھر مشرکین سے کہیں کہ اگر وہ بھی خدا کے سامنے تسلیم ہیں اور پیرو حق ہیں تو انہیں چاہیے کہ منطقی گفتگو کے سامنے سر جھکا دیں اور اس صورت میں ان سے بحث و مباحثہ اور گفتگو کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اس مقام پر گفتگو بے محل اور بے اثر ہے اور تبلیغ رسالت کے علاوہ کوئی چیز تم پر لازم نہیں ہے "فان اسلموا فقد اهتدوا ۚ وان تولوا فانما عليك البلغ"۔

خدا تعالیٰ اپنے بندوں کے اعمال و افکار کو دیکھتا ہے " والله بصير بالعباد"۔

اس مقام پر چند نکات قابل توجہ ہیں:

۱۔ آیت سے ضمنی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ایسے ہٹ دھرم افراد سے بحث مباحثے سے پرہیز کرنا چاہیے جو صحیح منطق کو تسلیم نہیں کرتے۔

۲۔ "اُمّیّین"[1] سے اس آیت میں مراد "مشرکین" ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا ذکر بھی کتاب (یہود و نصاریٰ) کے مقابلے میں آیا ہے اور ان کے پاس کوئی آسمانی کتاب نہیں تھی کہ جس کی وجہ سے وہ پڑھنے لکھنے پر مجبور ہوتے۔

۳۔ اس آیت سے مکمل طور پر واضح ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کا طریق کار فکر و نظر اور عقیدہ ٹھونسنا نہیں تھا، بلکہ آپؐ کی کوشش ہوتی تھی کہ لوگوں پر حقائق آشکار ہو جائیں اور پھر انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ خود حق کی پیروی کے لیے عزم صمیم کریں۔

---

[1] اُمّی اُسے کہتے ہیں جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو۔



۲۱۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ○

۲۲۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ○

ترجمہ

۲۱۔ جو لوگ آیاتِ خدا سے کفر کرتے ہیں، انبیاء کو ناحق قتل کرتے ہیں اور عدل کا حکم دینے والوں کو بھی قتل کر دیتے ہیں انہیں دردناک عذاب کی بشارت دیجیئے۔

۲۲۔ وہ ایسے لوگ ہیں جن کے نیک اعمال (ان عظیم گناہوں کی وجہ سے) دنیا اور آخرت میں تباہ ہوگئے ہیں اور ان کا کوئی یاور و مددگار (اور شفاعت کرنے والا) نہیں ہے۔

تفسیر

اِن دو آیتوں میں پہلے ان تین عظیم گناہوں کا ذکر ہے:

۱۔ آیاتِ الٰہی سے کفر اختیار کرنا،

۲۔ ابنیاء کو ناحق قتل کرنا اور

۳۔ ابنیاء و مرسلین کے پروگرام کی حفاظت کرنے والوں اور لوگوں کو عدل و انصاف کا حکم دینے والوں کو بھی قتل کر دینا۔

اس کے بعد ان کے لیے تین سزاؤں اور بدبختیوں کا تذکرہ ہے جو یہ ہیں:

۱۔ "فبشرھم بعذاب الیم" (اُنہیں دردناک عذاب کی بشارت دیجیئے) اس جملے میں ان کے لیے سخت سزا کا ذکر ہے۔

۲۔ بعد والی آیت میں ہے: "اولٰئک الذین حبطت اعمالھم فی الدنیا



والاخرۃ ۔" (یعنی اِن لوگوں کے اعمال اِس دُنیا میں اور آخرت میں نابود اور اکارت ہو جائیں گے) اِس جملے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو نیک اعمال وہ انجام دے چکے ہیں وہ بھی ان کے عظیم گناہوں سے متاثر ہوں گے اور اپنی تاثیر کھو بیٹھیں گے اور ضائع ہو جائیں گے۔

۲۔ آخر میں مزید کہا گیا ہے کہ انہیں ملنے والی سخت سزا اور شدید عذاب کے مقابلے میں کوئی بھی شخص ان کی حمایت کرنے والا نہیں ہوگا یعنی وہ شفاعت کرنے والوں کی شفاعت سے بھی محروم رہیں گے" وما لھم من نٰصرین"

جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت ۶۱ کے ذیل میں ہم کہہ چکے ہیں کہ یہ آیت یہودیوں کی عجیب تاریخ کی طرف اشارہ کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ وہ آیاتِ الٰہی کے انکار کے علاوہ انبیاء کو قتل کرنے میں بھی بڑی جسارت کا مظاہرہ کرتے تھے اور ان مجاہدوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیتے تھے جو انبیاء کی حمایت کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے تھے لیکن مسلّم ہے کہ یہ حکم اور سزا ان کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ ان تمام اقوام کے بارے میں ہے جو ان جیسے افعال و اعمال بجالاتی ہیں۔

چند اہم نکات

۱۔ **اہلِ عدل انبیاء کے ساتھ ساتھ:** آیت میں عدالت کا حکم دینے والوں اور نیک کاموں اور حق کی دعوت دینے والوں کا تذکرہ انبیاء کے ساتھ ساتھ آیا ہے۔ خدا سے کفر کرنے والوں نیز انبیاء اور اہل عدل کو قتل کرنے والوں کو ایک سطح پر قرار دیا گیا ہے اور یہ چیز واضح کرتی ہے کہ اسلام نے معاشرے میں عدالت کے قیام کے لیے کس قدر اہتمام کیا ہے۔

دوسری آیت سے ایسے صالح افراد کو قتل کرنے والوں کے لیے شدید عذاب اور سزا کا پتہ چلتا ہے ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ "حبط"[1] سب گناہوں کے لیے نہیں بلکہ ایسے شدید اور سخت گناہوں کے بارے میں ہے جو نیک اعمال کو بھی لے ڈوبتے ہیں۔

علاوہ ازیں ایسے اشخاص کی شفاعت سے محرومی ان کے گناہوں کی شدت کے بارے میں ایک اور دلیل ہے۔

۲۔ **ناحق قتل** "بغیر حق" سے یہ مراد نہیں کہ حق کے ساتھ پیغمبروں کو قتل کیا جا سکتا ہے بلکہ مراد ہے کہ انبیاء کا قتل ہمیشہ ناحق اور ظالمانہ فعل ہے۔ اصطلاح میں "بغیر حق" کے الفاظ "قید توضیحی" کے طور پر ہیں اس لیے تاکید کے لیے ہیں۔

۳۔ **"بشارت" کا مفہوم:** "بشارت" کا لفظ دراصل نشاط انگیز خبروں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور ان کا اثر انسانی "بشرہ" اور صورت پر ظاہر ہوتا ہے۔ قرآن کی اس آیت میں اور دیگر آیات میں عذاب کے موقع پر اس لفظ کا استعمال درحقیقت ایک قسم کی تنبیہ ہے اور گنہ گاروں کے افکار و نظریات پر استہزا ہے۔ ایسی گفتگو ہمارے روزمرّہ میں بھی مروج ہے۔ جب کوئی بُرا کام انجام دیتا ہے تو سرزنش اور استہزاء کے طور پر کہتے ہیں: "ہم تجھے اس کا اجر اور بدلہ دیں گے"۔

---

[1] "حبط" کے مسئلے کے بارے میں تحقیق کے لیے سورہ بقرہ کی آیت ۲۱۷ کی تفسیر سے رجوع کریں۔



۲۳۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ○

۲۴۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۪ وَغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ○

۲۵۔ فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۣ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ○

ترجمہ

۲۳۔ کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کے پاس (آسمانی) کتاب کا کچھ حصّہ ہے اور ان میں فیصلے کے لیے انہیں کتابِ خدا کی طرف دعوت دی گئی ہے لیکن (علم و آگہی کے باوجود) ان میں سے ایک فریق نے روگردانی کی جب کہ وہ (قبولِ حق سے) اعراض کیے ہوئے تھے۔

۲۴۔ (ان کا) یہ عمل، اس بنا پر تھا کہ وہ کہتے تھے کہ چند دن کے سوا (جہنم کی) آگ ہم تک نہیں پہنچے گی (اور دوسری قوموں سے ہمارے امتیاز کی وجہ سے ہمیں بہت ہی محدود سزا ملے گی) اور (خدا پر باندھے گئے) اس افتراء نے انہیں بہت مغرور کر دیا تھا۔

۲۵۔ پس اس وقت کیا حالت ہوگی جب اُس (قیامت کے دن جس میں کوئی شک نہیں



سب جمع ہوں گے ہم انہیں اور ہر شخص کو جو کچھ اُنہوں نے اپنے اعمال کے ذریعے) کمایا ہے ۔ دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں ہوگا بلکہ وہ اپنے اعمال کی فصل ہی کاٹیں گے ۔

شانِ نزول

تفسیر مجمع البیان میں ابن عباس سے منقول :

رسول اللہؐ کے زمانے میں خیبر کے یہودیوں میں سے ایک عورت اور ایک مرد زنائے محصنہ[1] کے مرتکب ہوئے ۔ باوجودیکہ تورات میں ایسے اشخاص کو سنگسار کرنے کا حکم تھا، چونکہ یہ مرد عورت اشراف میں سے تھے اس لیے اِن پر یہ حکم جاری کرنے میں توقف برتا گیا اور تجویز ہوا کہ پیغمبر اسلامؐ سے رجوع کیا جائے اور ان سے فیصلہ حاصل کیا جائے ۔ انہیں توقع تھی کہ آپ کی طرف سے کم سزا معین ہوگی لیکن رسول اللہ نے بھی ان کے لیے وہی سزا معین فرمائی ۔ اس فیصلے پر بعض یہودیوں اور ان کے وڈیروں میں سے بعض نے اعتراض کیا اور اس بات کا انکار کر دیا کہ یہودی مذہب کے مطابق یہ فیصلہ درست ہے ۔

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا : یہ موجودہ تورات ہی تمہارے اور میرے درمیان فیصلہ کر دے گی ۔

اُنہوں نے قبول کر لیا ۔ ابن صوریا اُن کا ایک عالم تھا ۔ اسے فدک سے مدینہ بلایا گیا تھا ۔ پیغمبر اکرمؐ نے اسے پہچان لیا اور فرمایا : تو ابن صوریا ہے ؟

اس نے عرض کیا : جی ہاں ۔

آپؐ نے فرمایا : کیا تم یہودیوں میں اَعلم علماء ہو ؟

اُس نے کہا : وہ یہی سمجھتے ہیں ۔

پیغمبر اکرمؐ نے حکم دیا کہ اس کے سامنے تورات کا وہ حصّہ رکھا جائے جس میں سنگسار کرنے کا حکم ہے ۔

وہ چونکہ پہلے سے باخبر تھا اِس لیے جب تورات کی اس آیت تک پہنچا تو اس پر ہاتھ رکھ دیا اور اُس کے بعد کے جملے پڑھ دیے ۔

عبداللہ بن سلام جو پہلے یہودی علماء میں سے تھا اور مسلمان ہو گیا تھا ، وہاں

---

[1] شادی شدہ افراد کے زنا کو "زنائے محصنہ" کہتے ہیں (مترجم)



موجود تھا۔ وہ ابن صوریا کی اس پردہ پوشی پر متوجہ ہو کر فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور اس کا ہاتھ اس جملے سے ہٹا دیا اور متن تورات میں سے اسے پڑھا اور کہا کہ تورات کہتی ہے: یہودیوں کے لیے ضروری ہے جب کوئی عورت اور مرد زنائے محصنہ کے مرتکب ہوں اور ان کے جرم کا کافی ثبوت موجود ہو تو انہیں سنگسار کر دیا جائے۔

اس کے بعد پیغمبر اکرمؐ نے حکم دیا کہ ان کے دین کے مطابق مذکورہ سزا ان دو مجرموں پر جاری کی جائے۔

اس پر یہودیوں کی ایک جماعت سیخ پا ہو گئی، زیر نظر آیت اسی کیفیت کے بارے میں نازل ہوئی ہے [۱]

تفسیر

اِن آیات میں صراحت سے اہل کتاب کی چند خیانتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ کیسے حیلہ جوئی اور بے بنیاد مطالب کے ذریعے حدود الٰہی کے نفاذ سے بغاوت کرتے تھے۔ حالانکہ ان کے پاس موجود آسمانی کتاب صراحت سے حکم بیان کر چکی ہوتی تھی کہ اپنی مذہبی کتاب میں موجود حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں "الم تر الی الذین اوتوا نصیبا من الکتب یدعون الی کتب اللہ لیحکم بینھم"۔

لیکن اُنہوں نے صریحاً اس کی مخالفت کی اور مخالفت بھی ایسی جسے اعراض، سرکشی اور احکام خدا پر نکتہ چینی کہا جانا چاہیئے "ثم یتولی فریق منھم وھم معرضون"۔

"اوتوا نصیبا من الکتب" سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں جو تورات اور انجیل یہود و نصاریٰ کے پاس موجود تھی وہ ساری حقیقی تورات اور انجیل نہ تھی بلکہ یہ تو ان کا صرف ایک حصّہ تھا اور ان دونوں آسمانی کتابوں کا بیشتر حصّہ یا غائب تھا یا پھر تحریف شدہ تھا۔

اس آیت کی قرآن کی دیگر آیات بھی تائید کرتی ہیں۔ نیز تاریخی شواہد بھی اس کے مؤید ہیں۔

دوسری آیت میں ان کی مخالفت اور روگردانی کی وجہ بیان کی گئی ہے کہ ان کی ایک باطل اور غلط فکر تھی اور وہ یہ کہ وہ ایک بلند اور ممتاز خاندان سے ہیں۔ آج بھی وہ ایسا ہی سمجھتے ہیں اور بہت سی تحریریں ان کی نسل پرستی کی شاہد ہیں۔ ان کا اعتقاد تھا کہ پروردگار عالم سے ان کا ایک خاص تعلق ہے یہاں تک کہ وہ اپنے تئیں خدا کے بیٹے کہتے تھے

---

[۱] اِس وقت موجودہ تورات میں سفر لاویان کی بیسویں فصل کے دسویں جملے میں ہے: اور جو شخص کسی غیر کی عورت سے زنا کرے دشمناً اپنے ہمسائے کی بیوی سے زنا کرے تو چاہیے کہ زانی اور زانیہ کو قتل کر دیا جائے۔

اس عبارت میں اگرچہ سنگسار کا حکم صراحت سے نہیں ہے لیکن انہیں قتل کر دینے کی اصل سزا کا حکم ہے۔ ممکن ہے پیغمبر اسلام کے زمانے کے نسخوں میں وہ عبارت موجود ہو۔



جیسا کہ سورہ مائدہ آیہ اٹھارہ میں ان کی زبان سے قرآن نے نقل کیا ہے ۔

"نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ"

ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے خاص دوست ہیں ۔

اسی لیے وہ خدائی سزا کے مقابلے میں ایک قسم کی معنویت کے قائل تھے اور سمجھتے تھے کہ اس سے محفوظ رہیں گے اور اس امر کو خدا کی طرف بھی منسوب کرتے تھے لہٰذا ان کا اعتقاد تھا کہ ان میں سے گنہ گار افراد بھی قیامت میں چند دنوں کے سوا عذاب میں مبتلا نہیں ہوں گے ۔ جیسا کہ محل بحث آیات میں بھی ہے :

"قالوا لن تمسنا النار الا ایاما معدودات"

ان ایام معدودہ سے مراد یا تو وہ چالیس دن تھے جن میں حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی عدم موجودگی میں انہوں نے گوسالہ پرستی شروع کر دی تھی یہ ایسا گناہ تھا کہ وہ خود بھی اس کا انکار نہیں کر سکتے تھے یا پھر اس سے مراد ان کی زندگی کے معدود اور گنے چنے دن تھے کہ جن میں انہوں نے بہت زیادہ واضح اور ناقابلِ انکار گناہوں کا ارتکاب کیا تھا اور وہ خود بھی ان گناہوں کی توجیہ اور پردہ پوشی نہ کر سکتے تھے ۔

خدا کی طرف منسوب یہ جھوٹے اور جعلی امتیازات رفتہ رفتہ ان کے عقائد کا جزبن گئے جس سے وہ مغرور ہو گئے تھے یہاں تک کے احکام خدا کی مخالفت اور قانون شکنی میں بھی بے باک ہو گئے تھے ("وغرهم في دينهم ما كانوا يفترون") ۔

تیسری آیت میں قرآن ان تمام باطل خیالات پر خط بطلان کھینچتا ہے اور کہتا ہے : ایک روز یقیناً پروردگار کی بارگاہِ عدل میں دیگر انسانوں کی طرح پیش ہوں گے اور ہر شخص اپنے اعمال کا سامنا کرے گا چونکہ وہ اپنے ہی اعمال کا سامنا کریں گے اور اپنے ہی اعمال کا نتیجہ پائیں گے اس لیے انہیں جو بھی سزا ملے گی اس میں ان پر کسی قسم کا ظلم و ستم نہیں ہوگا کیونکہ یہ تو سب ان کے کیے کا ماحصل ہوگا " وفيت كل نفس ما كسبت وهم لا يظلمون "

" ما كسبت " سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ قیامت کے دن کی جزا و سزا اور دوسرے جہان کی خوش بختی و بدبختی صرف انسانی اعمال سے وابستہ ہے اور اس میں کوئی اور چیز موثر نہیں ہے ۔ اس حقیقت کی طرف بہت سی آیاتِ مجیدہ میں اشارہ ہوا ہے ۔

دو سوال اور ان کا جواب

کیا یہ ممکن ہے کہ انسان کوئی جھوٹ بولے یا خدا پر افترا باندھے اور پھر خود ہی اس کے زیر اثر آ جائے اور اس کے نتیجے میں مغرور ہو جائے جیسا کہ زیر نظر آیات میں فرمایا گیا ہے ؟ کیا یہ باور کیا جا سکتا ہے ؟

اس سوال کا جواب کوئی زیادہ مشکل نہیں ہے کیونکہ وجدان کو دھوکا اور فریب دینے کا مسئلہ آجکل نفسیات کے



مسلمہ مسائل میں سے ہے بعض اوقات قوت فکر و نظر وجدان کو غافل کر دیتی ہے اور حقیقت کے چہرے کو بگاڑ دیتی ہے۔ ہم نے بارہا دیکھا ہے کہ بڑے بڑے گناہوں مثلاً قتل، چوری یا طرح طرح کی بُری عادات میں ملوث افراد اپنے اعمال کی قباحت کو اچھی طرح جاننے کے باوجود وجدان کی جھوٹی تسکین کے لیے کوشش کرتے ہیں۔ وہ لوگوں پر کیے گئے ظلم کا انہیں مستحق قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں یا اپنی ضرر رساں عادتوں کی توجیہ کرتے ہیں۔ زندگی کی ناہمواریوں اور معاشرے کی طاقت فرسا مشکلات کا نام لے کر اپنے لیے منشیات کے استعمال کو درست ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

علاوہ ازیں یہ جھوٹے امتیازات اہل کتاب کی گذشتہ نسلوں نے گھڑے تھے اور بعد کی نسلیں جو اس سے آگاہ نہیں تھیں انہوں نے اسے بلا تحقیق صحیح عقیدے کے طور پر اپنا لیا۔

۲۔ یہ بھی سوال کیا جاتا ہے کہ محدود عذاب اور سزا کا عقیدہ تو مسلمانوں میں بھی موجود ہے کیونکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ حقیقی مسلمان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے عذاب الٰہی میں مبتلا نہیں رہیں گے اور آخرکار ان کا ایمان ان کی نجات کا سبب بنے گا۔

توجہ رہے کہ ہمارا یہ عقیدہ ہرگز نہیں کہ ایک گنہگار اور طرح طرح کے جرائم میں آلودہ مسلمان صرف چند دن عذاب الٰہی میں مبتلا رہے گا بلکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ وہ سالہا سال تک گرفتارِ سزا رہے گا اور اس کی سزا کی اصل مدت خدا تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے ممکن ہے اسکے ایمان کی وجہ سے اس کی سزا دائمی اور ابدی نہ ہو اور اگر واقعاً مسلمانوں میں کچھ ایسے افراد ہوں جو یہ سمجھتے ہوں کہ وہ اسلام، پیغمبر اکرمؐ اور آئمہ اطہارؑ پر ایمان کے نام پر ہر طرح کا گناہ کرنے کے مجاز ہیں اور اس پر انہیں چند روز کے علاوہ سزا نہیں ہوگی تو وہ بہت بڑے اشتباہ کا شکار ہیں اور روحِ اسلام اور تعلیماتِ اسلامی سے دُور ہیں۔

ہم اس معاملے میں مسلمانوں کے لیے امتیاز کے قائل نہیں بلکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ ہر امت کے افراد جو اپنے اپنے زمانے کے پیغمبر پر ایمان رکھتے تھے مگر کسی گناہ کے مرتکب ہو گئے ہوں تو وہ بھی اس قانون کے تحت آتے ہیں چاہے وہ کسی قوم یا قبیلے سے ہوں جب کہ یہودی صرف بنی اسرائیل کے لیے اس امتیاز کے قائل ہیں اور دیگر اقوام عالم کے لیے وہ ایسے کسی قانون کو نہیں مانتے۔

قرآن اُن کے اس جھوٹے امتیاز کا جواب دیتے ہوئے سورہ مائدہ کی آیت ۱۸ میں کہتا ہے۔

"بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ"

تم بھی دیگر انسانوں کی طرح ہو

۲۶۔ قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِى الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ○



۲۷۔ تُولِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُولِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ○

ترجمہ

۲۶۔ کہیے بارالٰہا! حکومتوں کا مالک تو ہے، تو ہی جسے چاہتا ہے کہ حکومت بخشتا ہے اور جس سے چاہتا ہے حکومت لے لیتا ہے، جسے چاہتا ہے عزّت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلت دیتا ہے، تمام خوبیاں تیرے ہاتھ میں ہیں کیونکہ تو ہر چیز پر قادر ہے۔

۲۷۔ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے، مُردہ سے زندہ کو اور زندہ سے مُردہ کو نکالتا ہے اور جسے چاہتا ہے بے حساب روزی دیتا ہے۔

شانِ نزول

مشہور مفسر طبرسی نے مجمع البیان میں اس سلسلے میں دو شان نزول بیان کی ہیں اور ہر دو ایک ہی حقیقت کی نشاندہی کرتی ہے۔ ذیل میں دونوں شانِ نزول پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ پیغمبر اکرمؐ نے مکہ فتح کر لیا تو مسلمانوں کو خوشخبری دی کہ بہت جلد ایران اور روم بھی پرچم اسلام کے نیچے ہوں گے۔ یہ بات سُنی تو منافقین کہ جن کے دل ابھی نورِ ایمان سے روشن نہیں ہوئے تھے اُسے مبالغہ آمیز سمجھنے لگے اور تعجب سے کہنے لگے۔

محمّدؐ نے مدینہ اور مکہ کو کافی نہیں سمجھا اور ایران و روم کی لالچ بھی رکھتا ہے۔

اِس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں۔

۲۔ جب پیغمبر اکرمؐ مدینے کے باہر مسلمانوں کے ساتھ خندق کھود رہے تھے، مسلمان نہایت نظم و نسق اور انہماک سے دستوں میں منقسم ہو کر خندق کھودنے میں معروف تھے تاکہ دشمن کے آنے سے پہلے یہ دفاعی کام پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے۔ اچانک خندق میں سے ایک سفید اور سخت پتھر نکلا جسے مسلمان ہلانے اور توڑنے میں ناکام ہو گئے۔ سلمانؓ پیغمبر اکرمؐ کے پاس آئے اور ماجرا بیان کیا۔ آنحضرتؐ خندق میں اُترے، سلمان سے کدال لی اور زور سے پتھر پر ماری۔



کدال پتھر پر لگی تو ایک شعلہ نکلا ۔ اس پر پیغمبر اکرمؐ نے کامیابی کی تکبیر بلند کی ۔ مسلمان بھی آپؐ کے ہم آواز ہوئے اور ہر طرف سے تکبیر بلند ہوئی ۔ نبی اکرمؐ نے دوسری دفعہ کدال پتھر پر ماری تو پھر شعلہ نکلا اور کچھ پتھر ٹوٹ گیا ۔ پیغمبر اکرمؐ اور مسلمانوں نے پھر تکبیر بلند کی ، تکبیر کی آواز سے فضا گونج اٹھی ۔ آپؐ نے تیسری مرتبہ کدال بلند کی اور باقی پتھر پر زور سے ماری پھر شعلہ نکلا جس سے چاروں طرف چمک پھیلی اور باقی پتھر بھی ٹوٹ گیا اور پھر تیسری مرتبہ تکبیر کی آواز خندق میں گونجی ۔

سلمان نے عرض کیا : آج میں نے آپؐ سے یہ عجیب و غریب چیز دیکھی ہے

پیغمبر اکرمؐ نے ارشاد فرمایا : پہلی مرتبہ شعلہ نکلا تو اس میں میں نے حیرا اور مدائن کے محلات دیکھے اور میرے بھائی جبرئیلؑ نے مجھے بشارت دی کہ وہ پرچم اسلام کے نیچے آئیں گے ۔ دوسرے شعلے میں میں نے روم کے محلات دیکھے اور جبرئیل نے بشارت دی کہ وہ میرے پیروکاروں کے قبضے میں آئیں گے اور تیسرے شعلے میں میں نے صنعاء اور یمن کے محلات دیکھے اس پر جبرئیلؑ نے بشارت دی کہ مسلمان انہیں بھی فتح کرلیں گے ۔ اسی لیے میں نے تکبیر کہی ۔ اے مسلمانو! تمہیں مبارک ہو ۔ مسلمان تو خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے اور خدا کا شکر ادا کرتے تھے لیکن منافقین کے چہرے بگڑ گئے اور وہ مغموم ہوگئے ۔ وہ اعتراض کرنے لگے : کیسی غلط آرزو ہے اور کیسا محال وعدہ ہے حالانکہ اس وقت تو انہوں نے اپنی جان کے خطرے سے دفاعی حالت اختیار کر رکھی ہے ، خندق کھود رہے ہیں ، اس چھوٹے دشمن سے بھی جنگ کے قابل نہیں ہیں اور سر میں دنیا کے عظیم ملکوں کی فتح کا سودا سمایا ہوا ہے ۔

اس موقع پر محل بحث آیات نازل ہوئیں جن میں ان منافقین کو جواب دیا گیا ہے ۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں مشرکین اور اہل کتاب کے بارے میں گفتگو تھی کہ وہ کیسے ملک اور عزت کو اپنے لیے مخصوص جانتے ہیں اور خود کو اسلام سے بے نیاز سمجھتے ہیں ۔ اب ان آیات میں خداوند عالم ان کے اس زعم باطل کو غلط ثابت کرتا ہے اور فرماتا ہے : خدا ہی ہر ملک و سلطنت کا مالک ہے ، خیر و نیکی اس کے قبضے میں ہے ، وہ قدرت مطلقہ ہے اور ہر حالت میں اسی کی پناہ حاصل کرنا چاہیئے ۔

موجودات کا حقیقی مالک وہی ہے جو ان کا خالق و پروردگار ہے ، جیساکہ سورہ مومن کی آیہ ۶۲ میں ہے :

"ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمْ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ" :

یہ خدا جو تمہارا پروردگار ہے ، تمام چیزوں کو خالق ہے

وہ وہی ہے جو جسے چاہتا ہے ملک و سلطنت بخش دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے لے لیتا ہے ۔ وہی عزت دیتا ہے اور وہی جسے چاہتا ہے خاک ذلت میں بٹھا دیتا ہے ۔ یہ سب کچھ اس کے قبضۂ قدرت میں ہے اور اُس کے زیر فرمان ہے ۔ وہ اپنے افعال میں مجبور نہیں ہے ۔ وہ فاعل مختار ہے نہ کہ فاعل مجبور ۔

بتا دینا واضح ہے کہ مشیت و ارادہ سے ان آیات میں یہ مراد نہیں کہ وہ بغیر کسی حساب کتاب کے یا بغیر کسی وجہ کے کسی کو کوئی چیز عطا کرتا ہے اور کسی سے کوئی چیز لے لیتا ہے بلکہ اُس کی مشیت حکمت سے وابستہ ہے جہاں



خلقت کا پورا نظام اور عالمِ انسانیت کا سارا پروگرام اس کی مصلحت و حکمت کے تحت چل رہا ۔ اس لیے وہ جو کام بھی کرتا ہے اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہترین اور صحیح ترین ہوتا ہے ۔

"بیدک الخیر انک علیٰ کل شیءٍ قدیر" :

لفظ "خیر" کا فارسی میں متبادل ہے "بہتر" ۔ یہ افضل التفضیل اور ایک چیز کی دوسری پر برتری بیان کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے ۔ تاہم ہر اچھے امر کے لیے بھی بولا جاتا ہے ۔ مثلاً سورہ بقرہ آیہ ۲۲۱ میں ہے :

"و لعبد مؤمن خیر من مشرک"

بت پرست کی نسبت بندۂ مومن سے شادی کرنا بہتر ہے

ظاہر ہے کہ مشرک میں تو کوئی اچھائی اور خوبی نہیں کہ کہا جا سکے کہ وہ اچھا ہے اور مومن اس سے بہتر ہے ۔
افضل التفضیل کے مفہوم میں بھی بعض اوقات یہ بات آجاتی ہے مثلاً سورہ یوسف کی آیہ ۳۳ میں حضرت یوسف کی زبانی فرمایا گیا ہے :

"رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَیْهِ" :

یعنی — پروردگار ! یہ شرمناک عمل زنا جس کی مجھے مصر کی عورتیں دعوت دے رہی ہیں اس سے قید مجھے زیادہ محبوب ہے ۔

واضح ہے زنا کوئی ایسا عمل نہیں کہ جو حضرت یوسفؑ کی نظر میں محبوب ہو کہ اسے قید سے زیادہ محبوب قرار دیا جائے اس بناء پر افضل التفضیل صرف موازنے کے لیے استعمال ہوتا ہے اگرچہ ایک طرف وہ صفت بالکل موجود نہ ہو اور فقط دوسری طرف پائی جاتی ہو ۔

"بیدک الخیر" یہ الفاظ دو حوالوں سے یہ بتاتے ہیں کہ تمام خیرات اور اچھائیاں خدا تعالیٰ میں منحصر ہیں ۔
۱ ۔ لفظ خیر کے ساتھ الف اور لام ہے اور یہاں اسے الف لام استغراق کہتے ہیں ۔
۲ ۔ یہاں مبداء یعنی "خیر" بعد میں ہے اور "بیدک" جو اس کی خبر ہے وہ پہلے ہے ۔
اور یہ دونوں چیزیں حصر کی دلیل ہیں ۔
اس لیے ان الفاظ کا معنی کچھ یوں ہوگا : تمام نیکیاں تیرے ہی قبضۂ قدرت میں ہیں ۔
"بیدک الخیر" سے ضمناً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ ہر قسم کی خیر اور سعادت کا سرچشمہ ہے ۔ وہ عزت بخشتا یا ذلت دیتا ہے تو یہ سب کچھ قانونِ عدالت کے مطابق ہوتا ہے اور اس میں کچھ بھی "شر" نہیں ہوتا ۔

"اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ"

یہ جملہ گذشتہ حصے کی دلیل کے طور پر آیا ہے ۔ یعنی جب خدا قدرتِ مطلقہ کا مالک ہے تو پھر کوئی اشکال اور شبہ نہیں ہے کہ تمام نیکیاں اور اچھائیاں اس کے ارادے کے ماتحت ہوں گی ۔



صالح اور غیر صالح حکومتیں

یہاں ایک اہم مسئلہ درپیش ہوگا اور وہ یہ کہ ممکن ہے مندرجہ بالا آیت سے کچھ لوگ یہ نتیجہ اخذ کریں کہ جس شخص کو بھی حکومت ملتی ہے اور جس سے بھی حکومت کھوجاتی ہے سب ارادۂ الٰہی کے تحت ہوتا ہے اور اس کا مطلب یہ ہوا کہ تاریخ میں گزرنے والے چنگیز اور ہٹلر جیسے جابر اور ستمگر حکمرانوں کی حکومت پر بھی مہر تصدیق ثبت کر دی جائے۔ اتفاق ہے کہ تاریخ کہتی ہے کہ یزید بن معاویہ نے اپنی شرمناک اور ظالمانہ حکومت کے جواز اور توجیہ کے لیے اسی آیت سے استدلال کیا تھا۔[1]

یہی وجہ ہے کہ مُفسرین نے اس اعتراض کے جواب میں آیت کی مختلف وضاحتیں پیش کی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ آیت خدائی حکومتوں سے مخصوص ہے یا پیغمبر اکرمؐ کی حکومت کے قیام اور قریش کی ظالم حکومتوں کے اختتام سے مخصوص ہے۔

لیکن حق یہ ہے کہ آیت ایک کُلی اور عمومی مفہوم کی حامل ہے جس کے مطابق تمام اچھی اور بُری حکومتیں خدا تعالیٰ کی مشیت اور ارادے کے مطابق ہیں مگر اس کا مفہوم یہ ہے کہ خداوند عالم نے اس دنیا میں کامیابی اور پیش رفت کے لیے عوامل واسباب کا ایک سلسلہ پیدا کیا ہے اور ان آثار سے فائدہ اٹھانا ہی مشیت خدا ہے۔ اس لیے خدا کی مشیت سے مراد وہ آثار ہیں جو ان عوامل واسباب میں پیدا کیے گئے ہیں۔ اب اگر چنگیز، یزید اور فرعون جیسے ظالم اور غیر صالح افراد کامیابی کے ان وسائل سے استفادہ کریں اور کمزور، پسماندہ اور بزدل قومیں اپنے آپ کو ان کے سپرد کر دیں اور ان کی شرمناک حکومت کو گوارا کرلیں تو یہ ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے۔ کہاوت ہے: ہر قوم اسی حکومت کی لائق ہے جو اس پر قائم ہے۔

اگر قومیں بیدار ہوں اور جابر و قاہر بادشاہوں سے یہ اسباب چھین کر صالح اور اہل ہاتھوں میں دے دیں اور عادلانہ حکومتیں قائم کریں تو یہ بھی ان کے اعمال کا نتیجہ ہے جو الٰہی اسباب وعوامل سے استفادہ کے طریقے سے وابستہ ہے۔

درحقیقت یہ آیت تمام افراد اور تمام انسانی معاشروں کی بیداری کے لیے ایک پیغام ہے تاکہ وہ ہوشیار رہیں اور اس سے پہلے کہ غیر صالح افراد ان عوامل کے ذریعے معاشرے کے حساس منصب سنبھال لیں اور تمام اہم مورچوں پر قبضہ کر لیں، یہ خود کامیابی کے وسائل سے فائدہ اٹھائیں۔

"تولج الّیل فی النّھار و تولج النّھار فی الّیل":

"ولوج" لغت میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے۔ آیت کہتی ہے۔ اللہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے۔ قرآن مجید میں آٹھ دیگر مقامات پر بھی اس بات کا تذکرہ موجود ہے۔

اس آیت سے مراد وہی تدریجی اور حسی تبدیلی ہے جو سال بھر میں رات دن میں ہم دیکھتے ہیں۔ یہ تبدیلی اس کرۂ ارض کے محور کے اپنے مدار سے جھکاؤ کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے جو ۲۳ درجے سے کچھ زیادہ ہے اور اس سے سورج کی کرنوں کے زاویے بھی بدل جاتے ہیں۔ اسی لیے بلاد شمالی (خط استواء سے اوپر والے حصے) میں سردیوں کی ابتداء میں دن بڑھنے لگتے ہیں اور راتیں چھوٹی ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ اس کے برعکس گرمیوں کے آغاز میں راتیں بڑھنے لگتی ہیں اور دن

---

[1] المیزان بحوالہ ارشاد از شیخ مفید



چھوٹے ہوتے جاتے ہیں اور سردیوں کی ابتداء تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ جب کہ بلادِ جنوبی (خطِ استوا کے نیچے والے حصّہ) میں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔

اس لیے خدا تعالیٰ ہمیشہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا رہتا ہے یعنی ایک میں کمی کرتا ہے اور دوسرے میں اضافہ کردیتا ہے ممکن ہے کہا جائے کہ خطِ استواء کے اوپر اور اسی طرح قطب شمالی اور قطب جنوبی کے اصلی نقطے میں رات دن تمام سال برابر رہتے ہیں اور ان میں کسی قسم کی تبدیلی اور تغیر رونما نہیں ہوتا۔ خطِ استوا پر سال بھر رات دن بارہ بارہ گھنٹے کے اور قطب شمالی اور جنوبی میں سال میں ایک رات چھ ماہ کی اور ایک دن بھی چھ ماہ کا ہوتا ہے، اس لیے یہ آیت عمومی پہلو نہیں رکھتی۔

اس کے جواب میں کہنا چاہیے کہ حقیقت میں خطِ استواء ایک فرضی خط کے سوا کچھ نہیں اور لوگ ہمیشہ سے خطِ استوا کے اس طرف یا اُس طرف زندگی بسر کرتے چلے آرہے ہیں اسی طرح نقطۂ قطب بھی فرضی نقطے سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتا اور شمالی و جنوبی قطب میں رہنے والے لوگوں کی زندگی (اگر وہاں کوئی رہتا ہو تو) یقیناً قطب کے حقیقی نقطے سے وسیع تر جگہ میں ہوگی اس بنا پر دونوں صورتوں میں رات اور دن کا اختلاف موجود ہے۔

ممکن ہے اس آیت کا مندرجہ بالا مفہوم کے علاوہ ایک اور معنی بھی ہو اور وہ یہ کہ کرۂ ارض میں فضا کے طبقات کی وجہ سے اس میں اچانک رات اور دن پیدا نہیں ہوتے بلکہ فجر اور شفق کے شروع ہو کر دن آہستہ آہستہ پھیلتا جاتا ہے اور رات کا آغاز شرق کی سُرخی سے ہوتا ہے اور تدریجاً تمام جگہوں پر تاریکی چھا جاتی ہے۔ رات اور دن میں تدریجی تبدیلی جس حوالے سے بھی ہو انسان اور کرۂ ارض کے دیگر موجودات کے لیے فائدہ مند ہے۔ سبزوں، فصلوں اور بہت سے جانداروں کی پرورش سُورج کی تدریجی روشنی اور حرارت کی مرہونِ منت ہے۔ آغازِ بہار سے جوں جوں دھوپ کی شدّت اور حدت میں اضافہ ہوتا ہے نباتات اور حیوانات اپنے تکامل کے نئے نئے مرحلے طے کرتے ہیں اور انہیں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زیادہ روشنی اور حرارت کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ ضرورت شب و روز کے تدریجی سفر سے پوری ہوتی ہے اور یہاں وہ اپنے ارتقاء کے آخری نقطے تک پہنچ جاتے ہیں۔

اگر رات اور دن ایک سے ہوتے تو بہت سے نباتات اور حیوانات نشوونما اور رشد و تکامل سے محروم رہ جاتے اور چار موسموں کا تصور بھی نہ ہوتا کیونکہ وہ بھی اختلافِ لیل و نہار اور سُورج کی کرنوں کے بدلتے ہوئے زاویوں کے مرہونِ منت ہیں۔ یوں انسان فطری طور پر موسموں کے اختلاف کے فوائد سے بے بہرہ رہ جاتا۔

اسی طرح اگر آیت کے دوسرے مفہوم کو پیشِ نظر رکھیں کہ رات اور دن تدریجی طور پر تبدیل ہوتے ہیں ناگہانی طور پر نہیں اور شفق، طلوعِ صبح صادق اور طلوعِ آفتاب رات اور دن کے درمیان ظہور پذیر ہوتے ہیں تو واضح ہوتا ہے کہ رات اور دن کا یہ تدریجی عمل زمین میں رہنے والوں کے لیے ایک عظیم نعمت ہے کیونکہ اس طرح وہ آہستہ آہستہ تاریکی یا روشنی سے ہمکنار ہوتے ہیں اور یہی صورت ان کی جسمانی اور اجتماعی کیفیت میں سازگار ہے جب کہ دوسری صورت بہت سی پریشانیوں کا سبب بن سکتی تھی۔

"وتخرج الحی من المیّت و تخرج المیّت من الحی"

یہ تعبیر بھی قرآن کی کئی ایک آیات میں موجود ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے: خدا زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے۔

زندہ کو مردہ سے نکالنے سے مراد بے جان موجودات سے حیات کو پیدا کرنا ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ جب زمین زندگی



کو قبول کرنے کے قابل ہوئی تو زندہ موجودات بے جان مادہ سے معرض وجود میں آئے۔ علاوہ ازیں ہمارے بدن میں اور تمام عالم کے زندہ موجودات میں بے جان مواد خلیوں (CELLS) کا جزبن کر زندہ موجود میں تبدیل ہوجاتا ہے۔

زندہ موجودات سے مردہ وجود کی پیدائش کا عمل بھی ہماری آنکھوں کے سامنے جاری وساری رہتا ہے۔

یہ آیت درحقیقت موت وحیات کے دائمی قانون تبادل کی طرف اشارہ ہے جو بہت عام اور بہت پیچیدہ ہے اس کے باوجود نہایت جاذب نظر اور عجیب ترین قانون ہے جو ہم پر حکمران ہے۔

اس آیت کی ایک اور تفسیر بھی ہے جو گذشتہ تفسیر کی نفی نہیں کرتی اور وہ ہے معنوی وروحانی زندگی اور موت کا مسئلہ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اوقات صاحبان ایمان جو حقیقی زندہ ہیں بے ایمان افراد جو دراصل مردہ ہیں سے معرض وجود میں آتے ہیں اور بعض اوقات اس کے برعکس بے ایمان افراد اہل ایمان سے پیدا ہوجاتے ہیں۔ قرآن نے معنوی زندگی اور موت کو متعدد آیات میں ایمان اور کفر سے تعبیر کیا ہے۔

اس تفسیر کے مطابق قرآن قانون توارث کی بنیادوں کو منہدم کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے جب کہ دانشور اسے طبیعت کے قطعی قوانین میں سے سمجھتے ہیں۔ انسان طبیعت کے بے جان موجودات کی طرح نہیں ہے کیونکہ یہ موجودات مختلف عوامل کے زیر اثر مجبور ہیں جب کہ انسان ارادے کی آزادی کا حامل ہے اور یہ بذات خود اللہ کی ایک قدرت نمائی ہے کہ وہ کافر کی اس اولاد سے آثار کفر محو کردیتا ہے جو واقعاً مومن بننا چاہے اور مومن کی اس اولاد سے آثار ایمان دھو ڈالتا ہے جو کافر بننا پسند کرے۔ ارادے کا یہ استقلال جو ہر طرح کے مساعد و نامساعد حالات میں توارث پر غالب آجاتا ہے، اسی کی طرف سے ہے۔

یہی مفہوم پیغمبر اسلامؐ کی ایک روایت میں ہم تک پہنچا ہے۔ تفسیر در منثور میں سلمان فارسی سے منقول ہے:

رسول اللہ نے "تخرج الحی من المیت....." کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرمایا: اللہ تعالیٰ مومن کو کافر کی صلب سے اور کافر کو مومن کی صلب سے نکالتا ہے۔

"وترزق من تشآء بغیر حساب"

اصطلاح کے مطابق یہ جملہ "خاص" کے بعد "عام" کے قبیل میں سے ہے۔ گذشتہ جملوں پر خدا کی طرف سے بندوں کو رزق دینے کے چند نمونے بیان ہوئے تھے اور اس جملے میں مسئلہ عمومی صورت میں بیان کیا گیا ہے جس میں ہر طرح کے رزق اور تمام عطیات کا ذکر آگیا ہے یعنی نہ صرف یہ کہ عزت، حکومت، موت اور زندگی خدا کے قبضۂ قدرت میں ہے بلکہ ہر روزی، نعمت اور عنایت اسی کی طرف سے ہے۔

"بغیر حساب" اس طرف اشارہ ہے کہ عنایات خداوند کے دریا اس قدر وسیع اور گہرے ہیں کہ وہ جتنی بھی مقدار جسے بھی بخش دے ان میں کچھ فرق نہیں آتا اور وہ حساب رکھنے کا محتاج نہیں کیونکہ حساب تو وہ رکھتے ہیں جن کا سرمایہ محدود ہو اور اس کے کم یا ختم ہوجانے کا خوف ہو لیکن وہ خدا جو عالم وجود و کمالات کا بے کنار سمندر ہے اسے کم ہونے کا خوف ہے نہ اس سے کوئی حساب لینے والا ہے اور نہ ہی اسے حساب کی ضرورت ہے۔



جو کچھ کہا گیا ہے اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ جملہ ان آیات کی نفی نہیں کرتا جن میں تقدیر الٰہی، حساب کتاب، لوگوں کی لیاقت و اہلیت اور خلقت کی حکمت و تدبیر کا تذکرہ ہے۔

جبر و اکراہ کی نفی

یہاں مختصر طور پر اس نکتے کی یاد دہانی ضروری ہے کہ قانون آفرینش، حکم عقل اور دعوت انبیاء کی نظر سے ہر شخص سعادت و خوش بختی، عزت و ذلت اور رزق کے حصول کے لیے کوشش کرنے میں آزاد اور مختار ہے، تو پھر مندرجہ بالا آیت میں ان چیزوں کی نسبت خدا تعالیٰ کی طرف کیونکر دی گئی ہے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ عالم آفرینش اور افراد بشر کے پاس جو عنایات، عطیات، توانائیاں اور صلاحتیں ہیں سب کا اصلی سرچشمہ خدا ہے۔ اسی نے عزت اور خوش بختی کے تمام ذرائع لوگوں کے اختیار میں دیے ہیں۔ اسی نے اس دنیا کے لیے ایسے قوانین وضع کیے ہیں کہ جنہیں ٹھکرا دینے کا نتیجہ ذلت ہے اس لیے ان تمام کی نسبت اس کی طرف دی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ نسبت انسان کے ارادے کی آزادی کی نفی نہیں کرتی کیونکہ یہ انسان ہی ہے جو اللہ کی ان عنایات اور عطیات سے اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کے ذریعے صحیح یا غلط فائدہ اٹھاتا ہے۔

۲۸۔ لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكٰفِرِينَ أَوْلِيَآءَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِي شَيْءٍ إِلَّآ أَن تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقٰىةً ۗ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهُ ۗ وَإِلَى اللّٰهِ الْمَصِيرُ ○

ترجمہ

۲۸۔ اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست اور سرپرست نہ بناؤ اور جو شخص ایسا کرے گا اس کا کسی چیز میں اللہ سے کوئی ربط نہیں ہے (یعنی اس کا رابطہ پروردگار سے بالکل ٹوٹ چکا ہے)، مگر یہ کہ ان سے (اور اہم تر مقاصد کے لیے) تقیہ کرو اور خدا تمہیں (اپنی نافرمانی سے) ڈراتا ہے اور (تمہاری) بازگشت خدا کی طرف ہے۔



تفسیر

غیروں سے رشتہ

"اولیاء" "ولی" کی جمع ہے۔ یہاں اس کا معنی ہے حامی، مددگار، ہم پیمان، یار اور یاور۔
یہ آیت فی الواقع مسلمانوں کو ایک اہم سیاسی، اجتماعی اور معاشرتی درس دیتی ہے کہ وہ غیروں سے دوست حامی، مددگار یا کسی اور حوالے سے کوئی ربط نہ رکھیں اور ان کی چکنی چپڑی باتوں، دلکش تقریروں، بظاہر گہری اور مخلصانہ محبت سے دھوکا نہ کھائیں کیونکہ تاریخ گواہ ہے کہ اہل ایمان اور با مقصد زندگی گزارنے والوں نے اس طرح سے بہت دکھ اُٹھائے ہیں۔

استعمار اور سامراج کی تاریخ کو غور سے دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ اس نے ہمیشہ مظلوموں کی نظر میں دوستی، غم گساری اور انسان دوستی کے لباس میں اثر و نفوذ پیدا کیا ہے۔ یہاں تک کہ لفظ "استعمار" جس کا معنی ہے "آبادی کی کوشش کرنا" اسی مفہوم کی نشاندہی کرتا ہے کہ استعمار گر ہمیشہ استعمار شدہ معاشرے کی جڑوں میں اپنے پنجے مضبوط کرنے کے بعد وہاں کے عوام پر بے دردی سے ٹوٹ پڑتے ہیں اور ان کا سب کچھ لوٹ لے جاتے ہیں۔

اس موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر آیت میں شدید تہدید اور دھمکی آئی ہے اور وہ یہ کہ جو شخص اپنے تئیں غیروں کے سپرد کر دے گا وہ خدا سے ہر قسم کا ربط منقطع کرے گا۔

"من دون المؤمنین" اس طرف اشارہ ہے کہ معاشرتی اور اجتماعی زندگی میں ہر شخص مجبور ہے کہ اس کے کچھ دوست احباب ہوں لیکن اہل ایمان کو چاہیے کہ وہ دوستی اور سرپرستی کے لیے ایمان والوں کا ہی انتخاب کریں اور ان کی جگہ کافروں سے رشتے استوار نہ کریں۔

"فلیس من اللہ فی شیء"۔
اس جملے کا مفہوم یہ ہے کہ جو افراد دشمنانِ خدا سے دوستی اور ہم کاری کرتے ہیں وہ کسی چیز میں خدا سے مربوط نہیں ہیں یعنی وہ فرمانِ الٰہی، خدا پرستوں اور فرمانِ خدا کے پیروکاروں سے بیگانے ہیں اور ان سے ہر لحاظ سے ان کا رشتہ ٹوٹ چکا ہے۔

"الا ان تتقوا منھم تقٰۃ"۔
اس جملے کے ذریعے مندرجہ بالا حکم میں استثناء کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ تقیہ کے موقع پر حرج نہیں کہ مسلمان اپنی جان کی حفاظت کے لیے یا ایسے اور امور میں بے ایمان افراد سے دوستی کا اظہار کریں اور آخر میں دو مزید جملوں سے مندرجہ بالا حکم کی تاکید کی گئی ہے:

"ویحذرکم اللہ نفسہ"۔



یعنی — خدا تمہیں اپنی سزا اور غضب سے ڈراتا ہے
" والی اللہ المصیر"
یعنی — تم سب کی بازگشت خدا کی طرف ہے اور اگر تم نے دشمنوں سے دوستی کر لی تو اپنے اعمال کا نتیجہ بہت جلد دیکھ لو گے۔

"تقیہ" ایک حفاظتی ڈھال ہے

یہ صحیح ہے کہ کبھی انسان اعلیٰ ترین مقاصد مثلاً حفظِ شرافت، تقویت حق اور باطل کی کمر توڑنے کے لیے اپنی جان عزیز تک فدا کرنے کو تیار ہوتا ہے لیکن کیا کوئی عقلمند بغیر کسی اہم مقصد کے اپنی جان خطرے میں ڈالنے کو جائز کہہ سکتا ہے، اسلام نے صراحت سے اجازت دی ہے کہ جب انسان کی جان، مال اور عزت و آبرو خطرے میں ہو اور اظہار حق سے کوئی اہم نتیجہ اور فائدہ بھی حاصل نہ ہوتا ہو تو وقتی طور پر اظہار حق نہ کیا جائے اور اپنے فرائض مخفی طور ادا کر لیے جائیں جیسا کہ مندرجہ بالا آیت میں قرآن نے یاد دلایا ہے ایک اور تعبیر کے ذریعے سورہ نحل آیہ ۱۰۶ میں ہے:

" اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ "
مگر جو شخص مجبور ہو جائے (اور اپنے ایمان کے خلاف کسی چیز کا اظہار کر دے) جب کہ اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو۔

تاریخ اور حدیث کی اسلامی کتابوں نے عمار، ان کے والد اور والدہ کی سرگذشت کو فراموش نہیں کیا کہ وہ بت پرستوں کے چنگل میں پھنس گئے تھے انہوں نے انہیں سخت اذیت میں مبتلا کر دیا اور کہتے تھے کہ اسلام سے بیزاری کا اظہار کریں۔ عمار کے ماں باپ نہ مانے اور مشرکین کے ہاتھوں قتل ہو گئے لیکن عمار نے ان کے کہنے کے مطابق اظہار کر دیا بعد میں خدا کے بزرگوار کے خوف سے روتے ہوئے پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے ان سے فرمایا:

" ان عادوا لك فعدلهم "
اگر پھر پکڑے جاؤ تو وہ جو کہیں کہہ دینا
یوں آپؐ نے عمار کے اضطراب اور گریہ کو سکون بخشا۔

جس نکتے کی طرف پوری توجہ کی ضرورت ہے یہ ہے کہ تمام مقامات پر " تقیہ " کا حکم ایک جیسا نہیں بلکہ وہ کبھی واجب ہے، کبھی حرام ہے اور کبھی مباح ہے۔

" تقیہ " اس حالت میں واجب ہوتا ہے جب بغیر کسی اہم فائدے کے انسان کی جان خطرے سے دوچار ہو لیکن جہاں " تقیہ " باطل کی ترویج، لوگوں کی گمراہی اور ظلم و ستم کی تقویت کا باعث ہو وہاں حرام اور ممنوع ہے۔
اسی بنیاد پر اس سلسلے میں کیے گئے تمام اعتراضات کا جواب دیا جائے گا۔

حقیقت میں اعتراض کرنے والے تحقیق کرتے تو انہیں پتہ چلتا کہ یہ شیعوں کا ہی عقیدہ نہیں بلکہ مسئلہ " تقیہ " اپنی



جگہ پر ایک قطعی حکم عقل ہے اور انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔[1]

دُنیا کے تمام عقلمند جب کبھی اپنے آپ کو کسی دوراہے پر پاتے ہیں جہاں یا تو انہیں اپنے عقیدے کو چھپانا پڑتا ہے یا عقیدے کا اظہار کر کے اپنی جان، مال اور عزت کو خطرے سے دوچار کرنا پڑتا ہے تو اگر عقیدے کا اظہار کرنا جان و مال اور عزت و آبرو کی قربانی کی قیمت رکھتا ہو تو وہ فداکاری کی راہ کو درست سمجھتے ہیں لیکن اگر اس کا واضح فائدہ نظر نہ آئے تو پھر عقیدے کو چھپانا بہتر سمجھتے ہیں۔

"تقیہ" مقابلے کی دوسری صورت

مذہبی، اجتماعی اور سیاسی مقابلوں کی تاریخ میں ایسے واقعات درپیش آتے ہیں کہ جب ایک حقیقت کا دفاع کرنیوالے کھلم کھلا مقابلہ کریں تو وہ خود، ان کا نظریہ، مکتب اور مذہب نابودی کا شکار ہو جائے یا کم از کم خطرے میں پڑ جائے۔

اس کی مثال بنی امیہ کی غاصب حکومت کے زمانے میں شیعیان علیؑ کی حالت ہے۔ ایسے موقع پر صحیح اور عاقلانہ راہ یہ ہے کہ اپنی توانائیاں ضائع نہ کی جائیں اور اپنے مقدس مقاصد و اہداف کے لیے غیر واضح اور مخفی طور پر مقابلہ جاری رکھا جائے "تقیہ" درحقیقت ایسے مکاتب فکر اور ان کے پیروکاروں کے لیے ایسے لمحات میں مقابلے کی ایک تبدیل شدہ شکل کا نام ہے۔ یہ طریقہ انہیں تباہی سے بچا سکتا ہے اور اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کا موقع دیتا ہے۔

جو لوگ بے سوچے سمجھے "تقیہ" پر قلم بطلان پھیر دیتے ہیں نجانے ایسے مواقع کے لیے ان کے پاس کیا طریق کار ہے۔ کیا نابود اور ختم ہو جانا اچھا ہے یا مقابلے کو صحیح اور منطقی صورت میں باقی رکھنا۔ دوسری راہ کو "تقیہ" کہتے ہیں اور پہلی صورت کو کوئی شخص بھی تجویز نہیں کر سکتا۔

۲۹۔ قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِیْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ یَعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝

ترجمہ

۲۹۔ کہیے کہ جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے اسے چھپائے رکھو یا آشکار کردو، خدا (بہرحال) اُسے جانتا ہے اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمینوں میں ہے۔ وہ اس سے آگاہ ہے اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

---

[1] اقتباس از کتاب آئین ما صفحہ ۳۶۹



تفسیر

گذشتہ آیت میں کفار سے تعاون و دوستی کرنے اور ان پر اعتماد و بھروسہ کرنے سے سختی سے منع کیا گیا ہے۔ ہاں البتہ " تقیہ " کے مقام کے لیے اس حکم میں استثناء رکھا گیا ہے۔

ممکن ہے کچھ لوگ بعض مواقع پر تقیہ کا نام لے کر غلط طور پر کفار سے دوستی کر لیں یا انہیں اپنا سرپرست بنا لیں دوسرے لفظوں میں تقیہ کے مفہوم سے غلط فائدہ اٹھائیں اور اس کا نام لے کر دشمنانِ اسلام سے تعلقات استوار کر لیں اس لیے محل بحث آیت میں ایسے افراد کو تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے لامتناہی علم کو فراموش نہ کریں کیونکہ خدا تعالیٰ تو سینوں میں چھپے ہوئے اسرار سے ظاہری امور کی طرح واقف ہے۔

درحقیقت یہ آیت لوگوں کو اس طرف متوجہ کرتے ہوئے کہ خدا تعالیٰ دلوں کے رازوں کو جانتا ہے، یہ اشارہ کرتی ہے کہ وہ نہ صرف اسرار سے آگاہ ہے بلکہ یہ تو اُس کے علم بے پایاں کا ایک مختصر سا گوشہ ہے اس کا علم تو زمین اور آسمانوں کی وسعتوں پر محیط ہے اور اس کے علاوہ وہ توانا بھی ہے اور گناہگاروں کو سزا دینے کی قدرت رکھتا ہے " واللہ علیٰ کلّ شیءٍ قدیر "۔

۳۰۔ يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۖ وَّمَا عَمِلَتْ مِن سُوٓءٍ ۚ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًا بَعِيدًا ۗ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۗ وَاللّٰهُ رَءُوفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝

ترجمہ

۳۰۔ وہ دن کہ جب ہر شخص اپنے انجام دیے ہوئے نیک کام کو موجود پائے گا اور خواہش کرے گا کہ (کاش) اُس کے اور اُس کے بُرے کاموں کے درمیان زیادہ زمانی فاصلہ ہوتا اور خدا تمہیں (اپنی نافرمانی سے) ڈراتا ہے اور (اس کے باوجود) اللہ تمام بندوں پر مہربان ہے۔



تفسیر

یہ آیت روزِ قیامت نیک و بد اعمال کے حاضر ہونے کی طرف اشارہ ہے ۔ آیت کہتی ہے : تمام لوگ بلا استثناء جو بھی نیک و بد انجام دے چکے اُس دن موجود پائیں گے بس فرق یہ ہوگا کہ نیک اعمال کو دیکھ کر خوش ہوں گے اور بُرے اعمال دیکھ کر وحشت و پریشانی میں مبتلا ہو جائیں گے اور چاہیں گے کہ یہ ان سے دُور رہیں ۔

لغت میں " امد " کا معنی ہے " محدود زمانہ " " ابد " اور " امد " میں فرق یہ ہے کہ " ابد " غیر محدود زمانے کو کہتے ہیں اور " امد " محدود زمانے کو اور اکثر اوقات " امد " انتہائے زمانہ کے مفہوم میں آتا ہے اگرچہ بعض اوقات مطلقاً " محدود زمانہ " کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے ۔

اس بناء پر مندرجہ بالا آیت میں یہ معنی پیدا ہوتا ہے کہ گنہ گار آرزو کریں گے کہ ان کے اور ان کے بُرے اعمال کے درمیان زیادہ زمانے کا فاصلہ ہو اور یہ اپنے کردار سے ان کی انتہائی بیزاری کا اظہار ہے کیونکہ تنفر اور بیزاری کے اظہار کے لیے مکانی فاصلے کی نسبت زمانی فاصلہ زیادہ موزوں ہے کیونکہ مکانی فاصلے میں حاضر ہو جانے کا احتمال زیادہ ہو سکتا ہے جبکہ زمانی فاصلے میں اس کا احتمال بالکل نہیں ہے مثلاً عالمی جنگوں کے دوران میں جو شخص میدان جنگ سے دور زندگی بسر کرتا تھا وہ بھی تھوڑا بہت پریشانی اور اضطراب کا شکار ہوتا تھا ۔ لیکن جو لوگ زمانی اعتبار سے ان جنگوں سے دُور ہیں انہیں ان سے پریشانی کا کوئی احساس نہیں

بعض مفسرین نے اگرچہ " امد " کو یہاں مکانی فاصلے کے مفہوم میں لیا ہے لیکن لغت میں ظاہراً یہ لفظ اس معنی کے لیے نہیں آیا ۔

جیسے گنہ گار آرزو کریں گے کہ کاش ان کے اور ان کے اعمال کے درمیان زیادہ زمانی فاصلہ ہوتا اس کے برعکس نیکوکار اپنے اعمال دیکھنے کے بعد سوچیں گے کہ کاش بہت جلد ان تک پہنچے ہوتے اور تھوڑے سے زمانے کا فاصلہ بھی نہ ہوتا ۔

" ویحذرکم اللہ نفسہ ط واللہ رءوف بالعباد "

پہلے تو خدا تعالیٰ لوگوں کو اپنے حکم کی نافرمانی سے ڈراتا ہے اور پھر بندوں پر اپنی مہربانی کا ذکر کرتا ہے یوں لگتا ہے کہ آیت کے یہ دونوں حصّے سنت قرآنی کے مطابق خوف اور امید کا ایک امتزاج ہیں لیکن یہ بھی احتمال ہے کہ دوسرا حصّہ " واللہ رءوف بالعباد " پہلے حصّے " ویحذرکم اللہ نفسہ " کے لیے تاکید ہو ۔ بالکل اس طرح جیسے کوئی شخص دوسرے سے کہیے کہ میں تجھے اس کام کے خطرناک انجام سے ڈراتا ہوں اور چونکہ میں تجھ پر مہربان ہوں لہٰذا تجھے خطرے سے باخبر کر رہا ہوں ۔ اگر مجھے تجھ سے محبت نہ ہوتی تو تجھے اس خطرے سے آگاہ نہ کرتا ۔

تجسم اور حضور اعمال قرآن کی نظر میں

محل بحث آیت میں قرآن وضاحت سے قیامت کے دن اعمال کے مجسم ہوتے اور حاضر ہونے کے امر کو پیش کرتا ہے ۔ " تجد " وجدان (پانا) ، ضد ہے " فقدان " (نابود ہونا) کی ۔ " خیر " اور " سوء " دونوں الفاظ یہاں نکرہ



کی صورت میں ہیں جو عمومی مفہوم دیتے ہیں یعنی روز قیامت انسان اپنے اچھے برے اعمال چاہے کم مقدار میں ہی کیوں نہ ہوں اپنے سامنے حاضر پائے گا

بعض چاہتے ہیں کہ اس آیت کی اور اس جیسی دیگر آیات کی یہ توجیہ کریں کہ اعمال کے حضور سے مراد یہ ہے کہ اُن کی جزا یا سزا حاضر ہوگی یا اس سے مراد اعمال نامہ ہے کہ جس میں تمام اعمال ثبت ہوں گے لیکن واضح ہے کہ یہ توجیہات آیت کے ظاہری مفہوم سے میل نہیں کھاتیں کیونکہ آیت وضاحت سے بتاتی ہے کہ قیامت کے دن انسان خود عمل کو موجود پائے گا اور آیت میں ہے کہ گنہ گار آرزو کرے گا کہ کاش اس کے اور اُس کے انجام دیے ہوئے بُرے عمل کے درمیان جدائی پیدا ہو جائے، یہاں بھی خود عمل زیر بحث ہے نہ کہ نامہ اعمال اور نہ ہی عمل کی جزا وسزا۔

اس ضمن میں دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ گنہ گار پسند کرے گا کہ اس کے اور اس کے عمل کے درمیان زیادہ فاصلہ ہو جائے اور اپنے عمل کی نابودی کی آرزو ہرگز نہیں کرے گا۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ اعمال کی نابودی اور خاتمے کا امکان نہیں ہے۔ اسی بناء پر وہ اس کی تمنا نہیں کرے گا۔ بہت سی دوسری آیات بھی اس مفہوم کی تائید کرتی ہیں۔ مثلاً سورہ کہف کی آیت ۴۹ میں ہے۔

"وَ وَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا وَ لَا
يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا"

"قیامت کے دن گنہ گار اپنے تمام اعمال کو اپنے سامنے
موجود پائیں گے اور خدا کسی پر ظلم نہیں کرتا۔"

سورہ زلزال کی آیہ ۷ اور ۸ یوں ہے:

"فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ
وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ"

"جو شخص نیک یا بُرا عمل انجام دے گا، کتنا ہی کم
ہو اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھے گا"

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ بعض مفسرین کبھی کبھار ان آیات میں لفظ "جزا" کو "مقدر" مانتے ہیں حالانکہ یہ آیات کے ظاہری مفہوم کے خلاف ہے۔

بعض آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دُنیا دوسری دُنیا کی کھیتی ہے اور انسان کا عمل اس دانے کی طرح ہے جسے کسان زمین میں ڈالتا ہے پھر اُسی دانے میں رشد اور نشوونما پیدا ہوتی ہے اور اسی دانے کو بہت سے اضافے کے ساتھ اُٹھاتا ہے۔ انسان کے اعمال میں بھی بہت سی تبدیلیاں اور تغیرات رونما ہوں گے اور پھر وہ خود اس کی طرف پلٹ آئیں گے اور یہ عمل قیامت کا لازمہ ہے۔ جیسا کہ خداوند عالم سورہ شوریٰ آیہ ۲۰ میں فرماتا ہے:

"من كان يريد حرث الاخرة نزد له في حرثه".



"جو آخرت کی کھیتی چاہتا ہے اُس کی کھیتی میں ہم اضافہ کریں گے۔"

بعض دیگر آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس جہان کے نیک عمل دوسرے جہان میں نور اور روشنی کی صورت میں ظاہر ہوں گے۔ منافقین اِس نور کے لیے مومنین سے تقاضا کریں گے اور کہیں گے:

"انظرونا نقتبس من نورکم"

ٹھہرو! تاکہ ہم تمہارے نور سے کچھ فائدہ اٹھالیں

جواب میں اِن سے کہا جائے گا:

"ارجعوا وراءکم فالتمسوا نورًا"

لوٹ جاؤ اور دنیا میں جاکر یہ نور حاصل کرو (حدید-۱۳)

یہ اور اس جیسی بہت سی آیات بتاتی ہیں کہ قیامت کے دن ہم اپنے اسی عمل کو کامل تر صورت میں پائیں گے۔ اسی کا نام تجسم اعمال ہے جس کے علماء اسلام قائل ہیں۔ اسلام کے عظیم پیشواؤں سے اس ضمن میں بہت سی روایات منقول ہیں جو اسی مفہوم پر دلالت کرتی ہیں۔ یہاں ہم صرف ایک کو نمونے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

ایک شخص نے پیغمبرِ اسلامؐ سے نصیحت کی فرمائش کی تو آپؐ نے فرمایا:

"لا بد لك یا قیس من قرین یدفن معك وهو حی وانت میت فان کان کریمًا اکرمك وان کان لئیمًا اسلمك ثم لا یحشر الا معك ولا تحشر الا معه ولا تسئل الا عنه فلا تجعله الا صالحًا فانه ان صلح انست به و ان فسد لا تستوحش الا منه وهو فعلك"

"اِس سے مفر نہیں کہ تیرا ایک ہم نشین ہے جو موت کے بعد تیرے ساتھ ہی دفن ہوگا لیکن وہ زندہ ہوگا اور تو مردہ۔ اگر وہ نیک اور محترم ہوا تو تیرا احترام اور عزت کرے گا اور اگر وہ پست اور کمینہ ہوا تو تجھے حوادث کے سپرد کردے گا۔ وہ تیرے علاوہ کسی اور کے ساتھ محشور نہیں ہوگا اور تو بھی میدانِ قیامت میں اس کے علاوہ کسی اور کے ساتھ نہیں آئے گا۔ تجھ سے اُس کے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا۔ لہٰذا کوشش کرو کہ اسے بہتر شکل میں انجام دو کیونکہ وہ درست ہوا تو تو اُس سے مانوس رہے گا ورنہ اس کے علاوہ کسی اور سے تجھے وحشت نہ ہوگی اور وہ تیرا عمل ہے"[1]

اِس بحث کی وضاحت کے لیے ضروری ہے کہ اعمال کی جزا و سزا کی کیفیت کے بارے میں تحقیق کی جائے۔

---

[1] بحار، چھاپ کمپانی، جلد ۳ ص ۱۵۵



جزا و سزا کے بارے میں علماء کے نظریات

اعمال کی جزا اور سزا کے بارے میں علماء کے مختلف عقائد و نظریات ہیں، جو یہاں بیان کئے جاتے ہیں:

(۱) بعض کا عقیدہ ہے کہ اعمال کی جزا اِس دُنیا کی جزا و سزا کی طرح طے شدہ امور کی مانند ہے۔ یعنی جیسے اِس دُنیا میں ہر بُرے کام کے لیے قانون بنانے والوں کی طرف سے ایک سزا معین ہے اسی طرح خدائے بزرگ و برتر نے ہر عمل کے لیے ایک خاص سزا یا جزا معین کر رکھی ہے۔ یہ نظریہ اجر، مزدوری اور مقرر شدہ سزاؤں کا سا ہے۔

(۲) بعض کا اعتقاد ہے کہ تمام سزائیں اور جزائیں نفس اور روحِ انسانی کی پیداوار ہیں جنہیں انسانی روح بغیر اختیار کے اِس دُنیا میں پیدا کرتی ہے کیونکہ نیک اور بد اعمال روحِ انسانی میں اچھے اور بُرے ملکات پیدا کر دیتے ہیں اور یہ ملکات انسانی ضمیر اور ذات کا جُز بن جاتے ہیں اور ان ملکات میں سے ہر ایک اپنے حسبِ حال نعمت یا عذاب کی ایک شکل بنا لیتا ہے۔ جن لوگوں کا باطن اِس دُنیا میں اچھا ہے ان کا تعلق اچھے افکار و تصورات سے رہتا ہے اور ناپاک افراد سوتے جاگتے باطل افکار اور بُرے تصورات میں مشغول رہتے ہیں یہی ملکات قیامت کے دن نعمت و عذاب اور راحت و تکلیف کی تخلیق کریں گے دوسرے لفظوں میں جنّت کی نعمتوں اور دوزخ کی سزاؤں کے بارے میں جو کچھ بھی ہم پڑھتے ہیں وہ انسان کی اچھی بُری صفات کی مخلوق ہیں کوئی دوسری چیز نہیں۔

(۳)۔ بزرگ علماء اسلام نے ایک اور راہ انتخاب کی ہے اور اس کے لیے آیات و روایات میں سے بہت سے شواہد پیش کئے ہیں، ان کے موقف کا خلاصہ یہ ہے:

ہمارا ہر کردار، اچھا ہو یا بُرا ایک دنیاوی شکل و صورت رکھتا ہے جس کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں اور ایک اس کی اُخروی شکل و صورت ہے جو اس وقت عمل میں چھپی ہوئی ہے اور قیامت کے دن تغیر و تبدل کے بعد وہ اپنی دنیاوی شکل و صورت کھو بیٹھے گا اور ایک نئی شکل میں سامنے آئے گا جو عمل کرنے والے کے لیے راحت و سکون یا آزار و تکلیف کا باعث ہوگی۔

اِن تینوں مذکورہ نظریات میں سے آخری نظریہ بہت سی قرآنی آیات سے مطابقت اور موافقت رکھتا ہے۔ اِن کے اعمال صلاحیتوں اور توانائیوں کی مختلف شکلیں ہیں۔ قانون بقائے مادہ کی ترمیم شدہ شکل کے مطابق توانائی (ENERGY) کبھی ختم نہیں ہوتی اور ہمیشہ اِس دُنیا میں رہتی ہے اگرچہ ظاہراً ہم یہی سمجھتے ہیں کہ وہ ختم ہو چکی ہے۔

ان اعمال کی بقاء اور ابدیت کی وجہ سے قیامت میں ہر شخص حساب کتاب کے وقت اپنے تمام اعمال دیکھ سکے گا چاہے اسے تکلیف و رنج ہو یا آرام و سکون۔ انسانی ذرائع اور وسائل ابھی تک اس قابل نہیں ہو سکے کہ وہ چند ایک کے سوا گذشتہ لمحات کے بارے میں حقائق معلوم کر سکیں۔[1]

---

[1] ماضی قریب میں ہمارے سائنسدانوں نے "انفرا ریڈ" نامی ایک دوربین ایجاد کی ہے جو گزرے ہوئے چند لمحوں کی تصویر دے سکتی ہے۔ یہ نئی مشین (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)



لیکن مسلم ہے کہ اگر کوئی کامل تر آلہ وجود میں آجائے یا نگاہ اور ادراک زیادہ کامل ہوں تو ہو سکتا ہے کہ جو کچھ گذشتہ زمانے میں ہو چکا ہے ہم اسے محسوس کر سکیں اور جان سکیں۔

البتہ اس میں بھی کوئی مضائقہ اور مانع نہیں کہ بعض جزائیں اور سزائیں طے شدہ قوانین کے حوالے سے ہوں۔

تجسم اعمال آج کے علم کی روشنی میں

گذشتہ اعمال کے مجسم ہونے کے امکان کے ثبوت کے لیے ہم آج کے طبیعات کے مسلمہ اصول سے استفادہ کر سکتے ہیں جس کے مطابق مادہ توانائی میں تبدیل ہو جاتا ہے مادہ اور توانائی کے بارے میں طبیعات (Physics) کا جدید نظریہ یہ ہے کہ مادہ اور توانائی ایک حقیقت کے دو مظہر ہیں۔ مادہ متراکم اور منضبط توانائی ہے جو مخصوص حالات میں توانائی میں بدل جاتا ہے اور بعض اوقات ایک گرام مادہ میں چھپی ہوئی توانائی میں (Explosion) کی طاقت تیس ہزار ٹن ڈائنا میٹ سے زیادہ ہوتی ہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ مادہ اور توانائی ایک ہی حقیقت کے دو مختلف روپ ہیں اور ان کی بقاء کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ بعید نہیں کہ پھیلی ہوئی توانائیاں دوبارہ مل جائیں اور جسم کی صورت اختیار کر لیں۔ اصلاح اور راستی کی راہ پر صرف شدہ توانائیاں اور ظلم و جور کے راستے پر صرف شدہ توانائیاں آپس میں مل کر قیامت کے دن ایک خاص جسمانی صورت میں ڈھل سکتی ہیں۔ اس میں کوئی مانع نہیں کہ نیک اعمال جاذب نظر اور خوبصورت مادی نعمتوں کی شکل اختیار کر لیں اور بُرے اعمال سزا اور عذاب کے سانچوں میں ڈھل جائیں۔

۳۱۔ قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ○

۳۲۔ قُلْ أَطِيعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُولَ ۖ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِينَ ○

گذشتہ صفحے سے حاشیہ:۔
ہیٹ سسٹم (Heat system) کے ذریعے کام کرتی ہے۔ یہ اجسام سے نکلنے والی لہروں کو جذب کرتی ہے اور مخصوص ٹریو گرام کے ذریعے انہیں سرد اور گرم دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے پھر انہیں واضح یا تاریک تصویروں کی صورت میں پیش کرتی ہے (روزنامہ کیہان، شمارہ ۷۸۸۸، سال ۱۳۴۸ھ ش) اس ذریعے سے جرم کے وقوع اور کیفیت کو معلوم کیا جا سکتا ہے اور مجرموں کے گذشتہ کردار کی تصویر اُن کے سامنے پیش کی جاتی ہے اور ان کے جھوٹ کا پردہ چاک ہو جاتا ہے۔



ترجمہ

۳۱ ۔ کہہ دیجیے ! اگر خدا کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو تاکہ خدا بھی تمہیں اپنا دوست بنا لے اور تمہارے گناہوں کو بخش دے اور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

۳۲ ۔ کہہ دیجیے ! خدا اور (اس کے) رسول کی اطاعت کرو اور اگر روگردانی کریں تو خدا کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔

شانِ نزول

اِن آیات کے بارے میں مجمع البیان اور المنار میں دو شانِ نزول مذکور ہیں :

پہلی : یہ کہ کچھ افراد نے پیغمبر اکرمؐ کے سامنے پروردگار کی محبت کا دعویٰ کیا جب کہ وہ احکام الٰہی پر کم عمل کرتے تھے اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں۔

دوسری : یہ کہ نجران کے کچھ عیسائی مدینے میں پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی گفتگو کے دوران میں کہنے لگے ہم اگر حضرت مسیحؑ کا بہت زیادہ احترام کرتے ہیں تو اس کی وجہ ہماری خدا سے محبت ہے اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور انہیں جواب دیا گیا۔

تفسیر

حقیقی محبت

پہلی آیت کہتی ہے کہ محبت ایک قلبی تعلق ہی کا نام نہیں بلکہ انسان کے عمل میں اس کے آثار دکھائی دینے چاہئیں۔ جو شخص پروردگار سے محبت کا مدعی ہے اس کے لیے پہلی نشانی یہ ہے کہ وہ پیغمبر اور اللہ کے بھیجے ہوئے کی پیروی کرے "ان کنتم تحبون اللہ فاتّبعونی ...."

حقیقت میں محبت کا یہ فطری اثر ہے کہ وہ انسان کو محبوب اور اس کی خواہشات کی طرف کھینچ لے جاتی ہے البتہ کمزور محبتیں بھی ہو سکتی ہیں کہ جن کی شعاع دل سے باہر نہ پڑ سکے لیکن ایسی محبتیں اس قدر حقیر ہیں کہ انہیں محبت کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ ایک حقیقی محبت یقیناً عملی آثار کی حامل ہوتی ہے اور ایسی محبت مُحِب کا محبوب سے ضرور تعلق قائم کر دیتی ہے، محبوب کی آرزوؤں کی راہ میں ثمر بخش ہوتی ہے اور اس کی آرزوؤں کی تکمیل کے لیے مُحِب کو سعی و کوشش کے لیے ایستادہ کر دیتی ہے۔



اِس بات کی دلیل اور وجہ واضح ہے کیونکہ انسان کا کسی سے عشق اور لگاؤ یقیناً اِس لیے ہے کہ اسے اس میں کوئی کمال نظر آیا ہے۔ انسان کبھی کسی ایسی شے سے عشق و محبت نہیں کرتا جس میں کوئی نقطۂ کمال نہ ہو۔ اِس لیے خدا سے انسان کی محبت کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہر قسم کے کمال کا منبع اور سرچشمہ ہے۔ اس لیے مسلم ہے کہ ایسی ہستی کے تمام پروگرام اور احکام بھی کامل ہوں گے۔ ان حالات میں کیسے ممکن ہے کہ جو انسان تکامل وارتقاء کا حقیقی عاشق ہو وہ اِن پروگراموں سے منہ پھیرلے اور اگر وہ روگرداں ہو جاتا ہے تو یہ اس کے عشق و محبت کی عدم صداقت کی نشانی اور علامت ہے۔

یہ آیت نجران کے عیسائیوں اور زمانۂ رسولؐ کے مدعیان محبت کے بارے میں ہی نہیں بلکہ یہ تمام ادوار کے لیئے اسلام کی ایک منطق ہے۔ وہ لوگ جو رات دن عشقِ الہیٰ یا پیشوایان اسلام، مجاہدین راہ خدا اور صالحین سے محبت کا دم بھرتے ہیں لیکن عمل کی دُنیا میں اُن سے کچھ بھی شباہت نہیں رکھتے ان کی حیثیت جھوٹے دعویداروں سے زیادہ نہیں ہے۔ وہ لوگ جو سرتاپا گناہوں سے آلودہ ہیں اور اس کے باوجود اپنے دل کو خدا، رسولؐ، امیرالمومنینؑ اور عظیم پیشواؤں کے عشق سے لبریز سمجھتے ہیں یا یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ایمان، عشق اور محبت کا تعلق صرف دل سے ہے اور عمل سے ان چیزوں کا کوئی ربط نہیں، وہ اسلام کی منطق سے بالکل لاتعلق ہیں۔ معانی الاخبار میں حضرت امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

"ما احب اللّٰہ من عصاہ"

جو گناہ کرتا ہے وہ خدا کو دوست نہیں رکھتا

اِس کے بعد آپؑ نے یہ مشہور اشعار پڑھے:

تعصی الالٰہ و انت تظھر حبّہ
ھٰذا لعمرک فی الفعال بدیع
لو کان حبّک صادقاً لاطعتہ
ان المحب لمن یحبّ مطیع

یعنی

تو خدا کی نافرمانی کرتا ہے اور اِس کے باوجود اس کی محبت کا اظہار کرتا ہے۔
مجھے اپنی جان کی قسم یہ بڑی عجیب و غریب بات ہے۔
اگر تیری محبت سچی ہوتی تو تو اس کی اطاعت کرتا۔
کیونکہ جو کسی سے محبت کرتا ہے وہ اُس کے حکم کی پیروی کرتا ہے۔

"یحببکم اللّٰہ و یغفر لکم ذنوبکم واللّٰہ غفور رحیم۔"

قرآن پاک اِس جملے میں کہتا ہے: اگر تم نے خدا سے محبت رکھی اور اُس کے آثار تمہارے عمل اور زندگی پر مرتب ہوئے تو خدا تمہیں دوست رکھے گا اور اس دوستی کے اثرات حسبِ حال تم پر آشکار ہوں گے، وہ تمہارے گناہوں کو بخش



دے گا اور اپنی رحمت تمہارے شامل حال کردے گا۔

خدا کی طرف سے متبادل دوستی کی دلیل بھی واضح ہے کیونکہ وہ ایسی ہستی ہے جو ہر لحاظ سے کامل و اکمل ہے اور بحر بے کنار ہے، جو موجود بھی تکامل و ارتقاء کی راہ میں قدم اٹھائے گا اس کے اس پسندیدہ عمل کی وجہ سے خدا تعالیٰ بھی اس سے محبت کا رشتہ قائم کرے گا۔

اس آیت سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ محبت یک طرفہ نہیں ہو سکتی کیونکہ ہر محبت محب کو دعوت دیتی ہے کہ وہ عملاً محبوب کی حقیقی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے قدم بڑھائے اس طرح محبوب کو بھی اس سے ضرور محبت ہوگی

ممکن ہے یہاں سوال کیا جائے کہ اگر محب ہمیشہ محبوب کے فرمان کو بجا لائے تو پھر اس کے ذمے تو گناہ ہی کوئی نہ ہوگا کہ جسے بخشے جانے کی بات کی جائے لہٰذا یغفر لکم ذنوبکم کی یہاں کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو ممکن ہے یہ جملہ گذشتہ گناہوں کی بخشش کی طرف اشارہ ہو۔ دوم یہ کہ محب محبوب کی ہمیشہ نافرمانی نہیں کرتا لیکن شہوات و خواہشات کی سرکشی کی وجہ سے ممکن ہے کبھی کبھی اس سے لغزش بھی سرزد ہو جائے جو ہمیشہ فرماں بردار رہنے کی وجہ سے بخش دی جائے گی۔

دین اور محبت

پیشوایان اسلام سے متعدد روایات میں منقول ہے کہ دین محبت کے علاوہ کچھ نہیں۔ ان میں سے ایک روایت خصال اور کافی میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔

آپؑ نے فرمایا:

"هل الدين الا الحب، ثم تلا هذه الآية: "ان كنتم تحبون الله فاتبعوني"

کیا دین محبت کے علاوہ بھی کچھ ہے؟ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: "قل اطيعوا الله والرسول"

ان روایات سے مراد یہ ہے کہ روح دین اور حقیقت دین اصل میں ایمان باللہ اور عشق الٰہی ہی ہے۔ وہ ایمان اور عشق کہ جس کی شعاع تمام وجودِ انسانی کو روشن کر دیتی ہے اور اس کے تمام اعضاء جوارح اور قوت بدن اس کے زیر اثر آ جاتے ہیں اور اس کا ظاہری اور روشن اثر یہ ہے کہ انسان فرمانِ خدا کی اطاعت کرنے لگتا ہے۔

"اطيعوا الله واطيعوا الرسول"

اس آیت میں گذشتہ آیت کی بحث کو آگے بڑھایا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: چونکہ تم پروردگار کی محبت کے دعویدار ہو اس لیے فرمان خدا کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی پیروی کرو اور اگر تم نے اس سے روگردانی کی تو یہ پروردگار سے محبت نہ کرنے کی نشانی ہوگی اور خدا ایسے لوگوں کو دوست نہیں رکھتا۔ "فان تولوا فان الله



لا یحب الکٰفرین"

ضمناً "واطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول" سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا اور رسول کی اطاعت ایک دوسرے سے جدا نہیں ہے۔ رسول کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے اور خدا کی اطاعت رسول کی اطاعت ہے۔ اسی لیے گذشتہ آیت میں صرف اطاعتِ رسول کی بات کی گئی ہے یہاں خدا اور رسولؐ دونوں کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے۔

"فان تولوا فان اللہ لا یحب الکٰفرین"

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: اگر یہ لوگ روگردانی کریں اور دوستی کے تقاضوں پر عمل نہ کریں تو یہ اظہارِ محبت میں سچے نہیں ہیں اور خدا پر ایمان نہیں لائے۔ لہٰذا فطری بات ہے کہ خدا ایسے اشخاص کو دوست نہیں رکھتا۔

۳۳- اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰۤی اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِیْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ۝

۳۴- ذُرِّیَّةًۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ ؕ وَ اللّٰہُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ۝

ترجمہ

۳۳ — اللہ نے آدم، نوح، آل ابراہیم اور آل عمران کو سب جہانوں پر منتخب کر لیا۔

۳۴ — وہ ایسے فرزند (اور خاندان) تھے جو (پاکیزگی، تقویٰ اور فضیلت کے اعتبار سے) ایسے تھے کہ بعض کو بعض میں انتخاب کیا گیا اور خدا سننے والا اور جاننے والا ہے (اور اپنی رسالت کی راہ میں ان کی کاوشوں سے بھی آگاہ ہے)۔

تفسیر

اس آیت سے حضرت مریم اور ان کے آباؤ اجداد کی داستان شروع ہوتی ہے۔

"اِصطفٰی" لغت کے لحاظ سے "صفو" (بروزن "عفو") سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہے "خالص چیز"۔ اہل عرب صاف و شفاف پتھر کو بھی "صفا" خالص اور پاکیزہ ہونے کی وجہ سے کہتے ہیں۔ اس بناء پر "اصطفاء" کا معنی ہے "خالص چیز کے ایک حصّے کو منتخب کرنا"۔

قرآن حکیم مندرجہ بالا آیت میں کہتا ہے: خدا نے آدم، نوح، خاندانِ ابراہیم اور آل عمران کو تمام جہانوں پر منتخب



کرلیا ہے۔ یہ چناؤ ممکن ہے تکوینی طور پر بھی ہو اور تشریعی اعتبار سے بھی۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کی خلقت کو شروع ہی سے ممتاز قرار دیا ہے اگرچہ اس امتیاز کے باوجود وہ راہِ حق کے انتخاب میں مجبور نہ تھے بلکہ اپنے ارادے اور اختیار سے یہ راستہ طے کر رہے تھے لیکن اُن کی اِس مخصوص خلقت و آفرینش نے ان میں نوعِ بشر کی ہدایت کی صلاحیت پیدا کردی تھی اور اور پھر فرمانِ خدا کی اطاعت، تقویٰ و پرہیزگاری اور انسانوں کی راہنمائی کے راستے میں جد وجہد کرنے کی وجہ سے ایک طرح کا اکتسابی امتیاز بھی انہیں حاصل ہوگیا جو ان کے ذاتی امتیاز سے مل گیا اور وہ برگزیدہ انسانوں کی حیثیت سے ظاہر ہوئے

پیغمبروں کا امتیاز

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ انبیاء کو حاصل ہونے والا ذاتی امتیاز اگرچہ انہیں راہِ حق پر چلنے کے لیے مجبور نہ کرتا تھا اور یہ امر اختیار و ارادہ کے مسئلے کے بھی منافی نہیں بہرحال ایک طرح کی تبعیض تو ضرور ہے۔

اِس کا جواب یہ ہے کہ ایسی خلقت جو صحیح نظام سے ہم آہنگ ہو، اس میں ایسا فرق قابلِ قبول ہوتا ہے (غور کیجئے گا) مثلاً انسانی بدن ایک منظم خلقت ہے اور اس کے نظام کو صحیح رکھنے کے لیے اعضاء و جوارح میں فرق ہونا چاہیے ورنہ انسانی بدن کے تمام خلیے CELLS آنکھ کے اندرونی پردوں کی سی نزاکت، پنڈلی کی ہڈی کے خلیوں جیسی طاقت دماغ کے خلیوں کی سی حساسیت یا دل کے خلیوں جیسی دھڑکن رکھتے ہوتے تو یقیناً بدن کی عمارت گرجاتی۔ ضروری ہے کہ دماغ جیسے خلیے بدن میں ہوں جو جسم کے عضلات اور اعضاء کی رہبری کی ذمہ داری سنبھالیں، ہڈیوں کے محکم خلیوں کو بھی ہونا چاہیے جو بدن کی استقامت کے ضامن ہوں، حساس خلیے بھی چاہئیں جو چھوٹے چھوٹے حوادث سے آگاہ ہوں اور متحرک خلیے بھی درکار ہیں جو حرکت پیدا کریں۔

کوئی شخص نہیں کہتا کہ تمام جسم دماغ اور مغز کیوں نہیں یا مثلاً گھاس کے خلیے پھول کی پتیوں کی سی نزاکت، لطافت اور زیبائی کیوں نہیں رکھتے کیونکہ یہ کیفیت تو گھاس کی ساخت کو ہی ختم کردیتی۔

قابلِ توجہ نکتہ یہاں یہ ہے کہ ذاتی امتیاز جو ایک منظم نظام کے لیے انتہائی ضروری ہے آسان کام نہیں بلکہ اس کے ساتھ ایک بھاری ذمہ داری اور مسئولیت منسلک ہے جو اتنی ہی عظیم ہے جس قدر یہ امتیاز زیادہ ہے۔ یہ بھاری ذمہ داری خلقت کے ترازو کے دونوں پلڑوں میں اعتدال برقرار رکھتی ہے یعنی جس قدر پیغمبر اور ہادی نوعِ بشر سے امتیاز رکھتے ہیں اسی قدر ذمہ داری اور مسئولیت بھی رکھتے ہیں اور دوسروں کی ذمہ داری بھی اپنے امتیاز کے لحاظ سے کم ہے۔

علاوہ ازیں بارگاہِ الٰہی میں تقرب کے لیے انسان کے ذاتی امتیازات ہرگز کافی نہیں بلکہ انہیں اکتسابی امتیازات کے ہمراہ ہونا چاہیے۔

چند اہم نکات

(۱) آلِ ابراہیم: آیت خدا کے تمام برگزیدہ بندوں کا ذکر نہیں کر رہی بلکہ ان میں سے صرف بعض کی طرف اشارہ کر



رہی ہے۔ لہٰذا اگر بعض انبیاء جو مذکورہ خانوادوں سے نہیں، یہ آیت ان کے برگزیدہ نہ ہونے پر دلیل نہیں ہے۔

ساتھ یہ بھی توجہ رہے کہ آل ابراہیم میں موسیٰ بن عمرانؑ، پیغمبر اسلامؐ اور آپؐ کے خاندان کے برگزیدہ افراد بھی شامل ہیں کیونکہ وہ سب اولاد ابراہیم علیہ السلام میں سے ہیں۔

۲۔ لفظ آل" کا مفہوم : مفردات میں راغب نے لکھا ہے کہ " اٰل " " اھل " سے لیا گیا ہے اور فرق یہ ہے کہ " اٰل " عام طور پر بزرگ اور شریف افراد کے نزدیکی رشتہ داروں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اھل " زیادہ وسیع معنی رکھتا ہے اور سب کے لیے بولا جاتا ہے۔ اسی طرح " اٰل " کی اضافت انسانوں کے لیے ہوتی ہے لیکن " اھل " کی اضافت زمان و مکان اور دوسری ہر طرح کی چیزوں کے لیے مستعمل ہے۔ مثلاً کہتے ہیں " اہلِ شہر " لیکن آل شہر " نہیں کہتے۔

۳۔ آل عمران اور آل ابراہیم کے مفہوم کی حدود : بغیر کہے ہی واضح ہے کہ آل ابراہیم اور آل عمران کو چن لینے سے یہ مراد نہیں کہ ابراہیم اور عمران کی ساری اولاد برگزیدہ ہے کیونکہ ممکن ہے ان کی اولاد میں کفار تک موجود ہوں بلکہ اس سے مراد ان کے خاندان اور دودمان سے کچھ برگزیدہ ہستیاں ہیں۔

۴۔ عمران کون ہیں : مندرجہ آیت میں مذکور " عمران " حضرت مریم کے باپ ہیں حضرت موسیٰؑ کے والد نہیں کیونکہ قرآن حکیم میں جہاں کہیں بھی عمران کا نام آیا ہے وہاں حضرت مریمؑ کے والد ماجد ہی مراد ہیں۔ بعد کی آیات جو حضرت مریم کے حالات کے بارے میں ہیں وہ بھی اس بات کی شاہد ہیں۔

۵۔ عصمت انبیاءؑ و آئمہؑ پر دلیل : اہل بیت علیہم السلام کے حوالے سے پہنچنے والی متعدد روایات میں اس آیت سے انبیاء اور آئمہ کی عصمت پر استدلال کیا گیا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ کبھی بھی گناہ، شرک، کفر اور فسق سے آلودہ افراد کو منتخب نہیں کرتا بلکہ ایسے لوگوں کو منتخب کرتا ہے جو آلودگیوں سے کنارہ کش اور معصوم ہوں۔ البتہ آیت سے عصمت کے متعدد مراحل بھی معلوم ہوتے ہیں۔

۶۔ تکامل انواع پر استدلال : ماضی قریب کے بعض مؤلفین نے اس آیت سے تکامل انواع پر استدلال کیا ہے۔ ان کا نظریہ ہے کہ حضرت " آدمؑ " اوّل البشر نہ تھے بلکہ ان کے زمانے میں بہت سے انسان موجود تھے جن میں سے خدا تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو منتخب فرمایا اور ان کی اولاد میں سے ممتاز نسل کو وجود بخشا۔ اس نظریے کے حامل " علی العٰلمین " کو دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت آدمؑ کے دور میں " عالمین " یعنی " انسانی معاشرہ " موجود تھا اس لیے اس بناء پر یہ ماننے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ پہلا انسان لاکھوں سال قبل پیدا ہوا، وہ بھی باقی حیوانات کی طرح ارتقاء اور تکامل کی منزلیں طے کرتا رہا اس لیے حضرت آدمؑ تو ایک برگزیدہ انسان تھے۔

اس گفتگو کے مقابلے میں کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں کہ جس کی وجہ سے ہم یہ سمجھیں کہ " عالمین " سے یہاں مراد حضرت آدمؑ کے ہم عصر انسان تھے بلکہ ممکن ہے عالمین سے مراد یہاں تمام انسانی ادوار کے انسان ہوں۔ اس بناء پر آیت کا معنی یہ ہوگا : خدا نے تمام انسانی معاشروں میں انسانوں کی طویل تاریخ میں سے جنہیں منتخب فرمایا اُن میں پہلے



آدمؑ ، پھر نوحؑ ، پھر "آل ابرٰهیم" اور "آل عمرٰن" ہیں ۔ چونکہ یہ سب منتخب افراد مختلف زمانوں میں تھے اِس سے ہم سمجھے کہ عالمین سے مراد تمام زمانوں اور ادوار کا انسانی معاشرہ ہے ۔ اس لیے ضروری نہیں کہ ہم یہ اعتقاد رکھیں کہ حضرت آدمؑ کے زمانے میں بہت سے انسان موجود تھے ۔ جن میں سے حضرت آدمؑ چنے گئے تھے (غور کیجئے گا)

"ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِن بَعْضٍ"

"ذریت" کا معنی ہے "چھوٹی اولاد" ۔ لیکن کبھی کبھی بلا واسطہ یا بالواسطہ کی تمام اولاد کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے[1] اِس آیت میں قرآن اِس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہ منتخب افراد اسلام ۔ پاکیزگی ۔ تقویٰ اور نوع بشر کی راہنمائی کے لیے کوشش کے لحاظ سے ایک جیسے تھے اور ایک ہی کتاب کے مختلف نسخوں کی مانند تھے جیسے ان میں سے ایک دوسرے کا اقتباس لیا گیا ہو " بعضها من بعض "۔

"وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ"

آیت کے آخر میں اِس حقیقت کی نشاندہی کی گئی ہے کہ خدا تعالیٰ اُن کی کوشش اور فعالیت کو دیکھتا ہے ، ان کی باتیں سنتا ہے اور ان کے اعمال سے آگاہ ہے ۔ اس جملے میں چنے ہوئے افراد کی خدا تعالیٰ اور مخلوق خدا کے بارے میں شدید ذمہ داریوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ۔

ضمنی طور پر آیت میں حضرت آدمؑ کے علاوہ تمام اولوالعزم پیغمبروں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کیونکہ حضرت نوحؑ کا ذکر تو صراحت سے موجود ہے اور آل ابراہیم میں خود ابراہیمؑ ، موسیٰؑ ، عیسیٰؑ اور پیغمبر اسلامؐ بھی شامل ہیں ۔ نیز آل عمران میں حضرت مریمؑ اور حضرت مسیحؑ کی طرف مکرر اشارہ ہے ۔ اِس تکرار کی وجہ یہ ہے کہ زیر نظر آیت ان کے حالات کی تفصیل کے لیے مقدمے کی حیثیت رکھتی ہے ۔

۳۵ ۔ اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّىْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِىْ بَطْنِىْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّىْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○

۳۶ ۔ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّىْ وَضَعْتُهَاۤ اُنْثٰىؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْؕ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰىۚ وَاِنِّىْ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَاِنِّىْۤ اُعِيْذُهَا

---

[1] "ذریة" کا مادہ "ذرء" (بروزن "ذرع") ہے اور اس کا معنی ہے آفرینش اور خلق کرنا ۔



بِكَ وَ ذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○

ترجمہ

٣٥۔ (وہ وقت یاد کرو) جب عمران کی بیوی نے عرض کیا: خداوندا! جو کچھ میرے رحم میں ہے میں اسے تیری نذر کرتی ہوں تاکہ وہ (تیرے گھر کی خدمت کے لیے) محرّر (اور آزاد) ہو اور تو یہ مجھ سے قبول فرمالے کہ تو سننے اور جاننے والا ہے۔

٣٦۔ لیکن جب اسے جنم دیا (تو دیکھا تو وہ لڑکی تھی) عرض کیا: خداوندا! میں نے لڑکی کو جنم دیا لیکن خدا اِس سے آگاہ تھا کہ اُس نے کیا جنم دیا ہے (پھر اُس نے کہا) لڑکا لڑکی کی طرح نہیں ہوتا (اور لڑکی عبادت گاہ کی خدمت کی ذمہ داری لڑکے کی طرح انجام نہیں دے سکتی) اور میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے اسے اور اس کی اولاد کو شیطان مردود (کے وسوسوں) سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔

تفسیر

حضرت مریمؑ کی ولادت

گذشتہ آیت میں آل عمران کا ذکر تھا اور ان آیات میں عمرانؑ کی بیٹی مریمؑ کے بارے میں گفتگو شروع ہوئی ہے۔ ان آیات میں اِس عظیم خاتون کی ولادت، پرورش اور زندگی کے دیگر اہم واقعات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

تاریخ، اسلامی روایات اور مفسرین کے اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ حنہ اور اشیاع دو بہنیں تھیں۔ پہلی حضرت عمران کے نکاح میں آئیں۔ حضرت عمران بنی اسرائیل کی بہت اہم شخصیت تھے۔ دوسری کو اللہ کے ایک نبی زکریاؑ نے اپنی زوجیت کے لیے منتخب فرمالیا۔[1]

کئی سال گزر گئے۔ حنہ کے ہاں کوئی بچہ پیدا نہ ہوا۔ ایک روز وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھی تھیں۔ دیکھا کہ ایک پرندہ اپنے بچوں کو غذا دے رہا ہے۔ یہ منظر دیکھا تو اولاد کی خواہش ان کے دل میں آگ کی طرح بھڑک اُٹھی۔ انہوں نے خلوصِ دل سے بارگاہ خداوندی میں بیٹے کی درخواست کی۔ تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا یہ مخلصانہ دعا ہدفِ اجابت کو پہنچی اور وہ حاملہ ہوگئیں۔

---

[1] کچھ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عمران بھی پیغمبر تھے اور ان پر بھی وحی نازل ہوتی تھی۔ توجہ رہے کہ یہ عمران حضرت موسیٰ کے والد نہیں۔ ان دونوں میں تو قریبی اٹھارہ سو سال کا فاصلہ ہے۔



بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حنہ کے شوہر حضرت عمران کی طرف وحی کی تھی کہ انہیں ایک بابرکت لڑکا عطا کیا جائے گا، جو لاعلاج مریضوں کو شفا دے گا۔ حکمِ خدا سے مردوں کو زندہ کرے گا اور بنی اسرائیل کے لیے پیغمبری کے فرائض بھی سرانجام دے گا۔ انہوں نے یہ واقعہ اپنی بیوی حنہ سے بیان کیا۔ وہ حاملہ ہوئیں تو ان کا خیال تھا کہ یہی وہ لڑکا ہے جو اس وقت ان کے رحم میں ہے۔ وہ بے خبر تھیں کہ ان کے رحم میں تو اس لڑکے کی والدہ جناب مریمؑ ہیں۔ اسی لیے انہوں نے نذر کی تھی کہ بیٹے کو خانۂ خدا بیت المقدس کا خدمت گزار بنائیں گی۔ پیدائش ہوئی تو انہوں نے دیکھا کہ وہ لڑکی تھی۔ اب وہ پریشان ہوئیں۔ سوچنے لگیں کہ کیا کروں کیونکہ بیت المقدس کی خدمت تو لڑکے کیا کرتے ہیں۔ قبل ازیں کبھی کسی لڑکی کو بیت المقدس کی خدمت گزاری کے لیے منتخب نہیں کیا گیا تھا۔

اب ہم آیات کی تفسیر کی طرف لوٹتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس واقعے کے آخری حصے کو قرآن نے کیسے بیان کیا ہے۔

"اذ قالت امرات عمران ......"

اس آیت میں زوجۂ عمران کی نذر کا تذکرہ ہے۔ وہ حاملہ ہوئیں تو انہوں نے نذر کی کہ اپنے بچے کو بیت المقدس کا خدمت گزار بنائیں گی کیونکہ اللہ نے اُن کے شوہر عمران کو جو اطلاع دی تھی اُس سے وہ یہ سمجھے بیٹھی تھیں کہ اُن کے ہاں لڑکا ہوگا۔ اس لیے انہوں نے لفظ "محررًا" استعمال کیا۔ اور "محررۃ" نہیں کہا۔ انہوں نے خدا سے درخواست کی کہ وہ اُن کی نذر قبول کرے "فتقبل منی انک انت السمیع العلیم"۔

"محررًا" "تحریر" کے مادہ سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہے "آزاد کرنا" اُس زمانے میں یہ لفظ ایسی اولاد کے لیے بولا جاتا تھا جو عبادت خانے کی خدمت کے لیے معین کی جاتے تاکہ وہ عبادت خانے کی صفائی اور دوسری خدمات سرانجام دیں اور فراغت کے وقت پروردگار کی عبادت میں مشغول رہیں۔ "محرر" ان خدمت گزاروں کو اس لیے کہتے تھے کہ وہ ماں باپ کی ہر قسم کی خدمت سے آزاد ہوتے تھے اور عبادت خانے کی خدمت کو اپنے لیے باعثِ افتخار سمجھتے تھے۔

بعض کہتے ہیں جب بچے خدمت کے کچھ قابل ہو جاتے، بالغ ہونے تک ماں باپ کی نگرانی میں خدمت سرانجام دیتے تھے اور بعدازاں خود سے کام کرنے لگتے۔ چاہتے تو عبادت خانے میں اپنا کام ختم کر کے باہر چلے جاتے اور چاہتے تو کام جاری رکھتے۔

"فلما وضعتھا قالت رب انی وضعتھا انثیٰ"۔

اس آیت میں بچی کی ولادت کے بعد حضرت مریمؑ کی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے۔ انہوں نے پریشان ہو کر کہا: خداوندا! میں نے بچی کو جنم دیا ہے اور تو جانتا ہے کہ جو نذر میں نے کی ہے اُس کے لیے لڑکی لڑکے کی طرح نہیں ہو سکتی اور لڑکی لڑکے کی طرح ان فرائض کو انجام نہیں دے سکتی۔

"ولیس الذکر کالانثیٰ"۔

آیت میں موجود قرائن اور آیت کی تفسیر میں وارد ہونے والی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ "لیس الذکر کالانثیٰ" (لڑکا لڑکی کی طرح نہیں) یہ جملہ حضرت مریم کی والدہ کا ہے نہ کہ کلامِ خدا ہے لیکن قاعدۃً حضرت مریم کی والدہ کو کہنا چاہیے تھا "ولیس الانثیٰ کالذکر" "لڑکی لڑکے کی طرح نہیں ہے" کیونکہ انہوں نے تو لڑکی کو جنم دیا تھا نہ کہ لڑکے کو۔ اس لحاظ سے ممکن ہے کہ اس جملے میں تقدیم و تاخیر ہو جیسا کہ اہلِ عرب اور غیر عرب کے کلام میں ہوتا



ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وضع حمل کے وقت پیش آنے والی اچانک پریشانی کے سبب بے سمجھے یوں کہہ دیا ہو کیونکہ وہ تو لڑکے کی آس لگائے بیٹھی تھیں تاکہ وہ بیت المقدس کا خدمت گزار بنے۔ اسی رجحان کے پیش نظر ممکن ہے بے ساختہ اُنہوں نے پہلے بیٹے کا ذکر کیا ہو حالانکہ جملہ بندی اور مولود کا تقاضا تھا کہ وہ بیٹی کا نام پہلے لیتیں۔

آیت میں "واللہ اعلم بما وضعت" (خدا بہتر جانتا ہے کہ عمران کی بیوی نے کیا جنم دیا ہے) اصطلاح میں جملۂ معترضہ ہے۔ یعنی ضرورت نہ تھی کہ مریم کی والدہ کہتیں کہ خدایا! میں نے تو لڑکی کو جنم دیا ہے کیونکہ خدا تو جانتا ہی تھا کہ اُس نے کیا جنم دیا ہے وہ شروع سے انعقادِ نطفہ اور رحمِ مادر کے تمام مرحلوں سے آگاہ ہے۔

"وانی سمیتها مریم"

اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریم کا یہ نام اُن کی والدہ کے ذریعے سے وضع حمل کے وقت ہی رکھ دیا گیا تھا۔ یاد رہے کہ "مریم" ان کی لغت میں "عبادت گزار خاتون" کو کہتے تھے۔ یہ نام حضرت مریم کی پاکباز والدہ کے اس انتہائی عشق اور لگاؤ کا مظہر ہے جو انہیں اپنے بچے کو عبادتِ الٰہی کے لیے وقف کرنے کے لیے تھا لہٰذا اُنہوں نے نام رکھنے کے ساتھ ہی خدا سے درخواست کی کہ وہ اس نومولود بچی اور اس کی آئندہ اولاد کو شیطانی وسوسوں سے بچائے رکھے اور اُنہیں اپنے لطف و کرم کی پناہ میں رکھے "وانی اعیذها بك وذریتها من الشیطٰن الرجیم"۔

۳۷۔ فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۚ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ۭ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ○

ترجمہ

۳۷۔ اُس کے پروردگار نے اُس (مریم) کو خوشی سے قبول فرمالیا اور اُس کے وجود (کے پودے) کو خوب اچھی طرح پروان چڑھایا۔ زکریا کو ان کا کفیل بنایا۔ جب زکریا وہاں داخل ہوتے خاص غذا وہاں موجود پاتے۔ اُس سے پوچھتے: یہ کہاں سے لائی ہو۔ وہ کہتی: یہ خدا کی طرف سے ہے۔ خدا جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔



تفسیر

گذشتہ آیات حضرت مریمؑ کی ولادت کے بارے میں تھیں ۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ نے مریمؑ کو حسنِ قبول سے نوازا اور اُن کی پرورش اچھے پودے کی طرح کی ۔

درحقیقت جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے کہ جناب مریم کی والدہ کو یقین نہیں آتا تھا کہ کسی لڑکی کو خانۂ خدا بیت المقدس کی خدمت کے لیے قبول کر لیا جائے گا لہٰذا وہ چاہتی تھیں کہ ان کے شکم میں جو بچہ ہے وہ لڑکا ہو کیونکہ قبل ازیں کبھی کسی لڑکی کو اس مقصد کے لیے منتخب نہیں کیا گیا تھا ۔

زیرِ نظر آیت کہتی ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس پاکیزہ لڑکی کو پہلی مرتبہ اس روحانی اور معنوی خدمت کے لیے قبول کر لیا ۔

بعض مفسرین کہتے ہیں قبولیت کی نشانی یہ تھی کہ حضرت مریم بیت المقدس کی خدمت کے دوران میں ماہواری میں کبھی مبتلا نہیں ہوئیں کہ انہیں اس روحانی مرکز سے دور ہونا پڑتا ۔ ممکن ہے اس نذر کی قبولیت اور جناب مریمؑ کا قبولِ بارگاہ ہونا، اس کے بارے میں ان کی والدہ کو الہام کے ذریعے مطلع کیا گیا ہو ۔

" انبات " یعنی " اُگنا " یہ تعبیر حضرت مریم کی نشوونما اور پرورش کے بارے میں ان کے معنوی، روحانی، اور اخلاقی پہلوؤں کے تکامل و ارتقاء کی طرف اشارہ ہے ۔

ضمناً یہ جملہ ایک لطیف نکتے کی طرف اشارہ ہے اور وہ یہ کہ خدا کا کام " ابنات " یعنی اگانا ہے ۔ جیسے پھولوں اور پودوں کے بیج میں اہلیت اور استعداد مخفی ہوتی ہے اور وہ باغبان کی نگرانی میں پرورش پاتے ہیں اور خود کو آشکار کرتے ہیں ۔ اسی طرح انسانی وجود میں بھی ہر قسم کی بلند ترین انسانی صلاحیتیں رکھ دی گئی ہیں اگر انسان اپنے آپ کو تربیت کے لیے خدائی نمائندوں اور باغِ انسانیت کے باغبانوں کے سپرد کر دے تو وہ بہت جلد تربیت حاصل کر لیتا ہے اور اس کی پنہاں استعداد ظاہر ہو جاتی ہے اور یوں " ابنات " کا مفہوم حقیقت کا روپ دھار لیتا ہے ۔

" وکفلھا زکریا "

" کفالت " کا معنی ہے " کسی چیز کو دوسری میں ضم کرنا " اسی مناسبت سے ان افراد کو کافل " یا " کفیل " کہتے ہیں جو چھوٹے بچوں کی سرپرستی اپنے ذمے لے لیں کیونکہ وہ درحقیقت اپنے آپ کو اُن کے ساتھ منضم کر لیتے ہیں ۔

یہ مادہ جب ثلاثی مجرد (یعنی " کفل " بغیر شد کے) کی صورت میں استعمال ہو تو کفالت و سرپرستی کو اپنے ذمے لینے کا مفہوم دیتا ہے اور جب ثلاثی مزید کی صورت میں (" کفّل " شد کے ساتھ) استعمال ہو تو کسی کے لیے کفیل منتخب کرنے کا مفہوم دیتا ہے ۔

اس جملے میں قرآن کہتا ہے : خدا نے زکریا کو مریم کی کفالت کے لیے منتخب کیا تھا ۔ کیونکہ جیسا کہ تاریخ میں آیا ہے مریمؑ کے والد اُن کی پیدائش سے پہلے وفات پا چکے تھے ۔ اُن کی والدہ انہیں یہودی علماء کے پاس بیت المقدس میں لے آئیں اور کہا کہ یہ بچی بیت المقدس کا ہدیہ ہے، اس کی سرپرستی تم میں سے کوئی اپنے ذمے لے لے ۔ علماء بنی اسرائیل نے اس سلسلے میں آپس میں گفتگو کی ۔ ہر



کوئی چاہتا تھا کہ مریم کی سرپرستی کا افتخار اور منصب اُسے نصیب ہو۔ اس مقصد کے لیے معلوم مخصوص مراسم سے گزرا جن کی تفصیل اسی سورہ کی آیہ ۴۴ کی تفسیر میں آئے گی اور آخر کار ان کی کفالت کے لیے حضرت زکریاؑ کا انتخاب عمل میں آیا۔

"کلما دخل علیها زکریا المحراب ، وجد عندها رزقا"

"محراب" ایک مخصوص جگہ کو کہتے ہیں جو عبادت گاہ میں اس کے امام یا مخصوص افراد کے لیے معین کی جاتی ہے۔ اس لفظ سے اس جگہ کو موسوم کرنے کی دو وجوہ بیان کی جاتی ہیں:

پہلی یہ کہ "محراب" مادہ "حرب" سے ہے جس کا معنی ہے "جنگ" اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل ایمان اس مقام پر شیطان، سرکش خواہشات اور ہوس کے خلاف جنگ کے لیے کھڑے ہوتے ہیں اس لیے اسے محراب کہتے ہیں۔

دوسری یہ کہ "محراب" اصولی طور پر مجلس کی بالائی اور اوپر والی جگہ کے معنی میں ہے اور چونکہ محراب کو عبادت خانے کی اوپر والی جگہ پر بنایا جاتا ہے۔ اس لیے یہ نام رکھا گیا ہے۔

یہ بھی خیال رہے کہ بنی اسرائیل کے ہاں محراب کی کیفیت ہمارے ہاں سے مختلف تھی وہ محراب سطح زمین سے بلند بناتے تھے اور اس کے لیے سیڑھیاں بنائی جاتی تھیں اور اس کے اطراف کو کمرے کی دیواروں کی طرح بناتے تھے تاکہ اسے محفوظ کر دیا جائے اور جو لوگ محراب کے اندر ہوتے وہ باہر سے بہت کم نظر آتے تھے۔

حضرت مریم حضرت زکریاؑ کی سرپرستی میں پروان چڑھیں اور خدا کی عبادت و بندگی میں اس طرح مستغرق ہوئیں کہ ابن عباس کے بقول جب وہ نو۹ سال کی ہوئیں تو دن کو روزہ رکھتیں اور رات کو عبادت کرتیں۔ پرہیزگاری اور معرفت الٰہی میں انہوں نے اتنی ترقی کی کہ اس دور کے احبار اور پارسا علماء سے بھی سبقت لے گئیں[1]

حضرت زکریاؑ اُن کے محراب کے پاس آکر دیکھتے تو خاص غذائیں وہاں پڑی ہوتیں۔ انہیں بہت حیرانی ہوتی۔ ایک دن پوچھنے لگے: "یٰمریم انی لک هذا"

مریم! یہ غذا کہاں سے لائی ہو۔

مریم بولیں:

"قالت هو من عند الله ان الله یرزق من یشآء بغیر حساب"

یہ خدا کی طرف سے ہے اور وہ تو جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔

یہ غذا کیسی تھی؟ اور جناب مریمؑ کے لیے کہاں سے آتی تھی؟ اس بارے میں آیت میں کچھ بیان نہیں کیا گیا لیکن بہت سی شیعہ و سُنّی کتب کی روایات سے جو تفسیر عیاشی وغیرہ میں مذکورہ ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ وہ جنت کے پھلوں کی ایک قسم تھی جو بے موسم حکم پروردگار سے جناب مریمؑ کے محراب کے پاس پہنچ جاتے اور یہ بات کوئی باعث تعجب نہیں ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے کسی پرہیزگار بندے کی یوں پذیرائی کرے۔

یہاں رزق سے مراد بہشت کی ایک غذا ہے اور یہ بات آیت میں موجود قرائن سے بھی ثابت ہوتی ہے کیونکہ "رزقا" یہاں نکرہ کی صورت میں ہے اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ کوئی خاص قسم کی غذا تھی جو حضرت زکریاؑ کے لیے انجانی تھی اور

[1] "مجمع البیان" ج ۲، ص ۴۳۶



دوسری نشانی خود حضرت مریمؑ کا جواب ہے کہ یہ خدا کی طرف سے ہے اور تیسری دلیل ہے حضرت زکریاؑ کا جوش میں آنا اور پروردگار سے فرزند کی آرزو کرنا جس کے بارے میں بعد والی آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

لیکن صاحب المنار اور دیگر مفسرین کا اعتقاد ہے کہ " رزقًا " سے مراد یہی عام دُنیا کی غذائیں ہیں کیونکہ ابن جریر نے لکھا ہے:۔

> بنی اسرائیل قحط سالی میں مبتلا ہو گئے، اناج کی بڑی کمی تھی۔ حضرت زکریاؑ مریمؑ کے مصارف برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ایسے عالم میں قرعہ ڈالا گیا۔ قرعہ نجار نامی ایک شخص کے نام نکلا۔ وہ بڑے فخر سے اپنی پاکیزہ آمدنی میں سے حضرت مریمؑ کے لیے غذا مہیا کرتا تھا زکریاؑ ان کے محراب کے پاس جاتے تو ایسے شدید حالات میں ان کے پاس ایسی غذا دیکھ کر انہیں تعجب ہوتا۔ جناب مریمؑ ان سے کہتیں: خدا نے ان حالات میں ایک صاحب ایمان کے ذمے یہ کام کر دیا ہے۔

لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں یہ تفسیر قرآن پاک میں موجود قرائن سے موافقت رکھتی ہے اور نہ ہی ان روایات سے موافقت رکھتی ہے جو آیت کے بارے میں وارد ہوئی ہیں ان میں سے ایک روایت امام باقرؑ سے منقول ہے جسے تفسیر عیاشی میں درج کیا گیا ہے ہم یہاں اس کا خلاصہ درج کرتے ہیں۔

> " ایک روز پیغمبر اکرمؐ جناب فاطمہ زہراؑ کے گھر تشریف لائے۔ حالت یہ تھی کہ کئی روز سے ان کے ہاں ٹھیک سے کھانا بھی میسر نہ تھا اچانک آپؐ نے اُن کے پاس مخصوص غذا دیکھی، آپؐ نے پُوچھا:
>
> " یہ کھانا کہاں سے آیا ہے ؟ "
>
> حضرت فاطمہؑ نے عرض کیا:
>
> " خُدا کے ہاں سے، کیونکہ وہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔"
>
> اس پر پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:
>
> " یہ واقعہ حضرت زکریاؑ کے واقعے کی طرح ہے، وہ جناب مریمؑ کے محراب کے پاس آئے تھے، وہاں کھانے کی کوئی خاص چیز دیکھی تو پوچھنے لگے یہ کھانا کہاں سے آیا ہے تو انہوں نے جواب میں کہا کہ خدا کے ہاں سے آیا ہے۔"[1]

" بغیر حساب " کے مفہوم کے بارے میں سورۂ بقرہ کی آیہ ۲۰۲ اور اس سورہ کی آیہ ۲۷ کے ذیل میں ہم گفتگو کر چکے ہیں۔

۳۸۔ هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهُ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِي

---

[1] تفسیر نور الثقلین ج ۱



مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ إِنَّكَ سَمِيعُ الدُّعَاءِ ○

۳۹۔ فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ
أَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ
اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ○

۴۰۔ قَالَ رَبِّ أَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ
وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ۭ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ○

ترجمہ

۳۸۔ (جب مریم میں یہ لیاقت و اہلیت دیکھی) اُس وقت زکریا نے اپنے پروردگار سے دُعا کی اور عرض کی: خداوندا! اپنی طرف سے مجھے (بھی) پاکیزہ فرزند عطا فرما کہ تو دُعا کو سُننے والا ہے۔

۳۹۔ جب وہ محراب میں مشغول عبادت تھا تو فرشتوں نے اُسے پکار کر کہا: خدا تجھے یحییٰ کی بشارت دیتا ہے وہ خدا کے کلمہ (مسیح) کی تصدیق کرے گا، رہبر و رہنما ہوگا، ہوا و ہوس سے دُور رہوگا، پیغمبر ہوگا اور صالحین میں سے ہوگا۔

۴۰۔ اُس نے عرض کیا: پروردگار! میرے ہاں لڑکا کیسے ہوسکتا ہے، جب کہ مجھے بڑھاپے نے آلیا ہے اور میری بیوی بانجھ ہے۔ فرمایا: اسی طرح خدا جو کام چاہتا ہے انجام دیتا ہے۔

تفسیر

ہم کہہ چکے ہیں کہ حضرت زکریاؑ کی بیوی اور جناب مریمؑ کی والدہ آپس میں بہنیں تھیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ دونوں ابتداء میں بانجھ تھیں۔ جناب مریمؑ کی والدہ کو ایسی لائق بیٹی نصیب ہوئی، حضرت زکریاؑ نے حضرت مریمؑ کے خلوص اور حیران کن خصوصیات کو دیکھا تو آرزو کی اُن کی بھی مریمؑ جیسی پاکیزہ اور پرہیزگار اولاد ہو جس کا چہرہ عظمت الٰہی اور توحید کی علامت ہو۔ حضرت



زکریاؑ اور ان کی بیوی کی طویل زندگی اسی طرح گزر چکی تھی ظاہری طبیعی قوانین اور فطرت کے نقطۂ نظر سے یہ بعید نظر آتا تھا کہ اب اُن کی کوئی اولاد ہو لیکن عشقِ الٰہی اور مریمؑ کے محرابِ عبادت کے پاس بے موسم کے پھل دیکھنے کا اثر تھا کہ حضرت زکریاؑ کے دل میں بھی اُمید پیدا ہوئی اور انہوں نے بڑھاپے کے موسم میں خواہش کی کہ ان کے وجود کی شاخ پر بھی فرزند کی صورت میں میوہ پیدا ہو جائے لہٰذا جب وہ عبادت اور مناجات میں مشغول تھے اُنہوں نے خدا تعالیٰ سے فرزند کا تقاضا کیا "قال ربّ ھب لی من لّدنک ذرّیة طیّبة ۚ انّک سمیع الدّعآء" یعنی خداوندا! مجھے پاکیزہ فرزند عطا فرما کہ تو بندوں کی دعائیں سننے والا ہے۔

"فنادته الملٰٓئکة وھو قآئمٌ یّصلّی فی المحراب"

زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ زکریاؑ کی دعا قبول ہوگئی۔ وہ محرابِ عبادت میں مناجات کر رہے تھے اور مشغولِ عبادت تھے کہ خدا کے فرشتوں نے انہیں آواز دی اور بشارت دی کہ خدا تعالیٰ انہیں بہت جلد ایک بیٹا دے گا جس کا نام یحیٰی ہوگا اور جو ان صفات کا حامل ہوگا۔

۱۔ وہ حضرت مسیحؑ پر ایمان لائے گا اور اپنے ایمان سے انہیں تقویت پہنچائے گا ("مصدّقاً بکلمةٍ مّن اللّٰه")۔

یاد رہے کہ اس آیت میں اور بعض دیگر آیات میں جن کا ذکر آگے آئے گا "کلمہ" سے مراد حضرت عیسٰی علیہ السلام ہیں اور جیسا کہ تاریخ میں آیا ہے حضرت یحیٰی حضرت عیسٰیؑ سے چھ ماہ بڑے ہیں اور وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے جناب مسیح علیہ السلام کی نبوت کی تصدیق کی اور چونکہ وہ لوگوں میں پاکیزگی اور زہد و تقویٰ کے اعتبار سے بہت زیادہ شہرت رکھتے تھے لہٰذا جب حضرت مسیحؑ کی طرف اُنکی رغبت، حضرت عیسٰیؑ کی دعوت و نبوت کی طرف لوگوں کی توجہ کے لیے بہت مؤثر ثابت ہوئی۔

۲۔ علم و عمل کے لحاظ سے معاشرے کی رہبری ان کے ذمے ہوگی ("وسیّدًا") علاوہ ازیں وہ اپنے تئیں سرکش ہوا و ہوس اور دُنیا پرستی سے محفوظ رکھیں گے ("وحصورًا")۔

"حصور" مادہ "حصر" سے ہے۔ اس کا معنی ہے وہ شخص جو کسی حوالے سے اپنے آپ کو محاصرے میں رکھے۔ کبھی یہ لفظ عدم ازدواج اور شادی نہ کرنے کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ بعض مفسرین نے مندرجہ بالا آیت میں اس لفظ سے یہی دوسرا مفہوم مراد لیا ہے نیز بعض روایات میں بھی اسی مفہوم کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

۳۔ وہ خدا کے پیغمبر اور صالحین میں سے ہوں گے۔

کیا شادی نہ کرنا باعثِ فضیلت ہے

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اگر حصور کا معنی شادی نہ کرنا ہے تو کیا یہ عمل کسی انسان کے لیے امتیاز اور خصوصیت شمار ہوتا ہے کیونکہ یہاں حضرت یحیٰیؑ کا ذکر اس حوالے سے کیا گیا ہے۔



اس کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو ہمارے پاس کوئی یقینی دلیل موجود نہیں کہ آیت میں "حصور" سے مراد شادی کو ترک کرنا ہے نیز اس سلسلے میں منقول روایت سند کے لحاظ سے مسلّم نہیں ہے۔ بعید نہیں کہ لفظ "حصور" آیت میں شہوات، ہوا و ہوس اور دُنیا پرستی کو ترک کرنے کے معنی میں ہو اور زہد کی ایک صفت کے لحاظ سے ہو۔

دوسری بات یہ ہے کہ ممکن ہے حضرت یحیٰیؑ بھی حضرت عیسیٰؑ کی طرح زندگی کے خاص حالات کی وجہ سے اور دین کے لئے بار بار سفر کرنے کی وجہ سے مجرد زندگی گزارنے پر مجبور ہوں۔ اس لیے یہ سب کے لیے کلّی قانون نہیں ہو سکتا اور خدا نے ان کی یہاں اس صفت سے اس لیے تعریف کی ہے کہ انہوں نے خاص حالات کے باعث شادی نہیں کی اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو گناہ سے باز رکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے اور وہ کسی طرح بھی گناہ سے آلودہ نہیں ہوئے۔ قانون ازدواج تو کلّی طور پر ایک فطری قانون ہے اور ممکن نہیں کہ کوئی بھی دین اس فطری قانون کے خلاف کوئی حکم جاری کرے اس لیے اسلام یا کسی اور دین میں شادی نہ کرنا کوئی اچھا کام نہیں سمجھا جاتا تھا۔

یحییٰؑ اور عیسیٰؑ

"یحییٰ" "حیٰوة" کے مادہ سے ہے اور اس کا معنیٰ ہے "زندہ رہتا ہے" اور یہ اُس عظیم پیغمبر کا نام رکھا گیا تھا۔ زندگی سے یہاں مراد مادی اور معنوی دونوں طرح کی زندگی ہے جو ایمان، منصب نبوت اور خدا سے ربط کے زیر سایہ ہو۔ سورہ مریم کی آیہ ۷ سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے حضرت یحییٰؑ کی پیدائش سے قبل ہی یہ نام ان کے لیے انتخاب فرمایا تھا۔

"یا زکریّا انا نبشرک بغلام اسمه یحیٰی
لم نجعل له من قبل سمیًّا"۔

"اے زکریا! ہم تجھے ایک فرزند کی بشارت دیتے ہیں جس کا نام یحییٰ ہے اور قبل ازیں کسی کا یہ نام نہیں تھا۔"

جیسا کہ گزشتہ آیات سے معلوم ہوا ہے یحییٰ کے تولد کی خواہش حضرت زکریاؑ کے دل میں جناب مریمؑ کی روحانی پیش رفت دیکھ کر پیدا ہوئی۔ یہ بات یہاں جالب نظر ہے کہ اس دعاء کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریاؑ کو ایک ایسا بیٹا عطا فرمایا جو کئی لحاظ سے حضرت مریمؑ کے بیٹے سے مشابہت رکھتا ہے۔

مثلاً:

——— بچپن میں بعثت نبوت کے لحاظ سے،

——— نام کے مفہوم کے اعتبار سے ——— کیونکہ عیسیٰ اور یحییٰ دونوں کا معنی ہے "زندہ رہتا ہے" اور

——— اللہ تعالیٰ نے دونوں پر پیدائش، موت اور حشر و نشر تین مواقع پر درود و سلام بھیجا ہے۔



"قال رب انّی یکون لی غلام......."

ملائکہ نے یحییٰ کی پیدائش کی بشارت دی تو حضرت زکریاؑ تعجب میں پڑ گئے اور بارگاہِ خداوندی میں عرض کرنے لگے: خداوندا ایسے ممکن ہے کہ مجھ سے بچہ ہو جب کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔

جواب میں وحی آئی: "خدا اسی طرح جو کچھ چاہے انجام دے لیتا ہے"۔

اِس آیت میں حضرت زکریاؑ اپنے بڑھاپے کا ذکر کرتے ہیں کہتے ہیں: "وقد بلغنی الکبر" (بڑھاپا مجھ تک آپہنچا ہے) لیکن سورہ مریم کی آیہ ۸ میں ان کا یہ قول درج ہے۔

"وقد بلغت من الکبر عتیّاً"

میں بڑھاپے کے آخری درجے تک جا پہنچا ہوں

تعبیر کا یہ اختلاف اِس لیے ہے کہ جیسے انسان بڑھاپے کی طرف جاتا ہے گویا بڑھاپا اور موت بھی دوسری طرف سے اس کی تلاش میں آگے بڑھتی ہے جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اذا کنت فی ادبار والموت فی اقبال فما اسرع الملتقی" [1]

"چونکہ تم عمر کے آخری حصّے کی طرف جارہے ہو اور موت تمہاری طرف بڑھ رہی ہے اِس لیے کس قدر جلدی تم ایک دوسرے سے مل جاؤ گے۔

"غلام" لغت میں "جوان لڑکے" کو کہتے ہیں "عاقر" "عقر" سے ہے، اس کا معنی ہے "جڑ اور بنیاد" اس کا ایک معنی "حبس" بھی ہے۔ بانجھ عورتوں کو اس لیے "عاقر" کہتے ہیں کہ ان کا معاملہ آخر تک پہنچ چکا ہوتا ہے یا یہ کہ وہ بچہ جننے سے رُک چکی ہوتی ہیں یعنی محبوس ہو چکی ہوتی ہیں۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت زکریاؑ کا تعجب اور حیرانی کس بنا پر تھی جب کہ خدا تعالیٰ کی بے پایاں قدرت پر بھی اُن کی نظر تھی۔

قرآن کی دیگر آیات پر نظر کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ حضرت زکریاؑ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ ایک بانجھ عورت جو کئی سال سے ماہانہ عادت بھی چھوڑ چکی تھی اُس کے ہاں بچہ پیدا ہونا کیونکر ممکن ہے۔ اُس میں کیا تغیر و تبدل ہو گا کیا پھر سے جوان یا ادھیڑ عمر کی عورتوں کی طرح اُنہیں ماہواری آنے لگے گی یا وہ کسی اور طرح سے بچے کی پیدائش کے قابل ہو جائیگی۔ علاوہ ازیں قدرت خداوندی پر ایمان شہود اور مشاہدے سے الگ چیز ہے۔ حضرت زکریاؑ دراصل چاہتے تھے کہ ایمان درجۂ شہود تک پہنچ جائے۔ یہ بات حضرت ابراہیمؑ کے پرندوں کے واقعے سے ملتی جلتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معاد اور قیامت پر ایمان تو تھا لیکن وہ اِس طرح اطمینان حاصل کرنا چاہتے تھے۔ یہ فطری امر ہے کہ انسان جب طبعی قوانین کے خلاف کسی امر کا سامنا کرتا ہے تو وہ غور و فکر میں پڑ جاتا ہے اور اُسے خواہش ہوتی ہے کہ اس کے لیے کوئی حسی دلیل حاصل کرے۔

---

[1] نہج البلاغہ، کلمات قصار - ۲۸



۴۱۔ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ۭ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ۝

ترجمہ

۴۱ — (حضرت زکریاؑ نے) عرض کیا: پروردگار! میرے لیے کوئی نشانی مقرر فرما۔ (خدا نے) کہا: تیرے لیے نشانی یہ ہے کہ تو تین دن تک لوگوں سے اشارے سے گفتگو کر سکے گا (اور تیری زبان بغیر کسی ظاہری سبب کے لوگوں سے بات نہیں کر پائے گی) اور (اس عظیم نعمت پر شکرانے کے طور پر) اپنے پروردگار کو بہت یاد کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کرو۔

تفسیر

یہاں حضرت زکریاؑ یحییٰؑ کی ولادت کی بشارت پر کسی نشانی کی درخواست کرتے ہیں۔ جیساکہ ہم کہہ چکے ہیں اس عجیب و غریب واقعے پر حضرت زکریاؑ کا اظہار تعجب اور پروردگار سے کسی نشانی کا تقاضا کسی طرح سے بھی اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر بے اعتمادی کی دلیل نہیں ہے۔ خصوصاً جب کہ "کذٰلک اللہ یفعل من یشآء" (اسی طرح خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے) کہہ کر بشارت الٰہی کی تاکید بھی کی جا چکی ہے۔ حضرت زکریاؑ چاہتے تھے کہ اس امر سے ان کا ایمان، ایمان شہودی کا درجہ حاصل کرلے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کا دل اطمینان سے مالا مال ہو جائے جیسے حضرت ابراہیمؑ نے مشاہدہ حسی کے ذریعے اطمینان کے حصول کی خواہش کی تھی، وہ بھی اس مرحلے تک جا پہنچیں۔

"قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا"

"رمز" اصل میں ہونٹوں سے اشارہ کرنے کو کہتے ہیں۔ آہستہ آہستہ کی جانے والی گفتگو کو بھی "رمز" کہتے ہیں۔ تدریجاً "رمز" کے مفہوم میں وسعت پیدا ہو گئی ہے اور اب ہر ایسی بات، اشارے اور نشانی کو رمز کہا جانے لگا ہے جو غیر صریح اور مخفی طور پر ہو۔

خدا تعالیٰ نے حضرت زکریاؑ کی یہ درخواست بھی قبول فرمائی اور ان کے لیے ایک نشانی مقرر فرمائی گئی کہ ان کی زبان کسی طبیعی عامل کے بغیر تین دن کے لیے بے کار ہو گئی۔ وہ عام گفتگو نہ کر سکتے تھے لیکن خدا تعالیٰ کے ذکر اور اس کی تسبیح



کے وقت ان کی زبان بغیر کسی تکلیف کے کام کرتی تھی۔ یہ عجیب و غریب کیفیت تمام امور پر اللہ کی قدرت کے لیے ایک نشانی تھی۔ وہ خدا جو بند زبان کو اپنے ذکر کے وقت کھول دینے کی طاقت رکھتا ہے وہ یہ قدرت بھی رکھتا ہے کہ کسی بانجھ رحم سے ایک ایسا با ایمان بچہ پیدا کردے جو ذکر پروردگار کا مظہر ہو اسی سے اس نشانی کا اُس چیز سے ربط ظاہر ہوجاتا ہے جو حضرت زکریاؑ چاہتے تھے۔

یہی مضمون سورۂ مریم کی ابتدائی آیات میں بھی ہے۔

ممکن ہے اِس نشانی میں ایک اور نکتہ بھی پنہاں ہو اور وہ یہ کہ اس مسئلے میں جناب زکریاؑ کا زیادہ اصرار اور نشانی کا تقاضا اگرچہ فعل حرام اور مکروہ نہ تھا لیکن بہر حال ترکِ اولیٰ سے کچھ مشابہ ضرور تھا اسی لیے خدا تعالیٰ کی طرف سے ایسی نشانی دی گئی جو قدرت نمائی بھی تھی اور ترکِ اولیٰ پر تنبیہ اور اشارہ بھی تھا۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ کیا پیغمبر کی زبان کی بندش اُن کے مقامِ نبوت اور تبلیغی فریضے سے مناسبت رکھتی ہے؟

اِس سوال کا جواب زیادہ مشکل نہیں کیونکہ یہ بات اس وقت فریضۂ نبوت سے مناسبت نہ رکھتی جب اس کا عرصہ طویل ہوتا۔ ایسی تھوڑی سی مدت جس میں پیغمبر اپنی امت سے الگ ہو کر عبادتِ خدا میں مشغول رہے تو کچھ غیر مناسب نہیں جبکہ وہ اِس مدت میں بھی ضروری امور اشارے سے بتا سکتے تھے یا آیاتِ خدا کے ذریعے حقائق سمجھا سکتے تھے کیونکہ آیاتِ خدا تو ذکرِ پروردگار شمار ہوتی تھیں اور اتفاق کی بات ہے کہ اُنہوں نے یہ کام کیا بھی اور اشارے سے لوگوں کو ذکرِ خدا کی تبلیغ کی۔

"وَاذْكُرْ رَبَّكَ كَثِيرًا وَسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ"

لفظ "عشی" عموماً دن کے آخری لمحات کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسے "دن کی ابتدائی گھڑیوں" کو "اِبکار" کہتے ہیں۔ بعض کا نظریہ ہے کہ ابتدائے زوال سے لے کر غروبِ آفتاب تک "عشی" ہے اور طلوعِ فجر کی ابتداء سے لے کر زوال تک "اِبکار" ہے۔[1] لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں یہ دونوں لفظ زیادہ تر پہلے معانی کے لیے ہی استعمال ہوتے ہیں۔

اِس جملے میں قرآن نے بتایا ہے کہ خدا تعالیٰ نے حضرت زکریاؑ کو پروردگار کی تسبیح اور ذکر کا حکم دیا۔ جب آپ کی زبان بند ہو چکی تھی ایسے میں یہ تسبیح اور ذکر اِس بات کی بھی نشانی تھی کہ خدا تعالیٰ بند امور کو کھولنے کی قدرت رکھتا ہے نیز خدا کے عظیم عطیّے پر شکر گزاری کے حوالے سے یہ ایک ذمہ داری بھی تھی۔

سورہ مریم کی ابتدائی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زکریاؑ نے خود ہی اس پروگرام پر عمل نہیں کیا بلکہ اشارے سے لوگوں کو بھی اس کی دعوت دی کیونکہ خدا تعالیٰ کی اس بخشش و عطا کا تعلق اُن کے معاشرے سے تھا اور حضرت یحییٰ کی صورت میں اُنہیں ایک لائق قیادت نصیب ہورہی تھی۔ اس لیے اُنہیں دعوت دی گئی کہ صبح اور عصر کے وقت پروردگار کی تسبیح اور ذکر میں مشغول رہیں۔ درحقیقت یہ سب کے لیے شکر و تسبیح کے دن قرار پائے تھے۔

۴۲۔ وَإِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ

---

[1] "المصحف المفسر" از فرید وجدی، محل بحث آیت کے ذیل میں۔



وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ۝

۴۳۔ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِىْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِىْ وَارْكَعِىْ
مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۝

ترجمہ

۴۲۔ اور (وہ وقت یاد کرو) جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! خدا نے تجھے چُنا، پاک کیا اور تمام جہان کی عورتوں پر برتری اور فضیلت دی۔

۴۳۔ اے مریم! (اس نعمت کے شکرانے کے طور پر) اپنے پروردگار کے سامنے خضوع کرو، سجدہ بجا لاؤ اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں جناب عمرانؑ اور ان کی بیوی کے متعلق بحث تھی۔ اب حضرت مریمؑ کا نام بھی لیا گیا ہے اور ان آیات میں اُن کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔ پہلے اس طرف اشارہ ہوا ہے کہ فرشتوں نے مریمؑ سے باتیں کیں ("و اذ قالت الملٰئکۃ یٰمریم ......") یہ آیت نشاندہی کرتی ہے کہ ممکن ہے کہ فرشتے پیغمبروں کے علاوہ دوسرے انسانوں سے بھی گفتگو کریں نیز یہ جملہ حضرت مریمؑ کے بلند مرتبے کی بھی حکایت کرتا ہے۔

فرشتے حضرت مریمؑ کو بشارت دیتے ہیں کہ خدا نے انہیں برگزیدہ کیا اور چُن لیا ہے اور انہیں پاک قرار دیا ہے یعنی تقویٰ، پرہیزگاری، ایمان اور عبادت کے نتیجے میں وہ خدا کے برگزیدہ اور پاک لوگوں میں سے ہو گئی ہیں اور انہیں حضرت عیسیٰؑ جیسے پیغمبر کی پیدائش کے لیے چُن لیا گیا ہے۔

"واصطفٰکِ علٰی نساۗء العٰلمین":

"اصطفٰکِ" کا تکرار کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: خدا نے تجھے جہان کی عورتوں میں سے چن لیا ہے اور تجھے سب پر برتری عطا کی ہے۔

آیت کا پہلا حصہ جناب مریمؑ کی اعلیٰ انسانی صفات کی طرف اشارہ کرتا ہے اور برگزیدہ انسان کے طور پر آپ کا نام لیتا ہے اور دوسرے حصے میں "اصطفٰک" ان کے اپنے زمانے کی تمام عورتوں پر برتری کی طرف اشارہ ہے۔



نماز پڑھو ، وضو کرو اور پاک و پاکیزہ رہو ۔ یعنی ان تمام فرائض کو انجام دو کیونکہ واؤ سے جو عطف ہو وہ ترتیب پر دلالت نہیں کرتا۔
علاوہ ازیں رکوع و سجود اصل میں عجز اور خضوع کے معنی میں ہے اور عام رکوع و سجود ان الفاظ کے مصادیق میں سے ایک شمار ہوتے ہیں ۔

۴۴ - ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۪ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ○

ترجمہ

۴۴ — یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تمہیں وحی کے ذریعے بتا رہے ہیں اور جب وہ اپنی قلمیں (قرعہ اندازی کے لیے پانی میں) پھینک رہے تھے کہ مریم کی کفالت اور سرپرستی کون کرے اور اُس وقت (بھی) جب اس کی سرپرستی کا افتخار اور منصب حاصل کرنے کے لیے (علماء) آپس میں مصروف کشمکش تھے ، تم موجود نہ تھے (اور یہ سب باتیں تمہیں وحی کی معرفت بتائی گئی ہیں) ۔

تفسیر

جیسا کہ گذشتہ آیات کی تفسیر میں کہا جا چکا ہے جناب مریم کی والدہ پیدائش کے بعد اپنی نوزائیدہ بچی کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر عبادت خانے میں لے آئیں ۔ وہاں بنی اسرائیل کے علماء اور بزرگوں سے کہنے لگیں : یہ نومولود بچی خانۂ خدا کی خدمت کے لیے نذر کی گئی ہے اس کی سرپرستی اپنے ذمے لے لیں ۔ جناب مریم چونکہ حضرت عمران کے خاندان سے تھیں اور یہ ایک بزرگ خاندان تھا اس لیے بنی اسرائیل کے علماء اور عباد ان کی سرپرستی کا منصب حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے ۔ قرعہ ڈال کر فیصلہ کرنے پر اُن کا اتفاق ہوگیا ۔ وہ ایک نہر کے کنارے گئے وہاں اُنہوں نے اپنی قرعہ ڈالنے کی لکڑیاں پیش کیں ۔ ان میں سے ہر ایک لکڑی یا قلم پر ان میں سے ایک ایک کا نام لکھا گیا ۔ جو قلم پانی میں ڈوب جاتی اس کا قرعہ نکلتا صرف جس کی قلم سطح آب پر رہتی اُس کے نام قرعہ شمار ہوتا ۔ جس قلم پر حضرت زکریا کا نام تھا پہلے پانی کی گہرائی میں چلی گئی اور پھر پانی پر اُبھر آئی ۔ یوں حضرت مریم کی سرپرستی کا منصب حضرت زکریا کے حصے آیا اور حقیقت میں بھی وہی اس کام کے لیے اہل تر تھے کیونکہ ایک تو وہ پیغمبرِ خدا تھے اور دوسرا ان کی بیوی حضرت مریم کی خالہ تھیں ۔

مندرجہ بالا آیت اس واقعے کے ایک پہلو کی طرف اشارہ کر رہی ہے فرمایا گیا ہے : مریم کی جو کچھ سرگذشت ہم نے



تمہیں بیان کی ہے یہ غیب کی خبروں میں سے ہے کیونکہ یہ واقعہ اس طرح سے خرافات سے پاک گذشتہ تحریف شدہ کتب میں بھی کہیں موجود نہیں تھا اس لیے آسمانی وحی ہی اس کی سند بن سکتی تھی ("ذالك من انباء الغيب نوحيه اليك") ۔

پھر اس واقعے کے ایک حصے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے: مریمؑ کی سرپرستی کے تعین کے لیے جب وہ اپنی قلمیں پانی میں ڈال رہے تھے تم موجود نہ تھے (ما كنت لديهم اذ يلقون اقلامهم ايهم يكفل مريم) یونہی جب وہ کفالتِ مریمؑ پر جھگڑ رہے تھے تم پاس نہ تھے اور یہ سب کچھ تم پر صرف وحی کے ذریعے نازل ہوا ہے ۔

اختلاف دور کرنے کا آخری طریقہ قرعہ اندازی ہے

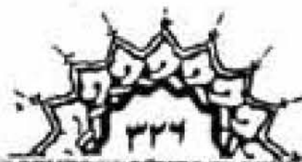
زیرِ نظر آیت اور سورہ صٰفٰت میں حضرت یونس کے بارے میں موجود آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مشکل کو حل کرنے کے لیے یا تنازعے میں معاملہ آخری حد تک پہنچ جانے پر جب جھگڑا ختم کرنے کا کوئی راستہ سجھائی نہ دے تو قرعہ اندازی سے مدد لی جاسکتی ہے۔ ان آیات کے ساتھ ساتھ پیشوایانِ اسلام سے منقول روایات بھی اس سلسلے میں موجود ہیں ۔ انہی آیات و روایات کے باعث فقہی کتابوں میں "قاعدۂ قرعہ" فقہی قواعد و اصول میں سے ایک کے طور پر زیرِ بحث آنے لگا ۔

لیکن جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے کہ قرعہ اندازی فقط بے بسی اور مسئلے کے حل کی کوئی دوسری صورت باقی نہ رہ جانے کی صورت میں ہی کی جاسکتی ہے ۔ اس لیے مسئلے کے حل کے لیے اور راستہ نکل آنے کی صورت میں قرعہ سے مدد نہیں لی جاسکتی ۔ قرعہ نکالنے کے لیے اسلام میں کوئی خاص طریقہ معین نہیں ہے بلکہ تیر کی لکڑیوں، سنگریزوں یا کاغذ کا اس طرح استعمال کیا جائے کہ کسی کے خلاف سازش یا کسی کو نقصان پہنچنے کا احتمال باقی نہ رہے ۔

واضح ہے کہ اسلام میں قرعہ اندازی کے ذریعے کاروبار، لین دین اور معاملہ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یہ کوئی مشکل مسئلہ نہیں جسے حل کرنے کے لیے قرعہ کو ذریعہ بنایا جائے اور ایسی آمدنی جائز نہیں ہے ۔

یہ نکتہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ قرعہ لوگوں کے تنازعات اور اختلافات سے ہی مخصوص نہیں بلکہ اس سے دیگر مشکلات کے حل میں بھی مدد لی جاسکتی ہے ۔ مثلاً جیسا کہ احادیث میں آیا ہے کہ اگر کوئی کسی بھیڑ سے بدفعلی کرے اور پھر اسے بھیڑ بکریوں کے ریوڑ میں چھوڑ دے ۔ اب اگر اسے پہچانا نہ جاسکے تو قرعہ اندازی کے ذریعے ان میں سے ایک بھیڑ نکال لی جائے اور اس کا گوشت کھانے سے پرہیز کیا جائے کیونکہ سارے ریوڑ کو چھوڑ دینا تو بڑے نقصان کا باعث بنے گا اور پھر ان سب کا گوشت کھانا بھی جائز نہیں ۔ یہاں قرعہ اِس مشکل کو حل کرتا ہے ۔

۴۵۔ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ



بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ○

ترجمہ

۴۵ ـ وہ وقت (یاد کرو) جب فرشتوں نے کہا: اے مریمؑ! خدا اپنی طرف سے تجھے ایک کلمہ (اور باعظمت شخصیت) کی بشارت دیتا ہے جس کا نام عیسٰی بن مریمؑ ہے ، وہ دُنیا و آخرت میں مقام و عظمت کا مالک ہوگا اور وہ مقربین میں سے ہے۔

تفسیر

اِس آیت میں حضرت مسیحؑ کی ولادت کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ واقعہ فرشتوں کی طرف سے جناب مریمؑ کو بشارت دینے سے شروع ہوتا ہے۔ فرشتے خدا کی طرف سے جناب مریمؑ کو خوشخبری دیتے ہیں کہ خدا انہیں ایک بچہ دے گا جس کا نام مسیح عیسٰی بن مریمؑ ہوگا ۔ وہ دُنیا و آخرت میں مقام و عظمت کا مالک ہوگا۔ اور بارگاہِ الٰہی کے مقربین میں سے ہوگا ("واذ قالت الملٰئكة يٰمريم ان الله يبشرك بكلمة منه اسمه المسيح عيسى ابن مريم")۔

چند اہم نکات

۱۔ **عیسٰیؑ کو کلمہ کیوں کہا گیا؟** : اِس آیت میں اور دو مزید آیات میں حضرت مسیحؑ کو "کلمة" کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے۔ یہ تعبیر عہد جدید کی کتب میں بھی دکھائی دیتی ہے۔

اِس بارے میں مفسرین میں بہت اختلاف ہے کہ حضرت عیسٰیؑ کو "کلمة" کیوں کہا گیا ہے لیکن زیادہ تر یہی نظر آتا ہے کہ اس کا سبب ان کی غیر معمولی پیدائش ہے جو اِس فرمانِ الٰہی کی مصداق ہے:۔

"انما امرہٗ اذا اراد شيئًا ان يقول له كن فيكون"

اس کا امر تو بس یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو جا بس وہ ہو جاتی ہے۔ (یٰس - ۸۲)

یا اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی ولادت سے پہلے خدا تعالیٰ نے ان کی والدہ کو ایک کلام کے ذریعے



بشارت دی تھی۔

یہ بھی ممکن ہے کہ اس تعبیر کی وجہ یہ ہو کہ لفظ "کلمۃ" قرآن کی اصطلاح میں مخلوق کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، مثلاً:

"قل لو كان البحر مداداً لكلمات ربي
لنفد البحر قبل ان تنفد كلمات ربي
ولو جئنا بمثله مددًا۔"

کہہ دیجئے: میرے پروردگار کے کلمات لکھنے کے لیے اگر دریا سیاہی بن جائیں تو وہ ختم ہو جائیں گے لیکن میرے رب کے کلمات ختم نہیں ہوں گے چاہے اتنے اور دریا بھی ان میں شامل ہو جائیں۔ (کہف ۱۰۹)

اس آیت میں کلمات خدا سے مراد مخلوقات خدا ہی ہے اور چونکہ حضرت "مسیح" خدا کی عظیم مخلوقات میں سے ایک تھے اس لیے ان پر "کلمۃ" کا اطلاق ہوا ہے۔ ضمناً اس میں حضرت عیسیٰ کی الوہیت کے دعویداروں کا جواب بھی آگیا ہے۔

۲۔ **حضرت عیسیٰؑ کو مسیح کیوں کہتے ہیں؟**: ممکن ہے یہ اس لیے ہو کہ "مسیح" کا معنی ہے "مسح کرنے والا" یا "مسح شدہ" اور وہ ناقابل علاج بیماروں کے بدن پر ہاتھ پھیر کر حکم خدا سے اُسے شفایاب کر دیتے تھے۔ اس افتخار اور عظمت کی ان کے لیے پہلے سے پیشگوئی کی گئی تھی اس لیے خدا تعالیٰ نے ولادت سے پہلے ہی ان کا نام مسیح رکھ دیا۔

یا یہ اس بناء پر ہے کہ خدا تعالیٰ نے انہیں ناپاکی اور گناہ سے مسح کیا، پاک رکھا۔

۳۔ **عیسیٰؑ مریمؑ کے بیٹے ہیں**: قرآن نے اس آیت میں صراحت سے حضرت عیسیٰؑ کو جناب مریمؑ کے بیٹے کی حیثیت سے متعارف کروایا ہے تاکہ یہ حضرت عیسیٰ کی الوہیت کے دعویداروں کے لیے جواب ہو کیونکہ جو ماں سے پیدا ہوتا ہے، عالم جنین کے تغیرات میں سے گزرتا ہے اور عالم مادہ کے تغیرات و تحولات میں داخل ہے وہ کس طرح خدا ہو سکتا ہے خدا تو تمام تغیرات اور تبدیلیوں سے بالاتر ہے۔

۴۶۔ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝

ترجمہ

۴۶۔ اور وہ لوگوں سے گہوارے میں اور ادھیڑ عمر میں گفتگو کرے گا اور وہ صالحین میں سے ہے۔



تفسیر

اب اِس آیت میں حضرت عیسٰی کی گہوارے میں گفتگو کا تذکرہ ہے کیونکہ جیساکہ سورہ مریم میں آئے گا وہ اپنی والدہ سے تہمت دور کرنے کے لیے گہوارے میں بول اُٹھے اور فصیح زبان میں خدا کے حضور اپنے مقامِ بندگی اور مقامِ نبوت کو آشکار کیا۔ اور چونکہ ممکن نہیں کہ پیغمبر ناپاک اور آلودۂ گناہ رحم سے پیدا ہو اس لیے اس اعجاز کے ذریعے اپنی والدہ کی پاکیزگی کو ثابت کیا۔

توجہ رہے کہ " مھد " نوزائیدہ بچے کے سونے اور آرام کرنے کے لیے تیار کی جانے والی چیز یا جگہ کو کہتے ہیں۔ فارسی میں یہ " گہوارہ " کے مفہوم کے قریب قریب ہے البتہ "گہوارہ" پورے طور پر "مہد" کا ہم معنی نہیں کیونکہ گہوارہ میں حرکت کا مفہوم بھی پوشیدہ ہے لیکن مہد ہر ایسی جگہ کو کہتے ہیں جو نوزائیدہ بچے کے لیے بنائی جائے۔

ضمناً اِس آیت میں اِس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ حضرت مسیحؑ اپنی ولادت سے لے کر ادھیڑ عمر تک حق بات کہتے رہیں گے گویا تمام عمر مخلوق کو تبلیغ و ہدایت کے لیے قدم اٹھاتے رہیں گے اور ایک لمحے کے لیے بھی آرام سے نہیں بیٹھیں گے۔

یہ بھی توجہ رہے کہ " کھولۃ " " کہل " کے مادہ سے ہے اور یہ "بوڑھے" کے معنی میں نہیں ہے بلکہ ادھیڑ عمر افراد کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض علماء لغت نے صراحت کی ہے کہ ۳۴ سے لے کر ۵۱ سال تک کا درمیانی زمانہ کہولت ہے۔ اس سے کم عمر والے کو " شاب " (جوان) کہتے ہیں اور اس سے زیادہ عمر والے کو " شیخ " کہتے ہیں۔

حضرت عیسٰی کے بارے میں یہ تعبیر گویا ایک قسم کی پیش گوئی ہے کہ وہ اِس دُنیا میں دوبارہ آئیں گے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ تواریخ کے مطابق ۳۳ سال کی عمر میں حضرت عیسٰی لوگوں کے درمیان سے اُٹھ گئے اور آسمان کیطرف صعود کیا اور یہ امر ان تمام روایات سے ہم آہنگ ہے جن میں بتایا گیا ہے کہ حضرت عیسٰیؑ امام مہدی علیہ السلام کے زمانے میں لوگوں میں پلٹ آئیں گے اور آنجنابؑ کی تائید کریں گے۔

آیت کے آخر میں حضرت عیسٰی کی مختلف صفات کے تذکرے کے بعد فرمایا گیا ہے: وہ صالحین میں سے ہوں گے (ومن الصّٰلحین)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صالح ہونا بہت بڑا اعزاز اور افتخار ہے اور صالح کے مفہوم میں تمام انسانی قدریں مجتمع ہیں۔

۴۷۔ قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِىْ
بَشَرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ اِذَا



قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ○

ترجمہ

۴۷۔ (مریمؑ نے) کہا: پروردگار! مجھ سے بچہ کیوں کر ہوگا جب کہ کسی شخص نے مجھے چھوا نہیں (جواب میں) فرمایا: خدا اسی طرح جسے چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، جب وہ کسی چیز کا فیصلہ کر لیتا ہے تو بس کہتا ہے ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔

تفسیر

ہم جانتے ہیں کہ یہ جہاں عالم اسباب ہے۔ خدا تعالیٰ نے خلقت کے عمل کو اس طرح سے جاری فرمایا ہے کہ ہر موجود عوامل کے ایک سلسلے کے بعد ہی دائرہ وجود میں قدم رکھتا ہے مثلاً ایک بچے کے پیدا ہونے کے لیے شادی بیاہ جنسی ملاپ اور "اسپرم" اور "اووِل" کا باہمی پیوند ضروری ہے۔ اس لیے یہ باعث تعجب نہیں کہ بہت جلد صاحب فرزند ہونے کی بشارت پر مریمؑ حیران و پریشان ہوگئیں۔ انہوں نے سوال کیا: میرے خدا: کیسے ہو سکتا ہے کہ مجھ سے بچہ پیدا ہو جب کہ کسی بشر نے مجھے مَس تک نہیں کیا۔ "قالت رب انّٰى يكون لى ولد؟ ولم يمسسنى بشر؟"۔

خدا نے فوراً فرشتوں کے ذریعے انہیں خبر دی: خدا جسے چاہتا ہے پیدا کرتا ہے یعنی جہان طبیعت کا نظام خدا کا پیدا کردہ ہے، اس کے تابع فرمان ہے، وہ جب چاہے اسے دگرگوں کر سکتا ہے اور غیر مادی علل و عوامل سے بھی موجودات کو پیدا کر سکتا ہے "كذالك الله يخلق ما يشآء"۔

اس کے بعد بات کی تکمیل کے لیے فرماتا ہے: جب وہ کسی چیز کے کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے حکم دیتا ہے کہ ہو جا اور وہ فوراً ہو جاتی ہے "اذا قضى امرا فانما يقول له كن فيكون"۔ "كن فيكون" سُرعت آفرینش کی طرف اشارہ ہے۔

واضح ہے کہ لفظ "كن" درحقیقت خدا کے حتمی ارادے کا بیان ہے ورنہ اسے کہنے کی ضرورت نہیں ہے یعنی کسی چیز کے بارے میں اس کا صرف ارادہ ہو اور فرمان آفرینش صادر ہو تو اسے فوراً لباس وجود پہنا دیا جاتا ہے۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ اس آیت میں حضرت عیسیٰؑ کی خلقت کے بارے میں لفظ "يخلق" (خلق کرتا ہے) استعمال ہوا ہے جب کہ گذشتہ چند آیات میں حضرت یحییٰؑ کی آفرینش کے بارے میں لفظ "يفعل" (انجام دیتا ہے) استعمال کیا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے تعبیر کا یہ اختلاف ان دو پیغمبروں کی خلقت کے اختلاف کی طرف اشارہ ہو کہ ایک معمول کے



مطابق اور دوسرا غیر معمولی طریقے سے عالم وجود میں آیا ہے۔

۴۸۔ وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝
۴۹۔ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ
بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّيْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ
كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًاۢ بِاِذْنِ
اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى
بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ
فِيْ بُيُوْتِكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ
كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝

ترجمہ

۴۸۔ اور اُسے کتاب و دانش اور تورات و انجیل کی تعلیم دے گا۔

۴۹۔ اور اُسے رسُول کی حیثیت سے بنی اسرائیل کی طرف بھیجے گا (جو ان سے کہے گا میں پروردگار کی طرف سے تمہارے لیے نشانی لایا ہوں۔ میں گیلی مٹی سے پرندے جیسی مُورت بناتا ہوں۔ پھر اُس میں پھونکتا ہوں تو وُہ حکم خدا سے پرندہ بن جاتا ہے۔ نیز مادر زاد اندھے کو اور برص میں مبتلا لوگوں کو شفا دیتا ہوں، مردوں کو زندہ کرتا ہوں اور جو کچھ تم کھاتے ہو اور اپنے گھروں میں ذخیرہ کرتے ہو، اس کی تمہیں خبر دیتا ہوں بے شک اِس میں تمہارے لیے نشانی ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو۔

تفسیر

جو افراد خدا کی طرف سے لوگوں کی ہدایت کے لیے مامور ہوتے ہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ پہلے مرحلے میں

علم و دانش کے ذریعے لوگوں کو دعوت دیں، اور زندہ و انسان ساز آئین و قوانین پیش کریں۔ پھر دوسرے مرحلے میں خدا سے اپنے ارتباط کے لیے واضح اسناد دکھائیں اور یوں خدا کی طرف سے اپنے منصوب ہونے کا ثبوت پیش کریں۔

اس مقصد کے لیے ہر پیغمبر اپنے زمانے کے ترقی یافتہ علوم کی قسم کے معجزے سے لیس ہوتا تھا تاکہ جہان ماوراء طبیعت سے ان کا ارتباط زیادہ واضح ہو جائے اور ہر زمانے کے علماء ان کے مقابلے میں اپنے عجز کی وجہ سے ان کی دعوت کی حقانیت کا اعتراف کریں۔

یہ بات ایک حدیث میں امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے منقول ہے۔ ان سے سوال کیا گیا تھا: ہر پیغمبر کے پاس کچھ نہ کچھ معجزات کیوں ہوتے تھے۔ اس سوال کے جواب میں آپ نے وضاحت فرمائی جس کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

> حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں جادوگر بہت زیادہ تھے۔ حضرت موسیٰؑ نے ایسا عمل انجام دیا جس کے مقابلے میں تمام جادوگر عاجز آگئے۔ حضرت مسیحؑ کے زمانے اور دعوت کے موقع پر اطباء بیماروں کے علاج معالجے میں بہت مہارت رکھتے تھے۔ جناب عیسیٰؑ نے لاعلاج بیماروں کو مادی وسائل کے بغیر شفا دیکر اپنی حقانیت کو ثابت کر دیا۔ پیغمبر اسلامؐ کے زمانے میں خطباء، شعرا اور سخنور بہت زیادہ فصاحت و بلاغت کے مالک تھے اور ان سب نے قرآنی فصاحت و بلاغت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے۔ [1]

مندرجہ بالا آیت میں حضرت مسیحؑ کی ماموریت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خداوند عالم نے پہلے فرمایا ہے: خُدا نے اُسے کتاب و حکمت کی تعلیم دی ("و یعلمه الکتب والحکمة") اور اس کے بعد کتاب و حکمت کے مصداق کی نشاندھی کی گئی ہے۔ فرمایا: تورات و انجیل سکھائی ("والتوریة والانجیل") اس کے بعد بنی اسرائیل کے منحرف لوگوں کی ہدایت کے لیے ان کی ماموریت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کیونکہ وہ ان دنوں طرح طرح کے خرافات، آلودگیوں اور اختلافات میں گرفتار تھے۔ فرمایا: "و رسولاً الی بنی اسرائیل"

یہ بات قابل ذکر ہے کہ مندرجہ بالا آیت سے ابتداء میں یہ لگتا ہے کہ حضرت عیسٰی کے ذمہ صرف بنی اسرائیل کو دعوت دینا تھا لیکن یہ اُن کے اولوالعزم ہونے کی نفی نہیں ہے کیونکہ اولوالعزم پیغمبر وُہ ہے جو نیا دین و آئین لے کر آئے اگرچہ اُس کی ماموریت عالمی نہ ہو۔ تفسیر نور الثقلین میں حضرت عیسٰیؑ کی بنی اسرائیل میں منحصر ماموریت کے بارے میں ایک روایت بھی منقول ہے۔[2]

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ حضرت عیسٰیؑ کی ماموریت عالمی تھی اور بنی اسرائیل میں منحصر نہ تھی۔ البتہ وہ کہتے ہیں کہ جن کی ہدایت اُن کے ذمے تھی اُن میں بنی اسرائیل پہلی صف میں تھے۔

مرحوم علامہ مجلسی نے بحار الانوار میں اولوالعزم کے معنی میں روایات نقل کی ہیں جن کا مفہوم یہ ہے کہ ان کی دعوت جہانی اور پوری دُنیا کے لیے ہونی چاہیے۔[3]

درحقیقت انبیاء کی دعوت حقیقی زندگی کی طرف دعوت ہے اس لیے مندرجہ بالا آیت میں حضرت مسیحؑ کے معجزات

---

[1] بحار، ج ۵، صہ ۱۹ [2] نور الثقلین، ج ۱، صہ ۳۴۲ [3] بحار، ج ۱۱، صہ ۳۲ (طبع جدید)



کی تفصیل کے موقع پر سب سے پہلے حکم خدا سے بے جان چیزوں میں زندگی پیدا کرنے کا تذکرہ ہے اور حضرت عیسٰی کی زبانی فرمایا گیا ہے۔ میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے لیے نشانی لایا ہوں۔ میں گیلی مٹی سے پرندے کی شکل کی کوئی چیز بناتا ہوں اور اس میں پھونکتا ہوں تو وہ حکم خدا سے پرندہ بن جاتا ہے۔

حکم خدا سے ایجادِ حیات کا مسئلہ کوئی پیچیدہ مسئلہ نہیں ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ دنیا کے تمام زندہ موجودات مٹی اور پانی سے وجود میں آتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ اسے تدریجی تحول و تغیر کہہ سکتے ہیں اور یہ تبدیلی عرصہ دراز میں وقوع پذیر ہوئی ہے تو کیا مانع ہے کہ خدا تعالٰی تمام عوامل کو جمع کر دے اور وہ تمام مراحل تیزی سے صورت پذیر ہو جائیں اور مٹی زندہ موجود میں بدل جائے۔ جب کہ یہ معجزہ پیش کرنے والے کا ربط ماوراء الطبیعات اور پروردگار کی لامتناہی قدرت کے ساتھ ہے۔

اس کے بعد ان بیماریوں کے علاج کا تذکرہ ہے جن کا علاج بہت مشکل ہے یا جو معمول کے طریقوں سے قابلِ علاج نہیں ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: میں مادر زاد اندھے اور ابرص (برص اور سفید داغ والی بیماری میں مبتلا لوگوں کا علاج کر سکتا ہوں اور مردوں کو بھی لباسِ حیات پہنا سکتا ہوں۔

واضح ہے کہ یہ امور خصوصاً اُس زمانے کے اطباء اور علماء کے لیے ناقابلِ انکار معجزات تھے۔

بعد کے مرحلے میں لوگوں کے پوشیدہ اسرار کی خبر دینے کی بات کی گئی ہے کیونکہ ہر شخص کی اپنی انفرادی اور شخصی زندگی سے کچھ ایسے اسرار اور راز ہوتے ہیں جن سے دوسرے لوگ آگاہ نہیں ہوتے۔ اب اگر کوئی شخص کسی قسم کے سابقہ روابط کے بغیر ایسے امور کی اطلاع دے دے مثلاً جو کھانے انہوں نے کھائے ہیں ان کی خبر دے یا جو کچھ انہوں نے پس انداز کر رکھا ہے اس کی تمام تفصیلات بتا دے تو یہ اس امر کی دلیل ہوگی کہ اُس نے غیبی منبع و مصدر سے الہام حاصل کیا ہے۔ جناب مسیح کہتے ہیں: میں ان امور سے آگاہ ہوں اور تمہیں ان کی خبر دیتا ہوں "وانبئکم بما تاکلون وما تدخرون فی بیوتکم"

آخر میں فرمایا گیا ہے، ان تمام چیزوں میں تمہارے لیے نشانیاں ہیں اگر تم صاحبِ ایمان ہو اور حقیقت کے متلاشی ہو۔
"ان فی ذٰلک لاٰیۃ لکم ان کنتم مؤمنین."

کیا یہ معجزات باعثِ تعجب ہیں؟ تفسیر المنار کے مؤلف اور بعض دیگر مفسرین مصر ہیں کہ آیت بالا میں مذکور معجزاتی امور جو حضرت مسیح کے بارے میں قرآن نے بیان کیے ہیں کی کچھ نہ کچھ توجیہ کی جانا چاہیے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسٰیؑ نے تو فقط دعویٰ کیا تھا کہ میں حکم خدا سے ایسا کر سکتا ہوں لیکن عملی طور پر یہ کام ہرگز انجام نہیں دیے۔ حالانکہ اگر فرض کریں کہ اس آیت میں یہ احتمال ہو پھر بھی سورہ مائدہ آیہ ۱۱۰ میں ہے:

"واذ تخلق من الطین کھیئۃ الطیر......"
(اے عیسٰی) خدا کی نعمتوں میں سے ایک نعمت تم پر یہ بھی تھی کہ تم گیلی مٹی سے پرندہ بناتے تھے، اس میں پھونکتے تھے اور وہ حکم خدا سے زندہ ہو جاتا تھا۔



لہٰذا مندرجہ بالا دلیل قابلِ قبول نہیں کیونکہ سورہ مائدہ کی مذکورہ آیت میں تو پوری صراحت سے اُن کے عملاً گزرنے کا ذکر ہے۔

علاوہ ازیں ایسی توجیہات پر اصرار کے لیے کوئی وجہ بھی نہیں کیونکہ اگر مراد انبیاء کے خارقِ عادت افعال کا انکار ہے تو قرآن نے بہت سے مواقع پر اس کی تصریح کی ہے اور بالفرض ایک آدھ جگہ پر توجیہ کر بھی لیں تو بقیہ مواقع پر کیا کریں گے۔

اِن سب پہلوؤں سے صرف نظر کرتے ہوئے جب ہم خدا کو تمام قوانینِ فطرت و طبیعت پر حاکم جانتے ہیں نہ کہ ان کا محکوم تو پھر کیا مانع ہے کہ اس کے حکم سے استثنائی مواقع پر طبیعت کے معمول کے قوانین میں غیر معمولی طریقے سے تبدیلی وقوع پذیر ہو جائے۔

اگر وُہ یہ تصور کرتے ہیں کہ یہ امر خدا کی توحیدِ افعالی، اس کی خالقیت اور لاشریک ہونے کے ساتھ ساز گار نہیں تو قرآن نے اِس کا جواب دیا ہے کیونکہ تمام جگہوں پر ان واقعات کے وقوع کو حکم خدا سے مشروط قرار دیا ہے یعنی کوئی شخص بھی اپنی ذاتی قوت و طاقت کے ذریعے ایسے کاموں میں ہاتھ نہیں ڈال سکتا مگر یہ کہ حکم خدا اور اس کی بے پایاں قدرت کو منظور ہو اور یہ عین توحید ہے شرک نہیں۔

ولایت تکوینی

اِس آیت اور اس سے مشابہ دیگر آیات جن کے بارے میں ہم انشاء اللہ اشارہ کریں گے۔ سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے بھیجے ہوئے افراد اور اولیاء اللہ اللہ کے فرمان اور اذن سے بوقت ضرورت عالم تکوین و آفرینش میں تصرف کر سکتے ہیں اور خلافِ معمول اور طبیعی قوانین سے ہٹ کر کچھ واقعات کو جنم دے سکتے ہیں۔ "ابرء" (شفا دیتا ہوں)، "احی الموتی" (مردوں کو زندہ کرتا ہوں) اور اس قسم کے دیگر الفاظ جو فعل متکلم کی صورت میں ذکر ہوئے ہیں، اس بات کی دلیل ہیں کہ اس قسم کے افعال خود پیغمبروں سے صادر ہوتے ہیں اور ان عبارات کو انبیاء کی دعائیں قرار دینا بلا دلیل دعویٰ ہے۔ ان عبارات کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ وہ عالم تکوین میں تصرف کرتے تھے اور ان واقعات کو عالم وجود میں لاتے تھے۔

زیادہ سے زیادہ اِس چیز کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کہ کوئی شخص یہ تصور نہ کرے کہ خدا کے انبیاء و اولیاء ذاتی طور پر صاحب استقلال تھے اور ان کی کوئی قدرت خدا کی قدرتِ خلقت کے مقابل تھی نیز دوگانہ پرستی کے احتمال کو برطرف کرنے کے لیے چند مواقع پر "باذن اللہ." کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں (محل بحث آیت میں دو مرتبہ اور سورۂ مائدہ کی آیہ ۱۱۰ میں چار مرتبہ "باذن اللہ." کا تکرار ہے)۔

ولایتِ تکوینی سے بھی اِس کے علاوہ کچھ مراد نہیں کہ انبیاء اور آئمہ علیہم السلام ضرورت کے وقت اذن پروردگار سے عالم خلقت میں تصرفات کر سکتے ہیں اور یہ چیز ولایت تشریعی یعنی عوام پر حکومت، قوانین کی نشر و اشاعت اور براہِ راست دعوت و ہدایت کرنے سے بالاتر ہے۔

جو کچھ کہا جا چکا ہے اِس سے ان لوگوں کا جواب بھی اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے جو مردانِ خدا کی ولایتِ تکوینی کے منکر ہو



جاتے ہیں اور اسے شرک کی ایک قسم سمجھتے ہیں کیونکہ کوئی شخص بھی حضرات انبیاء اور آئمہ علیہم السلام کو خدا کے مقابلے میں صاحب قدرت نہیں سمجھتا ۔ وہ حضرات یہ سب کام خدا کے فرمان اور اس کی اجازت سے انجام دیتے ہیں لیکن ولایت تکوینی کے منکر یہ کہتے ہیں کہ انبیاء کا کام صرف تبلیغ احکام اور خدا کی طرف دعوت دینا ہے اور کبھی کبھی وہ بعض امور تکوینی کی انجام دہی کے لیے دعا سے استفادہ کرتے ہیں اور اس سے زیادہ ان سے کوئی کام نہیں ہوسکتا حالانکہ مندرجہ بالا آیت اور اس کے مشابہ دیگر آیات کچھ اور کہتی ہیں ۔

ضمنی طور پر مندرجہ بالا آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم انبیاء کے بہت سے معجزات تو ایسے افعال ہیں جو خود انہی کے ذریعے انجام پاتے ہیں اگرچہ وہ فرمان خدا کے تحت اور خدائی طاقت کی مدد سے ہوتے ہیں ۔ اس لیے حقیقت میں کہا جاسکتا ہے کہ معجزہ انبیاء کا فعل بھی ہے کیونکہ ان کے ذریعے انجام پاتا ہے اور خدا کا کام بھی ہے کیونکہ پروردگار کی قدرت سے مدد طلب کرتے ہوئے اور اس کے اذن سے انجام پاتا ہے [1]

۵۰۔ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۟ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ○

ترجمہ

۵۰۔ اور میں تصدیق کرتا ہوں اور گواہی دیتا ہوں اس کی جو تورات میں سے مجھ سے پہلے تھا اور (میں آیا ہوں تاکہ) بعض چیزیں جو (ظلم و گناہ کی وجہ سے) تم پر حرام تھیں (جیسے بعض چوپایوں کا گوشت اور مچھلیاں) انہیں حلال کروں اور تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے لیے نشانی لایا ہوں ۔ اس لیے تم خدا سے ڈرو اور میری اطاعت کرو ۔

تفسیر

یہ آیت حضرت عیسیٰ کی زبان سے یوں نقل ہوئی ہے : میں تورات کی تصدیق کرنے اس کے مبانی و اصول محکم کرنے کے لیے آیا ہوں اور اس لیے بھی کہ دین موسیٰ میں جو بعض حد بندیاں (مثلاً اونٹ کا گوشت ، کچھ حیوانات کی چربیاں ، بعض پرندے اور مچھلیاں ممنوع تھیں) تمہاری خلاف ورزیوں کی وجہ سے تھیں انہیں تمہارے لیے مباح کردوں ۔

---

[1] لہٰذا یہی صورت آئمہ ہدیٰ علیہم السلام کے بارے میں ہے (مترجم) ۔



جیسا کہ سورہ نساء کی آیہ ۱۶۰ کی تفسیر میں آئے گا گروہ یہود کی ہٹ دھرمی اور سرکشی کی وجہ سے کچھ پاکیزہ نعمتیں وقتی طور پر ان پر حرام ہوگئی تھیں :

" فبظلم من الذین ھادوا حرمنا
علیھم طیبات احلت لھم "

پس اُن کے ظلم کی وجہ سے ان یہودیوں پر اللہ نے بہت سی
پاکیزہ چیزیں حرام قرار دے دی تھیں ۔

لیکن حضرت عیسیٰؑ کی رسالت اور اس عظیم پیغمبر کے ظہور پر قدردانی کے طور پر وہ ممانعتیں ختم کردی گئیں ۔

اس کے بعد حضرت عیسیٰؑ کی زبانی ایک جملہ جو گذشتہ آیت میں آیا تھا اس کا تکرار کیا گیا ہے : میں خدا کی طرف سے اپنی دعوت کی صداقت کے لیے ایک نشانی لایا ہوں اس بناء پر یہ ہونا چاہیے کہ خدا سے ڈرو اور میرے احکام کی پیروی کرو

" وجئتکم بآیۃ من ربکم فاتقوا اللہ واطیعون "

۵۱۔ اِنَّ اللّٰہَ رَبِّیْ وَرَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْہُ ؕ ھٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ○

ترجمہ

۵۱۔ خدا میرا اور تمہارا پروردگار ہے پس اسی کی عبادت کرو (نہ کہ میری یا کسی اور چیز کی) یہی سیدھی راہ ہے ۔

تفسیر

اس آیت سے اور قرآن کی دیگر آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ ہر قسم کے ابہام اور اشتباہ کے خاتمے کے لیے اور اس لیے کہ آپ کی استثنائی ولادت کو آپ کی الوہیت پر سند نہ سمجھ لیں بار بار کہتے تھے : اللہ ہی میرا اور تمہارا پروردگار ہے ۔ نیز کہتے : میں اس کا بندہ ہوں اور اس کا بھیجا ہوا ہوں ۔ اس کے برخلاف موجودہ تحریف شدہ انجیلوں میں حضرت مسیحؑ کی زبان سے خدا کے بارے میں " باپ " کا لفظ نقل کیا گیا ہے ۔ قرآن میں ایسے مقامات پر لفظ "رب" یا اس جیسے الفاظ نقل ہوئے ہیں " ان اللہ ربی و ربکم " ۔ اور یہ چیز دعوائے الوہیت کے خلاف اور اس کے مقابلے میں حضرت مسیحؑ کی انتہائی توجہ کی نشاندہی کرتی ہے ۔



آخر میں زیادہ تاکید کے لیے فرمایا: " فاعبدوہ " یعنی خدا کی پرستش اور عبادت کرو نہ کہ میری اور یہ توحید ویگانہ پرستی ہی سیدھی راہ ہے ۔

۵۲ ۔ فَلَمَّآ اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ○

ترجمہ

۵۲ ۔ حضرت عیسیٰؑ نے ان سے کفر (اور مخالفت) کو دیکھا تو کہا : کون خدا کی طرف (اور اس کے دین کے لیے) میرا یاور و مددگار بنے گا ؟ حواریین (جو ان کے مخصوص شاگرد تھے) کہنے لگے ہم خدا کے یاور و مددگار ہیں ، اس پر ایمان لاتے ہیں اور آپ (بھی) گواہ رہیں کہ ہم اسلام لے آئے ہیں ۔

تفسیر

اہل یہود حضرت عیسیٰؑ کے آنے سے پہلے حضرت موسیٰؑ کی پیشین گوئی اور بشارت کے مطابق حضرت مسیحؑ کے ظہور کے منتظر تھے لیکن جب انہوں نے ظہور فرمایا اور بنی اسرائیل کے ایک ستمگر اور منحرف گروہ کو اپنے منافع خطرے میں نظر آئے تو صرف تھوڑے سے لوگ آپ کے گرد جمع ہوئے اور جن لوگوں کا خیال تھا کہ حضرت مسیحؑ کی دعوت قبول کرنے اور احکام خدا کی پیروی سے ان کی حیثیت اور قدر و منزلت خطرے سے دوچار ہو جائے گی انہوں نے قوانین الٰہی کو قبول کرنے سے منہ پھیر لیا ۔

دلیل و برہان سے انہیں کافی دعوت دینے کے بعد حضرت عیسیٰؑ اس نتیجے پر پہنچے کہ بنی اسرائیل کا ایک گروہ مخالفت اور گناہ پر مصر ہے اور وہ کسی انکار اور کجروی سے دستبردار نہیں ہوگا لہٰذا انہوں نے پکار کر کہا : کون ہے جو دین خدا کی حمایت اور میرا دفاع کرے "فلما احس عیسٰی منھم الکفر قال من انصاری الی اللہ" ۔

صرف تھوڑے سے افراد نے اس کا مثبت جواب دیا ۔ یہ چند پاکباز افراد تھے جنہیں قرآن نے حواریین کا نام دیا ہے ۔



اُنہوں نے حضرت مسیحؑ کی پکار کا جواب دیا اور ہر قسم کی مدد کی ان کے مقدس مقاصد کی پیش رفت کی راہ میں دفاع کرنے سے دریغ نہ کیا۔

حواریین نے حضرت عیسٰیؑ کی ہر طرح سے مدد کا اعلان کیا اور جیسا کہ قرآن نے مندرجہ ذیل آیت میں اُن سے نقل کیا ہے کہنے لگے :

"قال الحواریون نحن انصار اللہ ۔
اٰمنا باللہ ۚ واشھد بانا مسلمون ۔"

"ہم خدا کے یاور و مددگار ہیں ، خدا پر ایمان لائے ہیں اور
آپ کو اپنے اسلام پر گواہ بناتے ہیں "

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ حواریوں نے حضرت عیسٰیؑ کی دعوت کے جواب میں یہ نہیں کہا کہ ہم آپ کے مددگار ہیں بلکہ اپنی انتہائی توحید پرستی اور خلوص کے ثبوت کے لیے اور اس مقصد کے لیے کہ ان کی بات سے کسی شرک کی بُو نہ آئے ، وہ کہنے لگے : ہم خدا کے مددگار اور ساتھی ہیں اور اس کے دین کی مدد کریں گے اور آپ کو اِس حقیقت پر گواہ بناتے ہیں۔ گویا وہ بھی یہ محسوس کرتے تھے کہ منحرف اور کج رو افراد آئندہ حضرت مسیحؑ کی الوہیت کا دعویٰ کریں گے لہٰذا وہ اُن کے ہاتھوں میں کوئی دلیل نہیں دینا چاہتے تھے ۔

حواری کون تھے

"حواریین" "حواری" کی جمع ہے اس کا مادہ "حور" ہے جس کا معنی ہے "دھونا اور سفید کرنا"۔ کبھی کبھی یہ لفظ ہر سفید چیز کے لیے بھی بولا جاتا ہے اسی لیے سفید غذا کو عرب لوگ "حواری" کہتے ہیں ۔ بہشت کی حوروں کو بھی اُن کے سفید رنگ کی وجہ "حوریہ" کہتے ہیں ۔

حضرت عیسٰیؑ کے شاگردوں کو "حواری" کیوں کہا گیا ، اِس کے لیے بہت سے احتمالات پیش کیے گئے ہیں مگر جو چیز زیادہ قرینِ عقل ہے اور دین کے عظیم رہبروں سے منقول احادیث میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے یہ ہے کہ وہ پاک دل لوگ تھے اور روحِ باصفا کے مالک تھے اِس کے علاوہ وہ دوسروں کے افکار کو پاکیزہ اور روشن کرنے ، لوگوں کے دامن کو آلودگی اور گناہ سے دھونے اور انہیں پاک کرنے میں بہت کوشاں رہتے تھے ۔

عیون الرضا میں امام علی بن موسٰی علیہما السلام سے منقول ہے :

آپؑ سے سوال کیا گیا ۔

حواریین کا یہ نام کیوں رکھا گیا ؟

آپؑ نے فرمایا :



"بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ اُن کا مشغلہ کپڑے دھونا تھا لیکن ہمارے نزدیک اس کی علت یہ ہے کہ اُنہوں نے خود کو بھی گناہ کی آلودگی سے پاک رکھا ہوا تھا اور دوسروں کو بھی پاک کرنے میں کوشاں رہتے تھے۔

حواری قرآن اور انجیل کی نظر میں

قرآن نے سورہ صف آیہ ۱۴ میں حواریوں کے بارے میں گفتگو کی ہے اور ان کے ایمان کا تذکرہ کیا ہے لیکن انجیل میں حواریوں کے بارے میں جو جملے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سب حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں لغزش کرتے تھے۔

انجیل متی اور لوقا کے باب ۶ میں حواریوں کے نام اِس طرح سے بیان کیے گئے ہیں۔

۱۔ پطرس	۲۔ اندریاس	۳۔ یعقوب
۴۔ یوحنا	۵۔ فیلوپس	۶۔ برتولوما
۷۔ توما	۸۔ متی	۹۔ یعقوب ابن حلفا
۱۰۔ شمعون (جن کا لقب غیور تھا)	۱۱۔ یہودا (جو یعقوب کے بھائی تھے)	۱۲۔ یہودائے اسخریوطی (جس نے حضرت مسیح سے خیانت کی)

مشہور مفسر طبرسی مجمع البیان میں لکھتے ہیں:

حواری حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ سفر کرتے تھے۔ جب کبھی انہیں بھوک یا پیاس لگتی، حکم خدا سے آب و غذا اُن کے لیے مہیا ہو جاتا۔ وہ اسے اپنے لیے عظیم افتخار اور بڑا اعزاز سمجھتے۔ وہ حضرت عیسیٰؑ سے پوچھتے: کیا ہم سے بڑھ کر بھی کوئی افضل و بالاتر ہے۔ تو وہ کہتے: ہاں، افضل منکم من یعمل بیدہ و یأکل من کسبہ. (یعنی وہ شخص تم سے افضل ہے جو اپنے ہاتھ سے کماتا ہے اور اپنی کمائی کھاتا ہے) اس کے بعد وہ لوگوں کے کپڑے دھوتے تھے اور اس کام سے اُجرت لیتے تھے (یوں عملاً اُنہوں نے سب لوگوں کو درس دیا کہ کام اور کوشش کرنا کوئی ننگ و عار نہیں ہے)۔

۵۳۔ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنۡزَلۡتَ وَاتَّبَعۡنَا الرَّسُوۡلَ فَاكۡتُبۡنَا مَعَ الشّٰهِدِيۡنَ ○



ترجمہ

۵۳۔ پروردگار! جو کچھ تُو نے نازل کیا ہے ہم اس پر ایمان لائے ہیں اور ہم نے (تیرے) رسول کی پیروی کی ہے۔ ہمیں گواہوں کے زمرے میں لکھ لے۔

تفسیر

حضرتِ مسیحؑ کی دعوت قبول کر لینے کے بعد حواریوں نے ان کا ساتھ دیا، اُن کی مدد کی اور انہیں اپنے ایمان پر گواہ بنایا۔ پھر بارگاہِ الٰہی کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنا ایمان پیش کیا اور کہنے لگے: پروردگار! جو کچھ تو نے بھیجا ہے ہم اس پر ایمان لائے ہیں ("ربنآ امنا بمآ انزلت") لیکن ایمان کا چونکہ دعویٰ ہی کافی نہیں تھا، اس لیے ساتھ ہی آسمانی احکام پر عمل کرنے اور پیغمبرِ خدا (حضرت عیسٰیؑ) کی پیروی کا ذکر کرنے لگے اور کہنے لگے: ہم نے تیرے بھیجے ہوئے مسیحؑ کی پیروی کی ("واتبعنا الرسول") اور یہ ہمارے ایمانِ راسخ کا زندہ ثبوت ہے۔ یہ اس لیے کہ جب ایمان روحِ انسانی میں اُتر جاتا ہے تو اُس کے عمل میں منعکس ہوتا ہے اور عمل کے بغیر ممکن ہے دعویٰ صرف خیالی ایمان ہو اور حقیقی و واقعی ایمان نہ ہو۔

اس کے بعد انہوں نے تقاضا کیا کہ خدا اُن کے نام شہادت دینے والوں اور گواہوں کے زمرے میں شمار کرے ("فاکتبنا مع الشّٰھدین")۔ یہ گواہ وہی لوگ ہیں جو اس دُنیا میں اُمتوں کی رہبری کرتے ہیں اور قیامت میں لوگوں کے نیک و بد اعمال کے گواہ ہوں گے۔

۵۴۔ وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝

ترجمہ

۵۴۔ اور (یہودیوں اور مسیحؑ کے دشمنوں نے ان کی اور ان کے دین کی بربادی و نابودی کے لیے) سازش کی اور خدا نے (ان کی اور ان کے دین کی حفاظت کے لیے) چارہ جوئی کی اور خدا بہترین چارہ جوئی کرنے والا ہے۔

تفسیر

خدائی مکر سے کیا مراد ہے

"حواریون" کے ایمان کا تذکرہ کرنے کے بعد اب اس میں یہودیوں کی شیطانی



سازشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: انہوں نے مسیح کو نابود کرنے، ان کی آواز کو خاموش کرنے اور ان کے دین کی پیش رفت روکنے کے لیے کئی مکرو فریب اور سازشیں کیں لیکن خدا کی تدبیر اور چارہ جوئی ان سب مکاریوں اور سازشوں سے بالاتر اور زیادہ موثر تھی۔

قرآن میں اس جیسی کئی ایک آیات دکھائی دیتی ہیں جن میں مکر کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے۔[1]

لغتِ عرب میں "مکر" کا معنی اس سے بہت مختلف ہے جو اس کا معنی آج کی فارسی میں ہے۔ فارسی میں آج کل "مکر" شیطانی سازشوں اور زیاں کاریوں کے لیے استعمال ہوتا ہے حالانکہ لغتِ عرب کے اصول معانی میں "مکر" ہر طرح کی "چارہ جوئی" کو کہتے ہیں جو اچھی بھی ہوتی ہے اور کبھی بُری بھی۔

مفرداتِ راغب میں ہے۔

"المکر صرف الغیر عما یقصده"

مکر یہ ہے کہ کسی کو اس کے مقصد سے ہٹا دیا جائے۔

(اس سے قطع نظر کہ اس کا مقصد اچھا ہے یا بُرا)

قرآن مجید میں بھی "مکر" کبھی لفظ "خیر" کے ساتھ آیا ہے، مثلاً

"واللّٰہ خیر الماکرین"

یعنی — خدا بہترین چارہ جوئی کرنے والا ہے۔

اور کبھی لفظ "سیّئ" (یعنی — بُرا) کے ساتھ مذکور ہے، مثلاً

"ولا یحیق المکر السیّئ الا باھلہ"

یعنی - بُری سازش اور سوچ اپنے اہل کے علاوہ کسی کا احاطہ نہیں کرے گی۔ (فاطر - ۴۳)

اس بناء پر محل بحث آیت سے مراد یہ ہے کہ حضرت عیسٰیؑ کے دشمن اپنی شیطانی سازشوں کے ذریعے اس خدائی دعوت کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنا چاہتے تھے لیکن خدا تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کی جان کی حفاظت اور اس کے دین کی پیش رفت کے لیے تدبیر کی اور ان کے نقشے نقش بر آب ثابت ہوئے۔

۵۵۔ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ
وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ
اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ
ثُمَّ اِلَىَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ

---

[1] مثلاً سورۂ انفال کی آیت ۳۰، سورۂ نمل کی آیت ۵۰ اور بعض دوسری آیات



فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ○

ترجمہ

۵۵۔ (وہ وقت یاد کرو) جب خدا نے عیسٰی سے کہا : میں تمہیں لے لوں گا اور اپنی طرف اُٹھا لوں گا اور جو لوگ کافر ہو گئے ہیں ان سے پاک کروں گا اور جو لوگ تیری پیروی کرتے ہیں اُنہیں اُن لوگوں سے یوم قیامت تک کے لیے برتر قرار دوں گا جو کافر ہو گئے ہیں ۔ پھر تمہاری بازگشت میری طرف ہے اور جس چیز میں تم اختلاف کرتے ہو اس کا تمہارے درمیان فیصلہ کر دوں گا ۔

تفسیر

ہم نے کہا ہے کہ یہودیوں نے بعض جرائم پیشہ عیسائیوں کی مدد سے حضرت مسیحؑ کے قتل کا مصمم ارادہ کر لیا تھا لیکن خدا تعالیٰ نے اُن کی سازشوں کو نقش بر آب کر دیا اور اپنے پیغمبر کو ان کے چنگل سے رہائی بخشی ۔ اس آیت میں خدا تعالیٰ نے اس سے پہلے جو احسان حضرت مسیحؑ پر کیا اُس کا ذکر فرمایا ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے : اے عیسٰی ! میں تمہیں لے لوں گا اور اپنی طرف اُٹھا لوں گا ("اِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ")

سورۂ نساء کی آیت ۱۵۷ سے استناد کرتے ہوئے مفسرین میں یہ مشہور ہے کہ حضرت عیسٰیؑ قتل نہیں ہوئے اور خدا انہیں آسمان کی طرف لے گیا ۔ لیکن خود عیسائی موجودہ اناجیل کے مطابق کہتے ہیں کہ حضرت عیسٰی قتل ہوتے اور بعد ازاں اُنہیں دفن کر دیا گیا ، پھر وہ مردوں کے درمیان سے اُٹھے ، تھوڑی مدت زمین پر رہے اور آسمان کی طرف اُٹھ گئے ۔

المنار کے مؤلف کی طرح بعض مفسرین اسلام کا عقیدہ ہے کہ حضرت مسیحؑ قتل ہوئے اور خدا صرف ان کی روح کو آسمان کی طرف لے گیا ۔

اس بارے میں ضروری گفتگو اور یہ کہ ان دو نظریوں میں سے کونسا حق ہے اس سلسلے میں بحث انشاء اللہ سورۂ نساء کی آیت ۱۵۷ کے ذیل میں آئے گی ۔

یہاں جس بات کی طرف توجہ ضروری ہے ، یہ ہے کہ محل بحث آیت حضرت عیسٰی کی موت پر دلالت نہیں کرتی اگرچہ بعض یہ تصور کرتے ہیں کہ "مُتَوَفِّيكَ" کا مادہ ہے "وفات" اور یہ موت کے معنی میں ہے



اس لیے ان کا خیال ہے کہ جو عقیدہ مسلمانوں میں مشہور ہے کہ حضرت عیسٰی نے وفات نہیں پائی اور وہ زندہ ہیں اس مفہوم کے منافی ہے حالانکہ احادیث بھی اس عقیدے کی تائید کرتی ہیں نیز "فوت" ہاتھ سے نکل جانے کے معنی میں ہے اور "توفی" (بروزن ترقی) "وفی" کے مادہ سے ہے جس کا مطلب ہے "کسی چیز کی تکمیل کرنا"۔ عہد و پیمان پر عمل کرنے کو "وفا" بھی تکمیل کرنے اور اسے انجام تک پہنچانے کی وجہ سے کہتے ہیں۔ اسی بنا پر اگر کوئی شخص کامل طور پر اپنا حق دوسرے سے اپنی تحویل میں لے لے تو عرب کہتے ہیں "توفی دینہ" یعنی اپنا حق پورا پورا وصول کر لیا۔

آیات قرآنی میں بھی "توفی" بارہا "لینے" کے معنی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً

"وھو الذی یتوفکم با لیل
ویعلم ما جرحتم بالنھار"

وہ ذات وہ ہے جو تمہاری روح کو رات کے
وقت لے لیتی ہے اور جو کچھ تم دن کو انجام دیتے ہو اس
سے آگاہ ہے۔ (انعام - ۶۰)

اس آیت میں نیند کو "توفی روح" کہا گیا ہے۔ یہی معنی سورہ زمر کی آیہ ۴۲ میں بھی آیا ہے۔ قرآن کی متعدد دیگر آیات میں بھی لفظ "توفی" "لینے" کے معنی میں نظر آتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ "توفی" بعض اوقات "موت" کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے لیکن وہاں بھی درحقیقت موت کے مفہوم میں نہیں بلکہ روح کو اپنی تحویل میں لے لینے کے معنی میں ہے۔ اصولی طور پر "توفی" کے معنی میں "موت" پوشیدہ نہیں ہے۔ اور "فوت" کا مادہ "وفی" کے مادہ سے بالکل جدا ہے۔

جو کچھ کہا جا چکا ہے اس کی طرف توجہ کرتے ہوئے محل بحث آیت کی تفسیر پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے خداوند عالم فرماتا ہے۔ اے عیسٰی میں تجھے اپنی تحویل میں لے لوں گا، تجھے اٹھا لے جاؤں گا اور یہ مفہوم حضرت عیسٰی کی حیات اور زندگی پر دلالت کرتا ہے نہ کہ اُن کی موت پر (غور کیجئے)۔

"ومطھرک من الذین کفروا"

پروردگار نے حضرت عیسٰی سے جو خطاب فرمایا اس جملے میں اس کا ایک حصہ آیا ہے۔ ارشاد ہے: جو کافر ہیں ان سے میں تمہیں پاک و پاکیزہ رکھوں گا۔ اس پاکیزگی سے مراد بے ایمان، ناپاک اور حق و حقیقت سے ہٹے ہوئے افراد کے چنگل سے نجات دینا ہے۔ وہ کوشش کرتے تھے کہ ناروا تہمتوں اور بزدلانہ سازشوں کے ذریعے انہیں آلودہ کر دیں لیکن خدا نے اُن کے دین کو کامیابی بخشی اور اُنہیں تہمتوں سے پاک کیا جیسا کہ سورہ فتح میں پیغمبر اسلام کے بارے میں ہے:

"انا فتحنا لک فتحا مبینا لیغفر لک اللہ
ما تقدم من ذنبک وما تاخر"



" ہم نے تمہیں واضح کامیابی عطا فرمائی تاکہ خدا تمہارے گذشتہ اور آئندہ گناہ بخش دے (اور تمہیں ان تہمتوں سے جو گناہ کی شکل میں دشمنوں نے تم سے باندھ دی تھیں، پاک رکھے) (فتح - ۲،۱)

یہ بھی ممکن ہے کہ پاک کرنے سے مراد حضرت مسیح کو اس آلودہ ماحول سے باہر نکالنا ہو اور اس جملے سے پہلے والے جملے سے بھی یہی معنی مناسبت رکھتا ہے۔

"وجاعل الذین اتبعوک فوق الذین کفروا الی یوم القیٰمة"

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: تیرے پیروکاروں کو قیامت تک کے لیے کافروں پر برتری دوں گا۔ یہ ایک بشارت ہے جو خدا نے حضرت مسیح اور ان کے پیروکاروں کو دی تاکہ جو راہ انہوں نے منتخب کی تھی اس پر چلتے رہنے کے لیے ان میں ولولہ پیدا ہو۔ درحقیقت یہ آیت قرآن کی معجز نمائیوں اور غیبی پیشین گوئیوں میں سے ہے جس میں کہا گیا ہے کہ حضرت مسیح کے پیروکار ہمیشہ یہودیوں پر جو کہ مسیح کے مخالف تھے، برتر رہیں گے۔ آج کی دنیا میں ہم یہ حقیقت اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ یہودی اور صیہونی عیسائیوں سے وابستگی اور ان پر بھروسہ کئے بغیر ایک دن بھی سیاسی اور سماجی طور پر زندہ نہیں رہ سکتے۔ واضح ہے کہ "الذین کفروا" سے یہاں مراد وہی یہودی ہیں جنہوں نے حضرت مسیح کا انکار کیا۔

کیا اہل یہود اور مسیح کا دین باقی رہے گا

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے وہ یہ کہ اس آیت کے مطابق یہود و نصاریٰ قیامت تک اس دنیا میں رہیں گے اور ان مذاہب کے پیروکار ہمیشہ موجود رہیں گے جب کہ ظہور حضرت "مہدی علیہ السلام" سے مربوط اخبار اور روایات میں ہم پڑھتے ہیں کہ آپ تمام ادیان پر غالب آئیں گے اور آپ پوری دنیا پر حکومت کریں گے۔

اس سوال کا جواب مذکورہ روایات پر غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کیونکہ حضرت "مہدی علیہ السلام" کے بارے میں مروی روایات میں ہے کہ کوئی گھر، شہر اور بیابان ایسا نہیں رہے گا جس میں توحید داخل نہ ہو۔ یعنی اسلام ایک باقاعدہ اور عمومی دین کی حیثیت سے دنیا کو اپنے اندر سموئے گا اور اس وقت کی حکومت ایک اسلامی حکومت کے طور پر ابھرے گی اور اسلامی قوانین کے علاوہ دنیا پر کسی چیز کی حکمرانی نہیں ہوگی۔ لیکن اس سے کوئی مانع نہیں کہ یہود و نصاریٰ کی ایک اقلیت حضرت "مہدی علیہ السلام" کی حکومت کے زیر سایہ "اھل ذمہ" کی حیثیت سے موجود ہو کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ حضرت "مہدی علیہ السلام" لوگوں کو جبری طور پر اسلام کی طرف نہیں کھینچیں گے بلکہ منطق و دلیل کے بل بوتے پر آگے بڑھیں گے اور آپ کی طاقت تو نظام عدل کے قیام، ظالم حکومتوں کو سرنگوں کرنے اور دنیا کو زیر پرچم اسلام لانے کے لیے استعمال ہوگی، نہ کہ آپ لوگوں کو اپنا دین قبول



کرنے پر مجبور کریں گے ورنہ تو آزادی اور اختیار کا کوئی مفہوم نہیں رہے گا۔

"ثم الی مرجعکم فاحکم بینکم فیما کنتم فیہ تختلفون"

جو کچھ گذشتہ جملوں میں کہا جا چکا ہے وہ اس جہان کی کامیابیوں کے بارے میں تھا لیکن آخری فیصلہ جو در اصل اعمال کے نتائج پر مبنی ہے اس کا ذکر اس جملے میں کیا گیا ہے۔ فرمایا: تم سب میری طرف پلٹ آؤ گے اور میں تمہارے اور ان چیزوں کے درمیان جن میں تم اختلاف کرتے ہو فیصلہ کروں گا۔

۵۶۔ فَاَمَّا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِیْدًا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ ۫ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ ۝

۵۷۔ وَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَیُوَفِّیْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ ۝

۵۸۔ ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَیْكَ مِنَ الْاٰیٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِیْمِ ۝

ترجمہ

۵۶۔ رہے وہ لوگ جو کافر ہو گئے ہیں (اور انہوں نے حق کو پہچاننے کے باوجود اس کا انکار کر دیا ہے) انہیں دنیا و آخرت میں سخت عذاب کروں گا اور ان کے یار و مددگار نہیں ہیں۔

۵۷۔ اور رہے وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور انہوں نے نیک عمل انجام دیے ہیں تو خدا انہیں ان کا پورا پورا اجر و ثواب دے گا اور خدا ظالموں کو دوست نہیں رکھتا۔

۵۸۔ یہ جو کچھ ہم تیرے لیے پڑھتے ہیں، تیری حقانیت کی نشانی اور حکیمانہ تذکرہ ہے



تفسیر

"فاما الذین کفروا فاعذبھم عذابًا شدیدًا فی الدنیا والاٰخرۃ ؗ وما لھم من نصرین"

یہ ذکر کرنے کے بعد کہ لوگوں کی بازگشت اللہ کی طرف ہے اور وہی ان کے درمیان فیصلہ کرے گا اب اِس آیت میں اِس تضادات کا نتیجہ بیان ہوا ہے کہ وہ افراد جو کافر ہیں اور حق و عدالت کے مخالف ہیں، جیسے وہ اِس دُنیا میں دردناک عذاب اور تکلیف میں مبتلا ہوں گے اُس جہان میں بھی ان کی یہی حالت ہوگی اور کوئی بھی ان کی حمایت اور مدد نہیں کرے گا۔

" واما الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت فیوفیھم اجورھم"

لیکن جو ایمان لائے ہیں اور عمل صالح بجا لاتے ہیں وہ لوگ اپنا پورا پورا اجر و ثواب حاصل کریں گے اور خدا کبھی ظالموں کو پسند نہیں کرتا " واللہ لا یحب الظّٰلمین "۔

پہلی آیت میں عذابِ دُنیا کی طرف بھی اشارہ ہوا تھا اِس سے ہم ضمناً یہ استفادہ کرتے ہیں کہ کفار (جن سے یہاں یہودی مراد ہیں) اِس جہان میں بھی پریشانیوں اور مصیبتوں میں گرفتار رہیں گے۔ یہودی قوم کی تاریخ اِس دعویٰ پر گواہ ہے۔ ان پر دوسری حکومتوں کے تفوق کا یہ ایک اثر ہے جس کی طرف گذشتہ آیات میں اشارہ ہوا ہے۔

" ذٰلک نتلوہ علیک من الاٰیٰت والذکر الحکیم"

حضرت مسیحؑ کی سرگزشت اور ان کی عجیب و غریب تاریخ کے ایک گوشے کا ذکر کرنے کے بعد اب رُوئے سخن پیغمبر اسلامؐ کی طرف ہے۔ فرماتا ہے: اور جو کچھ ہم نے تیرے سامنے پڑھا ہے وہ تیری دعوت و رسالت کی صداقت کی آیات اور نشانیاں ہیں اور حکمت آمیز یادآوری ہے جو آیات قرآن کی صورت میں تجھ پر نازل ہوئی اور یہ وہ آیات محکم ہیں جو ہر قسم کے سبزل، باطل اور خرافات سے پاک ہیں اور حقائق کو واضح کرتی ہیں۔

۵۹۔ اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَہٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ○

۶۰۔ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّکَ فَلَا تَکُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِیْنَ ○



ترجمہ

۵۹۔ عیسٰی کی مثال خدا کے نزدیک آدم کی سی ہے ، جسے خدا نے مٹی سے پیدا کیا۔ پھر اُس سے کہا : ہو جا تو وہ فوراً ہو گیا (اس لیے باپ کے بغیر مسیح کی ولادت ہرگز اُن کی الوہیت کی دلیل نہیں بن سکتی)۔

۶۰۔ یہ چیزیں تیرے پروردگار کی طرف سے حقائق ہیں لہٰذا تم تردّد و شک کرنے والوں میں سے نہ بنو۔

شانِ نزول

جیساکہ سورہ کی ابتداء میں تفصیل سے بیان ہو چکا ہے اِس سورہ کی کافی آیات نجران کے عیسائیوں کے سوال کے جواب کے طور پر نازل ہوئیں ۔ وہ ایک ساٹھ رکنی وفد کی صورت میں پیغمبر اسلامؐ کے پاس مدینہ میں آئے۔ اُس میں اُن کے چند نمائندہ رُؤسا اور بزرگ شامل تھے ۔

اُنہوں نے جو مسائل پیغمبر اکرمؐ کے سامنے پیش کیے ان میں سے ایک مسئلہ یہ تھا کہ وہ پُوچھنے لگے کہ آپ ہمیں کس چیز کی طرف دعوت دیتے ہیں ۔ رسُول اللہؐ نے فرمایا : خدائے یگانہ کی طرف اور یہ کہ میں اُس کی طرف سے ہدایتِ مخلوق کی رسالت کے منصب پر فائز ہوں نیز یہ کہ مسیح اُس کے بندوں میں سے ایک تھے ، حالاتِ بشری رکھتے تھے اور دوسرے لوگوں کی طرح غذا کھاتے تھے ۔ انہوں نے یہ بات نہ مانی اور باپ کے بغیر حضرت عیسٰی کی ولادت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے ان کی الوہیت کے لیے دلیل کے طور پر پیش کیا۔ اِس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور اُنہیں جواب دیا گیا۔ لیکن جب وہ یہ جواب قبول کرنے پر بھی تیار نہ ہوئے تو اُنہیں مباہلہ کی دعوت دی گئی جس کی تفصیل عنقریب بیان کی جائے گی ۔

تفسیر

پہلی آیت میں ایک مختصر اور واضح استدلال ہے جس میں نجران کے عیسائیوں کے حضرتِ عیسٰیؑ کے بارے میں دعوٰئ الوہیت کا جواب ہے ۔ فرمایا گیا ہے کہ اگر حضرت عیسٰی باپ کے بغیر پیدا ہوئے تو یہ امر اس کی دلیل کبھی نہیں بن سکتا کہ وہ خُدا کے بیٹے یا خود خدا تھے ، کیونکہ یہ بات تو حضرت آدمؑ کے بارے میں عجیب ترین صورت میں محقق اور ثابت ہو چکی ہے ۔ وہ تو ماں باپ دونوں کے بغیر دُنیا میں آئے تھے ۔ اِس لیے جیسے حضرت آدم کی مٹی



سے پیدائش کوئی تعجب کی بات نہیں اور خدا جو کام انجام دینا چاہے اس کا فعل اور ارادہ ہم آہنگ ہیں، اس طرح حضرت عیسٰیؑ کا اپنی والدہ سے بغیر باپ کے پیدا ہونا کوئی محال مسئلہ نہیں ہے بلکہ حضرت آدمؑ کی پیدائش کئی لحاظ سے زیادہ تعجب خیز ہے۔ پس اگر بغیر باپ کے حضرت عیسٰیؑ کی پیدائش ان کی الوہیت کی دلیل ہے تو حضرت آدمؑ اس امر کے زیادہ مستحق ہیں۔

مندرجہ بالا آیت میں پہلے حضرت آدمؑ کی خلقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: "خلقہ من تراب" (یعنی ۔ اسے مٹی سے پیدا کیا)۔ دوسرے جملوں کے قرینے سے، اس جملے سے مراد حضرت آدمؑ کے جسم اور مادی پہلو سے ان کی خلقت ہے۔ اس کے بعد دوسرے جملے میں ان کی حیات اور روح کی خلقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: "ثم قال لہ کن فیکون" (پھر اس سے کہا ہو جا تو وہ ہوگیا) یعنی حکم خلقت کے ساتھ حیات اور روح آدم کے قالب میں پھونک دی۔ یہی وجہ ہے کہ بعض حضرات عوالم کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں، عالم خلق (عالم مادہ) اور عالم امر (عالم ماورائے مادہ) اور یہ دونوں ہی فرمان خدا کے تابع ہیں ارشاد الٰہی ہے:

"الا لہ الخلق والامر"

"آگاہ رہو کہ عالم خلق و امر اسی کی طرف سے ہے۔" (اعراف ۔ ۵۴)

پھر اس بات کی تاکید کے طور پر فرمایا: جو کچھ ہم نے مسیح کے بارے میں تم پر نازل کیا ہے، یہ پروردگار کی طرف سے ایک ایسی حقیقت ہے جس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں اور اس کے بارے میں اپنے اندر کسی قسم کے تردد کو جگہ نہ دینا۔

"الحق من ربک" ـــــ اس جملے کے بارے میں مفسرین نے دو احتمالات پیش کیے ہیں۔

پہلا یہ کہ یہ جملہ مبتداء اور خبر سے مرکب ہے۔ یعنی "الحق" مبتداء ہے اور "من ربک" خبر ہے۔ اس بناء پر اس کا معنی یہ ہوگا: حق ہمیشہ تیرے پروردگار ہی کی طرف سے ہوگا کیونکہ حق کا معنی ہے واقعیت اور واقعیت عین ہستی وجود ہے اور تمام ہستیاں اور وجود اُس کے وجود سے ہیں اور باطل عدم و نیستی ہے جو اس کی ذات سے بیگانہ ہے۔

دوسرا یہ کہ یہ جملہ مبتدائے محذوف کی خبر ہے جو کہ "ذٰلک الاخبار" ہے۔ یعنی یہ خبریں جو آپ کو بتائی گئی ہیں، سب پروردگار کی طرف سے حقائق ہیں۔

یہ دونوں مفاہیم آیت کے لیے مناسب ہیں۔

۶۱۔ فَمَنْ حَآجَّکَ فِیْهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَکَ مِنَ



الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ قف ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ○

ترجمہ

۶۱ــ اِس علم و دانش کے بعد جو (عیسٰی کے بارے میں) تمہارے پاس پہنچا ہے۔ پھر بھی کوئی تم سے جھگڑے تو اسے کہہ دو: آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلاتے ہیں تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ، ہم اپنی عورتوں کو بلاتے ہیں۔ تم اپنی عورتوں کو بلاؤ اور ہم اپنے نفسوں کو بلاتے ہیں تم اپنے نفسوں کو بلاؤ۔ پھر مباہلہ کریں گے اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت کریں گے۔

تفسیر

مُباهلہ کیا ہے۔

"مُباهلہ" دراصل "بَهل" کے مادہ سے ہے۔ اس کا معنی ہے "رہا کرنا" اور کسی کی قید و بند کو ختم کر دینا۔ اسی بناء پر جب کسی جانور کو اس کے حال پر چھوڑ دیں اور اُس کے پستان کسی تھیلی میں نہ باندھیں تاکہ اُس کا نوزائیدہ بچہ آزادی سے اُس کا دودھ پی سکے تو اُسے "باھل" کہتے ہیں۔ دعا میں "ابتھال" تفرع و زاری اور کام خدا کے سپرد کرنے کے معنی میں آتا ہے۔

کبھی کبھار یہ لفظ ہلاکت، لعنت اور خدا سے دوری کے معنی میں اس لیے استعمال ہوتا ہے کہ بندے کو اُس کے حال پر چھوڑ دینا منفی نتائج کا حامل ہوتا ہے۔ یہ تو تھا "مُباهلہ" کا مفہوم اصل لغت کے لحاظ سے لیکن اس مروج مفہوم کے لحاظ سے جو اُوپر والی آیت میں مراد لیا گیا ہے یہ دو اشخاص کے درمیان ایک دوسرے پر نفرین کرنے کو کہتے ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ دو گروہ جو کسی اہم مذہبی مسئلے میں اختلاف رائے رکھتے ہوں، ایک جگہ جمع ہو جائیں، بارگاہِ الٰہی میں تفرع کریں اور اُس سے دعا کریں کہ وہ جھوٹے کو رسوا و ذلیل کرے اور اسے سزا و عذاب دے۔

دعوتِ مُباهلہ

مندرجہ بالا آیت میں خدا تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو حکم دیا ہے کہ ان واضح دلائل کے بعد بھی کوئی شخص تم سے حضرت عیسٰی کے بارے میں گفتگو اور جھگڑا کرے تو



اسے " مُباہلہ " کی دعوت دو اور کہو کہ وہ اپنے بچوں، عورتوں اور نفسوں کو لے آئے اور تم بھی اپنے بچوں عورتوں اور نفسوں کو بلاؤ، پھر دُعا کرو تاکہ خدا جھوٹوں کو رسوا کردے۔

"مُباہلہ" کی یہ صورت شاید قبل ازیں عرب میں مروّج نہ تھی اور یہ ایک ایسا راستہ ہے جو سو فی صد پیغمبر اکرمؐ کے ایمان اور دعوت کی صداقت کا پتہ دیتا ہے۔

کیسے ممکن ہے کہ جو شخص کامل ارتباط کے ساتھ خدا پر ایمان نہ رکھتا ہو وہ ایسے میدان کی طرف آئے اور مخالفین کو دعوت دے کہ آؤ! اکٹھے درگاہ خدا میں چلیں، اس سے درخواست کریں اور دُعا کریں کہ وہ جھوٹے کو رسوا کردے اور پھر یہ بھی کہے کہ تم عنقریب اس کا نتیجہ دیکھ لوگے کہ خدا کس طرح جھوٹوں کو سزا دیتا ہے اور عذاب کرتا ہے۔

یہ مسلّم ہے کہ ایسے میدان کا رُخ کرنا بہت خطرناک معاملہ ہے کیونکہ اگر دعوت دینے والے کی دُعا قبول نہ ہوئی اور مخالفین کو ملنے والی سزا کا اثر واضح نہ ہوا تو نتیجہ دعوت دینے والے کی رسوائی کے علاوہ کچھ نہ ہوگا۔

کیسے ممکن ہے کہ ایک عقلمند اور سمجھ دار انسان نتیجے کے متعلق اطمینان کئے بغیر اس مرحلے میں قدم رکھے۔ اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی طرف سے دعوت مُباہلہ اپنے نتائج سے قطع نظر، آپؐ کی دعوت کی صداقت اور ایمانِ قاطع کی دلیل بھی ہے۔

اسلامی روایات میں ہے کہ "مُباہلہ" کی دعوت دی گئی تو نجران کے عیسائیوں کے نمائندے پیغمبر اکرمؐ کے پاس آئے اور آپؐ سے مُہلت چاہی تاکہ اس بارے میں سوچ بچار کرلیں اور اس سلسلے میں اپنے بزرگوں سے مشورہ کرلیں۔ مشورے کی یہ بات ان کی نفسیاتی حالت کی چغلی کھاتی ہے۔ بہر حال مشورے کا نتیجہ یہ نکلا کہ عیسائیوں کے مابین یہ طے پایا کہ اگر محمد شور و غل، مجمع اور داد و فریاد کے ساتھ "مُباہلہ" کے لیے آئیں تو ڈرا نہ جائے اور مباہلہ کرلیا جائے کیونکہ اگر اس طرح آئیں تو پھر حقیقت کچھ بھی نہیں جبھی شور و غل کا سہارا لیا جائے گا اور اگر وہ بہت محدود افراد کے ساتھ آئیں، بہت قریبی خواص اور چھوٹے بچوں کو لے کر وعدہ گاہ میں پہنچیں تو پھر جان لینا چاہیے کہ وہ خدا کے پیغمبر ہیں اور اس صورت میں اُن سے "مباہلہ" کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے کیونکہ اس صورت میں معاملہ خطرناک ہے۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق عیسائی میدانِ مباہلہ میں پہنچے تو اچانک دیکھا کہ پیغمبرؐ اپنے بیٹے حسینؑ کو گود میں لیے حسنؑ کا ہاتھ پکڑے اور علیؑ و فاطمہؑ کو ہمراہ لیے آ پہنچے ہیں اور انہیں فرما رہے ہیں کہ جب میں دُعا کروں، تم آمین کہنا۔ عیسائیوں نے یہ کیفیت دیکھی تو انتہائی پریشان ہوئے اور مباہلہ سے رک گئے اور صلح و مصالحت کے لیے تیار ہوگئے اور اہل ذمہ کی حیثیت سے رہنے پر آمادہ ہوگئے۔

" فمن حاجّك فيه من بعد ما جاءك من العلم ...."

گذشتہ آیات میں حضرت مسیح کی الوہیت کی نفی پر استدلال تھا۔ اب اس آیت میں پیغمبر اکرمؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ اگر اس علم و دانش کے بعد بھی جو تمہارے پاس پہنچا ہے کچھ لوگ تم سے لڑیں جھگڑیں تو انہیں مباہلہ کی دعوت دو اور اُن سے کہو



کہ ہم اپنے بیٹوں کو بلاتے ہیں تم بھی اپنے بیٹوں کو بلاؤ ۔ ہم اپنی عورتوں کو دعوت دیتے ہیں تم بھی اپنی عورتوں کو بلاؤ اور ہم اپنے نفسوں کو بلاتے ہیں تم بھی اپنے نفسوں کو دعوت دو پھر ہم مباہلہ کریں گے اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت کریں گے ۔

بغیر کہے یہ بات واضح ہے کہ مباہلہ سے مراد یہ نہیں کہ طرفین جمع ہوں ، ایک دوسرے پر لعنت اور نفرین کریں اور پھر منتشر ہو جائیں کیونکہ یہ عمل تو نتیجہ خیز نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ دُعا اور نفرین عملی طور پر اپنا اثر ظاہر کرے اور جو جھوٹا ہو فوراً عذاب میں مبتلا ہو جائے ۔

آیت میں مباہلہ کا نتیجہ تو بیان نہیں کیا گیا لیکن چونکہ یہ طریقہ کار منطق و استدلال کے غیر موثر ہونے پر اختیار کیا گیا تھا اس لیے یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ مقصود صرف دعا نہ تھی بلکہ اس کا خارجی اثر پیش نظر تھا ۔

عظمتِ اہلِ بیتؑ کی ایک زندہ سند

شیعہ اور سُنّی مفسرین اور محدثین نے تصریح کی ہے کہ آیۂ مباہلہ "اہلبیتِ رسولؐ" کی شان میں نازل ہوئی ہے اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن افراد کو اپنے ہمراہ وعدہ گاہ کی طرف لے گئے تھے وہ صرف اُن کے بیٹے امام حسنؑ اور امام حسینؑ ، ان کی بیٹی فاطمہ زہراؑ اور حضرت علیؑ تھے ۔ اس بنا پر آیت میں "ابنآئنا" سے مراد صرف امام حسنؑ اور امام حسینؑ ہیں ۔ "نسآئنا" سے مراد جناب فاطمہؑ ہیں اور "انفسنا" سے مراد صرف حضرت علیؑ ہیں ۔

اس سلسلے میں بہت سی احادیث نقل ہوئی ہیں ۔ اہل سنت کے بعض مفسرین نے جو بہت کم تعداد میں ہیں اس سلسلے میں وارد ہونے والی احادیث کا انکار کرنے کی کوشش کی ہے مثلاً مؤلف "المنار" نے اس آیت کے ذیل میں کہا ہے :

> یہ تمام روایات شیعہ طریقوں سے مروی ہیں ۔ ان کا مقصد معین ہے ۔ انہوں نے ان احادیث کی نشر و اشاعت اور ترویج کی کوشش کی ہے ۔ جس سے بہت سے علماء اہل سنت کو بھی اشتباہ ہو گیا ہے ۔

لیکن اہل سنت کی بنیادی کتابوں کی طرف رجوع کیا جائے تو وہ نشاندہی کرتی ہیں کہ ان میں سے بہت سے طریقوں کا شیعوں یا اُن کی کتابوں سے ہرگز کوئی تعلق نہیں اور اگر اہل سُنت کے طریقوں سے مروی ان احادیث کا انکار کیا جائے تو ان کی باقی احادیث اور کتب بھی درجۂ اعتبار سے گر جائیں گی ۔

اس حقیقت کو زیادہ واضح کرنے کے لیے اہل سنت کے طریقے سے کچھ روایات ہم یہاں پیش کریں گے ۔

قاضی نور اللہ شوستری اپنی کتاب نفیس "احقاق الحق" کی جلد سوم طبع جدید صفحہ ۴۶ پر لکھتے ہیں :

> " مفسرین اس مسئلے میں متفق ہیں کہ "ابنآئنا" سے اس آیت میں امام حسنؑ اور امام حسینؑ مراد ہیں ، "نسآئنا"



سے " حضرت فاطمہ " مراد ہیں اور " انفسنا " میں حضرت
علیؑ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ۔"

اس کے بعد کتاب مذکور کے حاشیے پر تقریباً ساٹھ بزرگان اہل سنت کی فہرست دی گئی ہے جنہوں نے تصریح کی ہے کہ آیت مباہلہ اہل بیت رسولؐ کی شان میں نازل ہوئی ہے ۔ ان کے نام اور ان کی کتب کی خصوصیات صفحہ ۴۶ سے لے کر صفحہ ۷۶ تک تفصیل سے بیان کی گئی ہے ان شخصیتوں میں سے یہ زیادہ مشہور ہیں ۔

۱۔ مسلم بن حجاج نیشاپوری ۔ مولف صحیح مسلم جو نامور شخصیت ہیں اور ان کی حدیث کی کتاب اہل سنت کی چھ قابل اعتماد صحاح میں سے ہے ملاحظہ ہو مسلم ، ج ۷ ، ص۱۲۰ طبع مصر زیر اہتمام محمد علی صبیح ۔

۲۔ احمد بن حنبل نے اپنی "مسند" میں لکھا ہے ملاحظہ ہو جلد ۱ ، صفحہ ۱۸۵ طبع مصر ۔

۳۔ طبری نے اپنی مشہور تفسیر میں اسی آیت کے ضمن میں لکھا ہے ۔ دیکھئے جلد ۳ ، ص۱۹۲ طبع میمنیہ ، مصر ۔

۴۔ حاکم نے اپنی "مستدرک" میں لکھا ہے ، دیکھئے جلد ۳ ، ص۱۵ مطبوعہ حیدر آباد دکن ۔

۵۔ حافظ ابونعیم اصفہانی " کتاب "دلائل النبوۃ" ص۲۹۷ ، مطبوعہ حیدر آباد دکن ۔

۶۔ واحدی نیشاپوری " کتاب "اسباب النزول" ، ص۷۴ ، طبع ہندیہ ۔

۷۔ فخر رازی " نے اپنی مشہور تفسیر کبیر میں لکھا ہے ، دیکھئے جلد ۸ ، ص۸۵ ، طبع بہیہ ، مصر ۔

۸۔ ابن اثیر ، "جامع الاصول" ، جلد ۹ ، ص۴۷۰ ، طبع سنۃ المحمدیہ ، مصر ۔

۹۔ ابن جوزی "تذکرۃ الخواص" ، صفحہ ۱۷ ، طبع نجف ۔

۱۰۔ قاضی بیضاوی ، نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے ، ملاحظہ کریں جلد ۲ ، ص۲۲ ، طبع مصطفیٰ محمد ، مصر ۔

۱۱۔ آلوسی نے تفسیر "روح المعانی" میں لکھا ہے ۔ دیکھئے جلد سوم ص۱۶۷ ، طبع منیریہ ، مصر ۔

۱۲۔ معروف مفسر طنطاوی نے اپنی تفسیر "الجواہر" میں لکھا ہے ۔ جلد ۲ ، ص۱۲۰ ، مطبوعہ مصطفیٰ البابی الحلبی ، مصر ۔

۱۳۔ زمخشری نے تفسیر "کشاف" میں لکھا ہے ، دیکھئے جلد ۱ ، ص۱۹۳ ، مطبوعہ مصطفیٰ محمد ، مصر ۔

۱۴۔ حافظ احمد ابن حجر عسقلانی ، "الاصابۃ" ، جلد ۲ ، ص۵۰۳ ، مطبوعہ مصطفیٰ محمد ، مصر ۔

۱۵۔ ابن صباغ ، "فصول المہمۃ" ، ص۱۰۸ ، مطبوعہ نجف ۔

۱۶۔ علامہ قرطبی ، "الجامع لاحکام القرآن" ، جلد ۳ ، ص۱۰۴ ، مطبوعہ مصر ۱۹۳۶ ۔

"غایۃ المرام" میں "صحیح مسلم" کے حوالے سے لکھا ہے :

ایک روز معاویہ نے سعد بن ابی وقاص سے کہا : تم ابوتراب (علیؑ) کو سب و شتم کیوں نہیں کرتے ۔ وہ کہنے لگا ۔

جب سے علیؑ کے بارے میں پیغمبرؐ کی کہی ہوئی تین باتیں مجھے یاد آئی ہیں ،



میں نے اس کام سے صرف نظر کر لیا ہے ۔ ان میں سے ایک یہ تھی کہ جب آیت مباہلہ نازل ہوئی تو پیغمبرؐ نے صرف فاطمہؑ ، حسنؑ ، حسینؑ اور علیؑ کو دعوت دی ۔ اس کے بعد فرمایا " اللّٰھم ھٰؤلاء اھلی " (یعنی ـــ خدایا! یہ میرے نزدیکی اور خواص ہیں) ۔

تفسیر " کشاف " کے مؤلف اہل سنت کے بزرگوں میں سے ہیں ۔ وہ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں ۔

" یہ آیت اہل کساء کی فضیلت کو ثابت کرنے کے لیے قوی ترین دلیل ہے "۔

شیعہ مفسرین ، محدثین اور مورخین بھی سب کے سب اس آیت کے " اہل بیت " کی شان میں نازل ہونے پر متفق ہیں چنانچہ " نور الثقلین " میں اس سلسلے میں بہت سی روایات نقل کی گئی ہیں ۔ ان میں سے ایک کتاب " عیون اخبار الرضا " ہے ۔ اس میں ایک مجلس مناظرہ کا حال بیان کیا گیا ہے ۔ جو مامون نے اپنے دربار میں منعقد کی تھی ۔ اس میں ہے کہ امام علیؑ بن موسیٰ رضاؑ نے فرمایا :۔

خدا نے اپنے پاک بندوں کو آیت مباہلہ میں مشخص کر دیا ہے اور اپنے پیغمبر کو حکم دیا ہے :

" فمن حاجک فیہ من بعد ما جاءک من العلم فقل .... "

اس آیت کے نزول کے بعد پیغمبرؐ علیؑ ، فاطمہؑ ، حسنؑ اور حسینؑ کو اپنے ساتھ مباہلہ کے لیے لے گئے اور یہ ایسی خصوصیت اور اعزاز ہے کہ جس میں کوئی شخص اہل بیت پر سبقت حاصل نہیں کر سکا اور یہ ایسی منزلت ہے جہاں تک کوئی شخص بھی نہیں پہنچ سکا اور یہ ایسا شرف ہے جو اس سے پہلے کوئی حاصل نہیں کر سکا ۔[1]

تفسیر " برہان " ، " بحار الانوار " اور تفسیر " عیاشی " میں بھی اس مضمون کی بہت سی روایات نقل ہوئی ہیں جو تمام اس امر کی حکایت کرتی ہیں کہ مندرجہ بالا آیت " اہل بیت " کے حق میں نازل ہوئی ہے

ایک اعتراض اور اس کا جواب

اس مقام پر ایک مشہور اعتراض کیا جاتا ہے ۔ یہ اعتراض فخر الدین رازی اور بعض دوسرے لوگوں نے کیا ہے ۔

اعتراض یہ ہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ " ابناءنا " (ہمارے بیٹے) سے مراد " حسنؑ ، حسینؑ " ہوں جب کہ " ابناءنا " جمع ہے اور (عربی میں) جمع کا لفظ دو کے لیے نہیں ہوتا ۔ اس طرح کیسے ممکن ہے نساءنا

---

[1] " نور الثقلین " جلد ۱ ، صفحہ ۳۴۹ ، " برہان " جلد ۱ ، صفحہ ۲۹۰ ، " تفسیر عیاشی " جلد ۱ ، صفحہ ۱۷۷ ، " بحار " طبع جدید جلد ۲۰ صفحہ ۵۱ اور جلد ۶ ، صفحہ ۶۵۲ ۔



(ہماری عورتیں) جو جمع کا لفظ ہے صرف شہزادیٔ اسلام فاطمہؑ کے لیے ہو اور یوں ہی "انفسنا" سے صرف علیؑ مراد ہوں؟ اگر ایسا ہے تو پھر یہاں جمع کا صیغہ کیوں آیا ہے؟

اس کے جواب میں عرض ہے کہ پہلی بات اسی ضمن میں یہ ہے کہ بہت سی احادیث، بہت سے مشہور منابع اور معتبر اسلامی کتب میں جن میں شیعہ سنی سب شامل ہیں یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ آیت "اھل بیت" کے حق میں نازل ہوئی ہے اور ان میں تصریح کی گئی ہے کہ پیغمبر اکرمؐ سوائے علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ کے کسی کو مباہلہ کے لیے نہیں لے گئے۔ یہ بات آیت کی تفسیر کے لیے خود ایک واضح قرینہ ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ منجملہ ان قرائن کے جو آیات قرآن کی تفسیر کرتے ہیں ایک سنت اور قطعی شانِ نزول بھی ہے۔

اس بنا پر مذکورہ اعتراض کے جواب کی ذمہ داری فقط شیعوں پر نہیں ہے بلکہ تمام علماء اسلام کو اس کا جواب دینا ہوگا۔

دوسری بات یہ ہے کہ جمع کے صیغے کا مفرد یا تثنیہ پر اطلاق کوئی نئی بات نہیں۔ قرآن اور قرآن کے علاوہ ادبیات عرب بلکہ ادبیاتِ غیر عرب میں ایسا کثرت سے دکھائی دیتا ہے۔

اس کی وضاحت کچھ یوں ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک قانون بیان کرتے وقت یا کوئی عہد نامہ لکھتے وقت حکم کلی شکل میں اور جمع کے صیغے کے ساتھ آتا ہے۔ مثلاً کسی عہد نامہ میں یوں لکھا جاتا ہے:-

اس کے اجراء کے ذمے دار عہد نامے پر دستخط کرنے والے اور ان کے بیٹے ہوں گے۔

حالانکہ ممکن ہے کہ طرفین میں سے ایک طرف صرف ایک یا دو بیٹے ہوں اور ایسا ہونا قانون یا عہد نامے کے صیغہ جمع کے منافی نہیں ہے۔

خلاصہ یہ کہ مرحلے دو ہیں۔ ایک مرحلۂ قرارداد اور دوسرا مرحلۂ اجراء، مرحلۂ قرارداد میں بعض اوقات الفاظ جمع کی صورت میں آتے ہیں تاکہ وہ تمام مصادیق پر منطبق ہوں لیکن مرحلۂ اجراء میں ممکن ہے مصداق ایک ہی فرد ہو اور ایک فرد کا ہونا مسئلے کے کلی ہونے کی نفی نہیں کرتا۔

دوسرے لفظوں میں پیغمبر اکرمؐ نصاریٰ سے طے کی گئی قرارداد کے مطابق ذمہ دار تھے کہ اپنے مخصوص خاندان کے تمام فرزند، عورتیں اور وہ تمام اشخاص جو آپ کی جان کے بمنزلہ ہوں انہیں اپنے ساتھ مباہلہ کے لیے لاتے لیکن ان کا مصداق دو بچوں، ایک خاتون اور ایک مرد کے سوا کوئی نہ تھا (غور کیجئے گا)۔

آیاتِ قرآن میں ایسے متعدد مواقع ہیں جہاں عبارت میں جمع کا صیغہ آیا ہے لیکن اس کا مصداق کسی جہت سے ایک ہی فرد ہے۔ مثلاً سورہ آل عمران، آیہ ۱۷۳ میں ہے:

"الذین قال لھم الناس ان الناس قد جمعوا لکم فاخشوھم":

"وہ افراد کہ جنہیں لوگوں نے کہا کہ دشمنوں نے (تم پر حملے کے لیے) اکٹھ کر لیا ہے، ان سے ڈرو"



مفسرین کی ایک جماعت نے تصریح کی ہے کہ یہاں "النّاس" سے مراد نعیم بن مسعود ہے جس نے ابو سفیان سے کچھ مال لے رکھا تھا تاکہ مسلمانوں کو مشرکین کی طاقت سے ڈرایا جائے۔

اسی طرح سورہ آل عمران آیہ ۱۸۱ میں ہے:۔

"لقد سمع اللہ قول الذین قالوآ ان اللہ فقیر ونحن اغنیاء":

"خدا نے ان لوگوں کی بات سن لی جو کہتے تھے : خدا فقیر ہے اور ہم تونگر و بے نیاز ہیں۔ اسی لیے اس نے ہم سے زکوٰۃ کا مطالبہ کیا ہے۔"

مفسرین کی ایک جماعت کی تصریح کے مطابق آیت میں "الّذین" سے مراد "حی بن اخطب" یا "فنحاص" ہے۔

ایک اور بات یہ ہے کہ کبھی مفرد کے لیے جمع کا صیغہ اس کی بزرگی کے اظہار کے لیے بھی ہوتا ہے جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں ہے۔

"انّ ابراھیم کان امّۃ قانتاً للّٰہ":

ابراہیم بارگاہِ الٰہی میں خضوع کرنے والی اُمّت تھے۔ (نحل - ۱۲۰)

بیٹی کی اولاد

آیۂ مباہلہ سے ضمنی طور پر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بیٹی کی اولاد کو بھی "ابن" (بیٹا) کہا جاتا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں اس کے برعکس مرسوم تھا کہ صرف بیٹے کی اولاد کو اپنی اولاد سمجھا جاتا اور کہا جاتا تھا کہ:

بنونا بنوابنائنا وبناتنا

بنوھنّ ابناء الرّجال الاباعد

یعنی ـــــ ہماری اولاد تو فقط ہمارے پوتے ہیں۔ رہے ہمارے نواسے تو وہ دوسروں کی اولاد ہیں نہ کہ ہماری۔

بیٹوں اور عورتوں کو انسانی معاشرے کا حقیقی حصّہ نہ سمجھنے کی طرزِ فکر بھی اسی غلط سنتِ جاہلیت کی پیداوار تھی۔ وہ عورتوں کو اپنی اولاد کی نگہداری کے لیے فقط ظرف سمجھتے تھے۔

جیسا کہ ان کے شاعر نے کہا ہے:۔



وانما امهات الناس اوعية
مستودعات وللانساب آباء

یعنی — لوگوں کی مائیں ان کی پرورش کے لیے ظروف کی حیثیت رکھتی ہیں
اور نسب کے لیے تو صرف باپ ہی پہچانے جاتے ہیں۔

اسلام نے اس طرز فکر کی شدید نفی کی اور اولاد کے احکام پوتوں اور نواسوں پر ایک ہی طرح سے جاری کیے۔
سورہ انعام آیہ ۸۴ اور ۸۵ میں حضرت ابراہیمؑ کی اولاد کے بارے میں ہے:

"ومن ذریته داود وسلیمٰن وایوب و
یوسف وموسٰی وهارون وکذٰلك نجزی
المحسنین وزکریا ویحیٰی وعیسٰی و
الیاس کل من الصٰلحین"

"اور اولاد ابراہیم میں سے داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ
اور ہارون تھے اور اس طرح ہم نیک لوگوں کو جزاء دیتے ہیں نیز
زکریا، یحییٰ اور عیسیٰ (بھی تھے) جو سب کے سب صالحین میں سے تھے۔"

اس آیت میں حضرت عیسیٰ کو حضرت ابراہیم کی اولاد میں سے شمار کیا گیا ہے حالانکہ وہ بیٹی کی اولاد تھے اور جو شیعہ سنی روایات امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے بارے میں مذکور ہیں ان میں بارہا "ابن رسول الله" (فرزند رسول) کا لفظ ان کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

وہ آیات جن میں ایسی عورتوں کا ذکر ہے جن سے نکاح کرنا حرام ہے ان کے لیے فرمایا گیا ہے:

"وحلائل ابنائکم"

یعنی — تمہارے بیٹوں کی بیویاں۔

فقہائے اسلام کے درمیان یہ مسئلہ مسلّم ہے کہ بیٹوں، پوتوں اور نواسوں کی بیویاں انسان پر حرام ہیں اور وہ سب مندرجہ بالا آیت میں داخل ہیں۔

کیا مباہلہ ایک عمومی حکم ہے

اس میں شک نہیں کہ مندرجہ بالا آیت میں مسلمانوں کو مباہلے کی دعوت نہیں دی گئی بلکہ روئے سخن پیغمبر اسلام کی طرف ہے تاہم یہ بات مخالفین کے مقابلے میں مباہلے کے عمومی حکم سے مانع نہیں۔ یعنی جب دلائل پیش کرنے کے باوجود دشمن مصر ہوں اور ہٹ دھرمی کا ثبوت دیں تو کامل تقویٰ اور خدا پرستی کے حامل اہل ایمان انہیں مباہلے



کی دعوت دے سکتے ہیں ۔

اسلامی منابع میں اِس ضمن میں مذکورہ روایات سے بھی اِس حکم کی عمومیت ثابت ہوتی ہے ۔ تفسیر نورالثقلین ،جلد۱ صفحہ۳۵۱ میں امام صادقؑ سے ایک حدیث منقول ہے ۔آپؑ نے فرمایا :

مخالفین تمہاری حق کی باتیں قبول نہ کریں تو انہیں دعوتِ مباہلہ دو ۔

راوی کہتا ہے :

میں نے سوال کیا کہ کیسے مباہلہ کریں ۔

فرمایا :

تین دن تک اپنی اخلاق اصلاح کرو ۔

راوی مزید کہتا ہے :

" میرا گماں ہے کہ آپ نے فرمایا روزہ رکھو اور غسل کرو ۔ جس سے مباہلہ کرنا چاہتے ہو اُسے صحرا میں لے جاؤ ۔ پھر اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیاں اس کے دائیں ہاتھ میں ڈالو اور اپنی طرف سے ابتداء کرو اور کہو : خداوندا ! تو سات آسمانوں اور سات زمینوں کا پروردگار ہے اور پوشیدہ اسرار سے آگاہ ہے اور رحمٰن و رحیم ہے ۔ میرے مخالف نے اگر حق کا انکار کیا ہے اور باطل کا دعویٰ کیا ہے تو آسمان سے اس پر بلا و مصیبت نازل فرما اور اسے دردناک عذاب میں مبتلا کر دے ۔ اس دعا کو دھراؤ اور کہو : یہ شخص اگر حق کا انکار کرتا ہے اور باطل کا دعویدار ہے تو آسمان سے اس پر بلا نازل کر دے اور اُسے عذاب میں مبتلا کر دے ۔

اِس کے بعد آپؑ نے فرمایا :

زیادہ وقت نہیں گزرے گا کہ اس دعا کا نتیجہ آشکار ہوگا ۔ خدا کی قسم میں نے ہرگز ایسا کوئی شخص نہیں پایا جو تیار ہو کہ اس طرح اس کے ساتھ مباہلہ کیا جائے ۔

ضمنی طور پر اس آیت سے اُن لوگوں کو بھی جواب مل جاتا ہے جو بے سوچے سمجھے اسلام کو مَردوں کا دین قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس میں عورتیں کسی شمار میں نہیں ہیں ۔ لیکن یہ آیت ثابت کرتی ہے کہ خاص مواقع پر اسلامی مقاصد کی پیش رفت کے لیے عورتیں بھی مردوں کے ساتھ ساتھ دشمن سے مقابلے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوتی تھیں ۔ بانوئے اسلام جناب فاطمہ زہراؑ ، ان کی دختر نیک اختر جناب زینب کبریٰؑ اور ایسی خواتین جو اُن کے نقش قدم پر چلیں ان کی زندگی کے درخشاں صفحات اِس حقیقت پر گواہ ہیں ۔

۶۲- اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا



اللّٰهُ ۚ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

ترجمہ

۶۲۔ یہ (حضرت عیسٰیؑ کی) حقیقی سرگذشت ہے (اور ان کی الوہیت اور خدا کا بیٹا ہونے کی سب باتیں بے بنیاد ہیں) اور خدائے یگانہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور خدا توانا و حکیم ہے۔

تفسیر

"قصص" مفرد ہے اور "قصہ" کے معنی میں ہے۔ دراصل یہ لفظ "قص" کے مادہ سے ہے اور کسی چیز کی جستجو کرنے کے معنی میں لیا گیا ہے۔ شلاً حضرت موسٰی بن عمران کے واقعہ میں ہے۔

"وقالت لاخته قصیه"

حضرت موسٰیؑ کی والدہ نے ان کی بہن سے کہا: موسٰی کی جستجو میں جاؤ۔ (القصص: ۱۱)

یہ جو خون کے بدلے کو "قصاص" کہتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح مقتول کے حق کی جستجو کی جاتی ہے۔

گذشتہ واقعات اور گزرے ہوئے لوگوں کی تاریخ بھی اُن کے حالاتِ زندگی کی جستجو ہے اسی لیے ان کے واقعہ کو "قصہ" کہتے ہیں۔

حضرت مسیحؑ کی زندگی کے حالات بیان کرنے کے بعد مندرجہ بالا آیت میں کہا گیا ہے کہ حضرت عیسٰی کے بارے میں ہم نے جو تفصیل تم سے بیان کی ہے وہ ایک واقعیت اور حقیقت ہے جو پروردگار کی طرف سے تم پر نازل ہوئی ہے اس لیے حضرت عیسٰیؑ کے بارے میں الوہیت، خدا کا بیٹا یا اس کی بجائے (معاذ اللّٰہ!) غیر شرعی بچہ قرار دینے کے سب دعوے بے بنیاد اور بے ہودہ ہیں۔

اس کے بعد تاکید کے طور پر مزید کہا گیا ہے: جو ذات پرستش کے لائق ہے وہ صرف خداوند توانا و حکیم ہے اور خدا کے علاوہ کسی کے لیے اس منصب کا قائل ہونا غیر مناسب اور خلافِ حقیقت ہے۔

۶۳۔ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ ۝



ترجمہ

۶۳ ۔ اگر (ان واضح شواہد کے باوجود وہ قبولِ حق سے) روگردانی کرتے ہیں (تو جان لو کہ وہ حقیقت کے متلاشی نہیں اور) خدا فساد کرنے والوں سے آگاہ ہے ۔

تفسیر

آیت کہتی ہے کہ مسیح کے بارے میں قرآن کے منطقی دلائل کے باوجود اور دعوتِ مباہلہ کے بعد بھی اگر وہ حق کو تسلیم نہیں کرتے اور اپنی ہٹ دھرمی جاری رکھتے ہیں تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ طالبِ حق نہیں بلکہ ناروا تعصبات، سرکشی، ہوا و ہوس اور اندھی تقلید میں گرفتار ہیں اور ان کا کام بہرصورت معاشرے میں فساد پیدا کرنا ہے۔

حقیقت یہی ہے کہ جو گروہ حق کے واضح ہو جانے کے باوجود اپنی ڈھٹائی ترک نہیں کرتا وہ حق کا متلاشی نہیں ہو سکتا بلکہ وہ طالبِ فساد ہے اور اس کا مقصد لوگوں کے صحیح عقائد کی بنیادوں کو کھوکھلا اور خراب کرنا ہے۔

۶۴۔ قُلْ يَآ اَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ○

ترجمہ

۶۴ ۔ کہیے : اے اہل کتاب! آؤ ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے کہ سوائے خدائے یگانہ کے کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی چیز کو اُس کا شریک قرار نہ دیں اور ہم میں سے بعض خدا کو چھوڑ کر بعض دوسروں کو خدا کے طور پر قبول نہ کریں ۔ جب (وہ اس دعوت سے) روگردانی کریں تو کہیے : گواہ رہو کہ ہم تو مسلمان ہیں ۔



تفسیر

قرآن نے سب سے پہلے عیسائیوں کو گذشتہ آیات کے ضمن میں منطقی استدلال پیش کیا اور ان کی مخالفت کے بعد دعوتِ مباہلہ دی ۔ جب اس دعوت نے اُن پر کافی نفسیاتی اثر ڈالا تو چونکہ وہ مباہلے کے لیے تیار نہ ہوئے اور شرائط ذمہ قبول کرلیں تو اُن کی اس روحانی آمادگی سے استفادہ کرتے ہوئے پھر سے استدلال شروع کیا لیکن یہ استدلال پہلے بہت مختلف ہے ۔ گذشتہ آیات میں اسلام کی دعوت اس کی تمام تر خصوصیات کے ساتھ تھی لیکن اس آیت میں اسلام اور اہل کتاب کے مشترک نقاط کی طرف دعوت دی گئی ہے ۔ حقیقت میں اس طرز استدلال سے قرآن ہمیں سکھاتا ہے کہ اگر کچھ لوگ اس بات پر تیار نہیں کہ تمہارے تمام مقدس اہداف و مقاصد میں تمہارا ساتھ دیں تو ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہ بیٹھ جاؤ اور کوشش کرو کہ کم از کم جس قدر تمہارے ساتھ وہ اشتراکِ ہدف رکھتے ہیں اتنا ہی ان کی ہمکاری حاصل کرلو اور اسے اپنے مقدس اہداف و مقاصد کی پیش رفت کے لیے بنیاد قرار دو ۔

مندرجہ بالا آیت اہل کتاب کے لیے وحدت و اتحاد کی پکار ہے اور انہیں کہتی ہے کہ تم دعویٰ کرتے ہو بلکہ اعتقاد رکھتے ہو کہ مسئلہ "تثلیث"[1] "توحید" کے عقیدے کے منافی نہیں اس لیے تثلیث میں وحدت کے قائل ہو اور اس طرح یہودی شرک آلود باتوں کے باوجود اور عزیر کو خدا کا بیٹا جاننے کے باوجود توحید کے مدعی ہیں یوں تم سب کے سب اصل میں اپنی "توحید" کو مشترک سمجھتے ہو اس لیے آؤ ہم ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر اس مشترک بنیاد کو مستحکم کریں اور ایسی غیر مناسب تفسیروں سے اجتناب کریں جن کا نتیجہ شرک ہو اور توحید خالص سے دُوری ہو ۔

" ولا یتخذ بعضنا بعضًا اربابًا من دون الله "۔

آیت کی ابتداء میں دو مرتبہ مسئلہ توحید کی طرف اشارہ ہوا ہے ۔ ایک "الا نعبد الا الله" (یعنی — آؤ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں) اور دوسرا " لا نشرك به شيئًا " (یعنی — کسی کو اس کا شریک قرار نہ دیں) اب زیر نظر جملے میں تیسری دفعہ اس اصل کا تذکرہ ہے لیکن زیادہ صراحت سے اور ذمہ داری کے حقیقی نقطے پر انگلی رکھ کر، کیونکہ جملے کا مفہوم یہ ہے کہ ہم میں سے بعض کو نہیں چاہیے کہ بعض دوسروں کو اپنا معبود اور پروردگار قرار دے لیں۔

ممکن ہے یہ تعبیر ان دو مطالب میں سے ایک کی طرف اشارہ ہو :

پہلا یہ کہ حضرت عیسیٰؑ جو انسان اور ہمارے ہم نوع ہیں انہیں الوہیت کے عنوان سے نہیں پہچانا جانا چاہیے ۔

دوسرا یہ کہ منحرف اور کج رو علماء جو اپنے مقام سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں اور خدا کے حلال و حرام کو اپنی مرضی سے بدلتے ہیں اُنہیں سند نہیں سمجھنا چاہیے اور نہ ان کی پیروی کرنا چاہیے ۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ علماء اہل کتاب میں ایک ایسا گروہ بھی تھا جو احکامِ خدا کو اپنے منافع اور تعصبات کے مطابق تحریف کرتا تھا ۔ منطق اسلام کی نظر سے جو شخص ایسے افراد کی جان بوجھ کر بلا مشروط پیروی کرے اُس نے ایک قسم کی عبودیت اور ان کی پرستش کی ہے ۔

اس کے لیے روشن دلیل موجود ہے کیونکہ قانون بنانا اور حلال و حرام کی تشریع خدا سے مربوط ہے جو شخص کسی اور کو اس سلسلے

---

[1] تین خداؤں کا عقیدہ



ہیں صاحب اختیار سمجھے اس نے اُسے خدا کا شریک قرار دیا۔
مفسرین نے اس آیت کے ذیل میں نقل کیا ہے کہ:

"عدی بن حاتم پہلے عیسائی تھا۔ پھر اسلام لے آیا۔ اس آیت کے نزول کے بعد اس نے لفظ "ارباب" سے یہ سمجھا کہ قرآن کہتا ہے کہ اہل کتاب اپنے بعض علماء کی پرستش کرتے ہیں۔ لہٰذا اُس نے پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں عرض کیا: گذشتہ زمانے میں ہم کبھی اپنے علماء کی عبادت نہیں کرتے تھے۔ آپؐ نے فرمایا: کیا تم لوگ جانتے تھے کہ وہ اپنی مرضی سے احکام خدا میں تغیر و تبدل کرتے ہیں اور پھر بھی تم ان کی پیروی کرتے تھے۔ عدی نے کہا: جی ہاں۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: یہی پرستش و عبادت ہے۔[1]

درحقیقت اسلام غلامی اور فکری استعمار کو ایک قسم کی عبودیت و پرستش سمجھتا ہے اور اسلام نے جس شدت سے شرک اور بت پرستی کا مقابلہ کیا ہے اسی شدت سے فکری استعمار سے بھی جنگ کی ہے کیونکہ یہ بھی بت پرستی کی مانند ہے۔

توجہ رہے کہ "ارباب" جمع کا صیغہ ہے اس بناء پر اس آیت سے صرف حضرت عیسیٰؑ کی پرستش کی نفی نہیں ہوتی۔ لیکن ممکن ہے کہ یہاں حضرت عیسیٰؑ کی عبودیت سے بھی نفی ہو اور منحرف و کج رو علماء کی عبودیت سے بھی۔

"فان تولوا فقولوا اشهدوا بانا مسلمون"۔

اگر وہ لوگ توحید کے مشترک نقطے کی طرف منطقی دعوت کے بعد بھی منہ پھیر لیں تو انہیں کہا جانا چاہیے کہ گواہ رہنا کہ ہم تو حق کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں اور تم نہیں کرتے۔ دوسرے لفظوں میں جان لو کہ کون لوگ حق کے متلاشی ہیں اور کون متعصب اور ہٹ دھرم۔

اس وقت انہیں "اشهدوا بانا مسلمون" یعنی — گواہ رہو کہ ہم مسلمان ہیں کے جملے سے خطرے کا الارم دو کہ حق سے تمہاری روگردانی اور دوری ہم پر کچھ بھی اثر نہیں رکھتی اور ہم اس طرح اپنے (اسلام کے) راستے پر چلتے رہیں گے، صرف خدا کی عبادت کریں گے، صرف اس کے قوانین قبول کریں گے (اور پختگی سے پہچانیں گے) اور ہمارے درمیان کسی بشر کی پرستش کا کسی شکل و صورت میں وجود نہیں ہوگا۔

پیغمبر اکرمؐ کے خطوط دنیا کے بادشاہوں کے نام

تاریخ اسلام سے معلوم ہوتا ہے کہ جب سرزمین حجاز میں اسلام کافی نفوذ کر چکا تو پیغمبر اکرمؐ نے اس زمانے کے بڑے بڑے حکمرانوں کے نام کئی ایک خطوط روانہ کیے۔ ان میں بعض خطوط میں مندرجہ بالا آیت کا سہارا لیا گیا ہے، جس میں آسمانی ادیان کی قدر مشترک کا تذکرہ ہے۔

ان میں سے بعض اہم خطوط کا ذکر کیا جاتا ہے۔

---

[1] "مجمع البیان" اوپر کی آیت کے بارے میں۔ تفسیر "نور الثقلین" جلد اول، صفحہ ۳۵۲



۱۔ مقوقسؑ کے نام خط

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

من ــــــــ محمد بن عبد اللہ

الی ــــــــ المقوقس عظیم القبط،

سلام علی من اتبع الھدٰی،

اما بعد: فانی ادعوک بدعایۃ الاسلام،

اسلم تسلم، یؤتک اللہ اجرک مرتین فان تولیت فانما علیک اثم القبط ــــ یا اھل الکتٰب تعالوا الیٰ کلمۃ سواء بیننا وبینکم ان لا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئا ولا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللہ فان تولوا فقولوا اشھدوا بانا مسلمون۔"

اللہ کے نام سے جو بخشنے والا بڑا مہربان ہے

از ــــــــ محمد بن عبد اللہ

بطرف ــــــــ قبطیوں کے مقوقس بزرگ

حق کے پیروکاروں پر سلام ہو۔

میں تجھے اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ اسلام لے آؤ تاکہ سالم رہو۔ خدا تجھے دوگنا اجر دے گا (ایک خود تمہارے ایمان لانے پر اور دوسرا ان لوگوں کی وجہ سے جو تمہاری پیروی کرکے ایمان لائیں گے) اور اگر تو نے قانونِ اسلام سے روگردانی کی تو قبطیوں کے گناہ تیرے ذمہ ہوں گے [2] ــــ اے اہل کتاب! ہم تمہیں ایک مشترک بنیاد کی طرف دعوت دیتے ہیں اور وہ یہ کہ ہم خدائے یگانہ کے سوا کسی کی پرستش نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک قرار نہ دیں اور ہم میں سے بعض دوسرے بعض کو خدا کے طور پر قبول نہ کریں اور جب وہ دینِ حق سے روگردانی کریں تو ان سے کہو کہ گواہ رہو ہم تو مسلمان ہیں۔

(مکاتیب الرسول، ج ۱، ص ۹۷)

---

[1] "مقوقس" (بروزن مفوض - بضم میم و بفتح ہر دو قاف) - "ھرقل" بادشاہ روم کی طرف سے مصر کا والی۔

[2] قبطی قوم مصر میں آباد تھی۔



جب مقوقس مصر کا حاکم تھا پیغمبر اسلامؐ نے دُنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں اور حکام کو خطوط لکھے اور انہیں اسلام کی طرف دعوت دی ۔ حاطب بن ابی بلتعہ کو آپؐ نے حاکم مصر مقوقس کی طرف یہ خط دے کر روانہ کیا ۔

پیغمبرؐ کا سفیر مصر کی طرف روانہ ہوا ۔ اُسے اطلاع ملی کہ حاکم مصر اسکندریہ میں ہے لہٰذا وہ اِس وقت کے ذرائع آمد و رفت کے ذریعے اسکندریہ پہنچا اور مقوقس کے محل میں گیا ۔ حضرتؐ کا خط اسے دیا ۔ مقوقس نے خط کھول کر پڑھا کچھ دیر تک سوچتا رہا ۔ پھر کہنے لگا :

" اگر واقعاً محمدؐ خدا کا بھیجا ہوا ہے تو اُس کے مخالفین اسے اس کی پیدائش کی جگہ سے باہر نکالنے میں کیوں کامیاب ہوئے اور وہ مجبور ہوا کہ مدینہ میں سکونت اختیار کرے ؟ اُن پر نفرین اور بد دعا کیوں نہیں کی تاکہ وہ نابود ہو جاتے ؟ "

پیغمبرؐ کے قاصد نے جواباً کہا :

" حضرت عیسیٰؑ خدا کے رسول تھے اور آپ بھی ان کی حقانیت کی گواہی دیتے ہیں ۔ بنی اسرائیل نے جب ان کے قتل کی سازش کی تو آپؑ نے ان پر نفرین اور بد دعا کیوں نہیں کی تاکہ خدا انہیں ہلاک کر دیتا ؟

یہ منطق سُن کر مقوقس تحسین کرنے لگا اور کہنے لگا :

" احسنت انت حکیم من عند حکیم "

" آفرین ہے ، تم سمجھدار آدمی ہو اور ایک صاحبِ حکمت کی طرف سے آئے ہو "

حاطب نے پھر گفتگو شروع کی اور کہا :

" آپ سے پہلے ایک شخص (یعنی فرعون) اس ملک پر حکومت کرتا تھا ۔ وہ مدتوں لوگوں میں اپنی خدائی کا سودا بیچتا رہا ۔ بالآخر اللہ نے اُسے نابود کر دیا تاکہ اس کی زندگی آپ کے لیے باعثِ عبرت ہو لیکن آپ کوشش کریں کہ آپ کی زندگی دوسروں کے لیے نمونۂ عبرت نہ بن جائے ۔ "

" پیغمبر اسلامؐ نے ہمیں ایک پاکیزہ دین کی طرف دعوت دی ہے ۔ قریش نے ان سے بہت سخت جنگ کی اور ان کے مقابل صف آراء ہوئے ۔ یہودی بھی کینہ پروری سے ان کے مقابلے میں آکھڑے ہوئے اور اسلام سے زیادہ نزدیک عیسائی ہیں ۔ "

" مجھے اپنی جان کی قسم جیسے حضرت موسیٰؑ نے حضرت عیسیٰؑ کی نبوت کی بشارت دی تھی اِس طرح حضرت عیسیٰؑ حضرت محمدؐ کے مبشر تھے ۔ ہم آپ کو اسلام کی دعوت دیتے ہیں جیسے آپ لوگوں نے تورات کے ماننے والوں کو انجیل کی دعوت دی تھی ۔ جو قوم پیغمبرِ حق کی دعوت کو سُنے اُسے چاہیے کہ اس کی پیروی کرے ۔ میں



نے محمدؐ کی دعوت آپ کی سرزمین تک پہنچا دی ہے۔ مناسب یہی ہے کہ آپ اور مصری قوم یہ دعوت قبول کرے۔"

حاطب کچھ عرصہ اسکندریہ ہی میں ٹھہرا تاکہ رسول اللہؐ کے خط کا جواب حاصل کرے۔ چند روز گزر گئے۔ ایک دن مقوقس نے حاطب کو اپنے محل میں بلایا اور خواہش کی کہ اُسے اسلام کے بارے میں کچھ مزید بتایا جائے۔

حاطب نے کہا:

"محمدؐ ہمیں خدائے یکتا کی پرستش کی دعوت دیتے ہیں اور حکم دیتے ہیں کہ لوگ روز و شب میں پانچ مرتبہ اپنے پروردگار سے قریبی رابطہ پیدا کریں اور نماز پڑھیں، سال میں ایک ماہ روزے رکھیں، خانۂ خدا (مرکز توحید) کی زیارت کریں، اپنے عہد و پیمان پورے کریں، خون اور مردار کھانے سے اجتناب کریں۔"

علاوہ ازیں حاطب نے پیغمبر اسلامؐ کی زندگی کی بعض خصوصیات بھی بیان کیں۔

مقوقس کہنے لگا:

"یہ تو بڑی اچھی نشانیاں ہیں۔ میرا خیال تھا کہ خاتم النبیینؐ سرزمین شام سے ظہور کریں گے جو انبیاء کی سرزمین ہے۔ اب معلوم ہوا کہ وہ سرزمین حجاز سے مبعوث ہوئے ہیں۔"

اس کے بعد اُس نے اپنے کاتب کو حکم دیا کہ وہ عربی زبان میں اس مضمون کا خط تحریر کرے:

محمدؐ بن عبداللہ کی طرف
قبطیوں کے بزرگ مقوقس کی جانب سے

"آپ پر سلام ہو۔ میں نے آپ کا خط پڑھا، آپ کے مقصد سے باخبر ہوا اور آپ کی دعوت کی حقیقت کو سمجھ لیا۔ میں یہ تو جانتا تھا کہ ایک پیغمبر ظہور کرے گا لیکن میرا خیال تھا کہ وہ خطۂ شام سے مبعوث ہوگا۔ میں آپ کے قاصد کا احترام کرتا ہوں۔"

پھر خط میں ان ہدیوں اور تحفوں کی طرف اشارہ کیا جو اُس نے آپؐ کی خدمت میں بھیجے۔ خط اُس نے ان الفاظ پر ختم کیا۔

"آپ پر سلام ہو" [1]

تاریخ میں ہے کہ مقوقس نے کوئی گیارہ قسم کے ہدیے پیغمبر اکرمؐ کے لیے بھیجے۔ تاریخ اسلام میں ان کی تفصیلات موجود ہیں۔ ان میں سے ایک طبیب بھی تھا تاکہ وہ بیمار ہونے والے مسلمانوں کا علاج کرے۔ نبی اکرمؐ نے دیگر ہدیے تو قبول فرما لیے لیکن طبیب کو قبول نہ کیا اور فرمایا:

"ہم ایسے لوگ ہیں کہ جب تک بھوک نہ لگے کھانا نہیں کھاتے اور سیر ہونے سے

---

[1] مکاتیب الرسولؐ، صفحہ



پہلے کھانے سے ہاتھ روک لیتے ہیں ۔یہی چیز ہماری صحت و سلامتی کے لیے کافی ہے۔
شاید صحت کے اس عظیم اصول کے علاوہ پیغمبر اسلامؐ اس طبیب کی وہاں موجودگی کو درست نہ سمجھتے ہوں کیونکہ وہ ایک متعصب عیسائی تھا لہٰذا آپؐ نہیں چاہتے تھے کہ اپنی اور مسلمانوں کی جان کا معاملہ اُس کے سپرد کردیں ۔
مقوقس نے جو سفیر پیغمبرؐ کا احترام کیا، آپؐ کے لیے ہدیے بھیجے اور خط میں نام محمدؐ اپنے نام سے مقدم رکھا یہ سب اس بات کی حکایت کرتے ہیں کہ اس نے آپؐ کی دعوت کو باطن میں قبول کرلیا تھا یا کم از کم اسلام کی طرف مائل ہوگیا تھا لیکن اس بناء پر کہ اس کی حیثیت اور وقعت کو نقصان نہ پہنچے ظاہری طور پر اس نے اسلام کی طرف اپنی رغبت کا اظہار نہ کیا ۔

۲۔ قیصرِ رُوم کے نام خط

"بسم الله الرحمٰن الرحيم .

من ـــــ محمد بن عبد الله

الی ـــــ هرقل عظيم الروم

سلام على من اتبع الهدى ـــ امّا بعد ؛

فانی ادعوك بدعاية الإسلام اسلم تسلم،

يؤتك الله اجرك مرتين فان توليت فانما

عليك اثم الاريسين ـــ "يا اهل الكتٰب تعالوا

الى كلمةٍ سوآءٍ بيننا وبينكم الّا نعبد الّا الله ولا

نشرك به شيئًا ولا يتخذ بعضنا بعضًا اربابًا

من دون الله فان تولّوا فقولوا اشهدوا

بانّا مسلمون"

خدائے رحمٰن و رحیم کے نام سے

از ـــــ محمد بن عبد اللہ

بطرف ـــــ ہرقل بادشاہ روم



"اُس پر سلام ہے جو ہدایت کی پیروی کرے ــــــ میں تجھے اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ اسلام لے آؤ تاکہ امان میں رہو۔ خدا تجھے دوگنا اجر دے گا (ایک تیرے ایمان لانے کا اور دوسرا ان لوگوں کا جو تیری وجہ سے ایمان لائیں گے) اور اگر تو نے روگردانی کی تو اریسیوں[1] کا گناہ بھی تیری گردن پر ہوگا ــــ اے اہل کتاب ہم تمہیں مشترک بنیاد کی طرف دعوت دیتے ہیں ــــ کہ غیر خدا کی عبادت نہ کرو اور کسی کو اس کا شریک قرار نہ دو۔ ہم میں سے بعض دوسرے بعض کو خدا کے طور پر قبول نہ کریں اور اگر وہ دینِ حق سے سرتابی کریں تو کہہ دو کہ گواہ رہو ہم تو مسلمان ہیں۔"

قیصر کے پاس نبی اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا پیغام پہنچانے کے لیے دحیہ کلبی مامور ہوا۔ سفیر پیغمبرؐ عازم روم ہوا۔ قیصر کے دارالحکومت قسطنطنیہ پہنچنے سے پہلے اسے معلوم ہوا کہ قیصر بیت المقدس کی زیارت کے ارادے سے قسطنطنیہ چھوڑ چکا ہے لہٰذا اُس نے بصریٰ کے گورنر حارث بن ابی شمر سے رابطہ پیدا کیا اور اسے اپنا مقصدِ سفر بتایا۔ ظاہراً پیغمبر اکرمؐ نے بھی اجازت دے رکھی تھی کہ دحیہ وہ خط حاکمِ بصریٰ کو دے دے تاکہ وہ اسے قیصر تک پہنچا دے۔ سفیر پیغمبرؐ نے گورنر سے رابطہ کیا تو اُس نے عدی بن حاتم کو بلایا اور اسے حکم دیا کہ وہ دحیہ کے ساتھ بیت المقدس کی طرف جائے اور خط قیصر تک پہنچا دے۔ حمص میں سفیر کی قیصر سے ملاقات ہوئی لیکن ملاقات سے قبل شاہی دربار کے کارکنوں نے کہا:

"تمہیں قیصر کے سامنے سجدہ کرنا پڑے گا ورنہ وہ تمہاری پرواہ نہیں کرے گا۔"

دحیہ ایک سمجھدار آدمی تھا، کہنے لگا:

"میں ان غیر مناسب بدعتوں کو ختم کرنے کے لیے اتنا سفر کر کے آیا ہوں۔ میں اس مراسلے کے بھیجنے والے کی طرف سے آیا ہوں تاکہ قیصر کو یہ پیغام دوں کہ بشر پرستی کو ختم ہونا چاہیئے اور خدائے واحد کے سوا کسی کی عبادت نہیں ہونی چاہیئے۔ اس عقیدے کے باوصف کیسے ممکن ہے کہ میں غیر خدا کے لیے سجدہ کروں۔"

پیغمبرؐ کے قاصد کی قوی منطق سے وہ بہت حیران ہوئے۔ درباریوں میں سے ایک نے کہا:

"تمہیں چاہیئے کہ خط بادشاہ کی مخصوص میز پر رکھ کر چلے جاؤ۔ اس میز پر رکھے ہوئے خط کو قیصر کے علاوہ کوئی نہیں اٹھا سکتا۔"

دحیہ نے اس کا شکریہ ادا کیا، خط میز پر رکھا اور خود واپس چلا گیا۔ قیصر نے خط کھولا۔ خط نے جو بسم اللہ سے شروع ہوتا تھا اسے متوجہ کیا اور کہنے لگا۔

"حضرت سلیمانؑ کے خط کے سوا آج تک میں نے ایسا خط نہیں دیکھا۔"

اُس نے اپنے مترجم کو بلایا تاکہ وہ خط پڑھے اور اس کا ترجمہ کرے۔ بادشاہ روم کو خیال ہوا کہ ہو سکتا ہے خط لکھنے والا وہی نبی ہو جس کا وعدہ انجیل اور تورات میں کیا گیا ہے۔ وہ اِس جستجو میں لگ گیا کہ آپؐ کی زندگی کی خصوصیات



معلوم کرے ۔ اُس نے حکم دیا کہ شام کے پورے علاقے میں چھان بین کی جائے ۔ شاید محمد کے رشتہ داروں میں سے کوئی شخص مل جائے جو ان کے حالات سے واقف ہو ۔ اتفاق سے ابوسفیان اور قریش کا ایک گروہ تجارت کے لیے شام آیا ہوا تھا شام اس وقت سلطنتِ روم کا مشرقی حصّہ تھا ۔ قیصر کے آدمیوں نے ان سے رابطہ قائم کیا اور اُنہیں بیت المقدس لے گئے ۔ قیصر نے اُن سے سوال کیا :۔

کیا تم میں سے کوئی محمّد کا نزدیکی رشتہ دار ہے ؟

ابوسفیان نے کہا :۔

میں اور محمّد ایک ہی خاندان سے ہیں اور ہم چوتھی پشت میں ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں ۔

پھر قیصر نے اُس سے کچھ سوالات کئے ۔ دونوں میں یوں گفتگو ہوئی :۔

قیصر : اس کے بزرگوں میں سے کوئی حکمران ہوا ہے ؟

ابوسفیان : نہیں

قیصر : کیا نبوت کے دعویٰ سے پہلے وہ جھوٹ بولنے سے اجتناب کرتا تھا ؟

ابوسفیان : ہاں محمّد راست گو اور سچا انسان ہے ۔

قیصر : کونسا طبقہ اس کا مخالف ہے اور کونسا موافق ؟

ابوسفیان : اشراف اُس کے مخالف ہیں ، عام اور متوسط درجے کے لوگ اُسے چاہتے ہیں ۔

قیصر : اس کے پیروکاروں میں سے کوئی اس کے دین سے پھرا بھی ہے ؟

ابوسفیان : نہیں

قیصر : کیا اُس کے پیروکار روز بروز بڑھ رہے ہیں ؟

ابوسفیان : ہاں

اس کے بعد قیصر نے ابوسفیان اور اُس کے ساتھیوں سے کہا :

" اگر یہ باتیں سچّی ہیں تو پھر یقیناً وہ پیغمبر موعود ہیں ۔ مجھے معلوم تھا کہ ایسے پیغمبر کا ظہور ہوگا لیکن مجھے یہ پتہ نہ تھا کہ وہ قریش میں سے ہوگا ۔ مَیں تیار ہوں کہ اس کے لیے خضوع کروں اور احترام کے طور پر اُس کے پاؤں دھوؤں [1] میں پیش گوئی کرتا ہوں کہ اس کا دین اور حکومت سرزمین روم پر غالب آئے گی ۔ "

پھر قیصر نے دحیہ کو بلایا اور اس سے احترام سے پیش آیا ۔ پیغمبر اکرمؐ کے خط کا جواب لکھا اور آپؐ کے لیے دحیہ کے ذریعے ہدیہ بھیجا اور آپؐ کے نام اپنے خط میں آپ سے اپنی عقیدت و تعلق کا اظہار کیا ۔[2]

---

[1] یہ احترام کے اظہار کا ایک طریقہ تھا جو ان دنوں مروج تھا ۔ [2] مکاتیب الرسول ، ج ۱ ، ص ۱۹



۶۵۔ یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِیْٓ اِبْرٰھِیْمَ وَ مَآ
اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَ الْاِنْجِیْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○
۶۶۔ ھٰٓاَنْتُمْ ھٰٓؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِیْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ
فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِیْمَا لَیْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ
وَاللّٰهُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○
۶۷۔ مَا كَانَ اِبْرٰھِیْمُ یَھُوْدِیًّا وَّ لَا نَصْرَانِیًّا وَّلٰكِنْ
كَانَ حَنِیْفًا مُّسْلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ○
۶۸۔ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰھِیْمَ لَلَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ
وَھٰذَا النَّبِیُّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ وَلِیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ ○

ترجمہ

۶۵۔ اے اہل کتاب! (حضرت) ابراہیم کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو (اور تم میں سے ہر ایک انہیں اپنے دین کا پیروکار سمجھتا ہے) حالانکہ تورات اور انجیل تو ان کے بعد نازل ہوئی ہیں، کیا تم عقل و فکر نہیں رکھتے۔

۶۶۔ تم تو وہی ہو جو اس چیز کے بارے میں گفتگو کرتے تھے جس کے بارے میں آگاہ ہوتے تھے اب ان چیزوں کے بارے میں گفتگو کیوں کرتے ہو جن سے آگاہ نہیں ہو۔ خدا جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

۶۷۔ ابراہیم یہودی تھے نہ نصرانی بلکہ وہ مخلص موحّد اور مسلمان شخص تھے اور وہ ہرگز مشرکین میں



سے نہیں تھے۔

۶۸۔ ابراہیم سے اولیت (اور زیادہ نسبت) رکھنے والے وہ لوگ ہیں جو ان کی پیروی کرتے ہیں (اور ان کے دور میں ان کے مکتب کے وفادار تھے اور اس طرح) یہ پیغمبر اور وہ لوگ جو (اس پر) ایمان لائے ہیں اور خدا مومنین کا ولی اور سرپرست ہے۔

تفسیر

"یآاھل الکتٰب لم تحآجون فی ابراھیم ...."

تاریخ کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ یہودی ظہور اسلام کے وقت ہی سے اس دین سے خاص دشمنی اور عداوت رکھتے تھے۔ اسلام کے نفوذ پھیلاؤ اور اس جدید دین کے ذریعے دینِ مسیحؑ کے منسوخ ہو جانے سے عیسائیوں کا ایک گروہ بھی اس کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ لوگ کبھی کبھی بحث مباحثے، حجت بازی اور جھگڑے کے لیے اپنے وفادار افراد کو نبی اکرمؐ کے پاس بھیجتے تھے اور وہ اس طرح اپنے دین کو بہتر ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

ان امور میں سے ایک یہ تھا کہ وہ سب کے سب کوشش کرتے کہ خدا کے عظیم پیغمبر حضرت ابراہیمؑ کو اپنے میں سے ثابت کریں کیونکہ حضرت ابراہیمؑ تمام مذاہب کے پیروکاروں میں معظم و محترم سمجھے جاتے تھے۔ یہودی مدعی تھے کہ وہ اُن میں سے ہیں اور اُن کے دین کے پیرو ہیں۔ یہی دعویٰ عیسائی بھی کرتے تھے۔

مندرجہ بالا آیت میں قرآن اُنہیں جواب دیتا ہے کہ اصولی طور پر خدا کے مبارز و مجاہد پیغمبر حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں تمہارا جھگڑا اور گفتگو ہی بیکار ہے کیونکہ وہ تو سالہا سال حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ سے پہلے ہو گزرے ہیں اور تورات و انجیل ان کے کئی سال بعد نازل ہوئیں۔

("وما انزلت التوراۃ والانجیل الا من بعدہ")

کیا یہ چیز معقول ہے کہ گذشتہ پیغمبر اپنے سے بعد والے دین کا پیروکار ہو افلا تعقلون کیا تم تفکر و تعقل نہیں کرتے۔

"ھآ انتم ھٰؤلاء حاججتم فیما لکم بہ علم فلم تحآجون فیما لیس لکم بہ علم"

یہاں خدا تعالیٰ انہیں سرزنش کرتا ہے کہ اپنے مذہب سے مربوط مسائل جن کا تمہیں علم تھا ان کے بارے میں تم نے گفتگو اور بحث کی ہے (اور تم نے دیکھ لیا جن مباحث کے بارے میں تمہارے خیال میں تمہیں علم تھا ان میں



بھی تم کیسے کیسے بڑے اشتباہات میں مبتلا اور حقیقت سے دور تھے اور واقع میں تمہارا علم جہل مرکب تھا۔ اس کے باوجود جس چیز کی تمہیں خبر نہیں اُس کے بارے میں بحث مباحثہ کرتے ہو اور نتیجے کے طور پر تم ایسا دعویٰ کرتے ہو جو کسی تاریخ کے مطابق درست نہیں۔

اس کے بعد آیت کے آخر میں گذشتہ مطالب کی تاکید کے لیے اور بعد والی آیت کی بحث کی طرف متوجہ کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے: خدا جانتا ہے اور تم نہیں جانتے "واللہ یعلم وانتم لا تعلمون"۔

"ما کان ابرٰھیم یھودیًا ولا نصرانیًا ...."

یہاں صراحت سے ان کے دعووں کا جواب دیا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے: ابراہیمؑ یہودی تھے نہ عیسائی بلکہ پاک اور خالص موحّد تھے اور خدا کے حضور سرِ تسلیم خم کیے ہوئے تھے اور کبھی تمہاری طرح شریک خدا کے قائل نہیں ہوئے تھے۔

توجہ رہے کہ لفظ "حنیف" مادہ "حنف" (بروزن "انف") سے ہے اور ایسے شخص یا چیز کے معنی میں بولا جاتا ہے جو کسی طرف مائل ہو اور قرآن کی زبان میں ایسے شخص کے لیے بولا جاتا ہے جو اپنے زمانے کے باطل دین سے منہ موڑ کر دین حق کی طرف مائل ہو۔

مندرجہ بالا آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی "حنیف" کے لقب سے توصیف کی ہے کیونکہ انہوں نے تقلید اور تعصب کے پردے چاک کر دیئے تھے آپ ایسے ماحول اور زمانے میں ہرگز بتوں کے سامنے نہیں جھکے جو بت پرستی میں غرق تھا لیکن زمانہ جاہلیت کے بُت پرست عرب بھی اپنے آپ کو حضرت ابراہیمؑ کے دین "حنیف" پر سمجھتے تھے اور یہ بات اتنی مشہور تھی کہ اہل کتاب انہیں "حنفا" کہتے تھے یوں لفظ "حنیف" کا بالکل متضاد معنی پیدا ہو گیا تھا اور ان کی نظر میں یہ لفظ بت پرستی کا مترادف اور ہم معنی ہو چکا تھا لہٰذا خداوند عالم نے حضرت ابراہیمؑ کی "حنیف" کے عنوان سے توصیف کرنے کے بعد "مسلمًا" اور "وما کان من المشرکین" کہہ کر ہر قسم کے دوسرے احتمال کی نفی کر دی۔

حضرت ابراہیمؑ کس طرح مسلمان تھے

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو دین موسیٰؑ و عیسیٰؑ کا پیروکار نہیں کہا جا سکتا تو بطریق اولیٰ انہیں مسلمان بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ وہ تو ان ادیان سے پہلے تھے، پھر قرآن ان کا تعارف "مسلم" کے طور پر کیوں کروا رہا ہے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن کی اصطلاح میں مسلم صرف پیغمبر اسلامؐ کے پیروکاروں کے معنی میں نہیں ہے بلکہ اسلام کا ایک وسیع معنی ہے اور خدا کے حضور تسلیم مطلق، توحید کامل، نیز ہر قسم کے شرک اور دوگانہ پرستی سے پاک کے معنی میں ہے اور اسی کے حضرت ابراہیمؑ علمبردار تھے۔

مکتب و ہدف کا رشتہ

"ان اولی الناس بابرٰھیم للذین



اتبعوہ ......"

خدا کے عظیم پیغمبر حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں اہل کتاب کی باتوں کے خاتمے کے لیے قرآن نے یہاں ایک بنیادی بات کی ہے۔ نیز ان میں سے ہر ایک انہیں اپنے میں سے سمجھتا تھا اور شاید زیادہ تر اس عظیم پیغمبر سے قرابت کے مسئلہ کا سہارا لیتے تھے یا نسب و قومیت کو ان سے قربت کی دلیل سمجھتے تھے اس لیے قرآن نے وضاحت کی ہے کہ انبیاء سے دوستی اور ارتباط صرف ایمان اور ان کی پیروی کے ذریعہ ہوتا ہے، اس بنا پر ابراہیمؑ سے زیادہ نزدیک وہی لوگ ہیں جو ان کے مکتب کی پیروی کرتے ہیں اور ان کے اہداف و مقاصد کے زیادہ وفادار ہیں چاہے وہ لوگ جو ان کے زمانے میں موجود تھے "للذین اتبعوہ" اور چاہے وہ لوگ جو ان کے بعد ان کے مکتب اور پروگرام کے وفادار رہے۔ مثلاً پیغمبر اسلام اور آپؐ کے پیروکار۔ اس کی دلیل بھی واضح ہے اور وہ یہ کہ انبیاء کا احترام ان کے مکتب و مذہب کی وجہ سے تھا نہ کہ ان کی قوم، قبیلے اور نسب کے سبب۔ لہٰذا ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ اہل کتاب اپنے مشرکانہ عقائد کی وجہ سے حضرت ابراہیمؑ کی دعوت کی سب سے اہم بنیاد ہی سے منحرف ہو گئے ہیں جب کہ پیغمبر اسلام اور مسلمان اس بنیاد پر قائم ہیں اور اس اصل کو اسلام کے تمام اصول و فروع میں وسعت دیتے ہوئے اس کے مخلص ترین وفادار ہیں۔ اس لیے یہ اعتراف کرنا چاہیئے کہ ابراہیمؑ سے زیادہ قریب یہ لوگ ہیں نہ کہ وہ۔

مندرجہ بالا آیت میں انبیاء سے رابطے کے لیے صرف مکتب و ہدف سے ربط کو دلیل شمار کیا گیا ہے اور کسی اور چیز کو نہیں لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ پیشوایان اسلام سے مروی روایات میں صراحت سے اسی کا سہارا لیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک روایت تفسیر "مجمع البیان" اور "نور الثقلین" میں حضرت علیؑ سے منقول ہے۔ آپؑ نے فرمایا:

"ان اولی الناس بالانبیاء اعملھم بما جاءوا بہ،
ثم تلا ھذہ الآیۃ. وقال ان ولی محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)
من اطاع اللہ وان بعدت لحمتہ وان عدو
محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) من عصی اللہ وان قربت
قرابتہ".

"انبیاء سے قریبی تعلق رکھنے والے لوگ وہ ہیں جو ان احکام پر سب سے زیادہ عمل کرتے ہیں ــــ محمدؐ کا دوست وہ ہے جو فرمان خدا کی اطاعت کرتا ہے اگرچہ نسبی طور پر وہ آپ سے دُور ہو اور محمدؐ کا دشمن وہ ہے جو خدا کی نافرمانی کرتا ہے اگرچہ وہ محمدؐ کا نزدیکی قرابت دار ہو"۔

"واللہ ولی المؤمنین"۔

آیت کے آخر میں خدا کے عظیم پیغمبروں کے مکتب کے حقیقی پیروکاروں کو بشارت دی گئی ہے کہ خدا ان کا ولی، سرپرست، محافظ، یاور اور نگہبان ہے۔



۶۹۔ وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ○

ترجمہ

۶۹۔ اہل کتاب (یہود) کا ایک گروہ چاہتا تھا کہ تمہیں گمراہ کر دے لیکن (انہیں جان لینا چاہیئے کہ وہ تمہیں گمراہ نہیں کر سکتے) وہ اپنے آپ کو ہی گمراہ کرتے ہیں. مگر سمجھتے نہیں۔

شان نزول

بعض مفسرین نے نقل کیا ہے کہ بعض یہودیوں کی کوشش تھی کہ پاک دل مسلمانوں میں سے مشہور افراد مثلاً معاذ اور عمار وغیرہ کو اپنے دین کی طرف دعوت دیں اور شیطانی وسوسوں کے ذریعے انہیں اسلام سے موڑ لیں. اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی جس کے ذریعے تمام مسلمانوں کو اس سلسلے میں خطرے سے باخبر کیا گیا۔

تفسیر

"ودت طآئفة من اهل الكتٰب لو يضلونكم"

جیسا کہ شان نزول میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ دشمنانِ اسلام خصوصاً یہودی مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ پیغمبر اسلامؐ کے نزدیکی صحابہ کے بارے میں بھی وہ خواہشمند تھے کہ انہیں اسلام سے پھیر لیں ظاہر ہے کہ اگر وہ رسول اللہؐ کے قریبی صحابہ میں سے ایک یا چند افراد ہی کو برگشتہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو اسلام پر ایک عظیم ضرب پڑتی اور دوسروں کو متزلزل کرنے کے لیے فضا ہموار ہو جاتی۔

مندرجہ بالا آیت میں دشمنوں کی اس سازش سے باخبر کیا گیا ہے. نیز انہیں کہا گیا ہے کہ وہ اس بے جا کوشش سے دست کش ہو جائیں۔ اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ مکتب پیغمبرؐ میں ان مسلمانوں کی تربیت اس حساب اور آگاہی سے ہوئی ہے کہ اُن کے لوٹ جانے کا کوئی احتمال نہیں۔ انہوں نے اسلام کو دل و جان سے اپنا لیا ہے اُنہوں نے اِس عظیم انسانی مکتب سے گہرا قلبی لگاؤ پیدا کر لیا ہے اور وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں. لہٰذا دشمن انہیں گمراہ نہیں کر سکتے بلکہ وہ تو فقط اپنے تئیں گمراہ کرتے ہیں اور یہ اس لیے کہ وہ شبہات پیدا کرتے ہیں، اسلام اور پیغمبرؐ



کی طرف غلط نسبتیں دیتے ہیں یوں وہ خود بدنیتی کی روح اپنے وجود میں پروان چڑھاتے ہیں۔ زیادہ واضح الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو شخص عیب جوئی اور اعتراض کرنے ہی میں معروف رہتا ہے اسے نقاط قوت دکھائی نہیں دیتے یا پھر تعصب اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے نورانی نقاط بھی اسے تاریک معلوم ہوتے ہیں۔ اس امر میں اصرار کے نتیجہ میں روز بروز وہ حق سے دور ہی ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس لیے قرآن کہتا ہے:

("وما یضلون الا انفسھم وما یشعرون")

"وما یشعرون" ـــ یعنی وہ شعور اور توجہ نہیں رکھتے۔ یہ جملہ اس نفسیاتی نکتہ کی طرف اشارہ ہے کہ کبھی انسان اپنے آپ سے آشنا نہیں ہوتا اور وہ اپنی باتوں کے زیر اثر بھی ہو جاتا ہے۔ جب وہ کوشش کرتا ہے کہ جھوٹ اور تہمت کے ذریعے دوسروں کو گمراہ کرے تو وہ اپنے آپ کو بھی اس کے اثرات سے نہیں بچا سکتا اور یہ غلط باتیں آہستہ آہستہ خود اس کے قلب و جان پر اثر کرنے لگتی ہیں۔ زیادہ وقت نہیں گزرتا کہ غلط بات اس کا راسخ عقیدہ بن جاتی ہے۔ ایسی باتوں کو اختیار کرکے وہ خود گمراہ ہو جاتا ہے۔

۷۰۔ یٰاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ○

۷۱۔ یٰاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○

ترجمہ

۷۰۔ اے اہل کتاب! کیوں آیات خدا سے کفر کرتے ہو جب کہ (ان کی صحت و صداقت کی) گواہی (بھی) دیتے ہو۔

۷۱۔ اے اہل کتاب حق کو باطل سے کیوں ملاتے ہو (اور انہیں مشتبہ کرتے ہو تاکہ لوگ سمجھ نہ سکیں اور گمراہ ہو جائیں) اور حقیقت چھپاتے ہو حالانکہ تمہیں معلوم ہے۔

تفسیر

"یٰاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ"

یہاں بھی روئے سخن اہل کتاب کی طرف ہے کہ وہ اپنی دشمنی اور ہٹ دھرمی سے کیوں دست کش نہیں ہوتے



اور توراۃ وانجیل میں پیغمبر اسلام کی نشانیاں پڑھنے اور ان سے علم و آگاہی رکھنے کے باوجود انکار کی راہ کیوں اختیار کرتے ہیں

"یَاَهْلَ الْکِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ."

دوبارہ اہل کتاب کو ڈرایا گیا ہے کہ وہ کیوں حق و باطل کو ایک دوسرے سے ملا دیتے ہیں اور علم رکھنے کے باوجود حقیقت کو کیوں چھپاتے ہیں اور توراۃ و انجیل کی وہ آیات جن میں پیغمبر اسلام کا تعارف کروایا گیا ہے اور جو ان کی حقانیت کی نشانیاں ہیں انہیں کیوں چھپاتے ہیں۔

درحقیقت پہلی آیت میں علم و آگاہی کے باوجود راہ حق سے خود ان کے انحراف پر مواخذہ کیا گیا ہے اور دوسری آیت میں دوسرے لوگوں کو منحرف کرنے پر۔

سورہ بقرہ آیہ ۴۲ کے ذیل میں بھی ہم اس سلسلے میں گفتگو کر چکے ہیں۔ وہ آیت مندرجہ بالا آیت کے مشابہ ہے:

۷۲۔ وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِیْٓ
اُنْزِلَ عَلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا
اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ۚ ○

۷۳۔ وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِیْنَكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ
الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ یُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ
اُوْتِیْتُمْ اَوْ یُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ
الْفَضْلَ بِیَدِ اللّٰهِ ۚ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ
وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ۚ ○

۷۴۔ یَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ
الْعَظِیْمِ ○



ترجمہ

۷۲ ۔ اہل کتاب (یہود) کی ایک جماعت نے کہا ، جاؤ اور) جو کچھ مومنین پر نازل ہوا ہے (ظاہراً) دن کی ابتداء میں اس پر ایمان لے آؤ اور دن کے آخر میں کافر ہو جاؤ (اور لوٹ آؤ) شاید وہ (تمہارے اس عمل سے اپنے دین سے) برگشتہ ہو جائیں (کیونکہ وہ تمہیں اہل کتاب اور گذشتہ آسمانی بشارتوں سے آگاہ سمجھتے ہیں اور یہ سازش انہیں متنزلزل کرنے کے لئے کافی ہے)۔

۷۳ ۔ اور سوائے اس شخص کے جو تمہارے دین کی پیروی کرتا ہے اور کسی پر ایمان نہ رکھو، کہو کہ ہدایت تو وہ ہے جو خدا کی طرف سے ہو (اور تمہاری یہ سازش اس کے مقابلے میں بے اثر ہے) (پھر وہ اپنے ساتھیوں سے مزید کہنے لگے کہ یہ نہ سمجھنا کہ) کسی کو تمہاری طرح (آسمانی کتاب) دی جائے گی یا یہ کہ تمہارے پروردگار کے دربار میں کوئی تم سے بحث کر سکے گا (بلکہ نبوت اور منطق ، یہ دونوں چیزیں صرف تمہاری قوم اور نسل میں ہیں) کہہ دو کہ فضل (نبوت ، عقل اور منطق کی عطا کسی میں منحصر نہیں ہے بلکہ وہ) خدا کے ہاتھ میں ہے اور وہ جسے چاہتا ہے (اور اس کا اہل سمجھتا ہے) عطا کرتا ہے اور خدا واسع (وسیع عطیات و عنایات کا مالک) اور (ان کے مناسب مواقع سے) آگاہ ہے۔

۷۴ ۔ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت سے نوازتا ہے اور اللہ عظیم عنایات و فضل کا مالک ہے۔

شان نزول

بعض گذشتہ مفسرین نے نقل کیا ہے کہ خیبر اور دیگر مقامات کے بارہ ۱۲ یہودی علماء نے مل کر بعض مومنین کا ایمان متزلزل کرنے کے لیے ایک سازش بنائی ۔ انہوں نے پروگرام بنایا کہ ایک صبح پیغمبر اسلامؐ کی خدمت میں



جائیں اور ظاہراً ایمان لے آئیں اور اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کریں لیکن دن کے آخر میں اس دین سے پلٹ آئیں اور جب ان سے پوچھا جائے کہ تم نے ایسا کیوں کیا ہے تو کہیں کہ ہم نے محمدؐ کی صفات کو قریب سے دیکھا ہے لیکن جب اپنی دینی کتب کی طرف رجوع کیا ہے یا اپنے علماء سے مشورہ کیا ہے تو دیکھا ہے کہ ان کی صفات اور طور طریقے اس سے مطابقت نہیں رکھتے جو کچھ ہماری کتب میں ہے لہٰذا ہم اپنے دین کی طرف پلٹ آئے ہیں۔

یہودی علماء کا خیال تھا کہ اس طرح بعض مسلمان کہیں گے کہ چونکہ یہ لوگ ہماری نسبت آسمانی کتب کا زیادہ علم رکھتے ہیں اس لیے جو کچھ یہ کہتے ہیں یقیناً سچ اور حق ہے اور یوں وہ متزلزل ہو جائیں گے۔

آیت کے متعلق ایک اور شانِ نزول بھی مذکور ہے۔ لیکن درج بالا شانِ نزول آیت کے معنی سے زیادہ نزدیک ہے۔

تفسیر

مندرجہ بالا آیت یہودیوں کی ایک اور تباہ کن سازش سے پردہ اٹھاتی ہے اور نشاندہی کرتی ہے کہ وہ مسلمانوں کا ایمان متزلزل کرنے کے لیے ہر ذریعہ استعمال کرتے تھے۔ ایک گروہ کے ارکین جنہیں قرآن نے "طآئفۃ" من اھل الکتب" کہا ہے آپس میں ایک دوسرے سے کہنے لگے: آؤ اور جو کچھ مسلمانوں پر نازل ہوا ہے دن کے آغاز میں اس پر ایمان لے آئیں اور دن کے آخر میں اس سے پلٹ آئیں۔ بعید نہیں کہ دن کے آغاز و اختتام سے مراد اتنی کم مدت ہو کہ لوگ کہہ سکیں کہ وہ اسلام کو دور سے کچھ اور سمجھتے تھے لیکن نزدیک سے کچھ اور پایا ہے۔ اس لیے بہت ہی جلد پلٹ آئے ہیں ان کا خیال تھا کہ یہ سازش یقینی طور پر ضعیف الاعتقاد لوگوں پر کافی اثر کرے گی خصوصاً اس لحاظ سے کہ وہ لوگ علماءِ یہود میں سے ہیں اور سب لوگ جانتے ہیں کہ وہ آسمانی کتابوں اور آخری پیغمبر کی نشانیوں سے پوری واقفیت رکھتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ یہ ایمان و کفر کم از کم نئے مسلمانوں کے اعتقاد کی بنیادیں تو ضرور ہلا دے گا۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں اپنی ماہرانہ سازش کی کامیابی کی بہت اُمید تھی اور "لعلھم یرجعون" ان کی اسی اُمید کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

"ولا تؤمنوآ الا لمن تبع دینکم"

انہوں نے تاکید کی کہ تمہارا ایمان فقط ظاہری ہونا چاہیئے اور تمہارا رشتہ صرف اپنے دین کے پیروکاروں سے ہونا چاہیئے۔ بعض تفاسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ خیبر کے یہودیوں نے مدینہ کے یہودیوں کو وصیت کی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم ان لوگوں کے زیر اثر آجاؤ جو پیغمبر اسلامؐ کے زیادہ قریب ہیں اور یوں ان پر ایمان لے آؤ کیونکہ ان کا عقیدہ اور نظریہ تھا کہ نبوت صرف نسل یہود میں رہے گی اور اگر کوئی پیغمبر ظہور کرے تو اسے یہودیوں میں سے ہونا چاہیئے۔

بعض مفسرین نے "لا تؤمنوا" کو "ایمان" کے مادہ سے "اعتماد و اطمینان" کے معنی میں لیا ہے۔ کیونکہ لغوی طور پر بھی اس کا یہی معنی ہے۔ اس بناء پر مندرجہ بالا جملے کا مفہوم یہ ہوا کہ یہ سازش بالکل مخفی ہونا چاہیئے اسے



سوائے یہودیوں کے یہاں تک کہ مشرکوں سے بھی بیان نہ کرو تاکہ یہ راز فاش نہ ہو جائے اور یہ پروگرام نقش برآب ہوکر نہ رہ جائے۔ مندرجہ بالا آیت کے ذریعے خدا تعالیٰ نے یہودیوں کی اس خفیہ سازش سے پردہ اُٹھا کر انہیں رسوا کیا تاکہ مومنین کے لیے بھی یہ درس عبرت ہو اور مخالفین کے لیے بھی ذریعہ ہدایت بنے۔

"قل ان الھدیٰ ھدی اللہ":

یہ جملہ اصطلاح میں ایک جملۂ معترضہ ہے جو پروردگار کی طرف سے ہے جب کہ اس سے پہلے اور بعد والے جملے میں یہودیوں کی گفتگو نقل کی گئی ہے۔

یہودیوں کی گفتگو کے درمیان زیر نظر جملے میں خدا تعالیٰ نے انہیں ایک مختصر اور جامع جواب دیا ہے کہ ہدایت تو خدا کی طرف سے ہے اور وہ کسی خاص نسل اور قوم میں منحصر نہیں ہے اور کوئی ضروری نہیں کہ پیغمبر صرف یہود میں سے ہو۔

دوسری بات یہ ہے کہ جنہیں پروردگار کی ہر قسم کی ہدایت میسر ہے وہ ان سازشوں سے متزلزل نہیں ہوں گے اور یہ تخریبی منصوبے ان پر اثرانداز نہیں ہوسکتے۔

"ان یؤتیٰ احد مثل ما اوتیتم او یحاجوکم عند ربکم..."

یہ یہودیوں کی گفتگو کا آخری حصہ ہے۔ اس جملے کی ابتدا میں ولا تصدقوا (اعتراف اور اعتماد نہ کرو) مقدر ہے۔ [1]

اِس بناء پر اس جملے کا معنی یہ ہوگا کہ کبھی یہ باور نہ کرو ساری دُنیا کے لوگوں میں سے کوئی شخص وہ افتخار اور امتیاز اور آسمانی کتب جو تمہیں نصیب ہیں، لے سکے گا اور یہ بھی باور نہ کرو کہ کوئی شخص روزِ قیامت درگاہِ خداوندی میں تم سے مباحثہ اور گفتگو کرکے تمہیں مغلوب کرسکے گا کیونکہ تم دُنیا کی بہترین قوم اور خاندان ہو نیز نبوت، عقل، درایت، منطق اور استدلال صرف تمہارے پاس ہے۔

خلاصہ یہ کہ یہودی اِس فضول منطق کے ذریعے خدا سے اپنا ارتباط ظاہر کرتے اور تمام قوموں سے اپنے تئیں برتر سمجھتے تھے اِسی لیے بعد والے جملے میں خدا تعالیٰ نے اُنہیں صراحت جواب دیا ہے۔

"قل ان الفضل بید اللہ یؤتیہ من یشآء واللہ واسع علیم":

کہیئے کہ مقام نبوت ہو، عقلی و منطقی استدلال ہو یا کوئی اور امتیاز، سب فضل و عطا خدا کی طرف سے ہے وہ جسے چاہتا ہے اور اہل سمجھتا ہے اسے نوازتا ہے۔ کسی نے اُس سے عہد و پیمان نہیں لے رکھا

---

[1] اگر گذشتہ حصے میں "لا تؤمنوا" (اطمینان نہ کرو) کے معنی میں ہو تو "ان یؤتیٰ احد مثل ما اوتیتم او یحاجوکم عند ربکم" کے دونوں حصے ہو سکتا ہے اِس پر معطوف ہوں۔



اور نہ ہی کوئی اُس سے قرابت یا رشتہ داری رکھتا ہے اس کا جود و عطا واسع ہے اور استحقاق کے مواقع سے وہ علیم و آگاہ ہے۔

"یختص برحمتہ من یشآء واللہ ذوالفضل العظیم"

اس آیت میں بھی گذشتہ بحث کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: خدا جسے چاہتا ہے اور اہل سمجھتا ہے اپنی مخصوص رحمتوں سے نوازتا ہے۔ اور مقام نبوت و منصب رہبری بھی اس کی رحمتوں میں سے ہیں اور کوئی شخص انہیں محدود نہیں کرسکتا اور ہر حالت میں عنایات، عطیات اور فضل عظیم اسی کی طرف سے ہے۔

پرانی سازشیں

مندرجہ بالا آیات در اصل قرآن کی پُر اعجاز آیات ہیں جو یہودیوں اور دشمنان اسلام کے اسرار سے پردہ اٹھاتی ہیں اور ان کی صدر اوّل میں مسلمانوں کو متزلزل کرنے کی سازشوں کو فاش کرتی ہیں۔ ان کی وجہ سے مسلمان بیدار ہو گئے اور دشمن کے تباہ کن وسوسوں سے بچ گئے۔ اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ موجودہ دور میں بھی اسلام کے خلاف ایسے ہی منصوبے بنتے رہتے ہیں۔ دشمن کے ذرائع ابلاغ جو پوری دنیا میں سب سے قوی ہیں اس سلسلے میں استعمال ہو رہے ہیں۔ دشمنوں کی کوشش ہے کہ اہل اسلام خصوصاً ان کی نوجوان نسل کے افکار کو اسلامی عقائد سے متزلزل کردیں۔ وہ اس کے لیے عالم، دانشور، مؤرخ، سائنسدان، صحافی یہاں تک کہ فلمی اداکار کا بھیس بھی استعمال کرتے ہیں وہ یہ حقیقت نہیں چھپاتے کہ ان کے پراپیگنڈا کا مقصد مسلمانوں کو یہودی یا عیسائی بنانا نہیں بلکہ ان کا ہدف نوجوانوں کو اسلامی عقائد سے برگشتہ کرنا ہے اور انہیں اپنے دین اور ثقافت کے مفاخر سے لاتعلق کرنا ہے۔ قرآن آج مسلمانوں کو ان سازشوں سے ہوشیار رہنے کی دعوت دیتا ہے۔

۷۵۔ وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ
اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ
اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ
قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِى الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ
وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ○
۷۶۔ بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ



يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝

ترجمہ

۷۵۔ اور اہل کتاب میں سے کچھ ایسے بھی ہیں کہ اگر تم انہیں بہت سی دولت بطور امانت دو تو وُہ تمہیں لوٹا دیں گے اور کچھ ایسے بھی ہیں کہ اگر اُنہیں ایک دینار بھی سپرد کرو تو وہ تمہیں ہرگز واپس نہ کریں گے مگر اس وقت تک جب تک تم ان کے سر پر کھڑے رہو (اور ان پر مسلط رہو) یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ کہتے ہیں ہم اُمیین (یہودیوں کے علاوہ کسی) کے سامنے جواب دہ نہیں ہیں اور خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں حالانکہ جانتے ہیں۔

۷۶۔ جی ہاں جو شخص اپنے عہد و پیمان پورے کرے اور پرہیزگاری اختیار کرے (خدا اُسے دوست رکھتا ہے کیونکہ) خدا پرہیزگاروں کو پسند کرتا ہے۔

شان نزول

یہ آیت دو یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے ۔ ان میں سے ایک امین اور صحیح آدمی تھا اور دُوسرا خائن اور پست فطرت ۔ پہلا شخص عبداللہ بن سلام تھا ۔ اس کے پاس ایک دولت مند نے ۱۲۰۰ اوقیہ[1] سونا بطور امانت رکھا ۔ عبداللہ نے وہ سب معین موقع پر واپس کر دیا۔

دوسرا شخص فنحاص بن عازورا تھا ۔ ایک قریشی نے اُس کے پاس ایک دینار بطور امانت رکھا ۔ فنحاص نے اس میں خیانت کی ۔ اس خیانت کی وجہ سے خدا تعالیٰ نے زیر نظر آیت میں اس کی مذمت کی ہے۔

بعض کہتے ہیں پہلا جملہ نصاریٰ کی ایک جماعت کے بارے میں ہے اور خیانت کرنے والے یہودی تھے۔

اگر آیت ان دونوں واقعات کے متعلق ہو تو بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اگرچہ زیادہ تر قرآنی آیات خاص مواقع پر نازل ہوئی ہیں لیکن وہ عمومی پہلو بھی رکھتی ہیں اور اصطلاح کے مطابق موقع و محل سے مختص نہیں ہیں۔

تفسیر

یہ آیت اہل کتاب کے ایک اور چہرے سے نقاب پلٹتی ہے اور وہ یہ کہ بعض یہودی عقیدہ رکھتے تھے کہ وہ

[1] اوقیہ : جمع اواق ۔ رطل کے بارہویں حصے کو کہتے ہیں جو سات مثقال کے برابر ہوتا ہے۔



دوسروں کی امانتوں کی حفاظت کے جوابدہ نہیں ہیں ۔ یہاں تک کہ وہ سمجھتے تھے کہ انہیں حق پہنچتا ہے کہ وہ امانتوں کو اپنی ملکیت بنالیں ۔

وہ کہتے تھے : ہم اہل کتاب ہیں ۔ پیغمبر ہم میں سے ہیں اور آسمانی کتاب ہمارے پاس ہے لہذا دوسروں کے اموال ہمارے لیے کوئی احترام نہیں رکھتے ۔ یہ خیال ان کے ہاں اتنا مسلّم تھا کہ وہ اعتقادی اور مذہبی رُخ اختیار کر چکا تھا " یقولون علی اللہ الکذب " یعنی وہ اللہ پر جھوٹ باندھتے تھے ۔ یہ جملہ اُن کے اسی رُخ کی طرف اشارہ کر رہا ہے ۔

یہودی کہتے تھے ہم عربوں کے مال میں تصرف کرنے اور انہیں غصب کرنے کے مجاز ہیں کیونکہ وہ مشرک ہیں اور حضرت موسٰی کے پروگرام پر عمل نہیں کرتے ۔

یہاں بات کا ایک اور پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ یہودیوں کا عربوں سے اقتصادی معاہدہ تھا اور وہ عربوں سے تجارت کرتے تھے ۔ جب عرب اسلام لے آئے تو یہودیوں نے ان کے حقوق کی ادائیگی سے انکار کر دیا اور یہ استدلال پیش کیا کہ معاملہ کے وقت تم ہمارے مخالف نہیں تھے ، اب جب کہ تم نے نیا مذہب اختیار کر لیا ہے تمہارا حق ساقط ہوگیا ہے ۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ آیت تصریح کرتی ہے کہ تمام اہل کتاب اس غیر انسانی طرزِ فکر کے موافق نہیں تھے ۔ بلکہ ان میں سے بعض لوگ دوسروں کے حقوق ادا کرنا اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے ۔ یہ اس امر کی علامت ہے کہ قرآن ہرگز نہیں چاہتا کہ ایک گروہ کی غلط کاری کی بناء پر سب کی مذمت کی جائے ۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے :

" ومن اھل الکتٰب مَن اِن تامنہ بقنطار یؤدہٖ الیک ومنھم مَن اِن تامنہ بدینار لا یؤدہٖ الیک الا ما دمت علیہ قآئما "

یعنی ـــــ بعض اہل کتاب ایسے ہیں کہ اگر انہیں کثیر دولت بھی امانت کے طور پر دی جائے تو وہ واپس کر دیں گے اور کچھ ایسے بھی ہیں کہ اگر انہیں ایک دینار بھی امانت کے طور پر سپرد کریں تو وہ لوٹاتے نہیں مگر یہ کہ کوئی ان کے مقابلے میں زیادہ طاقتور ہو۔[1]

" الا ما دمت علیہ قآئما " ـــــ یعنی جب تک تم ان کے سر پر مسلط نہ رہو ، آیت کے اس حصے سے یہودیوں کے بارے میں ایک کلّی اصول بھی معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ان میں سے بہت سے لوگ ایسے ہیں جو دوسروں کے حقوق کی ادائیگی کے بارے میں وہ طاقت و قدرت کے علاوہ کسی طریقے کو نہیں پہچانتے ۔ مسلمانوں کے پاس ان سے اپنے حقوق کے حصول کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ وہ طاقت حاصل کریں ۔ اسی طرح یہودی ان کے حقوق ادا کرنے کے لیے آمادہ ہو سکیں گے ۔ حالیہ سالوں میں ایشیا میں جو بہت سے حوادث رونما ہوئے ہیں اُنہوں نے یہ حقیقت پایۂ ثبوت کو پہنچا دی ہے کہ عالمی رائے عامہ

[1] " قنطار " کے معنی کے سلسلے میں اسی سورہ کی آیہ ۱۴ کے ذیل میں بحث ہو چکی ہے ۔



دُنیا بھر کے لوگوں کے افکار و نظریات اور حق و عدالت اور ایسی کوئی چیز ہمارے دشمنوں کے لیے کوئی مفہوم نہیں رکھتی اور وہ صرف طاقت کے سامنے جھکتے ہیں، کسی اور چیز کو خاطر میں نہیں لاتے اور یہ ان قابل توجہ حقائق میں سے ایک ہے جن کی قرآن میں پیش گوئی کی گئی ہے۔

"ذٰلک بانهم قالوا لیس علینا فی الأمیین سبیل"۔

اس جملے میں ان کی وہ منطق بیان کی گئی ہے جو وہ دوسروں کا مال کھانے کے لیے اختیار کیے ہوئے تھے اور وہ یہ کہ "اهل الکتٰب" "اُمّیین" (مشرکین اور عرب جو عموماً لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے) پر برتری رکھتے ہیں لہٰذا کوئی حرج نہیں اگر اہل کتاب ان کے مال کو اپنی ملکیت بنالیں۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اس پر کوئی مواخذہ نہیں ہوگا یہاں تک کہ اس جھوٹے امتیاز کی وہ خدا کی طرف نسبت دیتے تھے۔

مسلّم ہے کہ یہ منطق تو امانت میں خیانت کرنے سے زیادہ خطرناک ہے کیونکہ وہ خود کو اس معاملے میں حق بجانب سمجھتے تھے۔ قرآن ان کے جواب میں صراحت سے کہتا ہے:- "وَيَقُولُونَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ"۔ یعنی — وہ جان بوجھ کر خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں اور اس کی طرف ناروا نسبت دیتے ہیں۔ وہ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ ان کی آسمانی کتب میں دوسروں کے مال میں خیانت کرنے کی کوئی اجازت نہیں دی گئی لیکن وہ اپنے بُرے اعمال کی توجیہ کے لیے ایسی دروغ سازی کرتے ہیں اور اس کی نسبت خدا کی طرف دیتے ہیں۔

"بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ"۔

عربی زبان میں "بَلٰى" کسی مطلب کے ثابت کرنے کے لیے آتا ہے لیکن عام طور پر ایسے موقع پر آتا ہے کہ جہاں سوال منفی صورت میں ہو۔ جیسا کہ خدا فرماتا ہے۔

"اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ"

کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟

"قَالُوْا بَلٰى" — انہوں نے کہا ہاں۔ جیسے لفظ "نَعَمْ" اثبات کے لیے آتا ہے

مثلاً "فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ۚ قَالُوْا نَعَمْ ...."

کیا جس چیز کا تمہارے پروردگار نے وعدہ کیا اُسے تم نے حقیقی طور پر پا لیا

انہوں نے کہا ہاں۔ (اعراف - ۴۴)

مذکورہ آیت یہودیوں کے کلام کی نفی ہے۔ وہ کہتے تھے: "لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ....." یعنی — غیر اہل کتاب کا مال کھانا ہمارے لیے حرام نہیں ہے (یہ کہہ کر وہ اپنے آپ کو عملی طور پر آزاد سمجھتے تھے۔ اسی بے دلیل اور غیر مناسب دعوے کی بنیاد پر وہ دوسروں کے حقوق پر تجاوز کرنے سے باز نہیں آتے تھے۔

اس دور میں بھی جو لوگ انسانوں کی قسمت سے کھیل رہے ہیں، انسانی حقوق پامال کرتے ہیں اور تمام اصول



اور معاہدے ان کے لیے بازیچہ اطفال ہیں اور انہیں فقط اپنی خوشحالی سے غرض ہے ، شاید یہ بھی اسرائیلی منطق پر کاربند ہیں۔

اس کے برعکس قرآن نسلی اور شخصی پہلوؤں کو اہم نہیں سمجھتا اور خدا کے حقیقی دوست انہیں قرار دیتا ہے جو گناہ سے دُور رہتے ہیں، معاشرے کے حقوق کا احترام کرتے ہیں اور اپنے مقام و منصب سے غلط فائدہ نہیں اٹھاتے۔

آیت میں دراصل انسان کی حقیقی قیمت اور خدا کی دوستی کی میزان ایفائے عہد بالخصوص امانت میں خیانت نہ کرنے اور ہر موقع پر تقویٰ اختیار کئے رہنے کو قرار دیا ہے : "مَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰی فَاِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ"۔

آج بھی ایسے شواہد موجود ہیں جو ظاہر کرتے ہیں کہ اس منصب کے پیروکاروں کی ایک جماعت دنیا کے دیگر انسانوں کے بارے میں وہی عقیدہ رکھتی ہے اور دوسروں کے مال و دولت اور تمام چیزوں کو اپنے لیے مباح سمجھتی ہے۔ یہ شواہد قرآن کی عظمت اور اس کی منطق کی اصالت کی دلیل ہیں۔

یہ شواہد ان سے متعلقہ مقالوں اور مختلف کتب میں جمع کیے گئے ہیں۔ شوق رکھنے والے لوگ ان سے رجوع کر سکتے ہیں ——

ایک اشکال اور اس کی وضاحت

ممکن ہے یہاں یہ سوال پیدا ہو کہ اسلام میں بھی دوسروں کے مال کے متعلق یہی حکم نظر آتا ہے کیونکہ اسلام اجازت دیتا ہے کہ مسلمان دوسروں کے اموال کو اپنی ملکیت بنا لیں۔

بلاشبہ اسلام کی طرف ایسی نسبت دینا تہمت ہے کیونکہ اسلام کے قطعی احکام میں سے ہے کہ امانت میں خیانت کرنا جائز نہیں چاہے وہ مسلمان کی ہو یا غیر مسلم کی یہاں تک کہ وہ مشرک و بت پرست ہی کی کیوں نہ ہو۔ ایک مشہور حدیث میں امام سجادؑ سے منقول ہے :

"عَلَیْکُمْ بِاَدَاءِ الْاَمَانَةِ فَوَالَّذِیْ بَعَثَ مُحَمَّدًا بِالْحَقِّ نَبِیًّا لَوْ اَنَّ قَاتِلَ اَبِی الْحُسَیْنِ بْنِ عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ ائْتَمَنَنِیْ عَلَی السَّیْفِ الَّذِیْ قَتَلَهٗ بِهٖ لَاَدَّیْتُهٗ اِلَیْهِ"۔ [1]

امانت ادا کرنا تم سب پر لازم ہے۔ قسم ہے اس خُدا کی جس نے محمدؐ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا۔ اگر میرے والد حسین بن علی بن ابی طالب (علیہم السلام) کا قاتل وہی تلوار جس سے اُس نے انہیں شہید کیا ہے

[1] "امالی صدوق"، صفحہ ۱۴۹



میرے پاس بطور امانت رکھتا (اور میں قبول کرلیتا) تو (بھی) میں اس کی امانت اسے ادا کرتا۔

دوسری روایت میں امام صادقؑ سے منقول ہے۔ آپؑ نے فرمایا :۔

"اِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَبْعَثْ نَبِيًّا قَطُّ اِلَّا بِصِدْقِ الْحَدِيْثِ وَ اَدَاۗءِ الْاَمَانَةِ مُؤَدَّاتًا اِلَى الْبِرِّ وَالْفَاجِرِ" [1]

خدا نے کسی پیغمبر کو مبعوث نہیں کیا مگر یہ کہ ہر نیک و بد کے ساتھ راست گوئی اور امانت کی ادائیگی اس کے پروگراموں میں شامل تھی۔

اس لیے جو کچھ مندرجہ بالا آیت میں یہودیوں کی طرف سے امانت میں خیانت کرنے کے بارے میں بیان کیا گیا ہے، کسی طرح بھی مسلمانوں کو اس کی اجازت نہیں دی گئی اور مسلمان ذمہ دار ہیں کہ وہ بلا استثناء کسی کی امانت میں خیانت نہ کریں۔

۷۷۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ اَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰۗىِٕكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَ لَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ لَا يُزَكِّيْهِمْ ۠ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○

ترجمہ

۷۷۔ جو لوگ خدا سے باندھا ہوا عہد و پیمان اور (خدا کے مقدس ناموں سے کھائی گئی) اپنی قسموں کو تھوڑی سی قیمت پر فروخت کردیتے ہیں ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہوگا، خدا ان سے بات نہیں کرے گا، قیامت کے دن ان کی طرف (رحمت کی) نظر نہیں کرے گا، انہیں (گناہ سے) پاک نہیں کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

---

[1] "مشکوٰۃ الانوار" بنقل از "سفینۃ البحار"



شانِ نزول

بعض علماء یہود نے جن میں ابو رافع، حی بن اخطب اور کعب بن اشرف شامل تھا، جب دیکھا کہ ان کی اجتماعی حیثیت یہودیوں کے درمیان خطرے میں ہے تو کوشش کی کہ تورات میں آخری پیغمبر کے بارے میں جو نشانیاں تھیں اور تورات کے جو نسخے خود انہوں نے لکھے تھے ان میں تحریف کر دیں یہاں تک کہ وہ اس بات پر قسم بھی کھاتے کہ وہ تحریف شدہ جملے خدا کی طرف سے ہیں۔ اسی بناء پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور انہیں شدت سے خطرے کا الارم دیا گیا۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ آیت اشعث بن قیس کے بارے میں نازل ہوئی جو جھوٹے طریقے سے کسی کی زمین پر قبضہ کرنا چاہتا تھا اور اس کے لیے جب وہ جھوٹی قسم کھانے پر آمادہ ہوا تو مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی۔ اس پر اشعث ڈر گیا اور اعتراف حق کر لیا اور زمین اس کے مالک کو واپس کر دی۔

تفسیر

اس آیت میں یہود اور اہل کتاب کی بعض غلط کاریوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ البتہ آیت چونکہ عمومی صورت میں ہے اس لیے ان سب کے بارے میں ہے جن میں یہ صفات موجود ہیں۔

آیت کہتی ہے :۔ جو لوگ خدا سے باندھے ہوئے عہد و پیمان اور اس کے مقدس نام کی قسموں کو تھوڑی سی قیمت پر بیچتے ہیں وہ متعدد سزاؤں میں گرفتار ہوں گے :

پہلی یہ کہ وہ عالم آخرت کی بے شمار نعمتوں سے قابل ملاحظہ فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے "اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ"

دوسری یہ کہ خدا تعالیٰ روز قیامت صاحبانِ ایمان سے گفتگو کرے گا لیکن ایسے افراد سے کوئی کلام نہیں کرے گا "وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ"

تیسری یہ کہ اس دن ان سے اپنی نگاہ لطف و کرم اٹھائے گا "وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ"

چوتھی یہ کہ اس طرح انہیں گناہ کی آلودگیوں سے پاک نہیں کرے گا "وَلَا يُزَكِّيْهِمْ"

پانچویں یہ کہ اسی بناء پر ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا "وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ"

"ثَمَنًا قَلِيْلًا" (کم قیمت) سے مراد یہ ہے کہ انہیں ان عظیم گناہوں کے بدلے جو بھی مادی قیمت حاصل ہو جائے کم اور ناچیز ہے اگرچہ وہ وسیع حکومت ہی کیوں نہ ہو۔

واضح ہے کہ خدا کی گفتگو سے مراد زبان سے گفتگو نہیں ہے کیونکہ خدا تعالیٰ جسم و جسمانیت سے منزہ و مبرا



ہے بلکہ اس سے مراد دل میں الہام کے ذریعے گفتگو ہے یا فضا میں صوتی موجوں کو ایجاد کرنا ہے جیسے حضرت موسٰیؑ نے شجرِ طور سے گفتگو سنی تھی ۔

جس نکتے کی طرف یہاں توجہ ضروری ہے یہ ہے کہ عہد شکنی اور جھوٹی قسموں سے پیدا ہونے والے نتائج جن کا آیت میں ذکر ہے خدا سے قرب و بُعد کے تدریجی مراحل ہیں ۔

جو شخص خدا کے قریب ہو جاتا ہے اور اس کے قرب کی بساط پر قدم رکھتا ہے پہلے تو معنوی عنایات کا ایک سلسلہ اس کے شاملِ حال ہوتا ہے اور جب زیادہ نزدیک ہو جاتا ہے تو خدا اس سے گفتگو کرتا ہے ۔ جب اور زیادہ قریب ہوتا ہے تو خدا اس پر نظرِ رحمت کرتا ہے اس کے نتیجے میں وہ دردناک عذاب سے نجات پا جاتا ہے اور اس کی نعمتوں میں مستغرق ہو جاتا ہے لیکن جو لوگ عہد شکنی کرتے ہیں اور پروردگار کا نام غلط طور پر استعمال کرتے ہیں وہ ان تمام نعمات و برکات سے محروم ہو جاتے ہیں اور مرحلہ بمرحلہ دُور ہوتے جاتے ہیں۔ سورہ بقرہ کی آیہ ۱۷۴ ابھی زیرِ نظر آیت سے کئی لحاظ سے مشابہ ہے اُس کے ذیل میں اس آیت کے مفہوم کے بارے میں کئی ایک وضاحتیں آچکی ہیں ۔

۷۸۔ وَاِنَّ مِنۡهُمۡ لَفَرِيۡقًا يَّلۡوٗنَ اَلۡسِنَتَهُمۡ بِالۡكِتٰبِ لِتَحۡسَبُوۡهُ مِنَ الۡكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الۡكِتٰبِ ۚ وَيَقُوۡلُوۡنَ هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ۚ وَيَقُوۡلُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ ○

ترجمہ

۷۸۔ اِن (یہود) میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو (خدا کی) کتاب کی تلاوت کے وقت اپنی زبان یوں پھیرتے ہیں کہ تم گمان کرنے لگو کہ (جو کچھ وہ پڑھ رہے ہیں) کتابِ خدا میں سے ہے حالانکہ وُہ کتابِ خدا میں سے نہیں ہوتا (یہاں تک کہ وہ صراحت سے کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے ۔ جب کہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتا اور وہ



خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں ۔ حالانکہ جانتے ہیں ۔

تفسیر

"یَلْوٗنَ" "لَیّ" (بروزن "حَیّ") سے ہے ۔ اس کا معنی ہے پیچ وخم کھانا ۔ یہ آیت درحقیقت گذشتہ آیات کی تاکید کے طور پر آئی ہے ۔ اس آیت کی شان نزول بھی گذشتہ آیات کی شان نزول سے مشابہ ہے ۔ یہودیوں کا ایک گروہ کتاب خدا پڑھتے وقت اپنی زبان کو پیچ وخم دیتا ہے اور ٹیڑھا کرتا ہے ۔ یہ تعبیر کلام خدا میں تحریف کرنے سے خوبصورت کنایہ ہے ۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے : وہ یہ کام ایسے ماہرانہ طریقے سے انجام دیتے ہیں کہ تمہیں گمان ہو گا کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں خدا کی طرف سے نازل شدہ آیات ہیں ، حالانکہ ایسا نہیں ہے ("لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ") ۔

وہ اسی پر بس نہیں کرتے بلکہ صراحت سے کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے نازل شدہ ہے جب کہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے ("وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ") ۔

قرآن دوبارہ کہتا ہے کہ اس سلسلے میں انہیں اشتباہ نہیں ہوا بلکہ وہ جان بوجھ کر خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں اور جانتے بوجھتے ہوئے وہ یہ بہتان باندھتے ہیں ("وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ") ۔

۷۹۔ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝

۸۰۔ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ۭ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝



ترجمہ

۷۹۔ کسی شخص کو زیب نہیں دیتا کہ خدا آسمانی کتاب، حکم اور نبوت اُسے دے
اور پھر وہ لوگوں سے کہتا پھرے کہ خدا کو چھوڑ کر میری عبادت کرو (بلکہ اُس کے شایانِ
شان یہ ہے کہ وہ کہے) خدا والے بنو جیسا کہ کتابِ خدا کی تعلیم ہے اور جیسے تم نے
درس پڑھا ہے (اور خدا کے علاوہ کسی کی پرستش نہ کرو)۔
۸۰۔ اور نہ یہ کہ تمہیں حکم دے کہ فرشتوں اور انبیاءؑ کو اپنا پروردگار بنالو۔ تو کیا وہ
تمہیں کفر کی طرف دعوت دیتا ہے جب کہ تم مسلمان ہو چکے ہو۔

شانِ نزول

اِن دو آیات کے بارے میں دو شانِ نزول مذکور ہیں:

پہلی۔ ایک شخص پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا: ہم دوسروں کی طرح آپ پر سلام کرتے ہیں حالانکہ ہماری نظر میں ایسا احترام کافی نہیں۔ ہم تقاضا کرتے ہیں کہ آپ ہمیں اجازت دیں کہ ہم آپ کا امتیاز ملحوظ رکھیں اور آپ کو سجدہ کر لیا کریں۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: سجدہ خدا کے علاوہ کسی کے لیے جائز نہیں۔ اپنے پیغمبر کا ایک بشر کے طور پر احترام کرو لیکن ان (انبیاء) کا حق پہچانو اور ان کی پیروی کرو۔

دوسری۔ ابو رافع ایک یہودی تھا۔ ایک مرتبہ وہ نجران کے عیسائیوں کی طرف سے وفد کے قائد اور سرپرست کے ساتھ خدمت پیغمبرؐ میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کی عبادت کریں اور آپ کو مقامِ الوہیت پر فائز سمجھیں۔

شاید ان کا خیال تھا کہ پیغمبرؐ حضرت عیسٰیؑ کی الوہیت کی مخالفت اِس بناء پر کرتے ہیں کہ اس سلسلے میں اُن کا کوئی حصّہ نہیں لہٰذا اگر حضرت عیسٰیؑ کی طرح ان کے لیے بھی مقام الوہیت کو تسلیم کر لیا جائے تو وہ خود بخود مخالفت چھوڑ دیں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تجویز پیغمبر اکرمؐ کو بدنام کرنے اور عوام کو منحرف کرنے کے لیے پیش کی گئی ہے۔

بہرحال پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:

معاذ اللہ کیسے ممکن ہے کہ میں اجازت دوں کہ کوئی شخص ربّ واحد کے علاوہ کسی کی عبادت کرے خدا نے ہرگز مجھے ایسے معاملے کے لیے مبعوث نہیں کیا۔



تفسیر

اس سے پہلے ہم توجہ دلا چکے ہیں کہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کی بُری عادات میں سے ایک یہ تھی کہ وہ حقائق میں تحریف کر دیا کرتے تھے۔ حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں ان کا الوہیت کا دعویٰ انہی تحریفات میں سے ایک ہے۔ وہ کہتے تھے حضرت عیسیٰ نے خود ہمیں اس بات کا حکم دیا ہے۔ بعض لوگ چاہتے تھے کہ یہی موہوم خیال وہ پیغمبر اسلام کے بارے میں بھی رکھیں اور اس کی وجوہات کی طرف شانِ نزول میں اشارہ ہو چکا ہے۔ آیت نے انبیاء کی پرستش کی تجویز پیش کرنے والے ایسے تمام افراد کو صریح اور قطعی جواب دیا ہے۔

آیت کہتی ہے کہ پیغمبر اسلام، کسی اور نبی یا فرشتوں، میں سے کسی کی عبادت نہیں ہوسکتی اور اگر اہل کتاب یہ خیال کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ نے انہیں اپنی عبادت کی دعوت دی ہے تو وہ اشتباہ کرتے ہیں

"مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ
ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ....."

کسی انسان کو حق نہیں پہنچتا کہ خدا اُسے آسمانی کتاب، علم و دانش اور نبوت سے نوازے اور وہ لوگوں کو اپنی عبادت کی دعوت دے، حالانکہ تمام انبیاء نے بالاتفاق لوگوں کو ایک اکیلے خدا کی عبادت کی دعوت دی ہے۔ یہ آیت نفی مطلق کے معنی میں ہے۔

یعنی خدا کی طرف سے بھیجے گئے لوگ جنہیں علم و حکمت کا وافر حصّہ بخشا گیا ہے کسی وقت بھی بندگی اور عبودیت کے مرحلے سے تجاوز نہیں کریں گے۔ خدا کے بھیجے ہوئے رہبر ہمیشہ عام لوگوں کی نسبت بارگاہ الٰہی میں زیادہ منکسر اور خاضع رہتے ہیں۔ لہٰذا وہ بندگی اور توحید کی شاہراہ نہیں چھوڑ سکتے اور لوگوں کو شرک کے گڑھے میں نہیں پھینک سکتے۔

"وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ
وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ"

"رَبّٰنِيّٖنَ" جمع ہے "ربانی" کی۔ یہ لفظ ایسے شخص کے لیے بولا جاتا ہے جس کا رشتہ اور ربط پروردگار سے محکم اور مضبوط ہو۔ چونکہ یہ لفظ "ربّ" کے مادہ سے ہے اس لیے اُس شخص کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جو دوسروں کی تدبیر اصلاح اور تربیت کرے عرب ادب کے قواعد کی رو سے یہ لفظ "منسوب" ہے البتہ "یاءِ نسبت" کی اضافت کے وقت اس میں "اَلِف" کا اضافہ ہو جاتا ہے جیسا کہ "بحرین" سے منسوب بہ کو "بحرانی" کہتے ہیں۔ یہاں بھی اسی صورت میں "رَبّنی" کہا گیا ہے۔

مندرجہ بالا جملے میں قرآن کہتا ہے: انبیاء کو زیبا نہیں کہ وہ لوگوں کو اپنی پرستش کی دعوت دیں۔ ان کے



یہی مناسب ہے کہ وہ لوگوں کو آیات الٰہی کی "تعلیم" دیں اور حقائق دین کی "تدریس" کے ذریعے لوگوں کو علماء ربّانی بنادیں اور وہ ایسے لوگ تیار کریں جو خدا کے علاوہ کسی کی پرستش نہ کریں اور علم و دانش اور معرفت کے سوا کسی چیز کی طرف دعوت نہ دیں۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ مذکورہ جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کا مقصد فقط افراد کی تربیت کرنا نہ تھا بلکہ ان کا کام معلمین، تربیت کرنے والے اور مختلف گروہوں کے لیے رہبر تیار کرنا تھا۔ یعنی ایسے افراد تیار کرنا جن میں سے ہر کوئی ایک وسیع علاقے کو اپنے علم، ایمان اور دانش سے روشنی بخشے۔

اوپر والی آیت میں پہلے مسئلہ تعلیم کا ذکر ہے۔ پھر تدریس کا تذکرہ ہے۔ ان دو الفاظ میں یہ فرق ہے کہ تعلیم ایک وسیع و عریض معنی کا حامل ہے۔ اس میں گفتار و کردار کے ذریعے پڑھے لکھے یا ان پڑھ ہر طرح کے لوگوں کو تعلیم دینا شامل ہے لیکن تدریس ایسی تعلیم کے لیے بولا جاتا ہے جس کا تعلق کتاب اور کاغذ سے ہو اور اصطلاح کے لحاظ سے تعلیم سے "اخص" اور خصوصی ہے

"وَلَا يَأْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا."

اس آیت کی گفتگو گذشتہ بحث کی تکمیل ہے۔ اس میں فرمایا گیا ہے: جیسے انبیاء لوگوں کو اپنی پرستش کی دعوت نہیں دیتے اسی طرح انہیں فرشتوں اور دیگر انبیاء کی عبادت کی دعوت بھی نہیں دیتے

ایک طرف تو یہ جملہ مشرکین عرب کا جواب ہے، جو فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں سمجھتے تھے اور یوں ان کی ایک طرح سے ربوبیت کے قائل تھے پھر بھی اپنے تئیں دین ابراہیم کا پیروکار بتاتے تھے، یونہی یہ "صابئین" کا بھی جواب ہے جو اپنے آپ کو حضرت "یحییٰ" کا پیروکار بتاتے تھے اور فرشتوں کا مقام پرستش کی حد تک اوپر لے جاتے تھے۔

دوسری طرف یہ یہودیوں کا بھی جواب ہے جو حضرت "عزیر" کو خدا کا بیٹا قرار دیتے تھے اور یوں ان کے لیے ربوبیت کے ایک حصے کے قائل تھے اور اس عقیدے کو پیغمبران خدا کی طرف منسوب کرتے تھے۔

آیت ان سب کا جواب دیتی ہے کہ یہ بات کسی پیغمبر کے شایان شان ہرگز نہیں کہ وہ لوگوں کو غیر خدا کی ربوبیت کی طرف دعوت دے۔

"اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ."

آخر میں فرمایا: کیا یہ ممکن ہے کہ پیغمبر تمہیں کفر کی دعوت دے جب کہ تم اسلام اور توحید کا راستہ اپنا چکے ہو۔

کہے بغیر واضح ہے کہ یہاں اسلام سے مراد دیگر بہت سے مواقع کی طرح اس کا وسیع معنی ہے یعنی فرمان خدا، ایمان اور توحید کے سامنے سر تسلیم خم کرنا۔

یعنی ــــ کیسے ممکن ہے کہ کوئی ایسا پیغمبر ہو جو پہلے تو لوگوں کو ایمان اور توحید کی دعوت دے اور پھر



انہیں شرک کی راہ دکھائے یا یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ایک پیغمبر دیگر تمام انبیاء کی زحمتوں کو برباد کر دے جنہوں نے اسلام کی دعوت دی ہے اور وہ لوگوں کو کفر و شرک کی طرف کیسے راغب کر سکتا ہے۔
ضمنی طور پر آیت عصمتِ انبیاء اور فرمانِ خدا سے اُن کے انحراف نہ کرنے کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے۔[1]

بشر پرستی ممنوع ہے

مندرجہ بالا آیات پوری صراحت سے غیر خدا کی ہر قسم کی پرستش، بالخصوص بشر پرستی کو ممنوع قرار دیتی ہیں اور انسان میں آزادی و استقلال کی روح پیدا کرتی ہیں۔ یہی وہ روح ہے جس کے بغیر انسان انسان کہلانے کا مستحق نہیں۔

طویل انسانی تاریخ میں ایسے بہت سے افراد ہو گزرے ہیں جو اقتدار تک پہنچنے سے پہلے معصومانہ چہرہ رکھتے تھے اور لوگوں کو حق، عدالت، حریت، آزادی اور ایمان کی دعوت دیتے تھے لیکن جب ان کے اقتدار کی بنیادیں معاشرے میں مستحکم ہو گئیں تو آہستہ آہستہ انہوں نے اپنا راستہ بدل لیا اور وہ شخص پرستی کی طرف مائل ہوئے اور لوگوں کو اپنی پرستش کی دعوت دینے لگے۔

درحقیقت دعوتِ حق اور دعوتِ باطل دینے والوں کی پہچان کا یہی ایک راستہ ہے کہ حق کی دعوت دینے والے جن کے سرکردہ افراد انبیاءؑ اور آئمہ علیہم السلام ہیں اقتدار پا لینے کے بعد بھی پہلے کی طرح لوگوں کو دین و انسانیت کے مقدس مقاصد کی طرف دعوت دیتے ہیں جن میں توحید، یگانہ پرستی اور آزادی کی دعوت شامل ہے لیکن باطل کی دعوت دینے والے جب اقتدار اور کامیابی تک پہنچتے ہیں تو پہلی چیز جو ان کے دماغ میں گھومتی ہے وہ اپنی طرف لوگوں کو دعوت دینا ہے اور وہ لوگوں کو ایک قسم کی اپنی عبودیت کی تشویق و ترغیب دیتے ہیں۔ ان کے گرد اگرد بے حیثیت لوگ جمع ہو جاتے ہیں جن کا کام خوشامد اور چاپلوسی ہوتا ہے اور وہ غرور و کم ظرفی کے ذریعے ایسی چیزوں کو ظاہر کرتے ہیں
ایک جاذب نظر حدیث حضرت علیؑ سے منقول ہے۔ یہ حدیث آنجنابؑ کے حقیقی روحانی چہرے کو واضح کرتی ہے اور یہ ہماری بحث کے لیے شاہد بھی ہے۔ جب امام عالی مقامؑ عراق کے سرحدی شہر ابنار میں پہنچے تو کچھ کسان اپنے

---

[1] مشہور قرائت میں جس کے مطابق قرآن کا موجودہ متن ہے "وَلَا يَأْمُرَكُمْ" کا جملہ منصوب (را پر زبر کے ساتھ) پڑھا جاتا ہے۔ اور حقیقت میں اس کا تعلق گزشتہ آیت کے "اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ" سے ہے اور یہ اُس پر عطف ہے اور یہاں پر "لا" گزشتہ آیت میں آنے والے "مَا" کی تاکید ہے جو نافیہ ہے۔ اس بناء پر اس جملے کا معنی کچھ یوں ہوگا۔

"وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يَّاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا۔"

یعنی۔ کسی بشر کو یہ حق نہیں کہ تمہیں حکم دے کہ انبیاء اور ملائکہ کو پروردگار بنالو۔



مروجہ طریقے کے مطابق آپؑ کے سامنے سجدے میں گر پڑے۔ امام علیہ السلام نے نہ صرف یہ کہ اس فعل کو ناپسند کیا بلکہ بہت زیادہ غضبناک ہوئے اور انہیں کہنے لگے:

"ما هذا الذی صنعتموه؟"

تم نے یہ کیا کام انجام دیا ہے؟

فقالوا: "خلق منا نعظم به امرائنا"

وہ کہنے لگے: یہ کام ہم اپنے بادشاہوں اور امراء کی تعظیم کے طور پر انجام دیتے ہیں۔

فقال: "والله ما ینتفع بهذا امرائکم وانکم لتشقون علی انفسکم فی دنیاکم وتشقون به فی اخرتکم وما اخسر المشقة وراءها العقاب، واربح الدعة معها الامان من النار." [1]

آپؑ نے فرمایا:

بخدا تمہارے امراء اور حکام کو اس عمل سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا اور تم اپنے آپ کو اس سے دنیا میں رنج و تکلیف میں مبتلا کرتے ہوئے اور آخرت میں بدبختی میں گرفتار کرتے ہو۔ کس قدر نقصان دہ ہے وہ تکلیف و مشقت کہ جس کے بعد عذابِ خدا بھی ہو اور کس قدر فائدہ بخش ہے وہ آرام و آزادی جس کے ساتھ آتشِ جہنم سے بھی امان حاصل ہو۔

۸۱۔ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ○

[1] "نہج البلاغۃ" کلمات قصار نمبر ۳۷



ترجمہ

۸۱۔ وہ وقت (یاد کرو) جب خدا نے انبیاء (اور ان کے پیروکاروں سے) یہ تاکیدی عہدو پیمان لیا کہ جب میں تمہیں کتاب و حکمت دے دوں اس کے بعد تمہارے پاس ایک پیغمبر آئے جو اس کی تصدیق کرے جو تمہارے پاس ہے تو اُس پر ایمان لے آنا اور اس کی مدد کرنا (پھر خدا نے ان سے) کہا: کیا اس چیز کا اقرار کرتے ہو اور اس پر تاکیدی عہدو پیمان باندھتے ہو۔ انہوں نے کہا: (جی ہاں) ہم اقرار کرتے ہیں۔ (خدا نے ان سے) کہا: (اس مقدس عہدو پیمان پر) گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔

تفسیر

مقدس عہدو پیمان

"وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ."

یہ آیت ایک عمومی بنیاد کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ گذشتہ انبیاء اور ان کی اقتداء میں ان کے پیروکاروں نے خدا تعالیٰ سے ایک عہدو پیمان باندھا تھا اور وہ یہ کہ وہ بعد میں آنے والے انبیاء و رسل کے سامنے سرتسلیم خم کریں گے اور ان پر ایمان لانے کے علاوہ ان کے اہداف و مقاصد کی پیش رفت کے لیے ان کی کسی قسم کی مدد سے دریغ نہیں کریں گے۔

دراصل جیسے انبیاءؑ اور ان کی امتیں گذشتہ انبیاءؑ اور ان کے دین کا احترام کرتے تھے اس طرح گذشتہ انبیاءؑ اور ان کی امتوں پر آنے والے انبیاءؑ کے بارے میں ذمہ داری عائد ہوتی تھی۔ آیاتِ قرآن میں بارہا پیغمبرانِ خدا کے مقاصد کی وحدت کی طرف اشارہ ہوا ہے، زیر نظر آیت بھی اس امر کا زندہ نمونہ ہے۔

مندرجہ بالا آیت میں کہا گیا ہے: خدا نے انبیاءؑ سے میثاق لیا تھا۔ "میثاق دراصل وثوق" کے مادہ سے ہے اور اس کا معنی ہے" ایسی چیز جو اطمینان اور اعتماد کا سبب بنے" عام طور پر "تاکیدی عہدو پیمان" کو میثاق کہتے ہیں۔

انبیاء سے پیمان لینا فطری طور پر ان کے پیروکاروں سے بھی پیمان لینے کے مترادف ہے۔ مذکورہ عہدو پیمان کا مطلب یہ تھا کہ اگر کوئی ایسا پیغمبر آئے جس کی دعوت ان کی دعوت سے ہم آہنگ ہو اور یوں اس کی حقانیت ثابت ہو



جائے تو انہیں چاہیے کہ اس پر ایمان لائیں اور اس کی مدد کریں۔ اس بات کی تاکید کے لیے فرمایا گیا ہے: "قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ"[1] یعنی ـــ کیا تم اس پیمان کا اقرار کرتے ہو اور میرے عہد کو قبول کرتے ہو اور کیا اپنے پیروکاروں سے اس سلسلے میں تم نے پیمان لیا ہے؟ انہوں نے اس کے جواب میں کہا: جی ہاں! ہم اعتراف کرتے ہیں "قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا"

پھر خدا تعالیٰ نے اِس اہم امر کی تاکید کے لیے انہیں دوبارہ فرمایا: تم اس امر پر گواہ رہو اور میں بھی تم پر اور تمہارے پیروکاروں پر گواہ ہوں ("قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ")۔

چند اہم نکات

(۱) **میثاق کی وسعت:** کیا مندرجہ بالا آیت صرف گذشتہ انبیاء کی بشارتوں اور پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں ان سے عہد و پیمان میں منحصر ہے یا ہر اس پیغمبر کے بارے میں ہے جو کسی دوسرے پیغمبر کے بعد آیا۔

آیت کا ظہور تو کلی اور عمومی مفہوم کا حامل ہے اگرچہ خاتم الانبیاءؐ اس کے واضح تر اور روشن تر مصداق ہیں اور قرآن کے مفاہیم کی روح سے بھی یہی وسیع اور عمومی مفہوم مناسبت رکھتا ہے۔ لہٰذا اگر بعض روایات جو یہ تصریح نظر آتی ہے کہ اِس سے مراد پیغمبر اسلامؐ ہیں تو وہ دراصل اِن کے ایک واضح مصداق کے طور پر آیت کی تفسیر ہے نہ یہ کہ اس طرح آیت اِسی مفہوم میں منحصر ہو گئی ہے۔

فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر میں حضرت علیؑ سے نقل کیا ہے:

> خدا نے جب آدم اور دوسرے انبیاء کو پیدا کیا تو اُن سے عہد لیا کہ جب محمدؐ مبعوث ہوں تو وہ ان پر ایمان لائیں اور ان کی مدد کریں۔[2]

(۲) **دو اولوا العزم پیغمبر ایک زمانے میں ہو سکتے ہیں؟** آیت کے مضمون کی طرف توجہ رکھتے ہوئے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا ہو سکتا ہے کہ ایک اولوا العزم پیغمبر کے زمانے میں دوسرا اولوا العزم پیغمبر مبعوث ہو اور اُس کی ذمہ داری ہو تو وہ دوسرے پیغمبر کی پیروی کرے؟ اِس سوال کا جواب یہ ہے کہ جیسے آیت کی تفسیر میں اشارہ کیا گیا ہے کہ عہد پیمان صرف انبیاء سے نہیں لیا گیا بلکہ اُن کے پیروکاروں سے بھی لیا گیا ہے اور درحقیقت انبیاء سے عہد لینے سے مراد ان کی اُمتوں اور نسلوں سے عہد لینا ہے جو ان کے بعد وجود میں آتی ہیں اور بعد والے نبی کے زمانے کو پاتی ہیں اور فرض کیا اگر خود انبیاء بھی آنے والے انبیاء کے زمانے کو پائیں تو وہ ان پر ایمان لائیں گے یعنی پیغمبرانِ خدا اپنے اہداف و مقاصد اور دعوت میں ایک دوسرے سے ہرگز جُدا نہیں ہیں اور ان کی آپس میں کوئی جنگ نہیں ہے۔

(۳) **آیت انبیاءؑ کے جانشینوں کے بارے میں بھی ہے:** اِس آیت کے سلسلے میں آخری بات یہ ہے کہ اگرچہ یہ انبیاءؑ کے بارے میں ہے لیکن واضح ہے کہ ان کے جانشینوں پر بھی صادق آتی ہے کیونکہ اُن کے سچے

---

[1] "اِصْر": لغت میں تاکیدی عہد و پیمان کو کہتے ہیں جسے توڑنا سخت سزا کا موجب ہو۔ [2] "تفسیر کبیر"، جزء ہشتم، صفحہ ۱۳۱۔



جانشین اُن سے جدا نہیں ہیں اور سب کے سب ایک ہی مقصد رکھتے ہیں ۔ انبیاء ہمیشہ اپنے جانشینوں کا تعارف کرواتے تھے، ان کی بشارت دیتے تھے اور لوگوں کو ان پر ایمان لانے اور ان کی مدد کرنے کی دعوت دیتے تھے۔ اِس لیے اگر ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری تفسیر و حدیث کی کتب میں اس آیت کے ذیل میں چند روایات میں ——— "وَلَتَنْصُرُنَّهٗ" سے حضرت علیؑ کی مدد کرنا مراد لیا گیا ہے اور اس میں مسئلہ ولایت کو بھی شامل قرار دیا گیا ہے تو وہ درحقیقت اِسی مفہوم کی طرف اشارہ ہے۔

یہ بات کہے بغیر نہیں رہنا چاہیے کہ مندرجہ بالا آیت کے بارے میں مفسرین اور اہل ادب نے ترکیب نحوی کے حوالے سے بحث کی ہے ۔ [1]

مزاحم تعصبات

تاریخ نشان دہی کرتی ہے کہ ایک دین کے پیروکار آسانی سے اپنے دین سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہوتے اور خدا کی طرف سے نئے مبعوث ہونے والی انبیاء کے سامنے آسانی سے سرِ تسلیم خم نہیں کیا کرتے بلکہ جمود اور بڑی شدت سے اپنے قدیم دین پر جمے رہتے ہیں اور اُس کا دفاع کرتے ہیں گویا اسے اپنا اور اپنے آپ کو اُس کا سمجھتے ہیں اور اسے چھوڑ دینے کو اپنی ملی اور قومی بربادی خیال کرتے ہیں ۔ لہٰذا وہ بہت مشکل سے نیا دین قبول کرنے کو تیار ہوتے ہیں ۔ تاریخ میں مذکور بہت سی جنگوں اور دردناک حوادث کا سرچشمہ قوموں کا یہی خشک تعصب اور پرانے ادیان پر اڑے رہنا ہے حالانکہ تکامل و ارتقا کا قانون متقضی ہے کہ ادیان یکے بعد دیگرے آتے رہیں اور انسان کو خداشناسی، حق و عدالت، ایمان، اخلاق، انسانیت اور فضیلت کی راہ میں آگے سے آگے لے جاتے رہیں تاکہ وہ آخری دین تک پہنچ جائیں جو کہ خاتم الادیان ہے اور اس بچے کی طرح یہ راستہ طے کریں جو تعلیم و تربیت کے مدارج یکے بعد دیگرے طے کر کے فارغ التحصیل ہو جاتا ہے۔

واضح ہے کہ اگر پرائمری پڑھنے والے بچے پرائمری سکول سے ایسا لگاؤ اور تعصب پیدا کر لیں کہ ہائی اسکول میں جانے ہی سے انکار کر دیں تو اس کا نتیجہ قافلۂ ترقی میں جمود اور پسماندگی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

زیر نظر آیت میں گذشتہ انبیاء اور ان کی امتوں سے مستحکم عہد و پیمان پر جو اصرار اور تاکید موجود ہے وہ گویا ایسے تعصبات، جمود اور ہٹ دھرمی سے اجتناب و احتراز ہی کے لیے تھا لیکن بہت افسوس کا مقام ہے کہ ان تمام تاکیدوں کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ پرانے ادیان کے پیروکار آسانی سے جدید حقائق کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرتے ۔

اِس سوال کے ضمن میں کہ دینِ اسلام کیوں اور کیسے خاتم مذاہب اور آخری دین ہے، سورہ احزاب کی آیہ ہم کے

---

[1] "لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ" میں بعض "مَا" کو موصولہ اور مبتداء قرار دیتے ہیں ، لام کو توطۂ قسم اور "لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ" کو خبر سمجھتے ہیں ۔ کچھ لوگ "مَا" کو شرطیہ زمانیہ اور "لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ" کو اس کی جزا سمجھتے ہیں ۔ یہی دوسرا احتمال آیت کے معنی سے زیادہ قریب ہے۔



ذیل میں انشاءاللہ تفصیلی گفتگو کی جائے گی۔

۸۲۔ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○

ترجمہ

۸۲۔ اس بناء پر جو شخص اس (مستحکم پیمان) کے بعد منہ پھیر لے وہ فاسقین میں سے ہوگا۔

تفسیر

اس آیت میں قرآن کہتا ہے: ان سب تاکیدوں، اصرار اور مستحکم عہد و میثاق کے بعد بھی جو لوگ پیغمبر اسلام جیسے نبی پر ایمان لانے سے روگردانی کریں جن کے ظہور کی نشانیاں گذشتہ کتب میں آچکی ہیں تو وہ لوگ فاسق اور حکم خدا سے خارج ہیں۔

۸۳۔ اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ○

۸۴۔ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِىَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ○



۸۵۔ وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ ○

ترجمہ

۸۳۔ کیا وہ لوگ دین خدا کے علاوہ کوئی چیز چاہتے ہیں (اس کا دین تو اسلام ہے) اور تمام لوگ جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اختیار یا مجبوری سے اس کے (حکم) کے سامنے تسلیم ہیں اور وہ اُسی کی طرف لوٹ کر جائیں گے۔

۸۴۔ کہہ دو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں اور (اس طرح) اُس پر (بھی ایمان لائے ہیں) جو ہم پر، ابراہیم پر، اسماعیل پر، اسحٰق پر، یعقوب پر اور اسباط پر نازل ہوا ہے اور اُس پر (بھی ایمان لائے ہیں) جو موسٰی، عیسٰی اور (دوسرے) پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے دیا گیا ہے ہم اُن کے درمیان فرق نہیں کرتے اور اُس کے (فرمان) کے سامنے تسلیم ہیں۔

۸۵۔ اور جو کوئی اسلام (اور حکمِ حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنے) کے علاوہ اپنے لیے کوئی دین انتخاب کرے تو وہ اُس سے قبول نہیں ہوگا اور آخرت میں وہ زیاں کاروں میں سے ہوگا۔

تفسیر

"أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْغُونَ"

گذشتہ آیات میں اب تک گذشتہ مذاہب کے بارے میں تفصیلی بحث ہوئی ہے اب یہاں سے اسلام کے بارے میں بحث شروع ہوتی ہے اور اہل کتاب اور دیگر گذشتہ ادیان کے پیروکاروں کی توجہ اس کی طرف مبذول



کروائی گئی ہے۔

زیرِ نظر آیات میں سے پہلی میں قرآن کہتا ہے: کیا یہ لوگ خدا کے دین کے سوا کوئی اور چیز چاہتے ہیں، خدا کا دین تو قوانینِ الٰہی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے علاوہ کچھ اور نہیں اور یہ بات کامل اور جامع صورت میں پیغمبرِ اسلامؐ کے دین میں موجود ہے لہٰذا وہ اگر دینِ حقیقی کی تلاش میں ہیں تو انہیں مسلمان ہو جانا چاہیے۔

اسلام تمام موجوداتِ عالم کا دین ہے

"وَلَهٗۤ اَسۡلَمَ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ....."

قرآن نے ایک مرتبہ پھر اسلام کو ایک زیادہ وسیع معنی میں پیش کیا ہے۔ قرآن کہتا ہے: تمام آسمانوں اور زمین والے یا آسمان و زمین میں موجود تمام موجودات مسلمان ہیں اور وہ اُس کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ طوعاً و کرہاً (اختیار سے یا جبر سے) کی تعبیر کا مطلب ہے کہ پروردگار کے فرمان کے سامنے سر جھکانا کبھی "اختیاری" اور "تشریعی قوانین" کے ذریعے ہوتا ہے اور کبھی "اجباری" اور "تکوینی قوانین" کے ذریعے۔ اس کی وضاحت یوں ہے کہ عالمِ ہستی میں خدا کے احکام دو طرح کے ہیں۔ اِس کے فرامین کا ایک سلسلہ طبیعی قوانین اور ماوراء طبیعی کا ہے جو اس جہان کے مختلف موجودات پر حکومت کرتے ہیں اور وہ سب مجبور ہیں کہ ان کے سامنے گھٹنے ٹیک دیں اور وہ لمحہ بھر کے لیے بھی اِن قوانین سے روگردانی نہیں کر سکتے اور اگر خلاف ورزی کریں تو ہو سکتا ہے کہ محو اور نابود ہو جائیں۔ یہ فرمانِ خدا کے سامنے اسلام و تسلیم کی ایک قسم ہے۔ سورج کی شعاعیں دریاؤں پر پڑتی ہیں، پانی بخارات بن کر اُٹھتا ہے، بادل کے ٹکڑے ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں، بارش کے قطرے آسمان سے گرتے ہیں، درخت اِن سے نشوونما پاتے ہیں اور ان سے پھول کھلتے ہیں۔ یہ سب کے سب "مسلمان" ہیں کیونکہ ان میں سے ہر ایک آفرینش و فطرت کے معین کردہ قانون کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہیں۔

فرمانِ خدا کی دوسری قسم کا نام حکمِ تشریعی ہے یعنی وہ قوانین جو آسمانی شریعتوں اور انبیاءؑ کی تعلیمات میں موجود ہیں ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کی وجہ سے "مسلمان" کہلانے کے اہل ہیں۔ البتہ اِن قوانین سے روگردانی بھی قوانینِ فطرت سے روگردانی سے کم نہیں کیونکہ یہ بھی انحطاط اور پسماندگی یا نابودی کا سبب ہے۔ مندرجہ بالا آیت میں لفظ "اَسۡلَمَ" اسلام کے وسیع معنی میں ہے جس میں دونوں قسمیں شامل ہیں لہٰذا فرمایا گیا ہے کہ ایک گروہ اختیاری حالت میں سرِ تسلیم خم کرتا ہے یعنی "طَوۡعًا" مثلاً مومنین اور دوسرا مجبوری کی حالت میں یعنی "کَرۡهًا" مثلاً کافر تکوینی قوانین کے لحاظ سے۔ اِس بنا پر اگرچہ کفار کچھ احکامِ خدا کے سامنے اسلام قبول کرنے سے روگردانی کرتے ہیں لیکن بعض احکام قبول کیے بغیر انہیں کوئی چارہ نہیں، اِس لیے خدا کے تمام قوانین اور دینِ حق کے سامنے وہ بالکل سرِ تسلیم خم کیوں نہیں کرتے۔[1]

---

[1] ضمناً توجہ رہے کہ زیرِ نظر آیت میں "طَوۡعًا وَّ کَرۡهًا" کے الفاظ ذوی العقول کے بارے میں ہیں اور یہاں ان کا مفہوم سورہ فصلت کی آیہ ۱۱ میں آنے والے انہی الفاظ سے مختلف ہے وہاں ان کا تعلق صرف غیر ذوی العقول سے ہے۔ اس کے بارے میں متعلقہ آیت کے ذیل میں گفتگو کی جائے گی۔



اِس آیت کی تفسیر میں ایک اور احتمال بھی ہے جسے بہت سے مفسرین نے ذکر کیا ہے اور وہ مندرجہ بالا تفسیر کی نفی بھی نہیں کرتا ۔ وہ یہ ہے کہ صاحبِ ایمان لوگ اطمینان کے عالم میں رضا و رغبت اور اختیار کے ساتھ خدا کی طرف جاتے ہیں اور بے ایمان لوگ صرف مصیبت ، ابتلا اور سخت مشکلات کے وقت اس کی طرف بھاگتے ہیں اور اُسے پکارتے ہیں جب کہ عام حالات میں اِس کے لیے شرکاء کے قائل ہوتے ہیں لیکن ان سخت اور حساس لمحات میں اس کے علاوہ کسی کو پہچانتے ہیں نہ پکارتے ہیں ۔

"وَ اِلَیْهِ یُرْجَعُوْنَ"

آیت کے گذشتہ حصے میں مبداء کی طرف متوجہ ہونے کے لیے گفتگو تھی ، جو ایک فطری چیز ہے اور اب اس جملے میں معاد کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو اپنے مقام پر فطری ہے کیونکہ تمام اقوام و ملل موت کو تسلیم کرتی ہیں ۔ اصل توجہ غرضِ خلقت اور حکمتِ پروردگار کی طرف نظر رکھیں تو موت کا مطلب نابودی اور فنا ہرگز نہیں ہو سکتا بلکہ اس کا مطلب ایک قسم کا تکامل و ارتقاء ہے اور یہ ایک زیادہ وسیع ماحول میں قدم رکھنے کا دوسرا نام ہے ۔ دوسرے لفظوں میں یہ خدا کی طرف بازگشت ہے ۔

"قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ ...."

اس آیت میں خدا تعالیٰ نے پیغمبرؐ اور مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ جو کچھ پیغمبر اسلامؐ پر نازل ہوا ہے اس پر ایمان لانے کے علاوہ اِن تمام آیات اور تعلیمات پر بھی عقیدہ رکھو جو گذشتہ انبیاء پر نازل ہوئیں اور کہو کہ ہم ان میں حقانیت اور خدا سے ارتباط کے لحاظ سے کسی قسم کے فرق کے قائل نہیں ہیں ۔ ہم سب کو حقیقی طور پر (خدا کا نمائندہ) سمجھتے ہیں ، سب خدا کے بھیجے ہوئے رہبر ہیں ، سب مخلوق کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے ہیں اور ہم حکم خدا کے سامنے ہر لحاظ سے تسلیم ہیں ۔ لہٰذا اِس طرح سے ہم تفرقہ اندازی سے اپنا ہاتھ کھینچے ہوئے ہیں ۔

سورہ بقرہ کی آیت ۱۳۶ زیرِ نظر آیت سے پوری مشابہت رکھتی ہے ۔ اس میں کافی وضاحت کی جا چکی ہے۔[1]

"وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ"

لفظ "یَبْتَغِ" "اِبْتِغَآء" کے مادہ سے ہے اور اس کا معنی ہے کوشش اور جستجو کرنا ، یہ شائستہ اور ناشائستہ ہر موقع کے لیے استعمال ہوتا ہے یہاں یہ لفظ بحث کو نتیجہ پر پہنچانے کے لیے استعمال ہوا ہے اور وہ یہ کہ حقیقی دین اور آئین "اِسْلَام" ہی ہے یعنی حکمِ خدا کے سامنے "سرِ تسلیم" خم کرنا ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو نسل ، زبان ، قومی تعصبات اور ایسی تمام چیزوں سے بالاتر ہے اور جو لوگ ایسی واقعیت کے علاوہ کسی چیز کو دین کے طور پر مان لیں وہ ہرگز قبول نہیں کی جائے گی بلکہ اس کے بدلے انہیں سزا بھی دی جائے گی : "وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ" ـــــ یعنی وہ آخرت میں زیاں کاروں میں سے ہوگا ، کیونکہ اس نے اپنے وجود کا سرمایہ غیر مناسب خرافات و تقلید ، جاہلانہ تعصبات اور نسل پرستی کے عوض بیچ دیا ہے ۔ مسلم ہے کہ ایسے معاملے میں وہ نقصان و زیاں ہی میں مبتلا ہوگا اور قیامت میں انسانی وجود کے سرمائے کے نقصان کا نتیجہ

۱۔ تفسیر نمونہ کی جلد اوّل کی طرف رجوع کیجئے ۔



محرومیوں اور سزا و عذاب کی صورت میں ظاہر ہوگا۔
انشاء اللہ سورۂ حجرات کی آیۃ ۱۴ کے ذیل میں "اسلام" اور "ایمان" کے درمیان فرق پر بحث کی جائے گی۔

۸۶۔ كَيْفَ يَهْدِى اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَ شَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ○

۸۷۔ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ○

۸۸۔ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ○

۸۹۔ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۫ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

ترجمہ

۸۶۔ خدا ان لوگوں کو کیونکر ہدایت کرے جو ایمان لانے، رسول کی حقانیت کی گواہی دینے اور ان کے لیے واضح نشانیاں آجانے کے بعد کفر کریں اور خدا ظالموں کو ہدایت نہیں کرتا۔

۸۷۔ ان کا بدلا یہ ہے کہ ان پر اللہ، ملائکہ اور سب لوگوں کی لعنت ہے۔

۸۸۔ وہ ہمیشہ اس لعنت (اور پھٹکار) میں (مبتلا) رہیں گے ان کے عذاب میں تخفیف



نہیں ہوگی اور انہیں مہلت نہیں دی جائے گی۔

۸۹۔ مگر وہ لوگ کہ جو بعد ازاں توبہ کرلیں اور اپنی اصلاح کرلیں (اور گذشتہ گناہوں کی تلافی کریں تاکہ ان کی توبہ قبول ہو) کیونکہ خدا بخشنے والا اور رحیم ہے۔

شان نزول

(مدینہ کے مسلمانوں میں سے) ایک انصاری حارث بن سوید تھا۔ اُس کے ہاتھوں بذر بن زیاد نامی ایک بے گناہ قتل ہوگیا۔ وہ سزا کے خوف سے مرتد ہوگیا اور مکہ کی طرف بھاگ گیا۔ مکہ میں پہنچا تو اپنے کام سے سخت پشیمان ہوا اور سوچنے لگا اب کیا کروں۔ اُس نے سوچ سوچ کر فیصلہ کیا کہ ایک آدمی کو مدینہ میں اپنے رشتہ داروں کے پاس بھیجوں تاکہ وہ پیغمبر اکرمؐ سے سوال کریں کہ کیا اُس کے لیے لوٹنے کا کوئی راستہ ہے یا نہیں۔ اِس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں جن میں چند خاص شرائط کے ساتھ اُس کی توبہ قبول ہونے کا تذکرہ ہے۔ حارث بن سوید پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا، دوبارہ اسلام لایا اور آخری عمر تک اسلام کا وفادار رہا۔ اُس کے پیروکاروں میں سے گیارہ افراد بھی اسلام سے پھر گئے تھے وہ اپنی حالت پر باقی رہے۔

تفسیر درّ منثور اور بعض دوسری تفاسیر میں زیر نظر آیات کی کچھ اور شان نزول نقل کی گئی ہیں جو مذکورہ شان نزول سے زیادہ فرق نہیں رکھتیں۔

تفسیر

"كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ."

یہ آیات ان لوگوں کے بارے میں ہیں جنہوں نے اسلام قبول کرلیا ہے اور پھر اس سے پھر گئے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اصطلاح میں "مُرتَد" کہتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے: ایسے لوگوں کی ہدایت کے لیے خدا مدد نہیں کرتا کیونکہ ان لوگوں نے واضح علامات کے ذریعے پیغمبر کو پہچان لیا ہے اور اس کی رسالت کی گواہی دی ہے۔ یہ لوگ اسلام سے عدول کرکے اور اس سے پھر کر ظالم اور ستمگر بن گئے ہیں اور خدا ظالموں اور ستمگروں کی ہرگز ہدایت نہیں کرتا (وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ)۔

"اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ."



اِس آیت میں ایسے لوگوں کی سزا بیان کی گئی ہے جو پہچاننے کے بعد حق سے عدول کرتے ہیں اور وہ ہے پروردگار، فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت۔

"لعن" اصل میں دھتکارنے اور غیظ و غضب کے ساتھ دور کرنے کے معنی میں ہے۔ لہٰذا پروردگار کی لعنت کا مطلب اس کی رحمت سے دُوری ہے۔ باقی رہا فرشتوں اور لوگوں کی لعنت تو وہ غصّہ، تنفر اور معنوی طور پر ہے یا پروردگار کی رحمت سے دُور ہونے کی بد دُعا ہے۔

ایسے لوگ درحقیقت فساد اور گناہ میں اِس طرح سے ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں کہ تمام عقلمندوں اور سارے جہان کے بامقصد افراد چاہے انسان ہوں یا فرشتے سب کے تنفر کا ہدف بن جاتے ہیں۔

"خٰلِدِیْنَ فِیْهَا لَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ"

اِس آیت میں مزید ارشاد ہوتا ہے کہ یہ لوگ صرف عمومی لعنت کا مرکز نہیں ہیں بلکہ ہمیشہ لعنت کا شکار رہیں گے۔ درحقیقت شیطان کی طرح ہیں جو ہمیشہ لعنت میں گرفتار رہتا ہے۔ مسلّم ہے کہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ دردناک اور ناقابل تخفیف عذاب میں مبتلا ہوں گے اور انہیں کسی قسم کی مہلت نہیں دی جائے گی۔

"اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَ اَصْلَحُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ"

یہ آیت مندرجہ بالا احکام میں استثنائی صورت بیان کرتی ہے۔ اس آیت نے ایسے افراد کے لوٹ آنے کی راہ کھول دی ہے لیکن بہت سی دیگر آیات قرآن کی طرح مسئلہ توبہ کی طرف اشارہ کرنے کے بعد گذشتہ غلط کاریوں کی تلافی کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ "وَاَصْلَحُوْا" کے ذریعے یہ حقیقت سمجھائی گئی ہے کہ توبہ صرف گذشتہ گناہ پر پشیمانی اور آئندہ اپنے نیک اعمال کے ذریعے گذشتہ بُرے اعمال کی تلافی کی جائے۔ اسی لیے بعض آیات میں توبہ کے بعد ایمان اور عمل صالح کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ مثلاً:

"لِمَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا." طٰهٰ : ۸۲

مگر وہ شخص جو توبہ کرے اور ایمان لائے اور عمل صالح انجام دے۔ ورنہ اس کی توبہ کامل و مکمل نہیں ہے۔

ایسے ہی افراد بخشش اور رحمت خدا کے حق دار ہوں گے "فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ"

کیا مرتد کی توبہ قبول ہو جاتی ہے

مندرجہ بالا آیت اور شان نزول سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ اسلام قبول کر کے اس سے پلٹ جائیں دو قسم کے ہیں:



ترجمہ

۹۰ــ جو لوگ ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے ہیں اور پھر (اپنے) کفر میں بڑھ گئے ہیں (اور اس راہ میں اصرار کرتے ہیں) تو ان کی توبہ کبھی بھی (جو مجبوری کی بناء پر ہو یا مرتے وقت کی جائے) قبول نہیں ہوگی اور وہ (واقعاً) گمراہ ہیں (اور وہ خدا کی راہ بھی کھو چکے ہیں اور توبہ کی بھی)۔

شانِ نزول

جیسا کہ سابقہ آیات کی شانِ نزول میں اشارہ ہوا ہے حارث بن سوید اور اس کے گیارہ ساتھی بوجوہ اسلام سے پلٹ گئے تھے۔ حارث تو پشیمان ہوا اور توبہ کر کے پیغمبر اسلامؐ کی خدمت میں واپس آگیا لیکن دوسرے افراد اس کے ساتھ لوٹ کر نہ آئے اور اس کی دعوت کے جواب میں انہوں نے کہا کہ ہم مکہ میں رہیں گے اور محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کے خلاف کام کرتے رہیں گے اور ہمیں امید ہے کہ انہیں شکست ہوگی۔ اگر ہمارا مقصد پورا ہو گیا تو کیا ہی اچھا ہے۔ ورنہ توبہ کا راستہ تو کھلا ہی ہے، جب چاہیں گے توبہ کر لیں گے اور محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کی طرف پلٹ آئیں گے اور وہ بھی ہماری توبہ قبول کر لیں گے۔

بعض مفسرین نے اس آیت کی ایک اور شانِ نزول نقل کی ہے۔ اس کے مطابق مذکورہ آیت اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو پیغمبر اسلامؐ کے ظہور سے قبل لوگوں کو آپؐ کے ظہور کی بشارت دیتے تھے اور آپؐ سے ایمان اور وفاداری کا اظہار کرتے تھے لیکن بعثت کے بعد نہ صرف یہ کہ وہ کافر ہو گئے بلکہ آپؐ کے مقابلے پر اٹھ کھڑے ہوئے۔

تفسیر

بے فائدہ توبہ

"اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بَعْدَ اِیْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا کُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ"۔

گذشتہ آیات میں ان لوگوں کے بارے میں گفتگو تھی جو واقعاً اپنے انحرافی راستے اور کج روی پر پشیمان ہو گئے تھے اور انہوں نے حقیقتاً توبہ کر لی تھی لیکن اس آیت میں ایسے اشخاص کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے جن کی توبہ قبول نہیں ہوگی۔ یہ وہ لوگ ہیں جو پہلے مرحلہ پر ایمان لائے، پھر کافر ہو گئے اور اپنے کفر پر ڈٹ گئے اور اس پر مُصر ہیں اس لیے کسی وقت بھی احکام حق کی پیروی کے لیے تیار نہیں ہیں مگر یہ کہ



معاملہ اُن کے لیے مشکل ہوجاتے اور اطاعت و تسلیم کے علاوہ انہیں کوئی راستہ نظر نہ آئے ۔ خدا ایسے افراد کی توبہ قبول نہیں کرے گا کیونکہ وہ اختیاری طور پر راہِ حق پر قدم نہیں رکھتے بلکہ جب وہ اہل حق کا غلبہ دیکھتے ہیں تو ظاہراً پشیمان ہوکر توبہ کا اظہار کرتے ہیں اِس بناء اُن کو توبہ ظاہری ہے جو قبول نہیں ہوگی۔

آیت کی تفسیر میں ایک اور احتمال بھی ہے اور وہ یہ کہ ایسے افراد جب اپنے آپ کو موت کی چوکھٹ پر دیکھتے ہیں اور عمر کے آخری ایام میں ہوتے ہیں تو ہوسکتا ہے کہ پشیمان ہوں اور واقعاً توبہ کرلیں لیکن پھر بھی ان کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی کیونکہ جیسا کہ ہم بعد میں بتائیں گے ایسے اوقات میں توبہ کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ مندرجہ بالا آیت سے یہ مراد ہو کہ کفر کی حالت میں عام گناہوں سے توبہ کرنا قابل قبول نہیں ہے ۔ یعنی اگر کوئی شخص راہِ کفر پر اصرار کرتا ہے لیکن ظلم اور غیبت وغیرہ جیسے گناہوں سے توبہ کرتا ہے تو اس کی توبہ کا کوئی فائدہ نہیں ہے کیونکہ گہری اور شدید آلودگیوں کے ہوتے ہوئے سطحی آلودگیوں کو دھوڈالنا مؤثر نہیں ہے۔

یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ مندرجہ بالا تفاسیر ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں اور ممکن ہے کہ آیت کی نظر ان سب پر ہو ۔ اگرچہ پہلا احتمال گذشتہ آیات اور شانِ نزول کے حوالے سے زیادہ ساز گار ہے ۔

" وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ "

وہ حقیقی گمراہ ہیں کیونکہ وہ راہِ خدا اور راہِ ایمان کی طرح توبہ کا راستہ بھی کھو چکے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ حقیقی آمادگی ، اخلاص اور ہر موقع قلب و روح کی پاکیزگی کے بغیر توبہ کی حقیقت تک پہنچ سکتے ہیں ۔ حالانکہ معاملہ اس طرح نہیں ہے۔

۹۱- اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ مَاتُوْا وَ هُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ
يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا
وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ
اَلِيْمٌ وَّ مَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۟

ترجمہ

۹۱۔ جو لوگ کافر ہوگئے ہیں اور حالت کفر میں مر گئے ہیں زمین اگر سونے سے پُر ہو اور وہ اسے (اپنے گناہوں کے کفارے کے طور پر) فدیہ کردیں تو بھی ان سے یہ ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے اور ان کا کوئی یاور و مددگار نہیں ۔



تفسیر

فضول کفارہ

"اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَمَاتُوۡا وَہُمۡ کُفَّارٌ فَلَنۡ یُّقۡبَلَ مِنۡ اَحَدِہِمۡ مِّلۡءُ الۡاَرۡضِ ذَہَبًا وَّلَوِ افۡتَدٰی بِہٖ۔"

یہ آیت ایسے افراد کے بارے میں ہے جنہوں نے حالت کفر میں زندگی گزاری ہے اور اسی حالت میں دنیا سے چلے گئے ہیں۔ قرآن کہتا ہے: جو لوگ راہ حق واضح ہو جانے کے باوجود طغیان و سرکشی کا راستہ اختیار کیے رہے ہیں اور حقیقتاً سر تسلیم خم نہیں کرتے اُن کی بخششیں اور عطیات قابلِ قبول نہیں ہوں گے اور ان کے لیے راہ نجات نہیں ہے اگرچہ وہ تمام زمین کو سونے سے پُر کر کے راہ خدا میں خرچ کر دیں۔

واضح ہے کہ اتنا ڈھیر سارا سونا خرچ کرنے سے مراد یہ ہے کہ ان کی بخشش کتنی بھی زیادہ کیوں نہ ہو قلب و رُوح کی آلودگی اور حق سے دشمنی کے ہوتے ہوئے ان کے لیے مؤثر نہیں ہے ورنہ واضح ہے کہ اگر ساری زمین سونے سے پُر ہو جائے تو سونے کی قدر و قیمت مٹی کے برابر ہو جائے گی اس بناء پر مندرجہ بالا جملہ اس معاملے کی اہمیت ثابت کرنے کے لیے ہے۔

اِس بارے میں کہ اس انفاق اور خرچ کرنے سے مراد اِس جہاں میں انفاق کرنا ہے یا دوسرے جہاں میں۔ تو اکثر مفسرین نے دونوں احتمالات ذکر کیے ہیں لیکن آیت کا ظہور دوسرے جہان سے ربط رکھتا ہے یعنی حالتِ کفر میں مر جانے کے بعد اگر فرض کریں کہ زمین کی بہت بڑی دولت و ثروت ان کے اختیار میں ہو اور وہ خیال کریں کہ اِس جہان کی طرح اِس سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو سزا سے بچالیں گے تو یہ ان کا بہت بڑا اشتباہ ہوگا اور یہ مالی جرمانہ اور فدیہ ان کی سزا کی کیفیت پر کسی قسم کا کوئی اثر نہیں ڈال سکے گا۔

"اُولٰٓئِکَ لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ وَّمَا لَہُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِیۡنَ۔"

اُن کے لیے دردناک عذاب یقینی ہے اور اس عظیم سزا سے بچانے کے لیے انہیں کوئی حامی و مددگار نہیں مل سکے گا اور شفاعت کرنے والوں کی شفاعت بھی انہیں میسر نہ ہوگی۔

قرآن مجید کے تیسرے پارے کی تفسیر یہاں پر ختم ہوتی ہے



اشاریہ

تفسیرِ نمونہ جلد دوم

ترتیب و تدوین : سیّد شکیل حسین موسوی

فہرست



اصول و عقائد

توحید

۞ ۞ ۞

علمِ خدا

رجعت

عدل

نبوّت

امامت

دُعا

۞ ۞ ۞



معاد

شفاعت

جبر و اکراہ

معجزہ

احکام

نماز

جہاد

حج




۴۱۲





علماء



کتب آسمانی

انجیل

تورات

قرآن

قرآن اور سائنس



کتب تاریخ و تفسیر وغیرہ



لغاتِ قرآن




۴۱۹





متفرق موضوعات







مقامات

٭ ٭ ٭